بیدل و غالب

ڈاکٹر سید احسن الظفر

غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

بیدل و غالب

ڈاکٹر سید احسن الظفر

غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

BEDIL-O-GHALIB

BY :

Dr. SYED AHSAN-UZ-ZAFAR

ISBN : 81-8172-058-X

بہ اہتمام	:	شاہد ماہلی
اشاعت	:	۲۰۱۲ء
قیمت	:	۵۰۰ / روپے
مطبوعہ	:	اصیلا آفسیٹ پرنٹرس، دہلی

غالب انسٹی ٹیوٹ،

ایوانِ غالب مارگ، نئی دہلی۔۲

www.ghalibinstitute.com-- E-mail: ghalib@vsnl.net

فہرست مضامین

پیش لفظ

غالب نے بیدل سے جو اثر لیا اور جس احترام سے اُن کے رُتبے کو قبول کیا اس کی شہادت تو خود اُن کے کلام میں ملتی ہے۔ بیدل سے متعلق غالب کے ہاں متضاد بیانات بھی ہیں جن سے کچھ سوالات اٹھتے ہیں اسی کی بنا پر غالب کی شاعری پر اظہار خیال کرنے والوں نے بیدل کے حوالے سے ان کے اشعار کو سمجھنے اور ان کے مفاہیم کو متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ دو بڑے شاعروں کا باہم ایک دوسرے سے تخلیقی زندگی میں اس قدر قریب ہونا دلچسپ بھی ہے اور شاعری کی تاریخ کے ایک ایسے پہلو کو نمایاں بھی کرتا ہے جس کی تفصیلات پر غور کرنا خود غالبیات کے ماہرین کے لئے ایک چیلنج ہے۔ اس کا احساس تو سب کو ہے مگر اس کے پیشِ نظر مطالعہ کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ بس سرسری طور پر ضرور حوالے دیئے جاتے

رہے ہیں۔ سید احسن الظفر صاحب نے غالب اور بیدل کے خصوصی مطالعے کی اہمیت کے پیشِ نظر بڑا وقت اس موضوع کی تحقیق میں صرف کیا اور جس کا حاصل اس کتاب کی شکل میں پیش کیا ہے۔ انہوں نے دونوں کے تقابل اور کلام کے تجزیہ وتنقید پر اردو میں پہلی بار اس قدر جامع مقالہ تحریر کیا ہے۔ احسن الظفر صاحب فارسی کے عالم ہیں اور لکھنؤ یونیورسٹی میں مدتوں درس وتدریس میں مشغول رہے ہیں۔ وہ غالب انسٹی ٹیوٹ کے سمیناروں میں مقالات پیش کر چکے ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ اب اُن کا مقالہ مکمل ہو کر غالب انسٹی ٹیوٹ سے شایع ہو رہا ہے۔

مجھے اُمید ہے کہ اہلِ نظر کو غور وخوض کے لئے اس میں بہت کچھ ملے گا۔

صدیق الرحمٰن قدوائی

مقدمہ

اے التفات نام تو گیرائی زباں
ذکرت انیس خلوتِ تنہائی زباں
بیدل

بنامِ خداوند پیروزگر
مہ و مہر ساز و روز و شب گر
غالب

۷۵-۱۹۷۴ء کی بات ہے سبکِ ہندی کے مشہور اور عظیم شاعر مرزا عبدالقادر بیدل (۱۰۵۴-۱۱۳۳ھ/۱۶۴۴-۱۷۲۰ء) پر تحقیقی کام کے دوران بیدل کے کلام سے غالب کی غیر معمولی اثر پذیری کا اندازہ مجھے ہوا۔ تقریباً بارہ تیرہ اشعار میں غالب نے بیدل سے اثر پذیری کا تذکرہ نہایت واضح الفاظ میں کیا ہے۔ تب سے میں اس تلاش میں تھا کہ آخر وہ کون کون سے اشعار ہیں جن میں غالب نے بیدل کے خیال یا مضمون کو اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے۔ اتفاق سے دسمبر ۱۹۹۷ء میں غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی کی طرف سے سیمنار میں شرکت کے لئے ایک دعوت نامہ آیا۔ اس وقت تک کے مطالعہ و تحقیق کی بنا پر موازنۂ بیدل و غالب سے متعلق ایک مضمون ''آہنگ اسد میں نغمۂ بیدل'' کے عنوان سے لکھ کر میں نے سیمنار میں پڑھا جسے سامعین خصوصاً استاد محترم و مکرم جناب امیر حسن عابدی صاحب مدظلہ نے پسند کیا اور حوصلہ

افزائی فرمائی۔ پھر ''تاثیر بیدل بر غالب'' کے عنوان سے اس کا فارسی میں ترجمہ کر کے مجلّہ ''دانش'' اسلام آباد میں بھیجا جو ۱۹۹۸ء کے شمارہ ۵۲ میں شایع ہوا۔ مزید مطالعہ و تحقیق کا سلسلہ جاری تھا کہ خیال آیا کیوں نہ ایک پروجیکٹ کی شکل میں اسے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کو بھیجوں کہ ہم خرما و ہم ثواب کا مصداق ہو جائے۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ وہاں سے بھی منظور ہو گیا اور اب یہ کتابی شکل میں قارئین کے سامنے پیش ہے۔

بیدل کا انتقال ۱۷۲۰ء میں ہوا، ٹھیک اس کے ۷۵ سال بعد ۱۷۹۷ء میں غالب پیدا ہوئے۔ غالب سے پہلے بھی بیدل کا چرچا ایک فارسی گو شاعر کی حیثیت سے تھا، مگر صرف فارسی داں حضرات تک محدود تھا۔ اردو داں طبقے میں بیدل کے تعارف کا سہرا غالب اور اس کے بعد اقبال کے سر جاتا ہے۔ غالب نے اپنے اشعار میں بیدل کو بہت سراہا، اور خطوط میں کہیں سراہا اور کہیں گرایا ہے۔ ''کبھی محیط بے ساحل''، ''قلزم فیض، صاحب جاہ و دستگاہ'' اور ''غیر ناداں'' کے بھاری بھرکم القاب سے نوازا اور کبھی ''جادہ ناشناش'' اور ''کج رفتار'' کا خطاب دیا۔ کہیں لکھتے ہیں ''بیدل کی فارسی کیا؟''۔ دوسری جگہ کہتے ہیں ''بیدل کا شعر مجھ کو مزہ دیتا ہے'' کہیں کہتے ہیں ''ٹکسال باہر ہے'' اور کہیں سند کے طور پر کہتے ہیں ''متاخرین میں بھی مرزا عبدالقادر بیدل کہتا ہے''۔ اس طرح جو لوگ غالب اور بیدل کے کلام کا موازنہ کرنا چاہتے تھے ان کے لئے غالب کے یہ متضاد بیانات ذہنی کشمکش کا باعث بنے اور انہوں نے بھانت بھانت کے موافق و مخالف خیالات کا اظہار کیا۔ لیکن ایک بات مسلم ہے کہ بیدل کے کلام کی جو گہری چھاپ غالب کے ذہن پر شروع میں پڑ گئی تھی وہ آخر دم تک مٹائے نہیں مٹی اور اس کی ''بہار ایجادی'' کا جو جادو اس پر چل گیا تھا اس سے وہ پیچھا نہ چھڑا سکے۔ اسی لئے ان کے قریب ترین شاگرد رشید حالی نے لکھا ہے: ''خیالات میں بیدلیت آخر تک قائم رہی''۔

اس طرح دیکھا جائے تو غالب پہلا شاعر اور ادیب ہے جس نے اردو داں طبقے میں بیدل کا تعارف کرایا اور انہیں اس بات پر آمادہ کیا کہ بیدل کے کلام کا مطالعہ کریں اور اس کی خصوصیات کو بھی سمجھیں۔ یہاں سے بیدل اور غالب کے تقابلی مطالعے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور

مشہور ماہرین غالبیات پروفیسر عابد علی عابد، پروفیسر حمید احمد خاں ، ڈاکٹر وحید اختر، خورشید الاسلام، الیگزنڈر بوزانی، کالیداس گپتا، نیاز فتح پوری، ڈاکٹر عبدالغنی اور جگناتھ آزاد وغیرہ نے اس موضوع پر مقالے لکھے اور حالی، شبلی، غلام رسول مہر پروفیسر رشید احمد صدیقی ، پروفیسر احتشام حسین، پروفیسر آل احمد سرور، یگانہ چنگیزی، یوسف حسین خاں، خلیل الرحمن او. قاضی عبدالودود وغیرہ نے ضمنی طور پر اس پر بحث کی۔

پیش نظر کتاب میں غالب کے کلام کا بیدل کے کلام سے موازنہ کرکے اس نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کی گئی ہے کہ غالب کے ذریعہ بیدل کی تقلید، اس کے حدود اور غالب کی انفرادیت کی واقع میں کیا حقیقت ہے۔ نیز ان کی روشنی میں لوگوں کے اختلاف آراء کی حقیقت بھی کھل کر آجائے گی کہ کس کی رائے کس حد تک صحیح یا غلط ہے۔

راقم السطور کی تحقیق کے مطابق، غالب نے بیدل کا اثر تین طرح سے قبول کیا ہے۔ یا تو بیدل کے مصرعوں کا لفظی یا آزاد منظوم ترجمہ کیا ہے اور دوسرا مصرعہ بدل دیا جیسے:

بیدل	غالب
فریبِ فرصتِ ہستی مخور کہ ہم چو شرار	ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
نہفتنی است اگر ہست وا نمودنہا	عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

☆

بیدل	غالب
سربازی عشاق بہ بزم تو تماشاست	ہم نے مانا کہ تغافل نہ کروگے لیکن
ہر چند نباشد بمیاں پائے تغافل	خاک ہوجائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

☆

بیدل	غالب
باآنکہ ما اسیرِ کمند حوادثیم	گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
عنقاست بے نشاں بسراغِ نشان ما	لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

☆

بیدل	غالب
داغ محرومی دیدار ز محفل رفیتم	جاتا ہوں داغ حسرتِ ہستی لئے ہوئے
برسانید بہ آئینہ سلامِ دلِ ما	ہوں شمع کشتہ در خور محفل نہیں رہا

☆

رونقِ ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے — بے عشق محالست بود رونقِ ہستی

انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں — بے جلوۂ خورشید جہاں نامہ سیاہ است

اس طرح کے تقریباً سوڈیڑھ سو اشعار میری نظر سے گذرے ہیں جو اس کتاب میں موجود ہیں۔ یہاں غالب پر بیدل کی وہ پیشین گوئی صادق آتی ہے جس میں اس نے کہا ہے کہ ہمارے مصرع پر لوگ تضمین کر کے اپنا شعر مکمل کریں گے:

بردہ اند از موجِ گوہر پیچ و تابِ اشتراک
مصرعِ ما را ز تضمیں فرد پیدا کردہ اند

دوسری شکل یہ ہے کہ بیدل کے خیال کو اپنے الفاظ میں ادا کیا ہے:

فلک در خاک پنہاں کرد یکسر صورت آدم
مصور کردہ می خواہد از مردم گیاہ اینجا

بیدل کا خیال ہے کہ انسانی صورتوں کو خاک میں روپوش کر کے آسمان نے انھیں گھاس پھوس کی شکل میں نمایاں کرنا چاہا ہے۔ غالب نے اس خیال کو اپنے مخصوص اسلوب میں ادا کیا ہے۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہو گئیں

☆☆☆

من و ساز دکان فروشیہا، چہ حرفست ایں
جنونِ ایں فضولی در سرِ منصور می باشد

بیدل کا خیال ہے کہ منصور حلاج کا اناالحق کا نعرہ لگا کر وحدت الوجود کا ڈھنڈورا پیٹنا دکان داروں کا اپنے مال کو آواز لگا کر بیچنے کا سا انداز رکھتا ہے۔ میں بھی وحدت الوجودی ہوں لیکن اس کا ڈھنڈورا نہیں پیٹتا۔ اسی خیال کو غالب نے اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے۔

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلید تنک ظرفی منصور نہیں

تیسری شکل یہ ہے کہ کسی مسئلے پر بیدل کے خیال کے برعکس اپنے خیال کا اظہار کیا ہے :

در ساز وفا ناخنِ تدبیر دگر نیست
فرہاد ہماں بر سرِ خود تیشہ دواند

بیدل

تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہ کن اسد
سر گشتۂ خمار رسوم و قیود تھا

غالب

غالب کے نزدیک فرہاد کی اپنے تیشے سے خودکشی رسم پرستی پر مبنی تھی جبکہ بیدل کے نزدیک وہ اس کی وفاداری پر مبنی تھی، کیونکہ شیریں کی موت کی خبر سن کر اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا کہ اسی تیشے سے اپنا سر پھوڑ لے جس سے وہ پتھر توڑ رہا تھا۔

آرزو از سینہ بیروں کن ز کلفتہا بر آ
عالمی زیں دانہ در دامِ بلا افتادہ است

بیدل

نفس نہ انجمن آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں، انتظار ساغر کھینچ

غالب

غالب کے نزدیک آرزو سے زندگی کی رونق قایم ہے جبکہ بیدل کے نزدیک آرزو سے انسان دام بلا میں گرفتار ہو جاتا ہے۔

یہ کتاب چار ابواب پر منقسم ہے۔ پہلے باب میں غالب اور بیدل کے عہد کے سیاسی اور ادبی حالات کا تذکرہ ہے۔ دوسرے باب میں غالب اور تقلید کے عنوان پر تھوڑی سی بحث ہے۔ تیسرے باب میں بیدل کی تقلید سے وابستہ غالب کے خیالات اور نقادوں کی رائے کا ذکر ہے۔ چوتھے باب میں غالب اور بیدل کے ان ہم معنیٰ و ہم مضمون اشعار کو پہلو بہ پہلو رکھ کر ان کی

وضاحت کی گئی ہے، جن میں غالب بیدل کے خیال یا مضمون کے ترجمان نظر آتے ہیں، یا اس سے مختلف نظریہ پیش کرتے ہیں۔ یہاں اس بات کا اعتراف ضروری ہے کہ غالب کے کلام کی تشریح میں حالی کی کتاب یادگارِ غالب کے علاوہ پروفیسر یوسف سلیم چشتی کی شرح کلام غالب اور دیگر کتابوں اور مقالوں سے (جن کی فہرست کتابیات میں دی گئی ہے) اور عہدِ بیدل کے سیاسی وسماجی حالات کے سلسلے میں محمد ساقی کی تاریخ مآثر عالمگیری، عبدالقادر خاں قراچار کی کتاب اویماق مغل سے اور عہد غالب کے سیاسی وسماجی وادبی حالات کے سلسلے میں پروفیسر یوسف حسین خاں کی کتاب ''غالب وآہنگ غالب'' اور شریف حسین قاسمی کے مضمون سے استفادہ کیا گیا ہے۔

آخر میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کا شکریہ بجالانا ضروری ہے جس کی مالی امداد سے یہ مشکل کام انجام پاسکا۔

احسن الظفر

لکھنؤ

ستمبر ۲۰۱۱ء

باب اول

عہد بیدل و غالب
کے
سیاسی، سماجی و ادبی حالات

بہ فنا بود مگر ایمنی ز کشاکش غم زندگی
کہ فتادہ برسرِ عافیت ز نفس غبار تسلسلم
بیدل

کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعی آزادی
ہوئی زنجیر موج آب کو، فرصت روانی کی
غالب

ہر شاعر اور فنکار کے عہد میں معاشرہ کے جو سیاسی، سماجی، تہذیبی و ادبی حالات ہوتے ہیں ممکن نہیں ہے کہ وہ ان سے دامن بچا کر زندگی گزار سکے اور ان کے بارے میں موافق یا مخالف رائے نہ دے۔ بیدل نے ایک جگہ لکھا ہے:

''تا نسخہ اندیشہ از ہستی رقمِ تو ہمی دارد، با ہرزہ سوادانِ مکتب امتیاز ہم سبق بودن ناچاریست''(۱)

نسخۂ فکر کو جب تک ہستی کی وہمی تحریر منظور ہے مکتب امتیاز کے ہرزہ سوادوں کا ہم سبق رہنا ناگزیر ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ بیدل اور غالب دونوں ایک زبردست سیاسی بحران اور سماجی انتشار کے دور سے گذرے ہیں، جس میں سماجی اور تہذیبی قدریں تیزی سے بدل رہی تھیں۔ اس لئے ان کے کلام میں اس دور کی پرچھائیں ہونا ایک فطری امر ہے۔ خصوصیت سے بیدل کا آخری زمانہ تو جانشینی کی خونین جنگوں کا دور رہا ہے، جس میں اس نے انسانی قدروں کو پامال ہوتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ٹھیک اسی طرح غالب کو ۱۸۵۷ء کے انتہائی خوفناک دور سے گذرنا پڑا جس میں قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوتے ہوئے اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ان دونوں شاعروں کی سخت جانی حیرت انگیز ہے کہ ایسے پرآشوب اور پرفتن دور میں سیاست سے الگ رہ کر یا موقع شناسی سے کام لے کر نہ صرف یہ کہ اپنی جان صاف بچالے گئے بلکہ غیر معمولی شاعری کی جو ان کے عہد کے سیاسی اور سماجی حالات کی آئینہ دار تو ہے ہی، عاشقانہ جذبات و واردات اور عارفانہ افکار و خیالات کا مجموعہ بھی ہے۔ اس لئے ان دونوں کے کلام کا موازنہ کرنے سے پہلے ان کے عہد کے سیاسی، سماجی اور ادبی پس منظر کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

ابوالمعانی مرزا عبدالقادر بیدل ۱۰۵۴ھ-۴۵-۱۶۴۴ء میں پیدا ہوئے اور ۱۱۳۳ھ ۱۷۲۰ء میں وفات پائی۔ اس طرح اس نے شاہجہاں، اورنگ زیب، شاہ عالم بہادر شاہ، جہاندار شاہ، فرخ سیر اور محمد شاہ رنگیلے، چھ مغل بادشاہوں کا دور دیکھا۔ شاہجہاں ۱۰۳۷ھ میں تخت پر بیٹھا۔

اس کی تخت نشینی کے سولہ سترہ سال بعد بیدل پیدا ہوا۔ اس مدت میں شاہجہاں نے اپنی حکومت کی بنیاد استوار کرلی تھی اور پورے ملک میں امن وامان قائم تھا، بیدل اس عہد کے بابت کہتا ہے:

دور سعدی بود و عہد امن و ایام شریف
خلق در حمد خدا از عدل شاہِ نیک پے

وہ ایک خوشگوار اور مبارک عہد تھا، ہر طرف امن و امان کا دور دورہ تھا اور نیک دل بادشاہ کے انصاف و دادگری سے خوش ہوکر عوام خدا کی حمد وثنا کرتی تھی۔

شاہجہاں نے اپنے بڑے لڑکے داراشکوہ کو اپنی زندگی ہی میں ولی عہد مقرر کردیا تھا۔ اس کی وجہ سے داراشکوہ میں غرور اور اس کے بھائیوں کے درمیان باہمی نزاع اور حسد پیدا ہوا۔ داراشکوہ خود کو ہندوستان کا مطلق العنان بادشاہ تصور کرتا اور اپنے منصوبے کو عملی شکل دینے کے لئے بھائیوں کو راستے سے ہٹانا چاہتا تھا۔ شاہجہاں کو اپنے لڑکوں کے اس باہمی کشمکش کا اندازہ ہوگیا تھا اس لئے ملک میں امن وامان قائم رکھنے کی غرض سے اس نے مختلف صوبہ جات کو شہزادوں میں بانٹ دیا۔ ۵۸-۱۶۵۷ھ میں شاہجہاں حبس بول کی بیماری میں مبتلا ہوا تو حکومت کی باگ ڈور اس کے ہاتھ سے پوری طرح نکل گئی۔ داراشکوہ نے، جو نائب السلطنہ کے طور پر کام کررہا تھا، دارالسطنت تک پہنچنے کے سارے راستے گھاٹ بند کردئے۔ شاہجہاں کی بیماری کی خبر دھیرے دھیرے پورے ملک میں پھیل گئی۔ دکن میں اورنگ زیب، گجرات میں مراد بخش اور بنگال میں شاہ شجاع نے داراشکوہ کی برادر کش پالیسی کے خلاف بغاوت کا علم بلند کردیا۔ اورنگ زیب چونکہ زیادہ حوصلہ مند تھا اس لئے شاہجہاں کو اس کی طرف سے بدظن کرنے کی خاطر، داراشکوہ نے مختلف بہانے سے باپ کو اس بات پر آمادہ کرلیا کہ اپنے رکاب کی ساری فوج اس کے سپرد کردے۔ شاہجہاں کی زندگی میں پہلے شجاع اور مراد بخش کو راستے سے ہٹا کر دکن کی مہم میں متوجہ ہونے کی خاطر داراشکوہ نے شاہجہاں کو اس کی بیماری کی حالت میں دہلی سے اکبرآباد بھیج دیا۔ سلیمان شکوہ کی زیر قیادت راجہ جے سنگھ کو شاہی فوج اور اپنی فوج کے ساتھ شجاع کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا۔ شجاع بنارس پہنچا تھا کہ سلیمان شکوہ سے اس کی مڈھ بھیڑ ہوگئی۔ اپنی ہار دیکھ کر شجاع پٹنہ واپس ہوگیا۔ اورنگ زیب کی پیش قدمی کو روکنے کے

لئے داراشکوہ نے راجہ جسونت سنگھ کی زیر قیادت ایک عظیم فوج مالوہ کی طرف روانہ کیا اور قاسم خاں کی سپہ سالاری میں ایک الگ فوجی دستہ راجہ موصوف کے ساتھ اس ہدایت کے ساتھ اجین بھیجا کہ مراد بخش سے حسب مصلحت نمٹے۔ اورنگ زیب باپ کی ملاقات کے لئے برہان پور آیا اور ساتھ میں کچھ ہتھیار بھی رکھ لئے۔ ۲۵/ جنوری ۱۶۵۸ء کو برہان پور سے شاہجہاں کو خط لکھا۔ مگر ایک مہینے تک اس کا کوئی جواب نہیں ملا۔ داراشکوہ کی تحریک پر جسونت سنگھ مقابلہ کے لئے تیار بیٹھا تھا۔ اورنگ زیب نے اکبرآباد کا رخ کیا۔ دیبالپور پار کرتے ہی احمد آباد سے مراد بخش بھی آکر مل گیا۔ دھرما تپور کے مقام پر اورنگ زیب اور جسونت سنگھ کے درمیان گھمسان کا رن پڑا۔ جو بالآخر اورنگ زیب کی کامیابی اور جسونت سنگھ کی ناکامی پر ختم ہوا۔ الہ آباد سے بیس میل کے فاصلے پر واقع مقام راج پور میں اورنگ زیب اور داراشکوہ کی فوجوں میں زبردست جنگ ہوئی۔ داراشکوہ کے مشہور سپہ سالار رستم خاں، راؤ چھتر سال اور راجہ جے سنگھ راٹھور سب جنگ میں کام آگئے۔ داراشکوہ اتنا سہم چکا تھا کہ ہاتھی سے اترا اور گھوڑے پر سوار ہوکر راہِ فرار اختیار کرگیا۔ داراشکوہ کے خیمے میں داخل ہوکر اورنگ زیب نے کچھ دیر قیام کیا پھر اکبرآباد روانہ ہوا اور جنگ سے متعلق معذرت کا ایک خط شاہجہاں کو لکھا۔ شاہجہاں نے اس کا جواب دیا دوسرے دن ''عالم گیر'' نام کی ایک تلوار اسے تحفے میں عطا کی۔ اورنگ زیب داراشکوہ کے تعاقب میں دہلی روانہ ہوا۔ وہاں پتہ چلا کہ وہ بھاگ کر لاہور چلا گیا اس لئے اس نے پنجاب تک پیچھا کرنے کا فیصلہ کیا۔ ۲۱/ جولائی ۱۶۵۸ء بروز جمعہ دہلی کے پاس ایک مقام (اغراباد باغ) میں اورنگ زیب تخت شاہی پر جلوہ افروز ہوا۔ فوجی سپہ سالار اور ارکان دولت کو انعامات سے نوازا۔ یہ پہلا جلوس تھا۔ اس بیچ اسے خبر ملی کہ شجاع کو شکست دینے کے بعد سلیمان شکوہ ہردوار کی طرف روانہ ہوا ہے اور سہارنپور کے راستے اپنے باپ سے جا ملنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اورنگ زیب نے اس مہم پر شائستہ خان کو روانہ کیا۔ اورنگ زیب کو پتہ چلا کہ جو فوجی دستہ داراشکوہ کا پیچھا کرنے کے لئے دریائے ستلج کے کنارے روانہ کیا تھا وہ اسے پار کر چکا ہے۔ لاہور پہنچنے کے بعد داراشکوہ نے بیس ہزار سوار جمع کر لئے تھے۔ اورنگ زیب کی دریا پار کرنے کی خبر سنتے ہی اس نے اپنے بیٹے سپہر شکوہ کی زیر قیادت ایک فوجی دستہ اس کی پیش رفت پر روک

لگانے کے لئے روانہ کیا۔ ادھر اورنگ زیب نے مزید فوج بھیج دی جس کے مقابلے کی تاب نہ لا کر دارا شکوہ لاہور سے ملتان اور وہاں سے بھکر روانہ ہو گیا۔ اس بے سروسامانی کے عالم میں بہت سے نوکر بھی اس سے بچھڑ گئے۔ دارا شکوہ کا پیچھا ترک کر کے اورنگ زیب آہستہ آہستہ ملتان پہنچا۔ اس بیچ اسے پتہ چلا کہ شاہ شجاع بنگال سے روانہ ہو کر جنگ کا ارادہ رکھتا ہے۔ وہ ملتان سے دہلی واپس آیا تب تک شاہ شجاع بنارس پہنچ چکا تھا۔ شاہزادہ محمد سلطان کو شاہ شجاع سے نمٹنے کی ہدایت ملی اور خود سورون کی شکار گاہ پہنچ کر انتظار کرنے لگا۔ خط وکتابت کے ذریعے اورنگ زیب نے شاہ شجاع کا ارادہ معلوم کرنا چاہا لیکن جب اسے اندازہ ہو گیا کہ دلداری کی بات بے سود ہے تو سورون کی دفاع کے ارادے سے آگے بڑھا آخر کار الہ آباد سے ۵۰ کلو میٹر مغرب کھجوا کے مقام پر ۵/دسمبر ۱۶۵۸ء کو دونوں کے درمیان محاذ آرائی شروع ہوئی، زبردست میدان کارزار گرم ہوا، رات کے وقت شاہ شجاع نے توپ خانے پیچھے ہٹا لئے لڑائی رک گئی آخری شب میں مہاراجہ جسونت سنگھ نے، جو بظاہر اورنگ زیب کا طرفدار تھا اور درپردہ شاہ شجاع سے ملا ہوا تھا، بھاگنے کا ارادہ کیا اور شاہ شجاع کو اپنے ارادے سے مطلع کیا۔ اس طرح اس کی زیر قیادت پوری فوج نے بغاوت کر دی اور شہزادہ سلطان کی فوج پر حملہ کر کے اس کے مال واسباب لوٹ لئے۔ مگر اورنگ زیب اس قدر بلند حوصلہ اور عزم کا پکا انسان تھا کہ اس کی پامردی میں ذرہ برابر بھی کمی نہیں آئی۔ اس کی فوج اس وقت اگر چہ دو ہزار سے زیادہ نہیں رہ گئی تھی پھر بھی اس نے ہمت نہیں ہاری اور بڑی دلیری سے شجاع کی فوج سے ٹکر لیا۔ گھمسان کی لڑائی شروع ہو گئی، اورنگ زیب خود بھی بڑی پامردی سے لڑتا رہا اور فوج کے حوصلے بڑھاتا رہا۔ شاہ شجاع کے پاؤں اکھڑ گئے، اس نے فرار کو غنیمت سمجھا۔ اس کی فوج میں بھگدڑ مچ گئی اور اس کے بہت سے سوار کام آگئے۔ اورنگ زیب نے شاہزادہ محمد سلطان کو شجاع کے تعاقب میں روانہ کیا اور خود وہاں ٹھہر کر واپس لوٹ آیا۔ ۲۶/مئی ۱۶۵۸ء کو اورنگزیب نے تمام لوازمات کے ساتھ تخت شاہی پر دوبارہ جلوس کیا اور پچاس سال تک پوری شان وشوکت کے ساتھ ہندوستان کے وسیع علاقے پر حکومت کی۔ بیدل نے چہار عنصر میں ان واقعات کا تذکرہ کیا ہے۔

پچاس سال دو ماہ اور بیس دن کی حکومت کے بعد ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کا احمد نگر میں انتقال ہو گیا۔ دولت آباد میں شاہ بریاں غریب کے مقبرے کے پاس دفن کیا گیا۔ اس کی وفات کے وقت اس کا دوسرا لڑکا محمد معظم عرف شاہ عالم بہادر شاہ کابل میں تھا۔ اس لئے تیسرا لڑکا اعظم شاہ ارکان دولت کے اتفاق رائے سے ۴/مارچ ۱۷۰۷ء کو احمد نگر میں تخت شاہی پر جلوہ افروز ہوا۔ بہادر شاہ کو جب یہ خبر ملی تو ایک بڑی فوج کے ساتھ اس نے دہلی کا رخ کیا۔ ملک کو بھائیوں میں تقسیم کرنے اور جنگ سے کنارہ کشی کرنے سے متعلق ایک خط اس نے اعظم شاہ کو بھیجا لیکن یہ تجویز اس نے رد کر دی اور جنگ کے ارادے احمد نگر سے اپنی فوج کے ساتھ اکبر آباد روانہ ہوا۔ اکبر آباد سے بارہ کلومیٹر پر واقع مقام دھولپور میں دونوں کی فوجیں بھڑ گئیں جس میں اعظم شاہ اپنے دو بیٹوں بیدار بخت اور سلطان والا جاہ نیز بہت سے امراء کے ساتھ مارا گیا۔ شاہ عالم کے چھوٹے بھائی محمد کام بخش نے اپنے کو خود مختار دکھانے کے لئے ۱۷۰۸ء میں سکے اور خطبہ میں اپنا نام داخل کر لیا۔ بہادر شاہ ایک بڑی فوج کے ساتھ کام بخش سے جنگ کے لئے حیدر آباد کے قریب پہنچا تو کام بخش بھی اپنی فوج کے ساتھ میدان کارزار کی طرف بڑھا، لڑا اور مارا گیا۔

۱۷۱۲ء میں بہادر شاہ کے انتقال کے بعد اس کے لڑکوں میں جانشینی کی ایک بار پھر زبردست جنگ ہوئی جس میں ایک طرف جہاندار شاہ، رفیع الشان اور جہانشاہ تینوں بھائی اور امیر الامراء ذوالفقار خاں تھے اور دوسری طرف صرف عظیم الشان تھا جو خود کو مغل تاج کا اکیلا وارث سمجھتا تھا۔ دو حریف کی حیثیت سے دونوں آمنے سامنے آئے، عظیم الشان مارا گیا تخت اور خزانہ جہاندار کے ہاتھ لگا۔ ذوالفقار خاں کی رائے تھی کہ جہاندار بڑے بھائی ہونے کی وجہ سے تخت پر براجمان ہو، اس لئے تین دن بعد دوبارہ جنگ چھڑ گئی رفیع الشان اور جہانشاہ اپنے بیٹے فرخندہ کے ساتھ جنگ میں کام آ گئے۔ معز الدین جہاندار ۱۷۱۲ء میں لاہور میں تخت پر بیٹھا۔ چند دنوں بعد عظیم الشان کے لڑکے سلطان محمد کریم کو بھی گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا۔ کچھ ہی دنوں بعد بساط سلطنت پر ایک اور انقلاب برپا ہوا۔ ۹ مہینے بعد محمد فرخ سیر کو اپنے باپ عظیم الشان کے مارے جانے کی خبر ملی تو باپ اور بھائی کے خون کا بدلہ لینے کے ارادے سے اس نے دہلی کا رخ کیا۔ جہاندار شاہ نے اپنے بڑے لڑکے اعز الدین شاہ کو فوج دے کر دفاع کے لئے بھیجا۔ فرخ

سیر جب الہ آباد پہنچا تو وہاں کے صوبیدار سید عبداللہ خان اور بہار کے صوبیدار سید حسین علی خاں کو منا کر اپنا طرفدار کرلیا اور ایک بڑی فوج کے ساتھ الہ آباد سے پچاس کلومیٹر دور مقام کھجوا پہنچا جہاں دونوں کے بیچ گھمسان کا رن پڑا۔ اعزالدین ناکام ہو کر وہاں سے آگرہ کی طرف بھاگا۔ فرخ سیر نے اس کا پیچھا کیا وہاں اسے دوبارہ جہاندار شاہ کی فوج سے پالا پڑا۔ جہاندار شاہ میدان سے بھاگ کھڑا ہوا۔ محمد فرخ سیر ۹ر نومبر ۱۷۱۲ء کو اکبر آباد میں تخت نشین ہوا۔ کچھ دنوں بعد دہلی روانہ ہوا۔ فرخ سیر جو انتقام کے جذبے سے آگ بگولہ ہو رہا تھا، ذوالفقار خان اور جہاندار شاہ کو قتل کرنے کے بعد ان کے سر تن سے جدا کر دیے اور انہیں بھالے کی انی پر لٹکا دیا۔ ان کی بیجان نعش کو ہاتھ پیر باندھ کر ہاتھی کی پیٹھ پر لٹکا کر پورے شہر میں گشت کروائی۔ اقتدار کی کرسی پر پہنچنے کے بعد فرخ سیر نے سادات بارہہ کی قدردانی کے طور پر عبداللہ خاں کو قطب الملک بہادر وفادار ظفر جنگ اور اس کے بھائی حسین علی خاں کو امیر الامر کے خطاب سے نوازا۔ فرخ سیر پانچ سال تک اقتدار کی کرسی پر براجمان رہا۔ اس دوران امور مملکت کی باگ ڈور دھیرے دھیرے سادات بارہہ کے ہاتھ پہنچ گئی۔ سادات کے بڑھتے ہوئے اثر کو خطرے کی گھنٹی سمجھ کر فرخ سیر نے ان کو راستے سے ہٹانے کا ایک منصوبہ بنایا جن کی وجہ سے ان کے بیچ دشمنی پیدا ہوگئی۔ بدگمانی جب حد سے بڑھ گئی تو قطب الملک نے اپنے بھائی حسین علی خاں کو دکن سے بلایا، ۱۸ر جنوری ۱۷۱۹ء کو صبح کے وقت قلعہ میں داخل ہوئے اور اپنے بھروسے کے نوکروں کو مناسب جگہوں میں بٹھایا۔ سادات کے ڈر سے فرخ سیر حرم سرا میں چھپ گیا۔ دس دن بعد سادات نے نوکروں کو حکم دیا کہ فرخ سیر کو زبردستی باہر نکال لائیں، چنانچہ بڑی ذلت کے ساتھ حرم سرا سے نکال کر ترپولیا کے قلعہ میں اسے نظر بند کر دیا اور آنکھوں میں سلائی پھیر دی۔ دو مہینے بعد قطب الملک کے حسب حکم قید خانے میں اسے قتل کر دیا گیا اور مقبرۂ ہمایوں میں دفن ہوا۔ فرخ سیر کے بعد سادات بارہہ نے رفیع الدرجات کو قید خانے سے نکال کر ۱۸ر فروری ۱۷۱۹ء کو تخت پر بٹھایا لیکن سلطنت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ ہی میں رکھی۔ رفیع الدرجات بیمار اور کمزور تھا تین مہینے کے بعد اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ اس کے بعد اس کے بڑے بھائی رفیع الدولہ کو قید خانے سے نکال کر ۲۸ر مئی ۱۷۱۹ء کو تخت شاہی پر بٹھایا اور اسے شاہجہاں ثانی کا لقب دیا۔ لیکن وہ بھی بیمار اور نحیف تھا اس لئے تین مہینے بعد وہ بھی چل

بسا۔اس کے بعد ناصر الدین شاہ کو سترہ سال کی عمر میں ۱۸؍جون ۱۷۱۹ء کو آگرہ میں تخت نشیں کیا اور اسے محمد شاہ کا لقب دیا۔محمد شاہ نسبتاً کسی حد تک سوجھ بوجھ رکھتا تھا۔سلطنت پر سادات کا قبضہ اور ان کا غیر معمولی اثر اس کے لئے تشویش ناک بات تھی، اس لئے اس کے دل میں کدورت پیدا ہوئی۔آخر ایک دن ان کو راستے سے ہٹانے میں کامیاب ہوگیا۔۳۰؍اگست ۱۷۲۰ء کو حسین علی خاں جب دکن کے راستے میں تھا، محمد شاہ کے حسب حکم محمد امین خاں کے اغوا سے میر حیدر کاشغری کے ہاتھوں مارا گیا۔اس کے بعد بڑے بھائی عبداللہ خاں نے اپنے چھوٹے بھائی نجم الدین خاں کو خط لکھا کہ قید خانے سے ایک شہزادے کو نکال کر تخت پر بٹھائے۔۱۲؍ذی الحجہ ۱۱۳۲ھ کو شہزادہ سلطان ابن رفیع الشان کو تخت پر بٹھایا گیا۔دو دن بعد قطب الملک دہلی آ گیا محمد شاہ اور قطب الملک کی فوجوں کے درمیان زبردست لڑائی ہوئی۔قطب الملک کو جب اپنی شکست کا اندازہ ہونے لگا تو ہاتھی سے اتر کر خود کو شاہ کے سامنے پیش کیا۔حیدر قلی خاں نے ہاتھی پر سوار کر کے اسے بادشاہ کے حضور پیش کیا۔بادشاہ نے اس کی جان تو بخش دی مگر قید خانے میں ڈال دیا۔اس کے بعد ۱۱۳۵ھ کی آخری تاریخوں میں اسے زہر دے دیا گیا۔(۲)

یہ تھے عہد بیدل کے سیاسی حالات۔ان کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ تیموری حکومت عہد اورنگ زیب میں اپنے کمال کو پہنچ چکی تھی۔۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد اس میں زوال آنا شروع ہوا۔۱۷۱۲ء میں شاہ عالم بہادر شاہ کی وفات کے بعد زوال کا احساس زور پکڑتا ہے کیونکہ دس سال کے عرصہ میں سیاسی اسٹیج پر ایسے انقلابات رونما ہوئے جس کے نتیجے میں شہزادے، امراء، فوجی سپہ سالار اور مقربین سب کو اپنی جانوں سے ہاتھ دھونا پڑا۔یہاں تک کہ فرخ سیر کی شہادت اور سادات بارہہ کے ہاتھ سے مملکت کی باگ ڈور نکلنے اور ان کی شہادت کے بعد تیموری حکومت کی بنیادیں بری طرح ہل گئیں۔بیدل نے مغلیہ سلطنت کے اس عروج و زوال اور اتار چڑھاؤ کو نہ صرف یہ کہ اپنی آنکھوں سے دیکھا بلکہ اس کے ساتھ خود بھی ابھرتے اور ڈوبتے رہے ہیں۔درج ذیل اشعار میں ان واقعات کی کچھ جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔

روزی کہ ہوسہا درِ اقبال کشودند

آخر ہمہ رفتند بجای کہ نبودند

[جس دن کہ ہوس نے در اقبال کیۓ وا
آخر وہ گئے واں کو جہاں تھے نہ سر و پا]
زیں باغ گذشتند حریفاں بندامت
ہر رنگ کہ گردید کفی بود کہ سودند
[اس باغ سے گذرے ہیں حریفاں بندامت
جو رنگ رہا ان کا ہو ، تھا اک کفِ سودہ]
افسوس کہ ایں قافلہا بعد فنا ہم
یک نقش قدم چشم بہ عبرت نکشودند (۳)
[افسوس ہیں یہ قافلے کہ بعد فنا بھی
عبرت سے نہیں آنکھ انہوں نے کبھی کھولی]

سیاسی حالات جب کسی ملک کے بحران کے شکار ہوں تو سماجی حالات اس سے کیونکر دامن بچا سکتے ہیں۔ جو آدمی کل تک بادشاہ کی نظر میں محبوب تھا آج راندہ درگاہ ہو جائے اور کل تک جس کو بااثر شخص سمجھا جاتا تھا آج اس کا وجود خطرے میں پڑ جائے ایسے حالات میں کوئی یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کل کیا صورت حال رہے گی۔ بیدل نے چہار عنصر اور رقعات کے علاوہ اپنی غزلیات ،مثنویات ،رباعیات اور قصائد میں اس دور کے کشمکش سے بھرے ان سماجی حالات پر روشنی ڈالی ہے جہاں اس کا تعلق بالواسطہ یا براہ راست سماج کے ہر طبقے سے پڑا ہے، اس نے عوام وخواص ،شاہ و گدا ،علما وفضلا ،امراء ونواب ،اہل پیشہ غرض سب کے حالات پر بے لاگ تبصرہ کیا ہے۔ اس کی روشنی میں اس دور کی جو تصویر سامنے آتی ہے وہ مورخوں کے بیانات سے مختلف ہے۔ درج ذیل چند اشعار میں اس کیفیت کا تھوڑا سا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

امروز نیست قابلِ تفریق و امتیاز
انجام کارِ دشمن و آغاز آشنا
[دشمن کا ہو انجام یا ہو دوست کا آغاز
ممکن نہیں تفریق کرے ان میں کوئی آج]

از ہر چہ دم زنی بہ خموشی حوالہ کن
ایں انجمن پر است ز غماز آشنا
[ہے انجمن بھری ہوئی غمازوں سے یکسر
جو بات بھی کہنی ہو کہو چپکے سے دل پر]
بشنو نوائے نیک و بد از دور و دم مزن
نے نالہ داشتہ است ز دمساز آشنا(۴)
[اچھی ہو بات یا بری ، چپ رہو سن کر
نالہ نہیں دمساز سے ہے آشنا یکسر]

جہاں تک اس دور کے ادبی حالات کا تعلق ہے تیموری بادشاہوں کی غیر معمولی سرپرستی کی وجہ سے فارسی زبان کی ہندوستان میں غیر معمولی ترقی ہوئی۔ خصوصیت سے شاہجہاں کے عہد میں ادبی سرگرمی کافی نقطہ عروج کو پہنچ چکی تھی۔ وہ خود اعلیٰ کردار کا حامل اور کتب بینی کا شوقین تھا، قلمی نسخوں پر حاشیے اور تعلیقات لکھا کرتا تھا۔ داخلی امن وامان اور درباری سرپرستی کی بنا پر علم ودانش کے میدان میں خاصی ترقی ہوئی۔

اورنگ زیب کے عہد میں عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ مذہبی تنگ نظری کی وجہ سے شاعری کے بازار کی چہل پہل ختم ہوگئی تھی۔ حتیٰ کہ ملک الشعرا کا جو عہدہ اکبر کے زمانے سے چلا آرہا تھا اورنگ زیب نے ختم کردیا۔ شاعروں کے وظیفے بھی رکوا دیے اور اس کی وجہ سے ایرانی شاعرں کی آمد کا سلسلہ موقوف ہوگیا۔ لیکن تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ شاعروں کی نسبت اورنگ زیب کی اس بے اعتنائی کے علی الرغم ملک کی فضا شاعروں سے خالی نہ تھی۔ البتہ شاعری نے دربار سے نکل کر عوام کے گھروں کو اپنی آماجگاہ بنالیا تھا اس کی وجہ سے اس کے مضامین اور مواد و ہیئت سب میں تبدیلی آگئی۔ اس دور کے شاعروں کی تعداد دوسرے بادشاہوں کے عہد کے شاعروں کی تعداد سے کسی طرح کم نہیں تھی۔ مرزا عبدالقادر بیدل ، ناصر علی سرہندی ، راسخ ، عاقل خان رازی، نعمت خاں عالی ، عبدالجلیل بلگرامی ، غنی کشمیری، غنیمت کنجاہی، اشرف مازندرانی، مرزا مبارک اللہ واضح ، رفیع خان باذل، خالص اصفہانی ، فطرت موسوی، بینش کشمیری وغیرہ اس

دور کے نامور شعرا ہیں۔ اعظم شاہ کے درباری شاعروں کی بھی ایک جماعت تھی جن میں حاجی اسلم سالم، شیخ حسین شہرت، میر محمد زمان راسخ اور بیدل کو خاصی شہرت حاصل ہے۔ بادشاہ خود بھی ایک باذوق شاعر تھا۔ ہندی زبان میں شعر کہتا تھا۔ فنون لطیفہ، موسیقی و رقص وغیرہ سے بھی آشنا تھا۔ شاہ عالم بہادر شاہ کو بھی علم و فن سے تعلق تھا۔ بہادر شاہ کے انتقال کے بعد اگرچہ سیاسی اسٹیج پر ایک انقلاب رونما ہوا۔ تاہم ملک کی فضا زبان و ادب کی ترقی کے لئے ناسازگار نہ تھی۔ (۵)

مرزا اسد اللہ خاں غالب ۱۷۹۷ء۔ ۱۸۶۹ء نے جب ہوش سنبھالا تو مغلیہ سلطنت دم توڑ رہی تھی۔ مرہٹوں نے آگرہ میں قتل و غارتگری کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ جس کی بدولت امیروں کی امارت اور شریفوں کی عزت خاک میں ملتی دکھائی دے رہی تھی۔ پروفیسر یوسف حسین خاں کے مطابق، دہلی میں نابینا اور نادار بادشاہ شاہ عالم صرف بطور نام کے تخت پر جلوہ افروز تھا۔ غلام قادر روہیلہ اور مہادیو جی سندھیا نے موقع موقع سے اسے اپنے حملوں کا نشانہ بنا رکھا تھا اور اپنے اقتدار کا پرچم لہرا دیا تھا۔ اقتدار کی کرسی پر پہنچنے کے لئے انگریزوں اور مرہٹوں کے درمیان کشمکش شروع ہوگئی تھی۔ گورنر جنرل لارڈ ویلزلی نے شاہ عالم کو پیغام بھیجا کہ آپ کو سندھیا کے پنجے سے آزاد کرنے کا ہم نے تہیہ کر رکھا ہے۔ میرے پاس آپ کو ہر طرح کا سکون و آرام حاصل ہوگا اور آپ کا اعزاز و اکرام بھی بدستور باقی رہے گا۔ سندھیا نے شاہ عالم سے اس کا جواب یوں دلوایا کہ ''سندھیا کے خلاف ہر قسم کی فوجی کارروائی بند کرو ورنہ مجھے میدان جنگ میں اترنا پڑے گا۔'' جنرل لیک کی رہبری میں انگریز فوج نے سندھیا سے جنگ کر کے اسے شکست دی اور ۱۱ رستمبر ۱۸۰۳ء کو دہلی میں داخل ہوگئی۔ انگریزی فوج سے مقابلہ کرنے کے بجائے شاہ عالم نے شاہی دربار میں جنرل لیک کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور مختلف خطاب اور خلعت فاخرہ سے نوازا۔ جنرل آکٹر لونی (اختر لونی) دہلی میں ریزیڈنٹ کے عہدے پر براجمان ہوا۔ شاہ عالم نے اسے بھی چند خطاب دئے۔ شاہ عالم کی گذر بسر کے لئے ساٹھ ہزار روپئے اور ان کے متعلقین کے لئے تیس ہزار روپئے مہینے کا وظیفہ مقرر ہوا۔ علاوہ ازیں دریائے جمنا کے ساحلی علاقے بھی شاہ عالم کو اس شرط پر دئے گئے کہ ان کی مال گذاری کی وصولی اور عدالت کا سارا نظم انگریز ریزیڈنٹ کے ہاتھ انجام پائے گا۔ کل ملا کر شاہ عالم کی ماہانہ آمدنی تقریباً ایک لاکھ پچیس ہزار کے آس پاس ہوگئی جب کہ سندھیا

کے عہد اقتدار میں وہ کوڑیوں کے محتاج تھے۔اس طرح دہلی اوراس کے آس پاس میں انگریزی اقتدار دھیرے دھیرے بڑھنے لگا۔چنانچہ سکوں پر یہ الفاظ لکھے ہوتے تھے ''خلق خدا کی ،ملک بادشاہ کا،حکم کمپنی بہادر کا''۔تمام سرکاری کاغذات و اشتہارات میں اس جملے کو بار باراس لئے دہرایا جاتا تھا تاکہ لوگوں کو اس زمانے کی صحیح سیاسی صورت حال معلوم ہوتی رہے۔لیکن بادشاہ کا نام ابھی باقی تھا۔جاگیرداروں کی وراثت کی تصدیق کے لئے شاہی مہر لگنی ضروری تھی ،پراس کے استعمال کرنے کا حق صرف انگریز ریزیڈنٹ کو تھا۔دہلی کے شروع کے ریزیڈنٹ آکٹرلونی اورسٹن ہوش مند حاکم تھے،دوررس نتائج پران کی نظر رہتی تھی۔اس لئے مغل بادشاہ کے اقتدار کی ایک پرفریب ظاہرداری کو برقرار رکھنے کے لئے دیدہ ودانستہ یہ شکل اختیار کررکھی تھی کیونکہ ان کا خیال تھا اس طریقے سے ملک کی باگ ڈور دھیرے دھیرے مستحکم طریقے پران کے ہاتھ منتقل ہوجائے گی ۔مرہٹوں کے دوراقتدار میں دہلی میں اس حد تک انتشار و پراگندگی پھیلی ہوئی تھی کہ بڑے بڑے فنکار دہلی چھوڑ کر لکھنؤ اور فرخ آباد چلے گئے تھے۔دہلی اس زمانے میں ایک بڑی مارکیٹ کی حیثیت رکھتی تھی جہاں چھینٹ اور زری وغیرہ کی خریداری کے لئے ایرانی اور وسطی ایشیا کے تاجر بڑی تعداد میں آتے تھے لیکن اس وقت کی بربادی کا نقشہ میر تقی کے الفاظ میں پیش ہے:۔

دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انہیں

کل تک فراز چرخ پہ جن کا دماغ تھا

مثنوی سنگ نامہ میں شاہ عالم کی تنگ دستی کا ان الفاظ میں نقشہ کھینچتے ہیں۔''دہلی سے لکھنؤ آرہے تھے۔راستے میں شاہدرہ کی ایک سرائے میں قیام ہوا۔وہاں کی بھٹیارن نے کھانا تیار کرنے کو دریافت کیا تو میر صاحب نے کہا کہ تھوڑا سا سالن روٹی دے دینا۔اس پراس بڑی شوخ اور منہ پھٹ بھٹیارن بولنے لگی میرا خیال تھا کچھ تم کھاؤ گے کچھ ہمیں کھلاؤ گے۔لیکن تم تو شاہ کی طرح پھکڑ ہی نکلے۔''شاہ عالم کی وفات کے بعد ۱۸۰۶ء میں اکبر شاہ ثانی تخت نشین ہوئے۔ان کی حکومت اگرچہ ۳۱ سال رہی پر صرف نام کے لئے۔ان کے گھریلو اخراجات انگریزوں کی پنشن سے چلتے تھے۔حتیٰ کہ لال قلعہ کے اندر بھی انگریز ریزیڈنٹ کا ہی حکم چلتا تھا۔انگریزوں نے رفتہ رفتہ ان کے اندر احتیاج اور دست نگری کا احساس پیدا کردیا۔لارڈ ہسٹنگز جب دہلی آیا تو اس نے

باشاہ سے ملاقات تک کرنا گوارا نہ کیا۔تہواروں کے موقع پر انگریزی فوج کے سپہ سالار بادشاہ کی خدمت میں نذرانے پیش کیا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا تھا۔ بادشاہ سے خط و کتابت میں گورنر جنرل اپنے لئے ''فدوی'' کا لفظ استعمال کرتا تھا اسے بھی ختم کر دیا۔لارڈ ہسٹنگز نے اودھ کے نواب کو اپنے لئے بادشاہ کا لقب اختیار کرنے پر آمادہ کیا۔تا کہ اکبر شاہ ثانی کے اسٹیٹس کو ختم کیا جا سکے۔اس کے بعد نواب مذکور نے اپنے بادشاہ ہونے کی تشہیر کر دی۔جرات نے اپنے ایک قطعہ میں ان بادشاہ نوابوں کی قلعی اس طرح کھولی ہے:

کہیے نہ انہیں امیر اب اور نہ وزیر
انگریزوں کے ہاتھ یہ قفس میں ہیں اسیر
جو کچھ وہ پڑھائیں تو یہ منہ سے بولیں
بنگالے کے مینا ہیں یہ پورب کے امیر

لارڈ ایمر ہست نے جب دہلی میں قدم رکھا تو اکبر شاہ ثانی سے شاہانہ انداز سے ملا۔گورنر جنرل اور بادشاہ دونوں ایک دوسرے کی قیامگاہ پر تحفے لے کر ملنے جاتے تھے۔جو بعد میں ایک رواج بن گیا۔ورنہ پہلے صرف گورنر جنرل تحفے لے جایا کرتا تھا۔آخر میں سکے سے بادشاہ کا نام بھی نکال دیا گیا۔اس طرح اس کا نام بھی کالعدم ہو گیا اور انگریزوں کا ظاہری اور باطنی ہر لحاظ سے دہلی پر پورا کنٹرول ہو گیا۔ہندوستان کے شمالی علاقے کے باشندوں کو پورا یقین ہو گیا کہ بادشاہت ختم ہو گئی۔انگریزوں کی حکومت بن گئی۔عام طور سے یہ رسم چلی آرہی تھی کہ دربار میں بادشاہ جب تک ٹھہرا رہے دوسرے درباریوں کی طرح ریزیڈنٹ بھی کھڑا رہے گا۔ہاکرس نے پہلی دفعہ اس روایت کے خلاف شاہی دربار میں کرسی منگوائی۔بادشاہ کی طرف سے اگر ایسے مضمون کا کوئی خط آتا جس میں مغل بادشاہ کے اقتدار کی جھلک دکھائی دیتی تو بغیر جواب کے اسے واپس کر دیتا۔ہاکرس کے اس رویے کی خبر جب گورنر جنرل کو ہوئی تو اسے دہلی سے واپس بلا کر اس کی جگہ ولیم فریزر کو ریزیڈنٹ بنا کر بھیجا۔یہ سمجھدار اور متحمل مزاج حاکم تھا اور فارسی زبان سے بھی آشنا تھا۔غالب کی پنشن کے سلسلے میں اس نے ان کی پوری حوصلہ افزائی کی۔فریزر کے قتل ہونے کے بعد طامس مٹکاف ریزیڈنٹ بنا۔اس کو ہندوستانی عوام کے رہن سہن کا اچھی طرح علم تھا،ان سے ہمدردی بھی

رکھتا تھا اور ان کے طبقاتی مراتب کا خیال بھی رکھتا تھا۔ اس لئے اس نے شاہی ادب کا خیال رکھا۔ اس وقت تک دہلی کے ریزیڈنٹ کے اختیارات کافی وسیع ہو چکے تھے۔ مقامی عہدے دار کی حیثیت سے اس کا فیصلہ قطعی مانا جاتا تھا۔ جن امور کا تعلق مغل بادشاہوں سے ہوتا گورنر جنرل انہیں ریزیڈنٹ کی مصلحت بینی پر چھوڑ دیتا۔ طامس مٹکاف اور اس کے بھائی چارلس مٹکاف کا دہلی کی سماجی زندگی پر تقریباً پچاس سال تک اثر رہا۔ طامس مٹکاف نے دہلی کو اپنی مستقل قیامگاہ کی حیثیت دے دی تھی، مغل امرا کے طور طریقے اپنا لیے تھے اور ہندوستانی کھانوں اور گانوں کا بڑا شوقین ہو گیا تھا۔ اس کے یہاں برابر دعوتیں ہوتی رہتی تھیں اور دہلی کے چنے ہوئے باورچی اس کے ملازموں کی صف میں تھے۔ ناچ گانے کی مجلسیں بھی سجاتا اور اگر کہیں ایسی محفلیں منعقد ہوتیں تو بڑے اشتیاق سے ان میں شریک ہوتا۔ ایک مکان اس نے علی پور روڈ پر اور دوسرا مہرولی میں تعمیر کرایا۔ اس کا نام دلکشا رکھا۔ قیامگاہ سے متصل ہی ایک لمبا چوڑا پائین باغ تھا جس میں طرح طرح کے میوں کے درخت اور کیاریوں میں رنگ برنگے پھول کھلے رہتے تھے جس نے اس خطے کو جنت نشاں بنا دیا تھا۔ مٹکاف بھائیوں کے اس طرز رہائش کا اثر دہلی کے اعلیٰ طبقے کی زندگی اور ان کی سوچ پر پڑا۔ اکبر شاہ ثانی کے دوسرے لڑکے مرزا ماہر نے دیوان عام کے پیچھے رنگ محل کے صحن میں انگریزی انداز کی ایک قیام گاہ بنوائی اور وضع قطع بھی انگریزوں کی اختیار کر لی۔ چھ گھوڑوں والے کوچ میں بیٹھ کر سیر وتفریح کو نکلتا۔ شہزادے کی دیکھا دیکھی کچھ امرا نے بھی ریزیڈنٹ کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر انگریزی طرز کے مکان بنوائے۔

آزاد خیال انگریز حکام ہندوستانیوں میں مغربی خیالات کی اشاعت کو اس لئے پسند کرتے تھے کہ اس طرح سے یہاں انگریزی حکومت کی بنیاد مستحکم ہو جائے گی۔ بعض حاکموں کی رائے تھی کہ ہندوستانیوں کی سیاسی اور سماجی حالات کو سدھارنے کا کام خدا نے ان کے حوالے کیا ہے جسے ان کو بہر حال انجام دینا ہے۔ ان حاکموں میں مٹکاف، الفنسٹن اور مالکم شامل تھے۔ یہ لوگ ہندوستان میں انگریزی حکومت کے استحکام کے خواہاں تھے، اس لئے ہندوستانیوں کے حق میں اپنی ذات کو سود مند سمجھتے تھے۔ ہندوستانیوں میں جو آزاد خیال تھے ان کے سوچنے سمجھنے کا انداز بھی کچھ اسی ڈگر پر تھا۔ دوارکا ناتھ ٹیگور اور راجا رام موہن رائے کا خیال تھا کہ انگریزی تعلیم اور

حکومت کے ذریعہ جو روشن خیالی عوام میں پھیل رہی تھی اس سے انگریزی حکومت کی بنیاد تو مضبوط ہوگی ہی ہندوستانی عوام کو بھی اس سے فائدہ پہنچے گا۔ پرانی تہذیبی قدریں زوال پذیر تھیں۔ پورے ہندوستان میں انگریزی تعلیم حاصل کر کے لوگ ترقی کی راہ پر گامزن تھے اور سماجی حالات کو سدھارنے کا خیال ان میں پیدا ہو رہا تھا۔ ان کو ایسا لگ رہا تھا کہ پرانی تہذیبی قدریں چند لغو اور فضول اور بے جان رسم و رواج میں سمٹ کر رہ گئی ہیں اس لئے جدید تہذیبی قدوروں کا پتہ لگانے اور ان کو اپنانے کی ضرورت ہے۔ جس میں آزادی اور انفرادیت کا پیغام بڑی دلکشی کا حامل تھا۔ پہلے پہل مشرقی علاقے کے سمجھدار حضرات نے ادھر دھیان دیا۔ سماجی اصلاح کا مقصد یہ تھا کہ لوگ اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کا پتہ لگا کر اسے صحیح راستے پر لگائیں۔ کیونکہ سماج کی ترقی اس کے بغیر ممکن نہ تھی۔ مغربی علوم سے ذہن کا دائرہ وسیع ہوگا تو ان کی پوشیدہ صلاحیتیں بھی کارگر ہوں گی۔ فرد کی آزادی کا مقصد یہ تھا کہ وہ ایک با اصول زندگی گزارنے کا عادی ہو جائے۔ تنگ نظری کی جگہ رواداری، رسم پرستی کی جگہ کام کی آزادی اور کامیابی سے بے اعتنائی کی جگہ اس کی تلاش و جستجو کرے۔ حکومت قاعدے قانون کی پابند ہو۔ مذہبی نقطہ نظر کی جگہ دنیوی سوچ کے انداز پر غور کیا جائے۔ اور ان کو جانچے پرکھے۔ یہ سب اسی وقت ممکن تھا جب عقل اور عدل دونوں کو ایک جگہ اکٹھا کیا جائے اور انسانی مساوات اور آزادی کے اصول مانے جائیں۔ راجا رام موہن رائے کی پیروی میں، انگریزوں کے اثرات کو، جو انھوں نے تسلیم کئے تھے بنگال میں عام قبولیت حاصل ہو چکی تھی۔ دہلی پر انگریزوں کے تسلط کے بعد اس قسم کے افکار و خیالات نے پہلے سماج کے اونچے طبقے کو پھر اوسط طبقے کو متاثر کیا۔

دہلی کے امراء انگریز حاکموں سے میل جول رکھتے تھے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ اگر انگریز یہاں کے طور طریقے کو اپنانے لگے تو ہندوستانی بھی مغربی طرز فکر سے واقف ہونے لگے۔ جو انگریز پہلے پہل یہاں آتے ان کو پہلے فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں فارسی اور اردو پڑھائی جاتی تھی، تاکہ وہ یہاں کے عوام سے رابطہ قائم کر کے ان کے مسائل کو سمجھیں۔ اس لئے کہ ملک کو بہتر نظم و نسق فراہم کرنا اس کے بغیر ممکن نہ تھا۔ شاہی دربار کی زبان فارسی تھی اس لئے وہی حکام یہاں بھیجے جاتے تھے جو فارسی زبان سے اچھی طرح واقف ہوتے تھے۔ ان میں طامس مٹکاف کو فارسی

شعروادب سے نہ صرف آشنائی حاصل تھی بلکہ اس کا ستھرا ذوق بھی وہ رکھتا تھا۔ دہلی کے انگریز حکام اور امراء کے بیچ شراب نوشی ایک مشترک قدر بن گئی تھی۔ اکبر شاہ ثانی کے بعد دہلی اور اس کے آس پاس میں انگریزوں کا عمل دخل مکمل طور پر ہو گیا تھا اور نظم ونسق کی صورت حال بھی بہتر ہوگئی تھی۔ شمالی ہندوستان کے سرمایہ داروں نے دہلی میں پونجی لگائی۔ ادھر انگریز تاجروں نے بھی اپنے بنگلے بنوائے۔ تانبے اور پیتل کے برتنوں کے علاوہ چمڑے، کپڑے اور تیل کے کاروبار کی منڈی بھی وہ بن گئی تھی۔ پرامن حالات اور تجارت کی ترقی کی وجہ سے دہلی کے باشندوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ جو ہندوستانی انگریزی تجارت کے ایجنٹ تھے وہ کافی مالدار ہونے لگے تھے ان کا کام یہ تھا کہ جو مال انگریز انگلینڈ لے جانا چاہیں انہیں مہیا کریں اور جو مال ہندوستان آئے اس کی یہاں کھپت کرائیں۔ اس ظاہری خوشحالی کے نتیجے میں یہاں کی غربت میں اضافہ ہونے لگا اور یہاں کی ساری دولت کھنچ کھنچ کر انگلستان پہنچنے لگی تھی۔ انیسویں صدی میں یہاں معاشی غارت گری کا جو بازار گرم ہوا وہ پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ دوسری جانب نفع اندوزی کی وجہ سے انگلینڈ کا صنعتی انقلاب مکمل ہوا اور یہ دنیا کا سب سے مالدار ترین ملک بن ہو گیا۔ یہیں سے سرمایہ داری کا سلسلہ شروع ہو کر سارے یورپ میں پھیل گیا۔

دہلی میں انیسویں صدی کے آغاز میں امیروں کے ساتھ ساتھ درمیانی طبقہ بھی مغربی خیالات سے متاثر ہونے لگا تھا۔ مادی ترقی حاصل کرنے کے لئے انگریزی تعلیم کا کریز تیزی سے بڑھنے لگا تھا۔ چنانچہ ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے بیٹے بشیر احمد کے نام، جو اس وقت دہلی کالج میں زیر تعلیم تھے، ایک خط میں لکھا: ’’عربی فارسی جتنی جانتے ہو کافی ہے انگریزی فی زمانا رزق کی ڈولی ہے‘‘۔ ۱۸۲۵ء میں مسٹر ٹیلر کی ہدایت پر دہلی کالج کا قیام عمل میں آیا۔ یہاں فارسی کے ساتھ انگریزی بھی پڑھائی جاتی تھی۔ اس کا اصل مقصد ہندوستانی باشندوں میں مغربی تعلیم کی اشاعت تھی، تاکہ اس کے ذریعے ان کی ذہنی اور مادی ترقی دونوں ممکن ہو سکے۔ یہاں ذریعہ تعلیم اردو تھی۔ سائنس اور ریاضی کی کتابوں کے اردو میں ترجمے کئے گئے۔ اس کالج کے تعلیم یافتہ لوگوں میں ماسٹر تاراچند، پیارے لال آشوب، مملوک علی، شیخ امام بخش صہبائی، محمد حسین، مولوی ذکاءاللہ اور مولوی نذیر احمد نے بعد میں زبان وادب کی بڑی خدمات انجام دیں۔ کالج سے الگ مفتی

صدرالدین آزردہ اور اسد اللہ خاں غالب وغیرہ کو دہلی کالج کے اس مقصد سے اتفاق نہ تھا۔ یہ کالج ہندوستانیوں کو مغربی علوم اور تہذیب سے متعارف کرانے کا ایک ادارہ تھا۔ اس کالج میں انسان دوستی، عقل پرستی اور افادیت پر خاص توجہ دی جاتی تھی اور اس طرح زندگی کے مختلف مسائل کو سلجھانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ اس کالج کے قیام سے پہلے ہی باشندگان دہلی میں انگریزی زبان اور علوم کو سیکھنے کا شوق پیدا ہو چکا تھا۔ چنانچہ غالب اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں: ''انگریزی زبان نے بنگالہ میں سو سال اور دہلی اور اکبر آباد میں ساٹھ برس رواج پایا''۔ (غالب کے خطوط ص ۸۰۴) مرزا یوسف علی خاں عزیز کے نام یہ تیسرا خط ہے۔ اس میں تاریخ درج نہیں ہے۔ ان کے نام دو خطوط اور ہیں۔ پہلے خط کی تاریخ ۱۸۵۹ء ہے دوسرے اور تیسرے خط پر تاریخ درج نہیں ہے۔ لیکن اگر قیاساً ۶۱۔۱۸۶۰ء تک ان کی تاریخ مانی جائے تو لگ بھگ ۱۸۰۰ء سے دہلی اور اکبر آباد میں اس کا رواج ہوا۔ اسی لئے شاہ عبدالعزیز قدس سرہ نے جن کی وفات ۱۸۲۴ء کو ہوئی یہ فتویٰ دیا کہ انگریزی زبان پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ ہاں اگر اس کا مقصد انگریزوں کی خوشامد اور ان کے ساتھ میل جول بڑھانا ہو تو اس میں کراہیت ہے۔

دہلی میں انگریزی تعلیم تو درحقیقت لارڈ لیک کے ۱۸۰۳ء میں دہلی پر قبضہ کرنے کے زمانے ہی سے شروع ہو چکی تھی۔ جس کے نتیجے میں ایک طبقہ مغربی علوم کو ہندوستان کے زوال پذیر سماج کی بیماریوں کا علاج سمجھتا تھا۔ دوسرا طبقہ اسے لعنت سمجھتا تھا اور قرآن اور سنت کو ازسرنو زندہ کر کے مسلمانوں کی اصلاح کرنا چاہتا تھا۔ ان کے خیال میں اس کے ذریعہ ان کی اندرونی پراگندگی اور بیرونی طاقت کے سامنے ان کی شکست کے اسباب دور ہو جائیں گے۔ سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہید کی قیادت نے دہلی کے مسلمانوں کو غفلت کی نیند سے جگایا۔ یہ لوگ ولی اللہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے جنہوں نے ہندوستان میں اسلامی علوم کو زندہ کیا۔ ان دونوں نے شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر سے تعلیم حاصل کی تھی۔ ان کے مذہبی انقلاب کا نشانہ شروع میں انگریز تھے بعد میں ان کا رخ سکھوں کی طرف ہو گیا، جنہوں نے پنجاب میں مسلمانوں کو بے عزت کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ ۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ میں سکھوں کا مقابلہ کرتے ہوئے دونوں شہید ہو گئے۔ اس پسپائی کے باوجود اہل حدیث کی مذہبی تحریک، جسے بعد میں وہابی

تحریک کا نام دیا گیا، کسی نہ کسی طرح زندہ رہی۔ تقریباً بیس تیس سال کے عرصے میں پورے شمالی ہند میں پھیل گئی۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں، جسے اس زمانے میں جنگ آزادی کہا جاتا ہے اس تحریک کے پیشواؤں نے اپنی تمام سرگرمیوں کو انگریزی حکومت کی طرف موڑ دیا اور ہندوستان کے مسلمانوں کو انگریزوں کے خلاف کھڑا کر دیا۔ ۱۸۵۷ء کی ناکام بغاوت کے بعد بنگال اور بہار میں اس تحریک کو عوامی شکل حاصل ہوگئی جس کا اصل مقصد انگریزوں کی مخالفت تھا۔ لیکن یہ زیادہ دنوں تک قائم نہ رہا۔

۶۴ سال کی عمر میں ۱۸۳۷ء میں بہادر شاہ ظفر شاہی تخت پر بیٹھے۔ یہ آخری مغل بادشاہ تھے۔ ۱۸۵۷ء میں غدر کے بعد ان پر مقدمہ چلایا گیا اور آخر کار رنگون جلاوطن کر دیے گئے۔ ان کی مدت سلطنت بیس سال ہے، جو درحقیقت ان کے والد اکبر شاہ ثانی کے دور کی تکمیل ہے۔ کیونکہ جو مزاج ان کے زمانے میں لوگوں کا بن گیا تھا شاہ ظفر کے زمانے میں اس کو پنپنے کا موقع ملا۔ اس بادشاہ کی بے بسی اپنے والد سے بھی بڑھی ہوئی تھی۔ لال قلعے میں وہ ایک ذلیل قیدی کی طرح رہ رہے تھے وہاں انگریز قلعہ دار کی حکومت تھی۔ ۱۸۵۷ء میں باغیوں نے زبردستی ان کو اپنا رہبر بنایا جبکہ ان میں رہبری کی کوئی صلاحیت نہیں تھی۔ وہ شعروشاعری کے شوقین اور علم ادب کے دلدادہ تھے، فارسی سے دلچسپی تھی۔ ''خیابان تصوف'' کے نام سے گلستاں کی شرح لکھی تھی جس میں سعدی کی اخلاقی تعلیم کو قرآن وسنت سے ہم آہنگ کر کے پیش کیا گیا تھا۔ حکیم احسن اللہ خاں کے زیر اہتمام ان کے چار دیوان چھپ چکے تھے۔ شعروشاعری سے ان کو جوانی سے ہی دلچسپی تھی۔ ابتدا میں شاہ نصیر، بیقرار اور میر عزت اللہ عشق سے اصلاح لیتے تھے۔ ۱۸۰۸ء سے ذوق نے چار روپے مہینہ پر ان کی غزلیات میں اصلاح کا کام شروع کیا۔ ۱۸۵۴ء میں اپنی وفات تک وہ دربار سے وابستہ رہے۔ چھیالیس سال کے طویل عرصے میں ان کے قدم وہاں جم چکے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد غالب کو بادشاہ کے کلام دیکھنے کا شرف ملا، مگر صرف تین سال کے لئے۔

بہادر شاہ کو شعروشاعری کا ایسا شوق تھا کہ دنیاوی معاملات میں وہ بالکل نرے جاہل تھے۔ انگریز قلعہ دار کی اجازت لئے بغیر کوئی آدمی قلعہ کے اندر آمدورفت نہیں رکھ سکتا تھا۔ اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں بھی انگریز قلعہ دار تھا، مگر اس کا دائرہ اختیار محدود تھا۔ وہ اپنی پوشیدہ رپورٹ

ریزیڈنٹ کو بھیجتا تھا۔ بہادر شاہ کے زمانے میں قلعہ کے اندر تو اصل میں انگریز قلعہ دار ہی کی بود و باش تھی اور وہ بھی اس انداز سے کہ بجائے اس کے کہ وہ شاہ سے ڈرتا شاہ ان سے ڈرتا تھا اور ان کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ ان تلخ حقیقتوں کے باوجود درباری ان کو سات ملکوں کا بادشاہ کہتے تھے۔ ذوق کو اگر الگ رکھیں تو خود غالب نے ان کو ''بادشاہ عالم'' اور ''قیصر وفغفور'' اور ''در خلافت پیشوائے خسرواں'' کہتے تھے۔ انگریز قلعہ داروں کی خفیہ رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ بہادر شاہ زیادہ تر سیر وتفریح، شعر و شاعری، شکار، درگاہوں کی زیارت میں وقت گذارا کرتے تھے۔ بادشاہ نے مہرولی میں ایک مکان بنوایا تھا۔ اس کا نام ''ظفر محل'' رکھا تھا۔ لارڈ ایلینز کو جب اس کا پتہ چلا تو اس نے یہ پیغام بھجوایا کہ بادشاہ لال قلعہ چھوڑ کر اگر مہرولی میں مستقل طور پر اپنی بود و باش اختیار کرلیں تو زیاددہ اچھا رہے گا۔ قلعہ کسی اور اہم مقصد کے لئے حکومت استعمال کرنا چاہتی ہے۔ اس کی یہ بھی خواہش تھی کہ بہادر شاہ یہ وعدہ کرلیں کہ ان کے بعد ان کی اولاد شاہی لقب اختیار نہ کریں گی۔ لیکن بہادر شاہ نے ان کی یہ دونوں درخواستیں رد کردیں اور گورنر جنرل نے زبردستی اپنی تجویز منظور کرانا سیاسی مصلحت کے خلاف سمجھا۔ ولی عہد شہزادہ فتح الملک کے انتقال کے بعد بہادر شاہ ظفر اپنے چھوٹے شہزادے جوان بخت کو اپنا جانشین بنانا چاہتے تھے۔ شہزادہ جوان بخت ان کی پسندیدہ بیگم زینت محل کے بطن سے پیدا ہوئے تھے اور بادشاہ کو ان کی دلداری منظور تھی۔ جانشینی کے معاملے میں بہادر شاہ کے اس غیر عادلانہ رویہ کو گورنر جنرل نے پسند نہیں کیا۔ ریزیڈنٹ نے عمر کے لحاظ سے ان کے سب سے بڑے شہزادے قویش کو ولیعہد کے لئے منتخب کیا۔ اس نے ریزیڈنٹ کے سارے شرائط بغیر کسی بہانے کے منظور کرلئے۔ جن میں ایک تو شاہی خطاب اور القاب کا خاتمہ اور صرف لفظ شہزادہ کی برقراری تھی، دوسرے وظیفے کی رقم سوا لاکھ سے گھٹا کر پندرہ ہزار روپے کرنا تھا، تیسرے مہرولی والے مکان میں مستقل بود و باش اور چوتھے لال قلعہ انگریزوں کے حوالے کرنا تھا۔ ان شرطوں کے مان لینے کے بعد انگریزی حکومت نے ولیعہدی کا باقاعدہ اعلان کردیا۔ یہ اعلان ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے ایک سال پہلے ہوا جس پر بادشاہ نے کہا:

اے ظفر اب ہے تجھی تک انتظامِ سلطنت
بعد تیرے نے ولیعہدی نہ نامِ سلطنت

بہادر شاہ کی مالی حالت اکبر شاہ سے بھی کمزور تھی۔آمدنی کے ذرائع محدود ہونے کے باوجود ان کی فضول خرچیوں میں کوئی کمی نہیں تھی۔داد و دہش کی کسی بھی تقریب پر بخالت کو وہ شاہی روایت اور جاہ و مرتبت کے خلاف سمجھتے تھے۔لال قلعہ میں دکھاوے کی ایک فوج بھی تھی۔مختلف طرح کی تقریبیں اور جشن بدستور ہوتے رہتے تھے۔اکثر سیر و سیاحت اور ناچ رنگ میں مست رہتے،کبھی شعر و شاعری کی محفل میں اپنے شاعرانہ ذوق کی تسکین کے لئے آجاتے۔قلعہ میں اگر کسی کی وفات ہوجائے تو بھی خرچ میں کوئی کمی نہیں کرتے تھے۔خوشی کی کوئی گھڑی ہوتی تو خرچ میں اضافہ ہوجاتا۔لال قلعہ میں مالی دیوالیہ پن کی وجہ سے ایسے لوگ رکھے جاتے جو بادشاہ کے حضور زیادہ سے زیادہ تحائف پیش کرتے۔دربار میں حاضری کے لئے بھی نذرانے کی شرط تھی۔دربار سے وابستہ حضرات اور شاعروں کی سرپرستی میں بیشمار روپے خرچ کئے جاتے۔جس کی وجہ سے اکثر خزانہ خالی ہوجاتا اور محل کے اخراجات کے لئے قرض لینے کی نوبت آجاتی۔بہادر شاہ ظفر اپنی پنشن میں اضافے کے لئے ایسٹ انڈیا کمپنی سے برابر تقاضے کرتے۔گورنروں سے مایوس ہوکر ملکہ وکٹوریہ کو لکھا۔انگریز تاجر مسٹر جارج تھامسن کو سفیر الدولہ،مشیر الملک بہادر، مصلح جنگ کے القاب سے نواز کر ملکہ وکٹوریہ کی خدمت میں اپنی درخواست پیش کرنے کو بھیجا۔اس کے علاوہ کورٹ آف ڈائریکٹرس اور بورڈ آف کنٹرول کے صدر کے نام بھی خط لکھے۔ان خطوط میں پنشن کے بڑھانے کی اپیل اور اعزاز میں کمی کا شکوہ کیا گیا تھا۔مگر جارج تھامسن کے ذریعہ یہ کوشش ناکام رہی بلکہ کلکتہ کی گورنمنٹ بہادر شاہ سے خفا ہوگئی۔اور ان کے لئے اڑچنیں پیدا کردیں(۶)

اس دور کے ادبی حالات کا اگر بغور جائزہ لیں تو اندازہ ہوگا کہ اپنی کیفیت و کمیت کے لحاظ سے فارسی ادب کا سرمایہ گذشتہ عہد کی بہ نسبت کہیں زیادہ ہے۔بقول پروفیسر شریف حسین قاسمی ،اس دور کے شاعروں اور ادیبوں نے فارسی شعر و ادب کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی اور اہم تخلیقات پیش کیں۔فارسی ادب کی سرپرستی کا سہرا درحقیقت مغل سلاطین کے شاہی درباروں کے سر ہے۔جن کی سرپرستی کی وجہ سے شاعروں اور ادیبوں کی خاصی تعداد دربار سے وابستہ رہی ہے۔دربار اور فارسی ادب گویا لازم و ملزوم سمجھے جاتے تھے۔انیسویں صدی کے وسط تک انگریزی اقتدار کا جھنڈا جب ہندوستان کے سیاسی اسٹیج پر لہرانے لگا تو مغلوں کی حکومت برائے نام رہ گئی،مختلف صوبوں میں مختار

ونیم مختار ریاستوں پر بھی انگریزوں کی بالاتری قائم رہی۔ فارسی زبان وادب بھی دھیرے دھیرے زوال کا شکار ہوگیا۔ اس کی سرپرستی کا سلسلہ جب ختم ہوگیا تو اس کے باقی رہنے کا سوال ہی نہ رہا۔ مغلیہ سلطنت کے آخری دور زوال میں ان کی لاچاری کی وجہ سے مختلف ریاستوں میں ان کے مقرر کئے ہوئے صوبیداروں نے مرکز سے اپنا تعلق ختم کرلیا اور آزادانہ حکومت کرنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کئی دربار وجود میں آگئے۔ یہاں کے مسلم اور غیر مسلم حکمراں اپنے امکان بھر فارسی زبان وادب کی سرپرستی کرتے رہے۔ رامپور، حیدرآباد، بھوپال، ملتان، لاہور، عظیم آباد وغیرہ ایسی ہی ریاستی دربار تھے جہاں فارسی شاعروں اور ادیبوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ اس لئے اس زوال پذیر دور میں بھی فارسی زبان وادب کی نشو ونما ہوتی رہی۔

انیسویں صدی کے نصف اول (۱۸۰۶ء سے ۱۸۵۷ء تک) لگ بھگ سو فارسی شاعر اور ادیب ان ریاستوں میں فارسی زبان وادب کی خدمت کررہے تھے۔ تقریباً پچاس شاعروں کے فارسی دواوین اور دوسری تخلیقات مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں۔ ان کے علاوہ پچاس ایسے بھی شاعر ہیں جن کے نام ان کے مختصر نمونۂ کلام کے ساتھ تذکروں اور بیاضوں میں محفوظ ہیں۔ اس عہد کے فارسی گو شاعروں میں غالب کو سب سے زیادہ اہم مانا گیا ہے کیونکہ ان کے کلام میں فارسی شاعری کی ایک ہزار سالہ روایت کی خصوصیات پائی جاتی ہیں اور بقول خود فارسی زبان کے وہ محقق تھے اور میزان فارسی ان کے ہاتھ میں تھی۔

اس عہد کے بیشتر شاعروں نے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شاعری کی ہے۔ جو صرف اسی عہد کی خصوصیت کہی جاسکتی ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ فارسی کا رواج اس دور میں دھیرے دھیرے کم ہوتا جارہا تھا لیکن اس کی علمی اور ادبی اور ثقافتی حیثیت برقرار تھی۔ چنانچہ اس عہد میں فارسی داں حضرات اور ان کے سرپرستوں کی تعداد میں کوئی خاص کمی محسوس نہیں ہوتی ہے۔ (۷)

☆☆☆

باب دوم

غالب اور تقلید

از رہِ تقلید نتواں بہرہ عزت گرفت
نشہ جمعیت گوہر نباشد ژالہ را
بیدل

نداند قدرِ غم تا در نماند کس بداں غالب
مسرت خیز داز تقلید پیراں نوجواناں را
غالب

سترہویں صدی کے اواخر اور اٹھارویں صدی کے اوائل میں مرزا عبدالقادر بیدلؔ (۱۶۴۴-۴۵-۱۷۲۰ء) نے ایک آواز لگائی تھی کہ زمین سے لے کر آسمان تک ساری فضا میرے نغموں سے گونج رہی ہے۔اس لئے میری لے میں لے ملا کر نغمہ سرائی کرو:

زمیں تا فلک نغمہ بیدل است
بریں ساز بشکن بم و زیر را

بیدل کی وفات سے ۷۷ رسال کے بعد انیسویں صدی کے اوائل میں مرزا غالب (۱۷۹۷-۱۸۶۹ء) نے ایک دولسانی شاعر کی حیثیت سے اس کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے کہا:

مطرب دل نے مرے تار نفس سے غالب
ساز پُر رشتہ پی نغمہ بیدل باندھا

اور اس ہدایت پر ایسا عمل کیا کہ اپنی پوری شاعری کو بیدل کی شاعری کی صدائے بازگشت قرار دے دیا۔

آہنگ اسد میں نہیں جز نغمہ بیدل
عالم ہمہ افسانہ ما دارد و ما ہیچ

اس شعر کے حوالے سے مجنون گورکھپوری بجا طور پر رقمطراز ہیں:

''جن کی بارگاہ میں غالب جیسے یکتائے روزگار نے جس کو اپنی یکتائی کا پندار بھی تھا زانوے ادب تہ کر کے اور سر جھکا کر اپنی ارادت کا نذرانہ پیش کیا ہے''۔۸

دوسری جگہ غالب کے درج ذیل شعر:

طرز بیدل میں ریختہ لکھنا
اسد اللہ خاں قیامت ہے

کے تحت لکھتے ہیں:

''اصل بات یہ ہے کہ غالب بڑا مفکر اور شاعر تھا اس نے اپنے سے بڑا شاعر اور مفکر صرف بیدل کو پایا اسلئے اس کو اپنا نمونہ بنایا اور ڈنکے کی چوٹ پر اعلان کر دیا کہ مجھے رنگ بہار ایجادی بیدل پسند آیا۔'' ۹

بیدل کی زمین میں کہی گئی ایک فارسی غزل کے مقطع سے معلوم ہوتا ہے کہ نوجوان غالب کو بوڑھے بیدل کی تقلید بہت بھلی لگتی تھی، کہتا ہے۔

نداند قدرغم تا در نماند کس بداں غالب

مسرت خیزد از تقلید پیران نوجوانانرا ۱۰

اس لئے سب سے پہلے تقلید پر تھوڑی سی روشنی ڈالنی ضروری ہے۔

دنیا میں کسی بھی کام کو انجام دینے کے لئے پہلے کسی نمونے کی پیروی کی جاتی ہے۔ایک شعروشاعری اور زبان وادب پر کیا موقوف ہے، تہذیب وتمدن کے جملہ امور میں قومیں ایک دوسرے کا اثر قبول کرتی اور انکا رنگ اختیار کرتی ہیں۔خود فارسی شاعری نے، بقول علی دشتی، عربی شاعری کے بطن سے جنم لی ہے عروضی اوزان بھی اسی سے ماخوذ ہیں اور قصیدہ سرائی تو خاص طور سے عربی زبان سے فارسی میں منتقل ہوئی۔۱۱ لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ جن سماجی، تہذیبی اور ادبی اقدار کو شاعر نے اپنایا ہے کیا وہ بدستور اسی ہیئت میں شاعر کے پاس موجود ہیں، یا اپنے ذوق وسلیقہ سے ہم آہنگ کر کے ان میں مناسب تبدیلی بھی اس نے کی ہے۔

اہم بات یہ نہیں ہے کہ ایک شاعر نے کسی شاعر کا رنگ وآہنگ قبول کیا اور اسکا طرز وروش اپنایا بلکہ یہ ہے کہ جو اثرات اس نے دوسروں کے قبول کئے ہیں انہیں اسی خام ہیئت میں واپس کیا ہے یا اپنے ذوق کی بھٹی میں پگھلایا اور اپنے مخصوص افکار وخیالات اور جذبات وتاثرات سے ملا کر انہیں ایک نیا رنگ وروپ بخشا ہے۔ جہاں تک بیدل کا تعلق ہے اسکا خیال ہے کہ کسی شاعر کے اسلوب کی پیروی کر کے شاعر کو عزت وآبرو نصیب ہوسکتی ہے اور نہ وہ صاحب معنی بن سکتا ہے۔ بھلا اولے کو گوہر کی جمعیت اور پائداری مل سکتی ہے؟ اولے کا ٹھہراؤ چند لمحوں کا ہے،

از رہ تقلید نتواں صاحب معنی شدن ژالہ بیش از یکدودم برخود نچیند گوہری

از رہ تقلید نتواں بہرہ عزت گرفت نشہ جمعیت گوہر نباشد ژالہ را

بہ تقلید آشنائے نشۂ تحقیق نتواں شد　　چہ امکانست ساز دلربائی زلف پرچم را۱۲۱

لیکن غالب کے نزدیک اولے کی طرح پگھلنے ہی میں شاعر کی آبرو ہے اسکا خیال ہے کہ ہمارے اولے کے مقابلے پر گوہر کی کیا مجال کہ وہ فخر کرے:

ہمیں گداختن است آبروی ما غالب
گہر چہ ناز فروشد بہ پیش ژالہ ما

بہر حال تقلید کے بارے میں جو کچھ کہا جائے، ہر شاعر کو ابتداء میں اس کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ زندگی کا ایک حصہ جب تجرباتی دور سے گذر چکا ہوتا ہے تب کہیں جا کر اسے اپنی مخصوص منزل ملتی ہے۔ خود بیدل کو جس نے تقلید کی مذمت کی ہے اور جس کی تقلید کا اعتراف غالب نے کیا ہے، لگاتار انیس سال تک تجرباتی دور سے گذرنے اور دوسروں کی پیروی کرنے کے بعد اپنی منزل ملی ہے۔ ۱۰۶۴ھ/۵۳-۱۶۵۴ء میں ۱۰ سال کی عمر میں اس نے شاعری شروع کی اور ۱۰۸۳ھ/ ۷۲-۱۶۷۳ء میں ۲۹ سال کی عمر میں لکھتا ہے:

''ثمرات حدیقہ معانی درین ایام رنگ پختگی گرفتہ و عروج بنای کلام الحال بکرسی متانت نشستہ''۱۳

اب جا کر کہیں میرے کلام میں پختگی اور متانت پیدا ہوئی ہے۔ اور اس تاریخ سے پہلے جو کچھ کہا تھا اس کی بابت لکھتا ہے:

''این قدر از جملہ فوائد یست کہ پیش از آشنائی طرز سخن در ضمن بعضی احوال بی اختیار روی نمود''۱۴

یہ سارا کلام اس وقت کا ہے جب طرز شاعری سے آشنائی حاصل ہونے سے پہلے بعض حالات کے دوران بلا ارادہ صفحہ قرطاس پر رونما ہوئے۔ اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ اس وقت تک اپنے مخصوص اسلوب تک اس کی رسائی نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ ایک شعر میں بھی اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ زندگی کا ایک خاصہ حصہ تو نے ''لفظ پردازی'' میں گذارا ہے اب اپنے کلام میں ''حسن معانی'' پیدا کرنے کی کوشش کر:

نشستی عمرہا حسرت کمین لفظ پردازی
زخون گشتن زمانی غازہ شو حسن معانی را

بقیدِ لفظ بودم عمرہا بیگانہ معنی
کی مینا گرفتم با پری ہمسنگ گردیدم

اوراس طرح وہ تقلید کے مرحلے سے گذر کر تحقیق کی منزل پر پہونچا۔

مرزا غالب کو بھی تقلید کے ان مراحل سے گذرنا پڑا ہے۔ اس نے ایک جگہ اپنے معاصر شاعروں پر تنقید کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس وقت جس کے کلام پر غور کیجئے دوسروں کے مضامین کو اپنے الفاظ میں بیان کرتا نظر آئے گا:

غالب درین زمانہ بہر کس کہ واری
مضمون غیر و لفظ خودش برزبان اوست

غالب نے شاید اپنے کو مستثنی کر کے یہ کہا ہے لیکن اس کے کلام کا دقیق مطالعہ واضح کرتا ہے کہ خود اس نے بھی کچھ دنوں تک یہی کام کیا ہے۔ درحقیقت یہ ایک فطری امر ہے۔ کسی شاعر کو اس سے گریز نہیں۔ اگرچہ امریکی شاعر ٹی ایس ایلیٹ کا خیال ہے کہ برے شعراء تقلید کرتے ہیں اور اچھے شعراء سرقہ کرتے ہیں۔ لیکن غالب کے حق میں ہم اسے سرقہ نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس کا اعترافی بیان موجود ہے۔

دوسرے شاعروں کی تقلید

غالب نے کن کن شاعروں کا اثر قبول کیا اور کن کن کی تقلید کی یہ ایک لمبی بحث ہے۔ لیکن موضوع کی رعایت سے تھوڑی سی روشنی اس پر ڈالنی ضروری ہے جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے اپنے خطوط میں عام نازک خیال شاعروں کی پیروی کا تذکرہ کرتے ہوئے اس نے لکھا ہے:

''سخنوران گذشتہ کا طرز شناس اوران نازک خیالوں کا پیرو ہوں'' ۱۵

یہاں غالب کی دوسرے شاعروں سے اثر پذیری سے متعلق غالب کے بیانات خطوط اور دیوان کی روشنی میں لکھے جاتے ہیں۔

فردوسی: (م ۴۱۱ھ یا ۴۱۶ھ)

''قبلۂ اہل سخن فردوسی...... سنو صاحب شعرا میں فردوسی اور فقراء میں حسن بصری

اور عشاق میں مجنوں یہ تین آدمی تین فن میں سرِ دفتر اور پیشوا ہیں۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ فردوسی ہو جائے''۔۱۶

نظامی (م۶۰۲ھ):

''میرا خداوند نعمت نظامیؒ فرماتا ہے...... کلام سعدی و نظامی و حزین اور ان کے امثال و نظائر کا معتمد علیہ ہے۔''۱۷

امروز من نظامی و خاقانیم بدہر
دہلی ز من بگنجہ و شرواں برابر است

سعدی (م۶۹۱ یا ۶۹۲ھ):

''مانا کہ سعدی و حافظ کے برابر مشہور رہیں گے۔ ان کو شہرت سے کیا حاصل ہوا کہ ہم کو تم کو ہوگا...... کلام سعدی...... کا معتمد علیہ ہے...... دیکھو سیف الحق سعدی کا قول کیا سچا ہے۔''۱۸

خسرو (م۷۲۵ھ):

''کیخسر و قلمرو سخن طرازی ہے۔ ہم چشم نظامی گنجوی و ہم طرح سعدی شیرازی ہے۔''۱۹

مغربی (م۸۰۰۹ھ)

''عرفا میں سے ہے، بیشتر اس کے کلام میں مضامین حقیقت آگین ہے...... مغربی قدما میں اور عرفاء میں ہے، جیسا عراقی کا کلام دقائق و حقائق کے تصوف سے لبریز ہے۔''۲۰

حافظ (م۸۳۴ھ):

''حافظ کے شعر کی حقیقت جب سمجھو گے کہ قواعد مقررہ اہلِ سخن دریافت کرلو گے۔''۲۱

عرفی (م۹۹۹ھ):

''عرفی کی زبان سے جو نکل جائے وہ سند ہے۔ ہمارے واسطے وہ ایک قاعدہ محکم ہے۔ وہ مطاع ہے اور ہم اس کے مقلد اور مطیع ہیں۔ جب وہ خود عرفی نے لکھا ہے تو ہم سند اور کہاں سے لائیں گے۔ قواعد زبان فارسی کا ماخذ تو ان

حضرات کا کلام ہے۔ جب ہم انہیں کے قول پر اعتراض کریں تو اس اعتراض کے واسطے قاعدہ کہاں سے لائیں۔''۲۲

گشتہ ام غالب طرف باشرب عرفی کہ گفت
روئے دریا سلسبیل وقعر دریا آتش است

غالب! میں تو مسلک عرفی کا طرفدار ہوں جس نے کہا ہے دریا کا بالائی حصہ سلسبیل (بہشت کی ایک نہر) اور زیریں حصہ آتش کی حیثیت رکھتا ہے۔

چوں نہ نازد سخن از مرحمتِ دہر بخویش
کہ برد عرفی و غالب بہ عوض باز دہد

سخن یعنی شاعری زمانے کی مہربانی سے خود آپ پر کیوں نہ ناز کرے جو عرفی کو لے جا کر اس کی جگہ غالب کو پیش کرتی ہے۔

کیفیت عرفی طلب از طینت غالب
جام دگراں بادہ شیراز ندارد

غالب کی طینت سے عرفی کے کلام کی کیفیت اور خصوصیت معلوم کرو۔ دوسروں کے جام میں شیرازی شراب نہیں ہوتی ہے۔

قافیہ غالب چو نیست پرس ز عرفی
گر من فرہنگ بودی چہ غمستے

قافیہ چونکہ غالب کا نہیں ہے اس لئے عرفی سے پوچھو، اگر میں فرہنگ (ادب یا لغت کا ماہر) ہوتا تو اس میں غم واندوہ کی کیا بات ہوتی۔

فیضی (م ۱۰۰۴ھ):

''فیضی کی سند مقبول و مسموع......فیضی بھی نغز گوئی میں مشہور ہے۔ کلام اس کا پسندیدہ جمہور ہے۔''۲۳

صایب (م ۱۰۸۰ھ):

''بزرگوں کے کلام کو ہم مورد اعتراض نہ کریں اور خود اس کی پیروی نہ

کریں۔ فقیر گوارا نہیں رکھنے کا جمع الجمع کو اور برا نہ کہے گا حضرت صایب کو۔
صایب اگرچہ اصفہان نژاد تھا مگر وارد شاہجہان آباد تھا۔ انتقام کشیدن اور انتقام گرفتن دونوں بول گیا...... صایب کے دیوان میں ایک مطلع نظر آیا۔'' ۲۴

ذوق فکر غالب را بردہ ز انجمن بیروں
با ظہوری و صائب ہمچو ہمزبانیہاست

غالب کا ذوق شاعری اسے انجمن سے باہر کھینچ لایا، اب تو ظہوری اور صائب جیسوں کی ہم زبانی اسے حاصل ہے۔

ایں جواب آں غزل کہ صائب گفتہ است
در نمودِ نقشِ ہائے بے اختیار افتادہ ام

یہ صائب کی کہی ہوئی غزل کا جواب ہے۔ نقش ہائے شاعری کے اظہار میں میں بے اختیار واقع ہوا ہوں۔

نظیری (م ۱۰۲۱ھ)

'' ......مگر جبکہ نظیری شعر میں لایا اور وہ فارسی کا مالک اور عربی کا عالم ہے تو میں نے مانا...... نظیری علیہ الرحمہ کا شعر ایک کاغذ پر لکھ کر میرے گلے میں ڈال دیجئے اور زمرہ شعرا میں سے مجھ کو نکال دیجئے:

جوہر بینش من در تہِ زنگار بماند
آنکہ آئینۂ من ساخت نپرداخت دریغ

''بوعلی سینا کے علم کو اور نظیری کے شعر کو ضائع اور بے فائدہ اور موہوم جانتا ہوں''۔ ۲۵

غالب ز تو آں بادہ کہ خود گفت نظیری
در کاسۂ ما بادۂ سرجوش نہ کردند

غالب تجھے وہ شراب دستیاب ہے جس کو خود نظیری نے کہا ہمارے پیالے میں بادۂ سرجوش (عمدہ قسم کی شراب) نہیں انڈیلی۔

غالب مذاق ما نتواں یافتن زما
رو شیوۂ نظیری و طرز حزیں شناس

غالب ہمارے ذوق شاعری کا سراغ لگانا ممکن نہیں۔ جاؤ نظیری کا اسلوب اور حزین کا انداز سمجھنے کی کوشش کرو (گویا میرا انداز بیان ان کے انداز بیان کے مشابہ ہے)۔

غالب شنیدہ ام ز نظیری کہ گفتہ است
نالم ز چرخ گر نہ بہ افغاں خورم دریغ

غالب میں نے نظیری کی یہ بات سنی ہے کہ اگر میں آہ وفغاں پر افسوس نہ کروں تو آسمان کے ہاتھوں آہ و نالہ کروں گا۔

ظہوری (م ۱۰۲۵ھ)

"شست بستن جب ظہوری کے یہاں ہے تو باندھئے یہ روزمرہ ہے اور ہم روزمرہ میں ان کے پیرو ہیں۔"۲۶

غالب از صہبائے اخلاق ظہوری سرخوشم
پارۂ بیش است از گفتار ما کردار ما

غالب اخلاق ظہوری کی شراب پی کر میں مست و سرخوش ہوں ہمارا کردار ہماری گفتار سے کسی قدر زیادہ ہے۔

بہ نظم ونثر مولانا ظہوری زندہ ام غالب
رگ جاں کردہ ام شیرازہ اوراق کتابش را

مولانا ظہوری کی نظم ونثر کی کشش کی بدولت میں بقید حیات ہوں، اس کے دیوان کے اوراق کے لئے میں نے رگ جان کو شیرازہ بنالیا ہے۔

دریں ستیزہ ظہوری گواہ غالب بس
من و ز کوئے تو عزم سفر، دریغ دریغ

اس آویزش میں ظہوری غالب کی گواہی کے لئے کافی ہے۔ تیرے کوچے سے میرا عزم سفر کرنا انتہائی افسوس کا مقام ہے۔

غالب از جوش دم ما تربتش گل پوش باد!
پردۂ ساز ظہوری را گل افشاں کردہ ایم

غالب ہمارے دم سے اس کی تربت گلپوش رہے۔ ظہوری کے پردۂ ساز پر ہم نے گل فشانی کی ہے۔

غالب از اوراق ما نقش ظہوری دمید
سرمۂ حیرت کشیم دیدہ بدیدن دہیم

غالب ہمارے اوراق دیوان سے ظہوری کی چھاپ نمایاں ہے۔ آنکھوں میں حیرت کا سرمہ لگا کر ان کو نظارہ کرنے پر مامور کئے ہیں۔

غالب از ما شیوۂ نطق ظہوری زندہ گشت
از نوا جاں درتن ساز بیانش کردہ ایم

غالب ہماری بدولت ظہوری کے اسلوب کو زندگی ملی۔ اپنی شاعری سے اس کے ساز بیان کے پیکر میں میں نے جان ڈال دی۔

جلال اسیر: (۱۰۲۹تا۱۰۶۹ھ)

''مرزا جلال اسیر مختار ہیں اور ان کا کلام سند ہے میری کیا مجال کہ ان کے باندھے ہوئے لفظ کو غلط کہوں۔ صاحب زبان ہونے میں اسیر بھی ظہوری سے کم نہیں ہے...... جلال اسیر کا یہ بیت بہت پاکیزہ ہے''۔ ۲۷

قدسی (۹۹۱ھ پیدائش قیاسی)

'' قدسی شاہجانی شعرا میں ہے۔ صائب وکلیم کا ہمعصر اور ہم چشم۔ ان کا کلام شعر انگیز۔ ان بزرگوں کی طرز وروش میں زمین آسمان کا فرق ہے۔'' ۲۸

حزین (۱۱۰۳ھ تا ۱۱۸۰ھ)

'' کلام سعدی ونظامی وحزین کا معتمد علیہ ہے۔ حزین کے اس مطلع

ز ترکتازی آن نازنین سوار ہنوز
ز سبزہ می دمد انگشت زینہار ہنوز

میں واقعی ایک ہنوز زائد اور بیہودہ ہے۔ متتبع کے واسطے سند نہیں ہوسکتا ہے۔ یہ غلط ہے، یہ سقم ہے، یہ عبث اس کی کون پیروی کرے گا۔'' ۲۹

ناصر علی، بیدل اور غنیمت

''ناصر علی اور بیدل اور غنیمت ان کی فارسی کیا، ہر ایک کا کلام بنظر انصاف دیکھیے ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔'' ۳۰

کلیات فارسی کی تقریظ میں غالب لکھتے ہیں:

''ہر چند منش کہ یزدانی سروش ست، در سر آغاز نیز پسندیدہ گوی و گزیدہ جوی بود۔ اما بیشتر از فراخ روی پی جادۂ ناشناسان برداشتی، و کثری رفتار آنان را لغزش مستانہ انگاشتی۔ تا ہمدران تگاپو پیش خرامان را بہ فجستگی ارزش ہمقدمی کہ در من یافتند، مہر بجنبید و دل از آزرم بدرد آمد۔ اندوہ آوارگیھای من خوردند و آموزگارانہ در من نگریستند۔ شیخ علی حزین بخندۂ زیر لبی بیراہہ رویھای مرا در نظرم جلوہ گر ساخت، و زہر نگاہ طالب آملی و برق چشم عرفی شیرازی مادۂ آن ہرزہ جنبش ہای ناروا در پای رہ پیمای من بسوخت۔ ظہوری بسر گرمی گیرائی نفس حرزی ببازوی و توشۂ بر کمرم بست، و نظیری لاأبالی خرام بہنجار خاصۂ خود بچالش آورد۔ اکنوں بہ یمن فرۂ پرورش آموختگی این گروہ فرشتہ شکوہ، کلک رقاص من بخرامش تذروست، و برامش موسیقار، بجلوہ طاؤس ست، و بہ پرواز عنقا۔'' ۳۱

طبیعت، جو خدائی فرشتے کا حکم رکھتی ہے اگر چہ شروع ہی سے پسندیدہ مطالب اور عمدہ مضامین کو شعری جامہ پہناتی رہی۔ مگر اکثر کشادہ روی کے باعث پہلے جادۂ شعر سے ناآشنا شاعروں کی پیروی کرنے لگتی تھی اور ان کی کج رفتاری کو اپنی جگہ لغزش مستانہ تصور کرتی تھی۔ اس آوارگی کے دوران آخر ایک وقت آیا جب میرے پیشرو شعرا نے مجھ میں ہمقدمی کی صلاحیت پا کر مجھ پر نظر کرم ڈالی، میری آوارگی پر انہیں دکھ ہوا اور مجھے تربیت کی نگاہ سے دیکھا۔ شیخ علی حزین نے خندۂ زیر لبی سے میری بے راہ روی پر مجھے ٹوکا، طالب آملی کی زہر نگاہ اور عرفی شیرازی کی برق چشم نے میری راہ پیمائی میں اس ناروا ہرزہ سرائی کے مادے کو جلا ڈالا۔ ظہوری نے میرے بازو میں تاثیر نفس کا تعویذ اور کمر سے توشہ باندھا، اور بے پروا خرام نظیری نے اپنی خاص روش پر مجھے چلایا۔ اب ان فرشتہ شکوہ پیشرووں کی تربیت کی برکت سے میرا رقص کرنے والا قلم تذرو (چکور) کی چال سیکھ گیا ہے اور نغمہ سنجی میں موسیقار ہو گیا ہے، جلوے میں طاؤس اور پرواز میں عنقا

کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔

مثنوی ابر گہر بار کے مقدمہ میں غالب لکھتے ہیں:

"چوں خواستند کہ قوت ناطقہ بدین استخوانی پیکر کہ بہ اسد اللہ غالب نامور است، پیوند پذیرد، بہ ریزش نمک طرز عرفی شیرازی و آمیزش شکرادائی نظیری نیشاپوری شورانگیزی وگلوسوزی حسن برشتہ آن شاہد غیبی افزودند۔ غزل وقصیدہ وقطعہ ورباعی رادر فرجام کشی ودل کشی لفظ ومعنی کارازان گذشت کہ دیگری رادر اندیشہ گزرد۔ پسیچ نبشتن مثنوی دلنشین افتادفردوسی طوسی رابہ رہنمائی ونظامی گنجوی رابہ نیروفزائی گماشتند"۔۳۲

...... جب اس نے اس استخوان پیکر کو جسے غالب کہتے ہیں، قوت گویائی سے نوازنا چاہا تو عرفی شیرازی کی طرز شاعری کے نمک کی ریزش اور نظیری نیشاپوری کی شکرادائی کی آمیزش کے ذریعے اس شاہد غیبی کے رشتے میں حسن کی شورانگیزی اور گلوسازی بڑھائی۔ غزل، قصیدہ، قطعہ اور رباعی کا پلہ لفظ ومعنی کی دلکشی اور دلربائی کے لحاظ سے اس سے کہیں آگے نکل گیا کہ کسی اور شاعر کے دائرۂ خیال میں آئے۔ دلنشین مثنوی لکھنے کا ارادہ کیا تو فردوسی طوسی کو میری رہنمائی اور نظامی گنجوی کو میری حوصلہ افزائی پر مقرر کیا۔

غالب کے خطوط، کلیات اور مثنوی ابر گہر بار کے اشعار اور مقدموں سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آگئی کہ "نازک خیال شاعروں" سے غالب کی مراد کون شعر ہیں۔ بیدل کی تقلید کا تذکرہ اگرچہ اس نے ان جگہوں میں نہیں کیا ہے بلکہ صرف اپنی ابتدائی ریختہ گوئی میں کیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ بھی نازک خیال شاعروں کی صف میں شامل ہے بلکہ بقول ایز دبخش رسا "اورنگ نشین نازک خیالی" کشور نازک خیالی کا تخت نشین (۳۳) ہے، خود بیدل کا بھی یہی خیال ہے۔

بیدل از نازک خیالاں مشق ہمواری خوش است
تا نیفشارد تامل معنیِ یکدست را

بیدل یہ بات اچھی ہے کہ نازک خیال شاعروں کے کلام کی ہمواری کے ساتھ پیروی کی مشق کی جائے تا کہ قوت اندیشہ ایک ہی قسم کے مضامین کو پراگندہ نہ کردے۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد لکھتے ہیں:

''غالب نے اپنی فارسی غزلوں میں متعدد شعراء کے ذکر کے ساتھ ہی ساتھ ان کی عظمت کا اعتراف بھی کیا ہے اور یہ نکتہ بھی قاری کے سامنے لانے کی شعوری کوشش ہے کہ میں بھی کسی سے کم نہیں ہوں۔''۳۴

بہر حال غالب نے تقلید کی، پر وہ نرا مقلد بن کر نہیں رہا بلکہ تقلید سے تحقیق اور پیروی سے اصالت کی منزل تک پہنچ کر اس نے دم لیا، چنانچہ لکھتا ہے:

''مبدأ فیاض سے مجھ کو ان کی تقلید میں پایہ تحقیق ملا ہے۔ اور میں صاحب طرز جدید ہوں''۳۵

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس نے سب کے مجموعی اثرات قبول کیے۔ چنانچہ ایک شعر میں وہ اس طرف اشارہ کرتا ہے یہ تو نہیں کہتا کہ جادو بیان شاعروں کے طرز سخن میں تازگی پیدا کی ہے ہاں ان کے کلام کے جادو کا اثر اپنے اندر ضرور محسوس کرتا ہوں۔

نگویم تازہ دارم شیوۂ جادو بیانان را
ولی در خویش بینم کارگر جادوی آنان را

پھر ان کے افکار و خیالات کو اپنے ذوق کی بھٹی میں تپایا اور پگھلایا اور اپنے مخصوص افکار و خیالات اور نادر تشبیہات و استعارات کی آمیزش کر کے انہیں ایک نیا رنگ و آہنگ عطا کیا۔ یہیں غالب کی انفرادیت ہے جسے وہ ''آبروی غالب'' سے تعبیر کرتا ہے۔

ہمیں گداختن است آبروی ما غالب
گہر چہ ناز فروشد بہ پیش ژالۂ ما

غالب نے اپنی خون جگری اور بلند کوشی کا سفر جاری رکھا اور آخر کار اس کے دردمند دل نے شاعری کو وہ مقام و مرتبہ عطا کیا کہ آنے والی نسل سے وہ ایسے افراد کا متمنی ہے جو اس کے کلام کی رفعت و بلندی اور اسکے خیال کی ندرت و تازگی کا اندازہ لگا سکے:

''یارب پس از من چوں من بگر دسراپای گفتار گردیدہ بیافرینی تا دارسد کہ دیوار کاخ والائی سخن در چہ پایہ بلند است و سرشتہ کمند خیالم در آن فرازستان بکدامی زروہ نہد۔''۳۶

خدایا میرے بعد میرے جیسا سراپا گفتار کے گرد طواف کرنے والا شخص پیدا فرما تا کہ وہ غور کر کے اندازہ لگا سکے کہ میرے قصر شاعری کی دیوار کتنی بلند اور میرے کمند خیال کا سر رشتہ کس چوٹی تک پہنچا ہوا ہے۔ اور غزل کو وہ مقام عطا کیا کہ اسے ''خسروانی سرود'' کا لقب دیا۔

غزل را چون ز من نوائے رسید
ز والا پسیجے بجائے رسید

غزل کو جب میری ذات سے مخصوص لے ملی تو بلند عزم و ہمت کی وجہ سے وہ مخصوص مقام تک پہنچ گئی۔

که نشگفت کایں خسروانی سرود
شود وحی و ہم برمن آید فرود

جائے تعجب نہیں اگر یہ خسروانی سرود وحی بن کر مجھ پر نازل ہو۔

☆☆☆

باب سوم

بیدل کی تقلید

سے وابستہ غالب کے خیالات

اور

ناقدین کی رائے

ہر چند کنم دعوئ خلوتکدہ تحقیق
چوں حلقہ بجز خانہ بیرونِ درم نیست
بیدلؔ

آہنگ اسد میں نہیں جز نغمۂ بیدل
عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ
غالبؔ

بیدل کی پیروی:

اس مختصر سی تفصیل کے بعد ہم اب اپنے اصل موضوع ''بیدل کی پیروی'' کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ پروفیسر احتشام حسین صاحب مرحوم لکھتے ہیں:

''اردوادب کی روایات میں فارسی کی تقلید اور غالب کے معاملہ میں بیدل کی پیروی کو حد سے زیادہ اہمیت دینے کی وجہ سے شعراء اپنے ماحول سے کٹ کر اپنے شعور کے نہیں، محض معینہ اور مفروضہ شعور کے ترجمان بن کر رہ گئے ہیں۔'' ۴۷

محترم پروفیسر احتشام صاحب کی تنقیدی رائے اپنی جگہ باوزن سہی مگر ۷۵-۱۹۷۴ء میں بیدل پر تحقیقی کام کے دوران مجھے غالب سے سابقہ پڑا اور ایسا سابقہ پڑا کہ لگا غالب اور بیدل دونوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا ہے۔

غالب کا بیان

بیدل کی پیروی کے سلسلہ میں ایک تو خود غالب کی اپنی رائے ہے پھر دوسرے ناقدین حضرات کی گوناگوں رائیں ہیں۔عربی زبان کا ایک مقولہ ہے:''صاحب البیت ادریٰ بما فیہ'' گھر والے کو اپنے اثاثے کا علم دوسروں سے زیادہ ہوتا ہے۔اگر اس مقولے کو درست مانیں تو آیئے سب سے پہلے خود غالب کے خیالات کا تفصیلی جائزہ لیں۔اس کے بعد ناقدین کی رائے پھر غالب کے کلام پر بیدل کا اثر،اس کے حدود اور غالب کی انفرادیت کا ذکر ہوگا۔

تمام وہ اشعار جن میں غالب نے بیدل سے اپنی عقیدت یا پیروی کا تذکرہ کیا ہے عام ماہرین غالبیات کے خیال میں اس کی اردو شاعری کے ابتدائی دور سے وابستہ ہیں جب بیدل کی پیروی میں وہ ریختہ لکھ رہے تھے۔یہ اشعار درج ذیل ہیں۔

شوخی نغمہ بیدل نے جگایا ہے مجھے　　جوش فریاد سے لون گا دیتِ خواب اسد

اسد آئینہ پرداز معانی مانگے　　گر ملے حضرت بیدل کا خط لوح مزار

آئینہ بند خلوت و محفل ہے آئینہ　　ہم زانوئے تامل و ہم جلوہ گاہ گل

یاں سنگ آستانہ بیدل ہے آئینہ　　دل کارگاہ فکر و اسد بینوای دل

آہنگ اسد میں نہیں جز نغمہ بیدل	عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

مجھے راہ سخن میں خوف گمنامی نہیں غالب	عصای خضر صحرائے سخن ہے خامہ بیدل کا

مطرب دل نے مرے تارنفس سے غالب	ساز پر رشہ پئے نغمہ بیدل باندھا

اسد ہر جاسخن نے طرح باغ تازہ ڈالی ہے	مجھے رنگ بہار ایجادی بیدل پسند آیا

ہے خامہ فیض بیعت بیدل زکف اسد	یک نیستاں قلمرو اعجاز ہے مجھے

طرز بیدل میں ریختہ لکھنا	اسد اللہ خاں قیامت ہے

جوش دل ہے مجھ سے حسن فطرت بیدل نہ پوچھ	قطرے سے میخانۂ دریائے بے ساحل نہ پوچھ

اسد قرباں سلف جور بیدل	خبر لیتے ہیں لیکن بے دلی سے

ماہرین غالبیات کے دعوی کی اساس غالب کا وہ خط ہے جس میں وہ صراحت کے ساتھ لکھتے ہیں:

''ابتداء فکرسخن میں بیدل اور اسیر کے طرز پر ریختہ لکھتا تھا چنانچہ ایک غزل کا مقطع تھا:

طرز بیدل میں ریختہ لکھنا
اسداللہ خاں قیامت ہے

پندرہ برس کی عمر سے پچیس برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھتا گیا۔ دس برس میں ایک بڑا دیوان جمع ہوگیا۔ آخر جب تمیز آئی تو اس دیوان کو دور کیا۔ اوراق یک قلم چاک کئے۔ دس پندرہ اشعار واسطے نمونے کے دیوان حال میں رہنے دیئے۔'' ۳۸

اس خط سے بظاہر یہ نتائج نکلتے ہیں کہ:

۱۔ ۲۵ سال کی عمر یعنی تقریباً ۱۸۲۲ء تک انہوں نے بیدل کی پیروی اور وہ بھی ریختہ گوئی میں کی۔

۲۔ اس پیروی میں انہوں نے ''خیالی مضامین'' لکھے جن کا زندگی کے حقائق سے کوئی تعلق نہ تھا۔

۳۔ ان خیالی مضامین پر مشتمل ایک بڑا دیوان تیار ہوگیا۔

۴۔ ۲۵ برس کی عمر کے بعد شعور بیدار ہوا کہ خیالی مضامین باندھنے کے غلط راستے پر چل

پڑے تھے اب زندگی کے حقائق کی ترجمانی کرنی ہے۔ اس لئے اس کے اوراق چاک کئے۔

۵۔ نمونے کے لئے دس پندرہ اشعار چھوڑ دیئے۔

لیکن آئندہ صفحات میں جو حقایق سامنے آئیں گے ان کی بنیاد پر یہ نتیجہ نکالنا سراسر ناانصافی ہوگی۔

اگر غالب کا وہ خط جو اس نے ۱۸۶۰ء میں ۶۳ سال کی عمر میں چودہری عبدالغفور سرور کے نام لکھا ہے اور جس کا مضمون یہ ہے:

''عبدالقادر بیدل کا یہ مصرع گویا میری زبان سے ہے۔

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ''۳۹

کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس پر تضمین کیا گیا مصرع:

آہنگ اسد میں نہیں جز نغمہ بیدل

۱۸۶۰ء کے آس پاس ہی کہا گیا ہے۔ اسکا مطلب یہ ہوا کہ کم و پیش پچاس سال تک بیدل غالب کے ذہن پر چھایا رہا۔ اور غالب ''نغمہ بیدل'' سے متاثر ہو کر اسے اپنے کلام میں پیش کرتا رہا۔ چنانچہ ان کے شاگرد رشید حالی کا یہ بیان ''مگر خیالات میں بیدلیت مدت تک باقی رہی''۴۰ بڑا معنی خیز ہے اور اس خیال کی تائید کرتا ہے۔ لیکن اگر کوئی اس قیاس کو ماننے کو تیار نہیں تو اس سلسلے میں غالب کے دیگر بیانات سن اور ماہ کی قید سے درج کئے جاتے ہیں۔ بیدل کا تذکرہ غالب نے اپنے خطوط میں ۱۶ مقامات پر کیا ہے۔ اس میں بعض جگہ بیدل کے کلام سے استناد کیا ہے۔ بعض جگہ اس کے لئے تعریفی کلمے استعمال کئے ہیں۔ بعض جگہ بغیر کسی تعریف و تنقید کے اس کا کوئی شعر یا مصرعہ نقل کیا ہے جو بہر حال اس کی پسندیدگی کو ظاہر کرتا ہے، اور بعض جگہ تنقیدی الفاظ استعمال کئے ہیں۔

ان خطوط کے علاوہ دو اور مقامات پر بیدل کے لئے تحسین آمیز کلمات استعمال کئے ہیں۔ کوئی انیس سال کی عمر میں ۱۲۳۱ھ/ ۱۸۱۵ء میں بیدل کی دو مثنویاں ''محیط اعظم'' اور ''طور معرفت'' غالب کے مطالعہ میں تھیں۔ ان کے قلمی نسخے غالب کی مہر کے ساتھ پنجاب یونیورسٹی

لائبریری میں موجود ہیں۔سرورق پر غالب کی شکستہ تحریر میں مثنوی کی تعریف اس طرح ہے:

ازین صحیفہ بنوعی ظہور معرفت است　　که ذره ذره چراغان طور معرفت است

اس صحیفہ یعنی مثنوی سے معرفت وخدا شناسی کا مضمون اس طرح آشکار ہے کہ ایک ایک ذرہ طور معرفت کا چراغاں بنا ہوا ہے۔

ہر حبابی را کہ موجش گل کند جام جم است　　آب حیواں آب جوئے از محیط اعظم است۴۱

جس بلبلے کی موج پانی پر ظاہر ہوتی ہے وہ درحقیقت جام جمشید ہے۔آب حیات تو درحقیقت محیط اعظم کی ایک نہر کا نام ہے۔

یہ تو ۱۸۱۵ء کا قصہ ہے۔۱۸۲۸ء میں ۳۱ سال کی عمر میں انہوں نے مثنوی ''باد مخالف'' لکھی، اس میں بیدل کا تذکرہ ''محیط بی ساحل''، ''قلزم فیض''، ''صاحب جاہ ودستگاہ'' اور ''غیر ناداں'' کے پرشکوہ القاب وآداب کے ساتھ کیا ہے:

ہمچناں آن محیط بی ساحل　　قلزم فیض میرزا بیدل

صاحب جاہ و دستگاہی بود　　مرورا زین نمد کلاہی بود

گرچہ بیدل ز اہل ایراں نیست　　لیک ہمچو قتیل ناداں نیست

اس کے بعد لفظ 'زدہ' کے استعمال پر کسی نے اعتراض کیا تو اس کی شہادت بیدل کے درج ذیل شعر سے دی:

عاشقی، بیدلی، جنون زدہ ای

قدح آرزو بہ خون زدہ ای۴۲

ا۔۱۸۵۴ء میں لکھتے ہیں:

''میرا قدر رد داں کون کہ میں اس پر ناز کروں۔بہ قول ڈوم جو سمجھے وہ ہمارا غلام جو نہ سمجھے ہم اس کے غلام:

زندگی برگردنم افتاد بیدل چارہ نیست　　چار باید زیستن ناچار باید زیستن۴۳

۲۔۱۸۵۵ء میں لکھتے ہیں:

'' اگر تقطیع شعر مساعدت کر جائے۔ارنی بروزن چمنی گنجائش پائے تو نعم

الاتفاق۔ ورنہ قاعدہ تصرف مقتضی جواز ہے مرزا عبدالقادر بیدل:

چو رسی بہ طور ہمت ارنی مگو ومگریز   کہ نیرزد این تمنا بہ جواب لن ترانی ۴۴

۳۔ ۱۸۵۷ء میں لکھتے ہیں:

''بے فکر جو خیال میں آجائے وہ لکھ لوں ورنہ فکر کی صعوبت کا متحمل نہیں ہوسکتا۔

بقول مرزا عبدالقادر بیدل:

جہد ہا درخور توانائیست   ضعف یکسر فراغ میخواہد ۴۵

۴۔ اپریل ۱۸۵۸ء میں لکھتے ہیں:

'' بیدل کا شعر مجھ کو مزا دیتا ہے:

نہ شام ما را سحر نویدی، نہ صبح ما را دم سپیدی   چو حاصل ماست ناامیدی، غبار دنیا بہ فرق عقبی ۴۶

۵۔ اکتوبر ۱۸۵۸ء میں لکھتے ہیں:

''اے صاحب! ڈھیل نہ کرو، کام میں تعجیل کرو:

ای زفرصت بیخبر! در ہر چہ باشی زود باش'' ۴۷

۶۔ دسمبر ۱۸۵۸ء میں لکھتے ہیں:

''مرزا عبدالقادر بیدل خوب کہتا ہے:

رغبت جاہ چہ، ولذت اسباب کدام   زین ہوسہا بگذر یا مگذر، می گذرد ۴۸

۷۔ ۱۸۵۹ء میں لکھتے ہیں:

''ناصر علی، بیدل اور غنیمت۔ ان کی فارسی کیا؟ ہر ایک کا کلام بہ نظر انصاف دیکھیے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔'' ۴۹

۸۔ ۱۸۶۰ء میں لکھتے ہیں:

''عبدالقادر بیدل کا یہ مصرعہ گویا میری زبان سے ہے۔

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد وما ہیچ'' ۵۰

۹۔ ۱۸۶۱ء میں لکھتے ہیں:

''لغات دساتیری کی فرہنگ وہاں ہے؟ اگر ہوتی تو کیوں نہ تم بھیج دیتے خیر۔

آنچہ ما درکار داریم اکثری درکار نیست''۵۱

۱۰۔۱۸۶۱ء میں لکھتے ہیں:

''اور یہ جو قبلہ اہل سخن فردوسی علیہ الرحمہ کے ہاں آیا ہے۔

ممیراں کسی را و ہرگز ممیر

مجاز ہے، امر بھی ہے اور تعدیہ بھی متاخرین میں سے بھی عبدالقادر بیدل کہتا ہے:

بمیرای سرکش ناپاک تا یکدم بیاسائی''۵۲

۱۱۔۱۸۶۲ء میں لکھتے ہیں:

''حلقہ زا کی زیر نقطہ نہ تھا، میں نے غصے میں لکھا کہ نہ حلقہ زا درست نہ حلقہ را درست۔مگر یہ فارسی بیدلانہ ہے خیر رہنے دو''۵۳

۱۲۔۱۸۶۳ء میں قتیل سے لے کر بیدل اور ناصر علی تک کے شاعروں کی طرز کو چوتھی طرز قرار دے کر لکھتے ہیں:

''پس تو ہم نے جانا کہ ان کی طرز چوتھی ہے، کیا کہنا ہے خوب طرز ہے، اچھی طرز ہے مگر فارسی نہیں ہے، ہندی ہے، دارالضرب شاہی کا سکہ نہیں ہے، ٹکسال باہر ہے۔''۵۴

۱۳۔مارچ ۱۸۶۳ء میں لکھتے ہیں:

''باوجود سوابق معرفت رسم قدیم کا عمل میں نہ آنا خاطر آشوب کیوں نہ ہو:

بیدل نیم ہنوز بہ بینم چہ می شود۵۵

۱۴۔جون ۱۸۶۴ء میں لکھتے ہیں:

''لوہارو سے دلی تک کشتی کے بغیر کیوں کر جاؤں۔دخانی جہاز کہاں سے لاؤں:

اے زفرصت بیخبر! درہرچہ باشی زود باش ۵۶

۱۵۔جولائی۔۱۸۶۵ء میں لکھتے ہیں:

''بہر حال فکر میں ہوں۔اگر اسباب نے مساعدت کی فھوالمراد ورنہ:

آنچہ ما درکار داریم اکثری درکار نیست۔۵۷

۱۲۔۶۶-۱۸۶۵ء میں لکھتے ہیں:

''ابتداءِ فکر سخن میں بیدل کے طرز پر ریختہ لکھتا تھا۔الخ ۵۸

ان میں تین الفاظ 'زدہ'، 'ارنی' اور 'ممیز' کے استعمال میں غالب نے بیدل کے کلام سے استناد کیا ہے۔ تیسرے لفظ کے استعمال میں تو ایسا لگتا ہے کہ اس نے بیدل کو فردوسی کا ہم پلہ قرار دیدیا ہے۔

'پانچ جگہوں میں بیدل کے لئے تعریفی کلمے استعمال کئے ہیں۔ چھ مقامات پر اس نے بیدل کا کوئی شعر یا مصرعہ بغیر کسی تبصرہ کے، مگر موقع ومحل کی رعایت سے نقل کیا ہے، جو بہر حال اس کی پسندیدگی کا ترجمان ہے۔ ایک مقام پر اس کی تقلید کا اعتراف کیا ہے۔ اور تین مقامات پر اس کی فارسی دانی اور طرز پر تنقید کی ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ استنادی، تعریفی نیم تعریفی اور اعترافی بیانات کے مقابلے پر غالب کے تنقیدی بیانات کی تعداد بہت کم ہے بلکہ ہمیں تو اس انکار میں بھی اقرار چھپا نظر آتا ہے۔ خود کہتے ہیں۔ ع

نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا

اس سے اگر یہ نتیجہ نکالیں کہ بیدل کے کلام کی چھاپ جو عنفوان شباب میں غالب کے صفحہ ذہن پر پڑی تھی، مرور زمانہ کے ساتھ گہری ہوتی چلی گئی اور نکالے نہیں نکلی، تو بیجا نہ ہوگا۔

غالب کے کلام پر بیدل کا اثر:

غالب نے اپنی اردو اور فارسی دونوں قسم کی شاعری میں بیدل کا اثر قبول کیا ہے اور اس کی پیروی کی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کی نوعیت مختلف مراحل میں مختلف رہی ہے۔ سب سے پہلے ہم اس کی اردو شاعری کو لیتے ہیں۔ غالب کی اردو شاعری کے دو دور ہیں:

پہلا دور: ۱۲ سال کی عمر سے ۳۴ سال کی عمر تک یعنی ۱۸۰۹ء سے ۱۸۳۱ء تک۔

دوسرا دور: ۵۳ سال کی عمر سے آخر تک یعنی ۱۸۵۰ سے ۱۸۶۹ء تک۔

زمانے کی اتنی واضح تعیین درحقیقت ان کے خطوط کی روشنی میں کی گئی ہے جو درج ذیل ہیں:

۱۔ ''بارہ برس کی عمر سے کاغذ نظم ونثر میں مانند اپنے نامہ اعمال کے سیاہ کر رہا ہوں۔'' ۵۹

۲۔ ''ابتداء فکر سخن میں بیدل کے طرز پر ریختہ لکھتا تھا۔۔۔۔دیوان حال میں رہنے دیئے'' ۶۰

۳۔ ''درآغاز ریختہ گفتمے و بہ اردو زبان غزل سرا بودمی تا بہ زبان فارسی ذوق سخن یافت، ازاں وادی خیال عنان اندیشہ برتافت۔ کما بیش سی سالیست کہ اندیشہ فارسی نگاراست'' ۶۱

شروع میں ریختہ کہتا تھا اور اردو زبان میں غزل سرائی کرتا تھا تا آنکہ فارسی زبان میں شاعری کا ذوق پیدا ہوا، اس وادی خیال سے عنان اندیشہ موڑا کم۔ وبیش تیس سال سے فارسی میں شاعری کرر ہا ہوں۔

۴۔ خاکسار نے ابتدائے سن تمیز میں اردو زبان میں سخن سرائی کی پھر اواسط عمر میں بادشاہ دہلی کا نوکر ہوکر چند روز اسی روش پر خامہ فرسائی کی۔ ۶۲

ان خطوط سے درج ذیل نکات سامنے آتے ہیں:

۱۔ بارہ سال کی عمر یعنی ۹-۱۸۰۸ء سے شاعری شروع کی۔

۲۔ شاعری کی ابتداء ریختہ گوئی سے کی۔

۳۔ ۱۵ سے ۲۵ سال کی عمر یعنی ۱۸۲۲ء تک بیدل اور اسیر کے طرز میں اردو شاعری کی۔

۴۔ پھر اس کی پیروی ترک کی اور دس پندرہ اشعار کو چھوڑ کر باقی ضایع کر دیئے۔

۵۔ یہ فارسی خط نواب شمس الامراء کے نام ہے اور حسب تصریح خلیق انجم غالب نے نومبر ۱۸۸۱ء میں قصیدہ بہ نام شمس الامراء بھیجا تھا (غالب کے خطوط ج ۲، ص ۱۹۳۷) پھر ایک اردو خط میں غالب نے قصیدہ اور ایک عرضداشت ایک ساتھ بھیجنے کا تذکرہ کیا ہے۔ (غالب کے خطوط ج ۴ ص ۱۵۲۶) اسلئے یہ طے ہے کہ یہ فارسی خط جو درحقیقت ایک عرضداشت ہے اسی زمانے کا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اردو شاعری کا سلسلہ ۱۸۳۱ء تک جاری رہا اور فارسی شاعری لگ بھگ ۳۴ سال کی عمر میں ۱۸۳۱ء میں شروع کی۔

۶۔ فارسی میں شاعری شروع کرنے کے بعد اردو میں شاعری موقوف کردی۔

۷۔ پھر ۵۰-۱۸۴۹ء میں قلعہ سے وابستگی کے بعد اردو شاعری شروع کی، کیونکہ شاہ ظفر سے تعلق

کا یہی زمانہ ہے۔

۸۔اور اس دور میں بھی روش وہی سابقہ برقرار رہی۔

۹۔اردو شاعری سے فارسی شاعری کی طرف منتقل ہونے کی وجہ اصل میں فارسی زبان کی شیرینی اور حلاوت کا احساس تھا نہ کہ تنقید سے تنگ آکر یا اردو شاعری کی کم مائیگی کے احساس کے نتیجہ میں جیسا کہ پروفیسر حمید احمد خاں کا خیال ہے، اس سے دامن چھڑایا۔لیکن ۳۴ سال کی عمر سے فارسی شاعری شروع کرنے کی بات بعید از قیاس معلوم ہوتی ہے۔کیونکہ ۱۸۲۷ء میں مثنوی ''چراغ دیر'' اور ۱۸۲۸ء میں مثنوی ''بادِ مخالف'' فارسی میں لکھ چکے تھے۔ان مثنویوں میں زبان و بیان کی پختگی بتاتی ہے کہ کافی پہلے سے فارسی گوئی کی مشق جاری تھی۔ ہاں باقاعدہ غزل گوئی ممکن ہے ۳۴ سال کی عمر میں ۱۸۳۱ء سے شروع کی ہو۔

بیدل کی پیروی پر ناقدین کی رائے:

غالب نے بیدل کی پیروی کی، اردو فارسی دونوں شاعری میں کی یا صرف اردو میں کی، ابتدا میں کی یا آخر تک کی، کامیاب رہا یا ناکام رہا؟ اس سلسلے میں اتنی بھانت بھانت کی بولیاں ہیں کہ آدمی کا ذہن بعض وقت فیصلہ نہیں کر پاتا ہے کہ کس کی بات کو درست مانا جائے۔ذیل میں کچھ مخصوص ناقدین کی رائے پیش ہے:

۱۔غالب کے قریب ترین شاگرد الطاف حسین حالی لکھتے ہیں:

''اگر چہ مرزا بیدل اور ان کے متبعین کی زبان اور ان کے انداز بیان میں شعر کہنا ترک کر دیا تھا اور اس خصوص میں وہ اہل زبان کے طریقے سے سر مو تجاوز نہیں کرتے تھے مگر خیالات میں بیدلیت مدت تک قائم رہی۔''۶۳

۲۔مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

''ابتدا میں وہ بھی بیدل کی پیروی کی وجہ سے غلط راستے پر پڑ گئے تھے۔لیکن عرفی، طالب آملی، نظیری، حزین کی پیروی نے ان کو سنبھالا۔چنانچہ دیوان فارسی کے خاتمے میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔''۶۴

۳۔علامہ سر محمد اقبال لکھتے ہیں:

''غالب کے کلام میں بیدل کا اثر ہنوز کافی تحقیق طلب امر ہے...... بیدل کا خیال اس کے اپنے زمانے سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ تھا۔اور غالب اور دوسرے لوگوں نے اب تک اسے کافی حد تک نہیں پہچانا ہے۔ بیدل کی پیروی میں غالب ،خصوصاً اپنی اردو شاعری میں بہت حد تک ناکام رہا،اور اسی وجہ سے اپنی آخری عمر میں اس نے بیدل کے ہندوستانی اسلوب کی پیروی ترک کر دی...... البتہ غالب کے بعض فارسی کلام میں بیدل کے مضامین نمایاں طور پر نظر آتے ہیں...... بیدل کا ''فلسفۂ حرکت'' پر یقین ہے جبکہ غالب اکثر مواقع پر بیخودی اور سکون کی تلقین کرتا ہے۔''۶۵

۴۔یگانہ چنگیزی لکھتے ہیں:

''اسی ہندوستان میں ایک ایسا جلیل القدر فلسفی شاعر بالا دست ہوگذرا ہے جس کے آگے انوری اور خاقانی بھی پانی بھرتے ہیں۔(یہ شاعرانہ مبالغہ نہیں ،حقیقت ہے)جس کے سامنے غالب ایک طفل مکتب سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا،جس کے دریائے فیض سے یہ غازی میاں (غالب) بہت کچھ مستفید ہوتے رہے ہیں،جس کے خزانے سے بہت سا مال چرا چرا کر اپنی جھولی میں رکھ لیا ہے۔وہ کون؟وہ مرزا بیدل علیہ الرحمہ ہے۔''۶۶

۵۔خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہیں:

''منتخب شدہ مطبوعہ دیوان بھی بیدلیت سے معریٰ نہیں ہے...... غالب کا فارسی کلام اردو کے مقابلے میں زیادہ صاف ہے،اگر چہ کہیں کہیں بیدل کا چسکا عود کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔''۶۷

۶۔مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں:

''اس زمانے میں غالب پر بیدل کا رنگ اتنا غالب تھا کہ انہوں نے متعدد غزلوں کے مقطعوں میں مختلف طریقوں پر بیدل کا ذکر کیا ہے...... اسی زمانے کے کلام میں محض ردیفیں ہی فارسی نہیں ہیں، بلکہ پورے پورے مصرعے فارسی کے چلے آتے ہیں۔

......اس نسخہ حمیدیہ کے غائر مطالعے سے منکشف ہوتا ہے کہ اس میں زیادہ تر کلام بالکل ابتدائی دور کا ہے۔جب کہ غالب کی دقت پسند طبیعت بیدل کے مطالعے سے بہت مسحور تھی اور وہ بیدل کی تقلید میں نازک اور بلند مضامین پیدا کرنا چاہتے تھے۔لیکن نہ دماغی

قویٰ نے بلوغ حاصل کیا تھا، نہ انداز بیان پر پوری قدرت و دستگاہ حاصل ہوئی تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ وہ بیدل کے خاص الفاظ، ترکیب کو بکثرت استعمال کرتے تھے اور اسے اپنے ذہن میں بیدل کی پیروی سمجھتے تھے"۔ ۶۸

۷۔ ڈاکٹر عبداللہ لکھتے ہیں:

''جن غزلیات میں طلسم ،حیرت ،قفل ،کلید، جوہر، جوہر آئینہ ،ورطہ، گرداب، عقل کل، لاہوت، ہیولیٰ، افسون، تمثال ،نگین، عکس تجلی ،ایجاد ،تعمیر، آگہی ،عنقا، عدم، وجود ،عقدہ، کشائش، کشود، نیرنگ اور اس قسم کے فلسفیانہ الفاظ بکثرت موجود ہوں اور مضامین کی روح عارفانہ اور مابعدالطبیعیاتی ہوں ان میں بیدل کا تتبع مسلم سمجھنا چاہئے۔ ابتدائی زمانے کے بعد کی غزلوں میں بیدل اور میر کے اثرات کی کشمکش ذہن غالب میں بڑے عرصے تک جاری رہی۔ اور ہر چند کہ'' آہنگ اسد میں نہیں جز نغمہ بیدل'' ایک حقیقت ہے۔ مگر بعض دوسرے قوی اثرات کی پیہم یورش کی وجہ سے غالب کے ذہن پر بیدل کی گرفت آہستہ آہستہ کمزور ہوتی جاتی ہے۔ یہ اثرات فارسی میں ظہوری، نظیری اور علی حزین کے تھے۔'' ۶۹

۸۔ مرزا جعفر حسین لکھتے ہیں:

''مرزا نے اپنی ابتدائی مشق سخن میں بیدل کی تقلید کرنا چاہی تھی چنانچہ ان کے اردو دیوان میں بہت سے ایسے شعر ملیں گے جو بیدل کے رنگ میں کہے تھے۔ فارسی میں بھی اس کے بہت سے نمونے موجود ہیں، مثال کے طور پر مرزا اور بیدل کی ایک اہم غزل کے کچھ شعر پیش کئے جاتے ہیں:

ہر طرف نظر کر دیم ہم بخود سفر کردیم
اے محیط حیرانی ایں چہ بیکرانیہاست

بیدل

در کشاکش ضعفم نگسلد رواں از تن
ایں کہ من نمی میرم ہم ز ناتوانیہاست

غالب

ان اشعار کا موازنہ ثابت کر دے گا کہ بیدل کی تقلید کرنے کے باوجود مرزا کی انفرادیت ثابت ہے اور ان کا وہ طرز جو آگے بڑھ کر خود انہی کا انداز سخن کہلایا اور بن گیا اس کلام میں بھی موجود ہے ۔ ورنہ دل فریبیوں کو مہربانی کہنے ، نہ مرجانے کا سبب ناتوانی کو قرار دینے اور پیری میں حسرتِ جوانی کا نمونہ پیش کرنے کی ترجمانی نہ ہوتی ۔ یہی وہ مقامات ہیں جہاں مرزا غالب آپ اپنی مثال ہیں ، اور کوئی دوسرا کوئی ان کا ہم پلہ یا مرد مقابل نظر نہیں آتا۔

مرزا کی فطری صلاحیتوں میں ان کے مطالعہ اور دقیقہ سنجی نے بھی اضافہ کر دیا تھا، اور مرزا نے اگر بیدل کی تقلید کی تو اسی ایک زاویۂ نگاہ کے وہ پابند نہیں رہے ۔ انہوں نے ہر اس شاعر کے کلام کا گہرا مطالعہ کیا جس کو وہ اساتذہ کی صف میں جگہ دینے کیلئے تیار تھے ، اور ہر ایسے استاد سے کچھ نہ کچھ اکتساب کی جدوجہد بھی کی تھی ۔'' ۷۰

۹ ۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں لکھتے ہیں :

'' شروع شروع میں غالب نے بیدل کا تتبع کیا، اس لئے کہ روایتی صنعت گری اور لفظوں کی پینترے بازی سے ان کی طبیعت ابا کرتی تھی ۔ تخیل کی بلند پروازی کے لئے بیدل کے انداز سخن نے غالب کو اپنی طرف راغب کیا، لیکن بیدل کی پیروی کا زمانہ جلد ختم ہو گیا، اور انہوں نے اپنے بیان کی ندرت اور تخیل کی تازہ کاری اور جدت کے لئے اپنا علاحدہ طرز ایجاد کیا ۔ جو بس انہی کے لئے مخصوص رہا ۔'' ۷۱

۱۰ ۔ سید عابد علی عابد لکھتے ہیں :

'' غالب کے دل میں حد سے بڑھی ہوئی خودداری ، تمکین اور وقار کا جذبہ موجود تھا اس لئے اس کی نظر میں معیاری انسان اور شاعر وہ تھا جو مدح سلاطین و وزرا سے بے نیاز ہو...... بیدل میں غالب کو وہ معیاری فنکار ، شاعر اور مفکر نظر آیا جو اس کے وجود میں مثالی تصور کی طرح زندہ رہ سکتا تھا ۔ اس لئے جب غالب بیدل کی مدح کرتا ہے تو وہ اس غالب کی مدح کرتا ہے جو وہ نہ بن سکا اور جس کی اسے تمنا تھی ۔ یہ بھی خود بینی ، تکبر اور عزت نفس

کے قیام کے ایک الجھی ہوئی صورت ہے۔ بہر حال یہاں خود بینی کا جذبہ اتنا مہذب ضرور ہو گیا ہے کہ اس نے مدح غالب کے بجائے مدح بیدل کی صورت اختیار کرلی ہے۔ اب کچھ اشعار پر بھی غور کرنا چاہئے جو غالب نے بیدل کے متعلق کہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس غزل میں بیدل کے ساتھ عقیدت کا اظہار ہوتا ہے وہاں دو تین شعر ایسے ضرور کہے جاتے ہیں جن میں حد سے بڑھی ہوئی خودداری، تمکین اور وقار کا اظہار ہوتا ہے۔ اس سے میرے اس قیاس کو تقویت پہنچتی ہے کہ جہاں غالب کو بیدل کے کلام سے عقیدت تھی وہاں اس کے اوصاف اور اس کی ذات سے عقیدت تھی۔ ایک غزل جو مطبوعہ دیوان میں نہیں ہے:

دیدہ تا دل ہے یک آئینہ چراغاں کس نے
خلوتِ ناز پہ پیرایہ محفل باندھا
حیف اے ننگ تمنا کہ پئے عرض حیا
یک عرق آئینہ پر جبہۂ سائل باندھا
مطرب دل نے میرے تارِ نفس سے غالب
ساز پر رشتہ پئے نغمۂ بیدل باندھا

بیدل سے شیفتگی کی دوسری وجہ بیدل کے کلام کے اسلوب اور اس کی فکری پیمانوں سے تعلق رکھتی ہے۔ بیدل نہ صرف علوم وفنون معقول سے آگاہ اور عرفان وسلوک کی تمام منزلیں طے کر چکا تھا بلکہ اس کے سوچنے کا ڈھب، اس کے بات کرنے کا طریقہ اپنے معاصروں سے بالکل جدا تھا۔ بیدل میں بدرجۂ احسن یہ خصوصیت پائی جاتی ہے کہ اس کا کلام مختلف مقامات یعنی (Levels) سے سمجھ میں آتا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ شاعر کا کلام سمجھنے والے کو اپنی استعداد ذہنی کے مطابق سمجھ میں آتا ہے اور نقاد کو ایسے اشارے بھی شعر میں ملتے ہیں جن سے بحث کرنا غالباً شاعر کو مقصود نہ تھا لیکن جو بات میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ بیدل سوچتا اتنے مقامات سے ہے اور اپنی ترکیبات اور الفاظ میں اتنے التزامات اور اتنے اشارات مخفی کر دیتا ہے کہ ہر ذی بصیرت اور ہوش مند سننے والا یہ سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ بیدل کو ان تمام مقامات کا شعور حاصل تھا بالفاظ دیگر بیدل کے

پڑھنے والے بہت کم یہ محسوس کریں گے کہ انہوں نے کوئی ایسا دقیق مطلب دریافت کیا ہے جو بیدل کے شعور میں نہ تھا۔ مثال کے طور پر صرف ایک شعر پر اکتفا کرتا ہوں جس کی گونا گونی اور نیرنگی تو مسلم ہے لیکن اس کی دقیق ترین صفت، حسن کی گریز پائی Allusiveness ہے جس کی گریز پائی سے مقصود یہ ہے کہ شاعر یا فن کار حسن کی کلیت کا احاطہ کرنے کیلئے کتنے ہی پہلوؤں سے اسے کیوں نہ دیکھ لے لیکن حرمان کا احساس ہمیشہ قائم رہتا ہے کہ حسن کا کوئی نہ کوئی وصف، اس کی کوئی نہ کوئی ادا ایسی نظر آتی ہے، جو بیان میں نہ آئی تھی یعنی حسن نت نئے رنگ بدلتا رہتا ہے، نت نئی صورتوں میں جلوہ گر ہوتا ہے، نت نئے روپ دھارتا رہتا ہے۔ حسن کے کرشمے بے شمار ہیں اور ادائیں لاتعداد، حسن کی ہر ادا اور اس کے ہر کرشمے کو قلمبند کر دینا ناممکن ہے۔ میں نے جو یہاں حسن کا لفظ استعمال کیا یہ جمالیات کے نقطۂ نظر سے کیا ہے۔ اس میں حسنِ جسمی سے لے کر حسن ذہنی اور روحانی تک ہر مرحلہ شامل ہے۔ حسن مطلق بھی ظاہر ہے کہ سب سے زیادہ گریز پا ہے۔ حقیقت اور نکوئی بھی کہ حسن کے دوسرے نام ہیں، ان پر بھی اسی بات کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہ تمام مقامات، یہ تمام مرحلے جسمانی حسن کے تناسب سے لے کر فنون لطیفہ کے حسن تناسب تک اور اس حسن تناسب سے حقیقت اور نکوئی کے مقامات سے گزر کر حسن مطلق کی منزلِ آخری تک بیدل کی نظر میں تھے تو یہ شعر ہوا ہے۔:

همه عمر با تو قدح زدیم و نرفت رنج خمارِ ما
چه قیامتی که نمی رسی زکنارِ ما به کنارِ ما

فانی نے اس مضمون کی فقط ایک سرحد کو چھوا ہے:

دعویٰ یہ ہے کہ دوریِ معشوق ہے محال
مطلب یہ ہے کہ قرب نہیں اختیار میں

میں کہنے یہ چلا تھا کہ بیدل کے مطالب میں مختلف مقامات Levels ہوتے ہیں۔ بیدل کو ان کا شعور ہوتا ہے اور وہ ان مطالب کا اظہار ایسی قدرت سے کرتا ہے کہ بیشتر سننے والے کتنے ہی ذی استعداد کیوں نہ ہوں اس کے ساتھ ہی چلتے ہیں اس سے آگے

نہیں بڑھ پاتے ۔غالب کو بیدل کی یہ ادا بہت پسند آئی ہے اور اس کے شعر میں بھی مطالب کے مختلف مقامات ہوتے ہیں۔ وہ بھی الفاظ اور تراکیب کو جوہری کی طرح پرکھتا اور استعمال کرتا ہے ۔ایتلاف ذہنی اور دلالت ہائے التزامی سے اس کے اشعار لبریز ہوتے ہیں۔ وہ خود مدعی ہے:

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالب میرے اشعار میں آئے

حالی نے یادگارِ غالب میں بعض اشعار کے مختلف مقامات بتائے ہیں لیکن وہ دراصل مقامات نہیں ہیں بلکہ اختلافِ تعبیر ہیں۔'' ۲۷

۱۱۔مجنوں گورکھپوری لکھتے ہیں:

''غالب نے بیدل کی بہار ایجادی کا اعتراف کیا ہے۔ واقعی وہ ہر موقع پر نئی تشبیہیں اور نئے استعارے ایجاد کرتا ہے اور ان میں نئی کیفیتوں کا سامان ہمارے لئے ہوتا ہے۔ سنو! کیا کہتا ہے اور کس قدر اچھوتے انداز میں:

تمام شوقیم لیک غافل کہ دل براہ کہ می خرامد
جگر بہ داغ کہ می نشیند نفس بہ آہ کہ می خرامد

جو چیز ہماری ہستی کا اصلی اور مرکزی ترکیبی عنصر ہے وہی اس امر کی دلیل ہے کہ ہماری زندگی ایک مسلسل ''نایافت'' ہے۔ہم کو کبھی کبھی دھوکا ہو جاتا ہے کہ ہم منزل پر پہنچ گئے ہیں اور گوہر مقصود کو پالیا ہے۔ یہ دھوکا انسان کے حق میں بہت مبارک ہے۔اس سے اس کے اندر نئی تاب اور راہ طلب میں آگے بڑھنے کی تازہ سکت پیدا ہوتی رہتی ہے۔ بیدل زندگی کا بہت بڑا راز داں تھا۔اس کو کائناتی اور انسانی وجود کی تضاد در آغوش حقیقت کا حکیمانہ عرفان حاصل تھا وہ جانتا تھا کہ جس کو ہم بڑے زعم و پندار کے ساتھ منزل رسی سمجھتے ہیں وہ ایک ''لغزش پا'' سے زیادہ قدر اپنے اندر نہیں رکھتی ،اور وہ اس حقیقت سے خوش تھا۔ دیکھو کس نشہ کے ساتھ کہتا ہے:

به وصل لغزش پائے رسیده ام بیدل
بیا که داد رس سعئ نارسا اینجا است
مقیم انجمن نارسائیم بیدل
بهر کجا نرسد سعی کس مرا دریاب

بیدل اپنی شخصیت، اپنے فکر و احساس، اپنے اسلوب و انداز کے اعتبار سے ایک مجتہد تھا۔ اس لئے ایک بڑی مدت تک وہ اہل شعر و سخن کے درمیان باہری سمجھا گیا اور نا مقبول رہا۔ اس کو دنیا کی نارسائی اور اپنے بلند مقام کا احساس تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی بات سمجھنا آسان نہیں، اور اس کو کسی سے شکایت نہیں تھی۔ اس کا ایک شعر ہے:

در جستجوئے ما نکشی زحمت سراغ
جائے رسیده ایم که عنقا نمی رسد

غالب نے اسی شعر کو سامنے رکھ کر اپنا شعر کہا تھا، مگر دونوں میں وہی فرق ہے جو اصل و نقل میں ہونا چاہئے:

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

اور اس شعر کو تم کیا کہو گی:

غریق بحر ز فکر حباب مستغنی است
رسیده ایم به جائے که بیدل آنجا نیست

غالب نے اسی مفہوم کو اپنے اس شعر میں ادا کرنے کی کوشش کی ہے:

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

''لیکن بیدل کے شعر کے سامنے غالب کا شعر سحافت معلوم ہوتا ہے''۔ ۴۷

۱۲۔ پروفیسر حمید احمد خاں اس سلسلے میں اپنے خیال کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جن غزلیات میں غالب نے بیدل کے ساتھ ایضاحاً اظہارِ عقیدت کیا ہے ان میں سے

ایک میں بہ صراحت یہ بتایا ہے کہ مجھے بیدل کی جدت طرازیاں (یعنی تحلیلی نکتہ آفرینیاں) خصوصیت کے ساتھ مرغوب ہیں :

اسد ہر جا سخن نے طرح باغ تازہ ڈالی ہے
مجھے ''رنگِ بہار ایجادیِ بیدلؔ'' پسند آیا

لیکن اس قسم کی ''بہار ایجادیوں'' کے لئے بھی ذوقِ سلیم نے ایک حد مقرر کر رکھی ہے جس سے باہر قدم رکھنا ناقابلِ معافی نہیں تو خطرناک ضرور ہے۔ اس حد کو عبور کر کے ہم ''خیال بندی'' کے میدان میں داخل ہوتے ہیں۔ یہاں شاعر واقعات اور جذبات کی تشریح کے علاوہ خیالی اور وہمی چیزوں کے تجزیے سے بھی اپنے ذوقِ تحلیل کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ تجرید جو مابعد الطبعیات کے بازار کا خاص سکہ ہے یہاں نہایت کثرت سے رائج ہے۔ بیدلؔ کے یہ چند اشعار دیکھئے :

قماشِ رنگ زبس بے حجاب می بافند   بروئے گل ز دریدن نقاب می بافند

☆☆☆

چشم واکردم بکویش اما بہ آغوشِ شرار   غوطہ خوردم در دل خوابِ فراموشِ شرار
نہ غبار است کزیں دشت پرافشاں برخاست   نگہے بالِ تماشا زد و مژگاں برخاست
رنگِ طاقت سوخت اما دحشت آغازم ہنوز   چشم برخاکسترِ بال است پروازم ہنوز
شبنمِ رم طینتم ، بیدلؔ گر افسردم چہ باک   می زند بر یک جہاں بے طاقتی نازم ہنوز

خیال بندی کے یہ تمام خصائص غالبؔ کے دورِ اول میں موجود ہیں مثلاً وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ محبوب کی رنگین یاد سے میری حسرتِ فراق کی زینت ہے اور اس مضمون کو ادا کرنے میں واقعی اور خیالی چیزوں کو بلا تکلف ملا دیتا ہے :

کرتا ہے یہ یادِ بتِ رنگیں دلِ مایوس   رنگِ ز نظر رفتہ حنائے کفِ افسوس

اس کے ساتھ بیدل کا یہ شعر یاد آتا ہے:

در یادِ عمر رفتہ دلے شاد میکنم   رنگِ پریدہ بہ خیال آشیانہ ایست

دراصل اس زمانے میں غالبؔ کا کلام مضامین خیالی سے بھرا پڑا ہے اور تقریباً ہر شعر اسی

طرزِ بیان کی ایک پیچیدہ گتھی ہے صرف چند اقتباسات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

تماشا کردنی ہے انتظار آبادِ حیرانی نہیں غیر از نگہ چوں نرگستاں فرشِ محفلہا

☆☆☆

ذوقِ راحت اگر احرامِ تپش ہو جوں شمع پائے خوابیدہ بہ دل جوئی شبگیر آوے

☆☆☆

پرورشِ نالہ ہے وحشتِ پرواز سے ہے تہِ بالِ پری بیضۂ بلبل ہنوز

خیال بندی کی ایک اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ ایک ہی خیال کے بیان میں متعدد تشبیہات اس طرح مربوط کردی جائیں کہ بغیر کاوش کے مطلب حل نہ ہو۔ یہ شعر دیکھیے:

بیدل ز جوشِ آبلہ ام در رہِ طلب گوہر فروش شد صدفِ گوشِ نقشِ پا

اسی طرح غالبؔ کہتا ہے:

ہوئی جس کو بہارِ فرصتِ ہستی سے آگاہی برنگِ لالہ جامِ بادہ بر محمل پسند آیا

اس شعر کے مصرعہ ثانی میں پہلے لالے سے تشبیہ لی ہے اور پھر خود لالے کو ایک مسافر سے مشابہ قرار دے کر تشبیہ در تشبیہ پیدا کی ہے جو خیال بندی کا طغرائے امتیاز ہے

خیال بند شعراء صرف یہی نہیں کرتے کہ اپنے تخلیلی اندازِ بیان کی بنیاد وہمی و خیالی چیزوں کے تجزیے پر رکھیں۔ بار ہا یہ تجزیہ محض کسی لفظی مناسبت پر مبنی ہوتا ہے۔ عہدِ اورنگ زیب میں خیال بندی منتہائے عروج پر تھی۔ شیر علی خاں لودھی نے اس زمانے میں خیال بند شعرا کا جو تذکرہ مرتب کیا اس میں خیال بندی کی تعریف یہ کی ہے۔ ''دو ایسے کلمات بالاشتراک لانا جن میں سے ایک حقیقی ہو اور ایک مجازی۔ دونوں سے بہ لحاظ حقیقت و مجاز دو مفہوم مترشح ہوں اگر چہ دراصل مراد مجازی سے ہو۔ مگر شرط یہ ہے کہ اس مجازی کلمے میں کوئی اصطلاح یا لطیفہ یا ضرب المثل ہو۔'' خیال بندی کی اس تعریف کے بعد بہ طور تشریح بیدلؔ کا یہ شعر دیکھیے:

صافِ معنی کرد مستغنی ز دودِ صورتم چوں بط مے باطنِ من عالمِ آبِ من است

یہاں شعر سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لئے لفظ آب کے دو معنی لینے ضروری

ہے۔ صفائی اور پانی۔ غالب کا دورِ اول کا ایک شعر ہے:

آتشیں پا ہوں، گدازِ وحشتِ زنداں نہ پوچھ موئے آتش دیدہ ہے ہر حلقہ یاں زنجیر کا

یہاں شاعر قید خانے کی وحشتِ تنہائی سے مضطرب ہوا۔ مضطرب ہونے کے لئے دوسرا لفظ آتشِ زیرِ پا ہونا ہے۔ چنانچہ آتشِ زیرِ پا کی مناسبت سے مصرع ثانی پیدا ہوا:

بیدلؔ کا ایک اور شعر ہے:

بود سر مشقِ درسِ بیخودی باریک بینیہا زمو انگشتِ حیرانی بہ لب دارند چینیہا

چینی کے برتن میں جو بال آ گیا ہے اس سے باریک بینی مراد لی ہے لیکن چونکہ بال آنا دوسرے لفظوں میں برتن کے ٹوٹنے کو کہتے ہیں اس لئے ٹوٹنے سے درسِ بے خودی کی تعبیر کی ہے۔ اس بیخودی کا مزید ثبوت یہ ہے کہ برتن میں جو بال آ گیا ہے وہ اس کے لبوں پر انگشتِ حیرت کی مثال بن گیا ہے۔ اسی انداز میں غالبؔ کا ایک شعر ہے:

نہ پوچھ سینۂ عاشق سے آبِ تیغِ نگاہ کہ زخمِ روزنِ در سے ہوا نکلتی ہے

یہاں سینے کو بالکنایہ مکان سے اور دل کو (یا سوراخِ دہن کو) روزنِ در سے تشبیہ دی ہے جس میں سے ہوا (یعنی سانس) گزرتی ہے۔ پھر اسی روزنِ در کو زخم سے مماثل قرار دے کر زخم کو خطرناک ثابت کیا ہے اس لئے کہ اصولِ طب کے مطابق جو زخم ہوا دینے لگے وہ مہلک ثابت ہوتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ تیغِ نگاہ بے حد تیز ہے۔ ان خصوصیتوں کے علاوہ دونوں مصرعوں میں آب اور ہوا کا تقابل بھی ملحوظ رکھا ہے۔

جب ایک ایک شعر میں خیالات کی اس قدر بھرمار ہو تو مہمل گوئی کی منزل بہت قریب آ جاتی ہے۔ تحلیلی شاعری اور خیال بندی کا انتہائی کمال بلاغت ہے جس طرح ترکیبی شاعری کا انتہائی کمال فصاحت ہے لیکن سچ یہ ہے کہ بلاغت کلام کے وہی نمونے پسندِ طبع ہوتے ہیں جن میں فصاحتِ بیان کا پہلو بالکل چھوڑ نہ دیا گیا ہو۔ تحلیلی شاعری جب اپنے کمالِ بلاغت سے گرتی ہے تو مہمل گوئی ہو جاتی ہے اسی طرح ترکیبی شاعری انتہائی معراجِ فصاحت تک پہنچنے کے بعد اپنے دورِ زوال میں پھیکے اور بے مغز شعروں پر انحصار کر لیتی ہے۔ اورنگ زیب کے عہد میں فارسی کی تحلیلی شاعری خیال بندی کی شکل اختیار کر لینے کے بعد بلاغتِ

کلام کی اس منطقی تدریج تک پہنچ گئی تھی جسے اصطلاح عام میں ''مہمل گوئی'' کہتے ہیں۔چنانچہ صاحب ''مرأۃ الخیال'' لکھتا ہے:

''زمانۂ حال کے شعراء نے صنعتِ خیال بندی کو معراجِ کمال تک پہنچا دیا ہے جسے ہر شخص جانتا ہے۔یہ مشہور نکتہ کہ اچھے شعر کے معنی نہیں ہوتے خیال بند شعرا کے کلام میں صاف اور واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے''۔

جس ادبی دور کا تنقیدی طغرا یہ ہو کہ شعر خوب معنی ندارد، اس میں بلاغت کی اس تنزل کردہ شکل (مہمل گوئی) کا فروغ پانا باعثِ تعجب نہیں ۔شاعری میں پر جوش منطقیانہ استدلال خیال بند شعرا کا بڑا کارنامہ ہے۔بیدل اس فن کا بہت بڑا استاد ہے:

☆

گر تامل قفس بیضۂ طاؤس شود   در شبستان عدم نیز چراغانے ہست

نبض جہدم شرر کاغذ آتش زدہ است   یک مژہ راہ بصد چشم پریدن رفتم

نام را نقش نگیں ہا بال پرواز رساست   ماز خود رفتیم اگر پائے طلب در سنگ ماند

لیکن جب ناکافی توضیح بیان کے باعث ہمارا ذہن شاعر کی پر پیچ دلیل آرائی کے تمام مدارج کا ساتھ نہیں دے سکتا تو شعر مہمل معلوم ہونے لگتا ہے، بیدل کے حسب ذیل دو شعروں کو بے معنی تو یقیناً نہیں کہنا چاہئے لیکن عام انسانی فہم کے لئے ان کے مطلب تک پہنچنا بہت دشوار ضرور ہے:

دانہ مارا کہ بچندیں خطِ ساغر ریشہ کرد   در گزار شبنمِ ما عالمے زنار داشت

☆

حیرت دمیدہ ام گل داغم بہانہ ایست   طاؤس جلوہ زار تو آئینہ خانہ ایست

یہی شانِ اہمال غالؔب کے ابتدائی کلام میں بہت زیادہ کثرت کے ساتھ موجود ہے:

خطِ نوخیز ، نیلِ چشمِ زخمِ صافیِ عارض   لیا آئینے نے حرزِ پرِ طوطی بچنگ آخر

☆

آغوشِ گل ہے آئینۂ ذرہ ذرہ خاک   عرضِ بہار جوہر پرواز ہے مجھے

☆

بہ ذوقِ شوخیِ اعضا تکلف بارِ بستر ہے　　معافِ پیچ و تابِ کشمکش ہر تار بستر ہے

لیکن اس قسم کی مہمل گوئی کے ساتھ بلاغت کی سرحدیں اس طرح مل جاتی ہیں کہ بعض دفعہ دونوں میں تفریق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ بیدلؔ ہمیں تحلیلی تخیل کی پیچیدگیوں کے شعبدے ہی نہیں دکھاتا، وہ بلاغتِ کلام کا بھی بہت بڑا استاد ہے اور وسیع مضامین کو صناعانہ چابک دستی سے دو مصرعوں میں ادا کر سکتا ہے:

دیدۂ انتظار را دامِ امید کردہ ام　　اے قدمت بچشمِ من خانہ سفید کردہ ام

تنم ز بند لباسِ تکلف آزاد است　　برہنگی ببرم خلعتِ خدا داد است

مستِ عرفاں را شرابِ دیگرے درکار نیست　　جز طوافِ خویش دورِ ساغرے درکار نیست

غالبؔ کے ابتدائی دور میں اس قسم کی ماہرانہ بلاغت کی جستجو کرنا فضول ہے لیکن اگر غالبؔ کے ایامِ پختگی کے محض اردو کلام کو دیکھا جائے تو اس میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ غالب نے فنِ بلاغت کو معراجِ کمال تک پہنچا دیا اور اس لحاظ سے وہ اردو کے تمام قدیم وجدید شعرا کا سرتاج ہے۔ مثلاً غالبؔ کا یہ بظاہر سیدھا سادھا شعر ملاحظہ ہو:

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی　　بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا!

ان چند الفاظ میں حسب ذیل نکات مرکوز ہیں:

(۱) خدا کی عبادت کرنے سے بندوں کا بھلا ہوتا ہے۔ (۲) نمرود کی پرستش باعثِ عذاب ہے۔ (۳) میں نے تمام عمر خدا کی عبادت میں بسر کر دی۔ (۴) اور ہمیشہ امید یہ رکھی کہ اس میں میرے لئے فلاح کی کوئی صورت پیدا ہوگی۔ (۵) انجامِ کار مجھے مایوسی ہوئی۔ (۶) اور میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ میں نے عمر بھر جس کی پرستش کی شاید وہ خدا نہیں نمرود کی ذات تھی کیونکہ نمرود کی پرستش ہی اس قدر لا حاصل ہو سکتی تھی۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کی نکتہ طرازی کی توقع بارہ پندرہ برس کے کسی لڑکے سے نہیں کی جا سکتی۔ پھر بھی نسخۂ حمیدیہ کے بعض اشعار جو غالباً دورِ اول کے لکھے ہوئے ہیں۔ یقیناً اس پائے کے ہیں کہ انہیں مہمل گوئی کا نام دینا ظلم معلوم ہوتا ہے:

خاک بازیٔ امید کارخانۂ طفلی　　یاس کو دو عالم سے لب بہ خندہ وا پایا

☆

اسدؔ کو بت پرستی سے غرض درد آشنائی ہے　　نہاں ہیں نالۂ ناقوس میں در پردہ یارب ہا

☆

غنچہ تا شگفتنہا برگِ عافیت معلوم　　باوجودِ دل جمعی خوابِ گل پریشاں ہے

☆

اب خصوصیات بیان میں صرف ایک چیز باقی ہے اور وہ خیال بندی کی مخصوص تشبیہ ہے۔ اسے انگریزی میں (Gonciet) کہتے ہیں۔ اردو میں اس قسم کی تشبیہات کے لئے کوئی خاص اصطلاح وضع نہیں ہوئی لیکن اگر انہیں بدائع (واحد = بدیعہ) کا نام دے دیا جائے تو شاید کچھ زیادہ غلط نہ ہو۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ انگریزی ادب میں بھی خیال بندی کی شاعری (جسے وہاں (Metaphysical Poetry) کہتے ہیں۔ سترہویں ہی صدی کے قریب نمودار ہوئی۔ تقریباً نصف صدی کے فصلِ زمانی سے فارسی اور انگریزی ادب دونوں میں جلیل القدر خیال بند شعراء کا ظہور ہوا۔ انگریزی شاعری میں جان ڈن (John Donne) کو وہی حیثیت حاصل ہے جو ہندوستان کی فارسی شاعری میں بیدلؔ کو مگر اس اتفاق سے بھی زیادہ عجیب اتفاق یہ ہے کہ دونوں ملکوں میں خیال بندی کا ظہور اس وقت ہوا جب تمام ملک میں ایک شدید مذہبی احساس کا دور دورہ تھا۔ شاید مذہب کے پیدا کئے ہوئے تحلیلی شعور کو اس کیفیت سے کچھ تعلق ہو۔ بہر حال دونوں ملکوں میں خیال بند شعراء کا یہ قاعدہ تھا کہ اپنے استعارات و تشبیہات کی تمام جزئیات کو سر مشق تحلیل بناتے تھے۔ اسی طرز کی تشبیہ کو ہم نے یہاں بدیعہ کا نام دیا ہے۔ جب شاعر پیشِ نظر چیز کو کسی بظاہر غیر متعلق چیز سے مبالغہ آمیز یا بعید از قیاس تشبیہ دیتا ہے اور پھر اس اصل چیز (یعنی مشبہ) کو نظر انداز کر کے مبالغہ آمیز یا بعید از قیاس تشبیہ ہی کو اصل موضوع کلام قرار دے لیتا ہے یا اس تشبیہ کا تجزیہ اس طریقے پر کرتا ہے کہ اس کا خطاب تخیل کے بجائے انسانی فہم سے ہو جاتا ہے، اس وقت وہ بدیعہ نگاری کا مرتکب ہوتا ہے۔ بیدلؔ کے یہ دو شعر مثال کے طور پر دیکھئے:

اشک شمعے بود یک عمر آبیار دانہ ام　　سوختن خرمن کند از حاصلِ پروانہ ام

☆

خجلتِ سجدۂ خاکِ درِ او کرد مرا آں قدر آب کہ سامانِ وضوگر دیدم

دورِاول میں غالبؔ کی تشبیہ کا انداز بیدلؔ کی بدیعہ نگاری کا انداز ہے۔ یہ شعر دیکھئے:

رکھا غفلت نے دور افتادۂ ذوقِ فنا ورنہ اشارت فہم کو ہر ناخنِ بُریدہ ابرو تھا

ایک اور نسبتاً صاف شعر ہے۔

عزلت گزینِ بزم ہیں واماندگانِ دید مینائے مے ہے آبلہ پائے نگاہ کا

غالبؔ کے ان فارسی اشعار میں بھی بیدلؔ کی بدیعہ نگاری کا اثر نمایاں ہے:

در ہجر طرب بیش کند تاب و تبم را مہتاب کفِ مار سیاہست شبم را

☆

محتشم زادۂ اطرافِ بساطِ عدمیم گوہر از بیضۂ عنقاست بہ گنجینۂ ما

بدیعہ نگاری کے ساتھ علو خیال کا بہت گہرا اور قریبی تعلق ہے۔ علو خیال سے عام طور پر یا تو یہ مراد ہوتی ہے کہ شاعر کے فکر کا موضوع زندگی کے بہت بڑے بڑے مسائل ہیں اور یا یہ کہ وہ اپنی تشبیہات سے دو ایسی چیزوں کو ہم ربط بنا دیتا ہے جن میں بظاہر عظیم الشان فاصلہ حائل ہے۔ مثلاً ناخن بریدہ کو اشارۂ ابرو سے تشبیہ دینا دو قطعاً بے تعلق چیزوں کو باہم منطبق کر دیتا ہے۔ دراصل شعر کا آدھا لطف تشبیہ میں ہے جس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ دو بظاہر بے تعلق چیزوں میں کسی گہرے اندرونی ربط کا انکشاف۔ شاعر اس انکشاف کے ساتھ خوشگوار استعجاب کا احساس جس حد تک شامل کر سکے گا اسی حد تک تشبیہ عالی یا مضمون بلند ہوگا۔ لیکن ایک خاص حد تک پہنچنے کے بعد اس قسم کے تحسین آمیز انکشاف کی گنجائش باقی نہیں رہتی بلکہ طبیعت یا تو بدمزہ ہو جاتی ہے یا شاعر کے تخیل کی آوارگی مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے علوِ خیال اور بدیعہ نگاری میں بہت ہلکا سا پردہ حائل رہ جاتا ہے۔ چنانچہ بدائع طرازی کی انتہائی غیر متناسب صورتوں کے ساتھ انتہائی بلندئ خیال کے نمونے بارہا شریک ہو جاتے ہیں۔ بیدلؔ اور غالبؔ کے بدائع میں مضحکہ خیزی کے بجائے طبیعت کی بدمزگی کا احساس زیادہ ہوتا ہے۔ میر کے کلام میں بھی بدیعہ نگاری نے سر نکالا ہے لیکن اس کی یہ بلند پروازیاں دردِ سر کے بجائے ہمارے

ہلکے سے تبسم کا باعث ہوتی ہیں۔اس کے برعکس بیدلؔ کے بدائع بہت پیچ در پیچ اور عسیرالفہم ہوتے ہیں۔مشکل معموں کی طرح ان کو حل کرتے ہوئے بھی سر میں درد ہونے لگتا ہے لیکن اتنا نہیں جتنا غالبؔ کے دور اول کے اشعار کو سمجھنے میں کیونکہ ان میں بیدلؔ کے بدائع کے ساتھ بچوں اور نوعمر لڑکوں کا وہ روایتی شوق بھی منسلک ہو گیا ہے جس کی تشفی صرف پہیلیوں اور کہہ مکرنیوں سے ہوتی ہے۔

شاعرانہ تحلیل کا آخری درجہ یہ ہے کہ تجریدات کو اشیائے حقیقی کے برابر اہمیت دے دی جائے۔یہی بدیعہ نگاری کی منزل ہے۔جہاں کیفیات اشیاء کو اشیاء سے منفک کر کے بازیچۂ تجزیہ وتحلیل بنالیا جاتا ہے۔ترکیبی شاعر کا انتہائی تنزل محض محاورہ بندی اور تحلیلی شاعر کا انتہائی تنزل محض بدیعہ نگاری ہے۔''۴۷

نیاز فتح پوری نے اپنے ایک مضمون ''غالب و بیدل'' کے تحت بیدل کی پیروی سے متعلق اپنے خیال کا اظہار اس طرح کیا ہے:

''جہاں تک میرا حافظہ یاوری کرتا ہے، مجھے یاد نہیں آتا کہ میں نے غالب کو بیدل کا مقلد یا متبع لکھا ہو، لیکن یہ ضرور میں نے کسی جگہ ظاہر کیا ہے کہ اول اول غالب نے ریختہ میں بیدل ہی کے تتبع کی کوشش کی، لیکن جب اس میں کامیابی نہ ہوئی تو مومن کا رنگ اختیار کر کے بعض خصوصیات کے لحاظ سے ایک مستقل رنگ کا مالک ہو گیا۔

میں غالب کو بیدل کا متبع یا مقلد اس وقت کہتا جب وہ اس رنگ میں کامیاب ہو جاتا۔ناکامی کی حالت میں کیونکر ایسا دعویٰ کیا جا سکتا ہے۔لیکن ہاں یہ ضرور کہوں گا کہ اس نے اس کی کوشش ضرور کی اور آخر کار منزل کی دشواریوں کو دیکھ کر اپنا جادۂ مقصود ہی بدل دیا۔

اس سلسلۂ بحث میں صرف دو سوال پیدا ہوتے ہیں:

(۱) کیا غالب نے بیدل کا تتبع کیا اور کیوں (۲) کیا اس سعی میں وہ ناکام رہا اور کن اسباب کی بنا پر۔پہلے سوال کا اول جزو اپنے ثبوت کے لئے زیادہ کاوش کا محتاج نہیں چونکہ غالب کا بیان کافی ہے، ملاحظہ ہو:

طرز بیدل میں ریختہ لکھنا

اسد اللہ خاں قیامت ہے

اسد ہر جا سخن نے طرح باغ تازہ ڈالی ہے

مجھے رنگ بہار ایجادی بیدل پسند آیا

مطربِ دل نے مرے تار نفس سے غالب

ساز پر رشتہ پئے نغمۂ بیدل باندھا

دوسرے شعر میں غالب اعلانیہ اعتراف کرتا ہے کہ مجھے بیدل کی جدت طرازیاں پسند ہیں جسے وہ بیدل کے مخصوص انداز میں رنگ بہار ایجادی سے تعبیر کرتا ہے۔ تیسرے شعر میں وہ زیادہ قوت کے ساتھ ظاہر کرتا ہے کہ میرا تار نفس نغمۂ بیدل کے لئے وقف ہے۔ پہلا شعر معلوم ہوتا ہے بہت بعد کا ہے جب خود اس نے محسوس کرلیا کہ بیدل کا تتبع ممکن نہیں۔

اسی کے ساتھ جب اس کی شاعری کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو کثرت سے اس کی شہادتیں ملتی ہیں کہ غالب نے ریختہ میں کہاں کہاں اور کس کس طرح ''بیدل سرائی'' کی ہے۔ نسخۂ حمیدیہ کے دیکھنے سے تو ہر شخص معلوم کرسکتا ہے کہ غالب کے حذف شدہ کلام میں عنصر غالب اس حصے کا ہے جس میں بیدل کا رنگ پیدا کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ لیکن اس کے معروف و متداول دیوان میں بھی بہت سے اشعار اور متعدد ترکیبیں اس ثبوت میں پیش ہوسکتی ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ کیوں غالب نے بیدل کا تتبع کیا۔ اور کیوں اس میں وہ ناکام رہا۔ اور اسی کے ساتھ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ فارسی میں کیوں اس نے بیدل کا رنگ اختیار نہیں کیا۔ جس میں اس کے لئے زیادہ آسانی تھی۔

اس میں شک نہیں کہ غالب فطرت کی طرف سے فارسی کا نہایت پاکیزہ ذوق لے کر آیا تھا اور اسی کے ساتھ خوش بختی سے اسے استاد بھی ایک ایرانی ماہر زبان مل گیا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اس نے پہلے فارسی ہی زبان کی شاعری کی طرف توجہ کی ہوگی،

اور اساتذہ ایران ہی کے کلام کو اپنے سامنے رکھا ہوگا۔ پھر چونکہ اس میں شروع سے شوخی پائی جاتی تھی اور عنفوان شباب میں رندانہ جوش وخروش کا ہونا فطری امر ہے اس لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ ابتداء اسے بیدل کی طرف توجہ ہوتی جو نہ ایرانی شاعر تھا اور نہ اس سطح کا جو عام طور پر غزل گوئی کے لئے مخصوص ہے۔ بعد کو جب غالب سن وقوف کو پہنچا اور زمانہ کے گرم وسرد تجربات نے اسے روحانیت کی طرف مائل کیا تو یہ وہ وقت تھا جب اس کی ریختہ گوئی شروع ہوگئی تھی۔ حالت یہ تھی کہ مغلیہ عہد کا چراغ بجھ رہا تھا، مصائب وآلام نے دلوں میں سوز وگداز پیدا کر رکھا تھا اور طبائع متشائیم شاعری کی جانب مایل تھے۔ غالب، ہرچند ایسی طبیعت لے کر نہ آیا تھا کہ اس ماحول سے صحیح معنی میں جذبات رقیقہ اس کے اندر پیدا ہوتے، لیکن کچھ نہ کچھ اثر اس پر بھی ہوا اور دل میں ہلکی سی وہ کیفیت پیدا ہوئی جس کا پایا جانا کلام بیدل سے لطف اٹھانے کے لئے ناگزیر ہے، ریختہ گوئی کا زور تھا، غالب بھی محافل مشاعرہ کی گرم بازاری میں حصہ لے رہا تھا۔ اپنے فارسی کلام سے اپنی ریختہ گوئی کو ممیز بنانا چاہتا تھا، بلندی ذوق وجدت طرازی میر ودرد کے رنگ کی طرف مائل نہ ہونے دیتی تھی اس لئے وہ مجبور ہوگیا کہ بیدل ہی کو سامنے رکھ کر ریختہ گوئی کے نقوش ساز کرے کیونکہ وہ اس رنگ میں فارسی ترکیبیں بھی اغلاق کی حد تک استعمال کر سکتا تھا جو اس کا طبعی رجحان تھا اور اپنی تخیل میں بھی ندرت وابداع کی صورتیں پیدا کر سکتا تھا جو اس کا ذہنی میلان تھا۔

پھر اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ غالب کی ناکامی کے اسباب کیا تھے۔ اس پر غور کرنے سے قبل ضروری ہے کہ کلام بیدل کی خصوصیات کو مختصراً ظاہر کر دیا جائے۔

اکثر تذکرہ نویسوں نے جن میں مولانا شبلی مرحوم بھی شامل ہیں، بیدل کے سمجھنے میں غلطی کی ہے اور اس لئے اس کے کلام پر وہ صحیح تنقید نہ کر سکے۔ اس پر سب سے بڑا الزام یہ رکھا گیا ہے کہ اس کے کلام میں فارسیت نہ تھی اور دور از کار استعارات وتشبیہات نے اس کے کلام کو اغلاق کی حد تک پہونچا دیا تھا۔ پہلا الزام (اگر وہ واقعی بیدل کے لئے کوئی الزام ہو سکتا ہے) یقیناً ایک حد تک صحیح ہے، کیونکہ محض لطفِ زبان نہ اس کا

مقصود تھا اور نہ زبان کی پابندی کے ساتھ وہ اپنے خیالات کو ادا کرسکتا تھا، وہ اپنے جذبات کو ظاہر کرنا چاہتا تھا اور جب زبان کی تمام معمولی و متداول ترکیبیں ناکافی ثابت ہوتی تھیں تو بالکل الہامی و وجدانی طور پر از خود نئی نئی ترکیبیں اس کے ذہن سے پیدا ہوتی تھیں اور اس طرح گویا وہ اپنی ندرتِ تخیل کے ساتھ ساتھ ایک نئی زبان بھی پیدا کر رہا تھا۔ بیدل کو محض شاعر کہنا اور شاعر سمجھ کر اس کے کلام پر تنقید کرنا درست نہ ہوگا۔ وہ شاعر سے زیادہ بلند چیز حبر (بہت بڑا دانشور) تھا بلکہ اس سے بھی ارفع ایک خلاق سخن تھا، ایک پیامِ رسانِ قدرت تھا، حسن و عشق کی معمولی شاعری اس کے ذوق سے بہت فروتر چیز تھی اور اس کا ہر ہر لفظ ایک ایسا نغمۂ لاہوتی تھی جن کی مثال سوائے الہامی کتابوں کے کسی اور جگہ نہیں مل سکتی، پھر ظاہر ہے کہ وہ لوگ جو صرف سعدی، نظامی، حافظ، فردوسی، عرفی، نظیری کی سطح سے بیدل کا مطالعہ کریں گے وہ یقیناً کوئی لطف اس کے کلام میں نہ پائیں گے اور جنھوں نے وہ مخصوص ذہنیت فطرت کی طرف سے نہیں پائی ہے جو بیدل کے حقایق و معارف کو سمجھ سکے، وہ اگر اس کے کلام کو مغلق، مہمل اور لغو نہ قرار دیں تو تعجب ہے۔

غالب کو اپنی ذہانت، فارسیت اور شاعری پر جتنا ناز تھا وہ کسی سے پوشیدہ ہیں، مشکل ہی سے وہ کسی کا قایل ہوتا تھا، لیکن بیدل کی جدت طرازیوں اور معنی آفرینیوں سے وہ بھی مرعوب ہو گیا اور اس حد تک کہ آخر کار اس نے اس کے تتبع کی کوشش شروع کردی اور پھر خود ہی اس کے ذوقِ سلیم نے بتا دیا کہ کامیابی ممکن نہیں۔ غالب کی ناکامی کا سبب صرف یہ ہوا کہ اس نے زمین وہ نہیں پیدا کی جو بیدل کی تخیل کو بار آور کرسکتی۔ بیدل نے صرف فلسفۂ تکوین کو سامنے رکھا اور اس میں بھی خصوصیت کے ساتھ خالق و مخلوق کا تعلق، قدرت کی بے پایاں وسعت، اس کے مظاہر و آثار اپنی محدود و ناکام جستجو اور آخر میں وحدت وجود جو نتیجہ ہے اس نوع کی سعی و جستجو کا۔ غالب نے غلطی سے بیدل کے اس رنگ کو منطبق کرنا چاہا مادی شاعری پر، مادی تغزل پر اور ان واقعات حسن و عشق پر جو اس دنیا میں انسانی گوشت و پوست سے متعلق رونما ہوتے ہیں اس لئے جو کچھ اس نے

لکھا وہ اس کیفیت سے خالی رہا جو بیدل کے یہاں پایا جاتا ہے اور چونکہ غالب کا ذوق شعری نہایت بلند تھا اس لئے وہ اس کمی کو آخر کار خود بھی سمجھ گیا۔ بیدل و غالب کے کلام کے اس فرق کو آپ ذیل کی مثال سے سمجھ سکیں گے۔ غالب کا مشہور شعر ہے:

بساط عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے بانداز چکیدن سرنگوں وہ بھی

مفہوم یہ ہے کہ میری بساط عجز میں سوائے ایک دل کے کیا تھا سو اس کی بھی کیفیت یہ ہے کہ محض ایک قطرۂ خون ہے جو ہر وقت ٹپک پڑنے کے لئے آمادہ رہتا ہے۔ اس شعر میں قلب کی صنوبری ساخت اور اس کی تعلیق واژ گونی سے اس کا بہ صورت قطرہ آمادہ چکیدن رہنا ظاہر کیا ہے۔ یہ خیال غالب نے بیدل کے اس شعر سے لیا:

آب گہریم و خون یاقوت
داریم بروئے خود چکیدن

لیکن فرق قابل غور ہے۔ بیدل کہتا ہے کہ عالم خلق میں بہتر سے بہتر چیز کو لے لو مثلاً گوہر و یاقوت لیکن اس کا بھی یہ حال ہے کہ اس کا عجز اس کی حالت سے ظاہر ہے۔ داریم بروئے خود چکیدن۔ یہ پورا مصرع کیفیاتی تشبیہ سے متعلق ہے، غالب کے یہاں تشبیہ نظری و مادی ہے اور دل کی تخصیص کر کے بساط عجز کے صرف ایک محدود و مخصوص منظر کو سامنے لاتا ہے، بیدل کوئی تعیین نہیں کرتا بلکہ وہ تمام عالم وجود سے بحث کرتا ہے غالب کو دل کی تخصیص کے ساتھ سرنگوں اور یک قطرہ خون بڑھانا پڑا، بیدل کو اپنے مقصود کی وسعت کے لحاظ سے مطلق اس کی ضرورت نہیں ہوئی۔ غالب کو اپنا مفہوم ذہن نشین کرانے کے لئے غیر معمولی تکلف کرنا پڑا۔ لیکن بیدل نے اسے زیادہ سادہ مختصر الفاظ میں اور زیادہ قوت کے ساتھ ظاہر کر دیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ فرق کیوں پیدا ہوا صرف اس لئے کہ بیدل کا نظریہ شاعری اسے زیادہ بلند ہے اور اس لئے جس مضمون کو بیدل نے اس قدر بلند ہو کر بیان کیا، غالب کو اس اظہار کے لئے نیچے آنا پڑا۔" ۵۷

پروفیسر رشید احمد صدیقی اپنے ایک طویل مضمون میں بیدل کی پیروی سے متعلق اپنے

لات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''غالب کی ابتدائی شاعری کی کوئی فنکارانہ قدر قیمت ہو یا نہ ہو، ان کے جدت طراز ذہن کو رنگ بیدل میں تسکین ضرور ملتی تھی اس لئے کہ وہ نہ تو ''سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ'' کے شاعر تھے نہ ''پل بنا چاہ بنا مسجد و تالاب بنا'' کے۔ جو اسلوب دوسرے شاعروں کے لئے باعث شہرت تھے وہ اپنے لئے باعث لعنت سمجھتے تھے۔ کوچہ بیدل میں غالب کی تربیت ضروری تھی یا نہیں؟ اس سے ان کے دوسرے دور کی شاعری میں پرکاری آئی یا نہیں؟ اس کا بتانا بعض اعتبار سے مشکل ہے۔ غالب طرز بیدل کے قائل تھے۔ نسخہ حمیدیہ میں غالب کے جتنے اشعار درج ہیں ان میں سے بیشتر میں بیدل کا رنگ واضح طور پر ملتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اس امر کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ غالب بیدل کے کتنے ہی قائل کیوں نہ رہے ہوں انہوں نے ایک جگہ ''طرز بیدل بجز تفنن نیست'' بھی کہا ہے اور یہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں غالب کے کلام میں سادگی و پرکاری بیدل کی دین نہیں ہے اسلئے کہ بیدل کا کلام چاہے جو کچھ اور ہو، سادہ اور پرکار نہیں۔ دقیق اور اکثر بے ضرورت دقیق ہے، اور سادگی اور پرکاری کا نقیض ہے۔ غالب کی شہرت کا سبب ان کا اردو کا متداول مختصر و منتخب مجموعہ ہے۔ نسخۂ حمیدیہ نہیں ہے۔ سادگی و پرکاری غالب کی بالکل اپنی ہے، کسی کے اسلوب کی تقلید سے آج تک کوئی شاعر یا فنکار مجتہد یا معظم نہیں پایا گیا۔ بعض حلقوں میں اس بات پر زور دیا جارہا ہے کہ غالب پر بیدل کی گرفت بنیادی اور غیر منقطع ہے۔ اس کی تائید میں جو شواہد پیش کیئے جاتے ہیں ان سے انکار نہیں۔ لیکن غالب کے اردو و فارسی کلام، ان کے خطوط اور ان کے بعض بیانات کو نظر میں رکھیں تو معلوم ہوگا کہ غالب نے نامور پیشروں سے کتنا ہی کیوں نہ استفادہ کیا ہو وہ بنیادی اور غیر منقطع طور پر غالب ہی ہیں، غزل پر غزل کہنے، یکساں تراکیب و تلازمہ، رموز و علایم استعمال کرنے یا کبھی کبھی سوچنے کا یکساں انداز اختیار کرنے سے کوئی شاعر دوسرے شاعر کا لازما مقلد نہیں بن جاتا۔ شعراء کبھی کبھی اسطرح بھی طبع آزمائی یا دوسروں کے میدان میں زور آزمائی کرلیا

کرتے ہیں ۔ کسی بڑے شاعر یا فنکار کے بارے میں اب تک کسی نے یہ نہیں کہا کہ وہ اپنے بجائے کسی اور کے سہارے پر کھڑا ہے۔ بیدل کی غزلوں سے کہیں زیادہ دوسرے اکابر شعراء کی غزلوں پر غالب نے طبع آزمائی کی ہے لیکن کسی کے مقلد نہیں قرار پائے۔ غالب نے اپنے پیشرو اکابر شعراء کے کلام کو ذہن میں رکھ کر اپنے کلام کا جو نمونہ پیش کیا ہے وہ کمتر کسی سے نہیں ہے یا تو برابر ہے ورنہ بہتر ہے۔ غالب کا فارسی کلام بیدل کے رنگ سے خالی ہے میرا خیال ہے کہ فارسی یا اردو شعراء میں سے کسی قابل لحاظ شاعر نے بیدل کی پیروی نہیں کی ہے۔ بیدل کی پیروی ہمارے آپ کے لئے کتنی ہی حرکی ہو وہ کسی شاعر میں حرکت نہ پیدا کر سکی ۔ حالانکہ معمولی درجہ کے شعراء ہر حرکت پر قادر ہوتے ہیں۔ غالب کی جینیس ، بیدل کی جینیس سے بالکل علیحدہ ہے غالب جتنے حسیات کے شاعر ہیں اتنے مجردات کے نہیں۔ شخص اور شخصیت کے اعتبار سے بھی غالب بیدل سے جدا ہیں ۔ بیدل بروایت خود خوارق عادات پر قدرت رکھتے ہیں غالب بتان خود آگاہ، بادہ ناب و گوارا، صاحبان انگریز اور رؤساء عظام کے قائل تھے۔ بڑے شاعر امت کبھی نہیں ہوتے پیغمبر ہمیشہ رہتے ہیں۔''۷۶

۱۳۔ پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں:

''انہیں ایک معنی میں نئی زبان بنانی پڑی جس کے لئے انہوں نے بیدل اور دوسرے فارسی شعرا سے مدد لی۔ اس کوشش میں انہوں نے بڑی بڑی ٹھوکریں کھائیں مگر بالآخر کانٹوں سے الجھنے کی خو نے انہیں دشت میں پھول کھلانا سکھا دیا...... غالب نے بیدل کو چھوڑ کر عرفی اور نظیری کو یوں ہی نہیں پسند کیا۔ وہ ابہام سے بچ کر معنویت اور رنگینی کی طرف آ گئے۔''

''بیدل کے رنگ میں انہوں نے جو شعر کہے، ان میں نازک خیالی ہے، معنی آفرینی ہے، مشکل پسندی ہے، کوہ کندن اور کاہ بر آوردن بھی ہے۔ اردو میں فارسی تراکیب کی وجہ سے اغلاق و اشکال بھی ہے مگر یہ سب چیزیں ایک گم کردہ رہرو کی صدائے دردناک ہی نہیں ایک سیلانی کی نئے دشت و در کی جستجو، ایک سیاح کی نئے زمین و آسمان کی

تلاش، ایک آزاد اور بے پروا تخیل کی ذہنی مشق بھی ہے۔ یہ عنفوان شباب کی وہ ترنگ ہے جب فرد اپنے آپ کو خلاصۂ کائنات سمجھتا ہے جس میں تفلسف ہوتا ہے۔ فلسفہ نہیں ہوتا، تفکر ہوتا ہے، فکر نہیں ہوتی۔ پرواز ہوتی ہے رسائی نہیں ہوتی۔ یہاں نئی راہ صحیح راہ سے زیادہ عزیز ہے۔ یہاں تو سب کچھ ہے، کچھ بھی نہیں اس رنگ کے اشعار تمام نقادوں نے انتخاب کئے ہیں اس لئے اس کی مثالوں کی چنداں ضرورت نہیں ہے''۔۷۷

۱۴۔ خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں:

''بیدل وہ شاعر ہے جس نے حقیقت کی ان سنگین دیواروں کے بجائے تخیل کے رنگوں سے اپنے چاروں طرف ایک دیوار کھڑی کر رکھی تھی۔ غالب نے اس دیوار کی سمت ہاتھ بڑھایا تو سارے رنگ چھوٹنے لگے اور آنکھوں کے سامنے ایسا دھندلکا چھا گیا کہ وہ پرچھائیاں بھی دھندلی پڑنے لگیں جن میں اگر اصل جسم نہیں تو جسم کا سراغ مل جاتا...... مخلص دوستوں نے سمجھا بجھا کر بیدل کی دیوار رنگ سے پرے ہٹایا لیکن اس کے دل و دماغ میں جو بھٹی تپ رہی تھی اسے بجھانا دوستوں کے اختیار میں نہ تھا''۔۷۸

۱۵۔ قاضی عبدالودود لکھتے ہیں:

''ابتدا میں غالب پر بیدل کا اثر تھا، اس کا خود انہیں اقرار ہے اور میرا خیال ہے کہ اس زمانے میں بھی جب وہ اسے نکمے شاعروں میں شمار کرنے لگے تھے اس کے دائرۂ اثر سے باہر نہیں تھے۔ یہ بات اور ہے کہ ابتدا میں صرف بیدل یا اس کے ہم طرز شعرا سے متاثر تھے، بعد کو نظیری، عرفی، ظہوری اور حزین وغیرہ کا اثر قبول کیا۔ غالب آخر آخر تک بیدل کے اشعار اظہار پسندیدگی کے ساتھ اپنے خطوں میں نقل کرتے رہے ہیں''۔۷۹

۱۶۔ جگن ناتھ آزاد غالب کے شعر ''طرز بیدل میں الخ'' کا حوالہ دے کر لکھتے ہیں:

''ہمارے اکثر نقادوں نے اس شعر کا یہ مفہوم تو نکال لیا کہ غالب بیدل کے رنگ میں شعر کہنے کی کوشش میں ناکام رہے چنانچہ غالب نے اس فعل عبث سے توبہ کر لی لیکن جب ہم ان کے اردو کلام کے زیادہ تر حصے اور ساری فارسی شاعری کو دیکھتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اردو کلام کا خاصہ حصہ اور فارسی

شاعری کا قریب قریب سارا اول سے آخر تک نغمہ بیدل ہی کہ جھنکار سے معمور ہے۔۔۔۔ ہمیں اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کرنی چاہئے کہ مذکورہ شعر میں سارا زور لفظ ریختہ پر ہے غالب یہ نہیں کہہ رہے ہیں کہ بیدل کے انداز میں شعر نہیں کہہ سکتا بلکہ بات صرف اردو کی ہے یعنی غالب دوسرے لفظون میں اپنی نارسائی سے زیادہ اردو کی نارسائی کا ذکر کر رہے ہیں۔'' ۸۰

یہ تھے ان مشاہیر دانشوروں کے خیالات جن کی علمی اور ادبی حیثیت مسلم ہے۔ میں ان پر کوئی تبصرہ یا تنقید نہیں کرنا چاہتا کیونکہ ان کا علمی پایہ بہر حال مجھ خاکسار سے بڑھا ہوا ہے۔ البتہ موازنہ غالب و بیدل کے سلسلہ میں راقم السطور نے آئندہ صفحات میں جو کچھ لکھا ہے اگر وہ مستحکم دلائل پر مبنی ہے تو ان کی روشنی میں ناظرین خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ کس کا بیان کس حد تک قابل قبول ہے۔ درحقیقت ہر شخص کی تحقیق اس کی حد نظر ہوتی ہے، اس لئے یہ اختلاف بالکل فطری امر ہے۔ بیدل کہتا ہے ع

''ہر کس اینجا از مقام و حال خود گوید خبر''

بیدل کی پیروی کا پہلا مرحلہ:

راقم السطور کے ناقص خیال میں بیدل کی پیروی کا پہلا مرحلہ تو وہ ہے جب انہوں نے اپنی اردو شاعری کے پہلے دور ۱۸۰۹ء سے ۱۸۳۴ء تک (بلکہ بقول خود پچیس سال کی عمر یعنی ۱۸۲۲ء تک کہنا چاہئے) بیدل کی فارسی ترکیبات وتشبیہات، استعارات وکنایات اور توالیِ اضافات کو اردو اشعار میں منتقل کرنے کی کوشش کی۔ جس میں خود ان کے بقول نغمۂ بیدل کی شوخی نے ان کو بیدار کیا، جس میں خط لوح مزار بیدل سے آئینہ پرداز معانی کی بھیک مانگنے کی تمنا کی، جب سنگ آستانہ بیدل کو آئینہ قرار دیا، جب خامۂ بیدل کو عصائے خضر صحرائے سخن قرار دے کر راہ سخن میں گمراہی کا اندیشہ انہیں نہیں رہا، جب رنگ بہار ایجادی بیدل پر اپنی پسندیدگی کی مہر لگا کر ان کی شاعری نے باغ تازہ کی طرح ڈالی اور جب اس طرز میں اردو شاعری کرنی ان کے لئے قیامت ہوگئی۔ یہاں بیدل کی بہار ایجادی سے غالب کے تاثر کی بات جب آئی ہے تو اس کی تھوڑی وضاحت ضروری ہے۔

بیدل کی بہار ایجادی سے غالب کا تاثر

آغاز ریختہ گوئی میں بیدل کے کلام کی کن خصوصیات نے غالب کو متاثر کیا ہے، اس کا پتہ لگانے کے لئے ان اشعار کی طرف رجوع کرنا اور ان کی وضاحت کرنی ہوگی جن میں وہ اس نغمے اور اسلوب شاعری سے متاثر نظر آتے ہیں۔

آہنگ اسد میں نہیں جز نغمۂ بیدل
عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

جوش فریاد سے لوں گا دیت خواب اسد
شوخی نغمۂ بیدل نے جگایا ہے مجھے

مطرب دل نے مرے تار نفس سے غالب
ساز پر رشتہ پے نغمۂ بیدل باندھا

ان اشعار میں غالب نے ''نغمہ بیدل'' اور ''شوخیِ نغمہ بیدل'' کا تذکرہ کیا ہے جس نے اس کو اس قدر متاثر کیا کہ بقول خود اس کی شاعری بیدل کی شاعری کی صدائے بازگشت بن گئی یا غالب کے اشہب شاعری کو اس نے مہمیز کیا۔ اس لئے ''نغمہ بیدل'' یا ''شوخی نغمہ بیدل'' کی خصوصیات کو بیدل کے کلام کی روشنی میں سمجھنا اور اس کی تحلیل تجزیہ ضروری ہے۔ بیدل نے اس شوخی نغمہ کا حوالہ درج ذیل شعر میں دیا ہے :

خامش نفسم ، شوخی آہنگ من اینست
سر جوش بہار ادبم ، رنگ من اینست

میں ''خاموش نفس'' ہوں، یہی میری ''شوخی نغمہ'' یا ''شوخی آہنگ'' ہے، ''بہار ادب کا خلاصہ اور عمدہ حصہ'' ہوں، یہی میرا رنگ ہے۔ بیدل نے اس شعر میں ''خاموش نفس''، اور ''سر جوش بہار ادب''، کو اپنی شاعری کے ''رنگ و آہنگ کی شوخی'' قرار دی ہے اور ایک شعر میں اسے ''شوخی معنی'' سے بھی تعبیر کیا:

باہمہ نفی سخن ، ''شوخی معنی'' باقیست
بال و پر ریخت ، رنگ ز پرواز نماند

شاعری کی تمام ترنفی کے باوجود شوخی معنی، بدستور باقی ہے۔ ہمارے بال و پر گر گئے پر رنگ پرواز سے عاجز نہ رہا۔

''خاموش نفس'' کا مطلب میرے ناقص خیال میں یہ ہے کہ انسان بہت سے رازہائے سربستہ اور نکتہ ہائے باریک کو کھلے الفاظ کے بجائے خاموشی کے ساتھ استعارات وکنایات کے پردے میں بند الفاظ میں ادا کر جاتا ہے، اس کی تائید بیدلؔ کے دوسرے اشعار سے ہوتی ہے:

کسے را می رسد لاف سخن سنجی کہ چوں بیدل
بہ خاموشی ادا سازد سخنہاے نہانی را

دوسری جگہ کہتا ہے:

کسے را می رسد جمعیتِ معنی کہ چوں کلکم
بہ خاموشی ادا سازد سخن ہائے زبانی را

دعویٰ شاعری اسی کو پہنچتا ہے یا جمعیت معانی تک اسی کی رسائی ہوسکتی ہے جو میرے قلم کی طرح نہانی (پوشیدہ) باتوں یا زبانی باتوں یا زبان سے ادا کی جانے والی باتوں کو خاموشی سے ادا کر جائے۔ یا کہتا ہے:

بیدلؔ احیائے معانی بخموشی کردم
نفسِ سوختہ اعجاز مسیحای دلست

میں نے اپنے افکار وخیالات پر خاموشی سے غور وفکر کر کے معانی کو زندگی بخشی۔ نفس سوختہ مسیحائے دل کا اعجاز ہے۔ غالبؔ نے شاید اسی کا ترجمہ کر دیا ہے:

خاموشی سے ہی نکلے ہے جو بات چاہیے

یا کہتا ہے

قدر سخن بلند کن از مشق خامشی
حرف نگفتہ معنی الہام داشتہ است

خاموشی سے غور وفکر کی ریاضت کر کے شاعری کی قدر ومنزلت بڑھاؤ۔ جو بات کسی اور نے نہیں کہی

ہے اگر شاعر اسے بیان کرتا ہے تو وہ الہام کی حیثیت رکھتی ہے۔ یا کہتا ہے:

کو خامشی کہ شانہ کشِ مدعا شود
آشفتہ است طرۂ وضعِ بیان ما

خاموشی! تو کہاں ہے کہ میرے مضامین کی زلف کی شانہ کشی کرے، کیونکہ میرے شیوۂ بیان کی زلف پریشان اور آشفتہ ہے۔

بہ خاموشی رساند معنی نازک سخن گورا
چو مو از کاسہ چینی بنالد بے صدا گردد

معنی نازک شاعر کو خاموشی کی منزل تک پہونچاتا ہے۔ چینی کے پیالے میں جب بال پڑ جاتا ہے تو اس کی آواز ختم ہو جاتی ہے۔

گوش پیدا کن کہ بیدل از کتاب خامشاں
معنی کز ہیچکس نتواں شنود، آوردہ است

دھیان دو، بیدل نے کتاب خاموشاں سے ایسے ایسے مضامین اور مطالب پیدا کئے ہیں جن کو کسی نے نہیں سنا ہے۔

ان اشعار کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ بیدل نازک، باریک، رنگین، انوکھے اور دلکش مضامین کو پیش کرنے کے لئے سدا بیتاب رہتا تھا جیسا کہ کہتا ہے:

عیب ما رنگین خیالاں معنی باریک ماست

یا:

بحر قدرتم بیدل موج خیز معنیہاست

جن کے لئے وہ خاموشی کے ساتھ سر بگریباں ہو کر غور و فکر کرتا، پھر انہیں تشبیہات واستعارات اور تمثیلات وکنایات کے حسین وجمیل پیکر میں پیش کرتا، چنانچہ کہتا ہے:

تامل رتبۂ افکار پیدا می کند بیدل
بخاموشی نفسہا سوخت مریم تا مسیحا شد

غور وفکر اور تامل وتدبر سے اعلیٰ درجے کے افکار وخیالات پیدا ہوتے ہیں، دلیل اس کی یہ ہے کہ

حضرت مریمؑ نے خاموشی سے نفس سوزی کی تو حضرت مسیح علیہ السلام جیسے اولوالعزم پیغمبر پیدا ہوئے۔اس عمل کو وہ جگر خوری یا خوں جگری سے بھی تعبیر کرتا ہے:

بے جگر خوردن بہار طرز نتواں تازہ کرد
غوطہ تا درخوں نزد فطرت ، سخن رنگیں نہ شد

جگر خوری اور عرق ریزی کے بغیر اسلوب میں موسم بہار جیسی تازگی وشگفتگی نہیں پیدا کی جاسکتی ۔فطرت شاعر جب تک خون میں غوطہ نہیں لگاتی ،یعنی خوب عرق ریزی نہیں کرتی ، اس کا کلام رنگین نہیں ہوتا۔اقبال نے یہیں سے یہ خیال اخذ کیا ہے۔

نقش ہیں سب نا تمام خونِ جگر کے بغیر

ظاہر ہے ایسے مضامین تک رسائی کے لئے غور وفکر اور تامل وتدبر کی ضرورت ہے، محض سرسری طور پر پڑھ کر اس کی تہ تک نہیں پہونچا جاسکتا ہے:

غنچہ شو ، بوئے گل طرز کلامم نازک است
بی تامل نیست ممکن کس بایں انشا رسد

کلی کی طرح خاموشی اختیار کر، میرے اسلوب کلام کے گل کی خوشبو نازک ہے۔کسی کے بس کی بات نہیں کہ غور وفکر کیے بغیر اس انشا (شاعری) تک رسائی حاصل کر سکے۔

بوئے غنچہ نسبت کردہ ام طرز کلامت را
زبانِ برگ گل در عذرِ ایں تقصیر میخواہم

☆

بے سعی تامل نتواں یافت صدا یم
ہشدار کہ تار نفسم نبض سقیم است

غور وخوض سے پڑھے بغیر میری شاعری کی تہ تک نہیں پہنچ سکتے۔دھیان رہے کہ میرا تار نفس بیمار کی نبض کی طرح سست رفتار ہے جس کا پتہ لگانے کے لئے طبیب کو دیر تک نبض پر ہاتھ رکھنا پڑتا ہے۔ اسی طرح میرے کلام پر دست فکر کو دیر تک رکھنا پڑے گا۔اس خیال کو دوسری جگہ یوں ادا کرتا ہے:

کیست تا فہمد زبان عجز ما
نالہ اینجا نبض بیمار است و بس

ہماری زبان عجز آسا کو سمجھنے کا کس میں بوتا ہے۔ میرا نالہ (شاعری) بیمار کی نبض کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی مفہوم کو اس نے یوں ادا کیا ہے:

معنیِ آبلہ بستہ بخونِ جگریم
بی تامل نگذشت است کسے از سرما

ہماری حیثیت خون جگر سے وابستہ ایک معنی آبلہ کی سی ہے اس پر غور وفکر کئے بغیر کوئی ہمارے پاس سے نہیں گذر سکا ہے۔

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ:

"سخنہائے نہانی" یا "سخنہائے زبانی" یا "رازہائے سربستہ" یا "حرف نگفتہ" یا "معنی ناشنودہ کو تازہ بہ تازہ تشبیہات واستعارات کے ساتھ ایسے اسلوب میں بیان کرنا جو عام فہم ہونے کے بجائے تامل طلب ہو، بیدل کی شاعری کی اہم خصوصیت اور بالفاظ دیگر اس کے "نغمہ و آہنگ کی شوخی" ہے۔ اس شوخی نغمہ بیدل کے لئے غالب نے دوسری جگہ "بہار ایجادی" کی ترکیب بھی استعمال کی ہے:

اسد ہر جا سخن نے طرح باغ تازہ ڈالی ہے
مجھے رنگ بہار ایجادی بیدل پسند آیا

غالب نے اس شعر میں بیدل کے مخصوص اسلوب کو ''رنگ بہار ایجادی'' سے تعبیر کیا ہے بیدل کے کلام کے حوالے سے تھوڑی سی روشنی اس پر بھی ڈالنی ضروری ہے۔ راقم السطور کے ناقص خیال میں غالب نے بیدل کے درج ذیل اشعار کی طرف اشارہ کیا ہے۔

بیدل از طورکلامت حیرت زدہ ایم
در بہاریکہ توئی رنگ نگردد ہرگز

بیدل تیرے اسلوب شاعری پر ہم تو حیرت واستعجاب کے پتلا بنے ہوئے ہیں۔ جس موسم بہار میں تو براجمان ہے اس کا رنگ کبھی نہیں بدلتا۔ یعنی تیرا انداز کلام سدا بہار ہے۔

ہر چند نو بہاریم ،یا جوش لالہ زاریم
باغ دگر نداریم غیر از کنار عنقا

ہم گو کہ ''نو بہار'' یعنی وہ چیز ہیں جس میں نئی نکھار اور بہار ہو، یا ''جوش لالہ زار'' یعنی چمن کے جوبن ہیں، پر کنار عنقا کے سوا کوئی اور باغ ہمارے پاس نہیں ہے، (یعنی عنقا کی طرح ہمارا بھی بس نام ہی نام ہے)۔

چنیں از کلک مارنگ معانی می چکد بیدل
تواں گفتن رگ ابر بہار ایں ناودانہارا

رنگ برنگے مضامین ہمارے قلم سے صفحہ قرطاس پر اس طرح ثبت ہوتے رہتے ہیں کہ اس ناوداں (پرنالے) یعنی قلم کو ''رگ ابر بہار'' کا لقب دیا جاسکتا ہے۔ ابر بہار اس بادل کو کہتے ہیں جو موسم بہار میں آئے۔ موسم بہار انواع واقسام کے خوش رنگ اور خوشبودار پھولوں، ہرے بھرے پیڑ پودوں، دلکش مرغزاروں وسبزہ زاروں، پرندوں کی چہچہاہٹ اور دلفریب فضاؤں کا جو سماں ہماری نگاہوں کے سامنے پیش کرتا ہے، حواس خمسہ سے اس کا احساس تو کیا جاسکتا ہے پر بیان میں نہیں آسکتا۔ ان تمام اشعار میں بیدل کا خود کو بہار اور جوش لالہ زار، اپنے قلم کو رگ ابر بہار اور اپنے اسلوب کو سدا بہار کہنے سے اس کا اشارہ اس امر کی طرف ہے کہ اس کی شاعرانہ طبیعت بہار صفت واقع ہوئی ہے، اس کا قلم موسم بہار کی طرح ہے جو انواع واقسام کے اچھوتے، دلکش اور رنگین مضامین پیش کرتا ہے جن کے مطالعہ سے دل ودماغ کو وہی حظ ملتا ہے جو آنکھوں کو انواع واقسام کے رنگ برنگے پھولوں کے مشاہدہ سے ملتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بیدل ایک خط میں خود کو ''ترجمان رنگینیھای تعبیر'' (۸۱) کے لقب سے یاد کرتا ہے۔ بیدل طبعی طور پر بھی شوخ طبع تھا جس کی بدولت بقول خود ہمیشہ کلفت میں رہا کرتا تھا:

از طبع شوخ ایں ہمہ در بند کلفتیم
بستند چوں شرار بسنگ آشیانِ ما

اپنی شوخ طبعی کی وجہ سے میں سدا کلفت کی قید وبند میں رہتا ہوں، ہمارے آشیانے کو چنگاری کی طرح پتھر سے وابستہ کر رکھا ہے۔

پیر گر دیدی و شوخی یکسر مو کم نشد
پیکر خم گشتہ ات ہمچشم ابروئے خم است

بوڑھے ہو گئے پر شوخی تمہاری سر مو کم نہیں ہوئی تمہارا خم گشتہ پیکر ابرو کی طرح خم ہے۔ایک شعر میں اپنی قوت خیالیہ کو چمن پرور کا لقب دیتا ہے:

بس کہ چیدم از بہار جلوہ ات گلہائے زرد
جیب دامان خیال ما چمن می پرورد

تیری بہار جلوہ سے اس قدر گلہائے زرد توڑے ہیں کہ ہمارا جیب دامن خیال سراسر چمن پرور ہو گیا ہے۔غالب نے اسی کے قریب کہا ہے :

وہی اک بات جو یاں نفس و اں نکہتِ گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

کہیں اپنے کو چمن پرداز سے تعبیر کرتے ہوئے کہتا ہے:

بہارِ آرزو در دل ، گلِ امید در دامن
بہر رنگی کہ می آیم چمن پرداز می آیم

اور کہیں اپنے خیال نازک کو ''بوئے گل انشاء کردنی'' سے تعبیر کر کے کہتا ہے:

لطف معنی بیش ازیں بیدلؔ ندارد اعتبار
از خیال نازکت بوئے گل انشاء کردنیست

لطف معنی کا اس سے بڑھ کر کوئی اور معیار نہیں ہو سکتا کہ تیرے نازک خیال سے پھول کی خوشبو کشید کی جا سکے۔اور کہیں اپنے کلام کو ''شعرِ تر'' قرار دیتا ہے:

خشکی بطبع خلق ز شعرِ ترم نماند
فطرت ہنوز از قلمم نال می کشد

میرے شعر تر یعنی تر و تازہ معانی پر مشتمل کلام کی بدولت لوگوں کی طبیعت سے خشکی جاتی رہی ،فطرت ہنوز میرے قلم سے نال کشی کر رہی ہے۔(قلم تراشنے سے جو برادہ نکلتا ہے اسے نال کشی کہتے ہیں)اور کہیں اس کو آتش نوائی سے تعبیر کرتا ہے۔

اثر گم کردہ آہنگم مپرس از عندلیب من
دریں گلشن نفس می سوزم از آتش نوائیہا

میں وہ آہنگ ہوں جو بے اثر ہو چکا ہے۔ میری بلبل کے بابت مت پوچھو۔ میں تو اس باغ میں اپنی آتش نوائی سے نفس سوزی کا کام کر رہا ہوں۔ لیکن غالب کی تعبیر میں یہ ''بہار ایجادی'' اور بیدل کی تعبیر میں ''بہار طرزی''، بڑی جگر خوری، عرق ریزی اور جانفشانی کا تقاضا کرتی ہے۔ بیدل کہتا ہے:

بی جگر خوردن بہار طرز نتواں تازہ کرد
غوطہ تا در خوں نزد فطرت، سخن رنگین نہ شد

جگر خوری اور بہتر تعبیر میں خون جگری کے بغیر بہار طرز میں تازگی نہیں پیدا کی جا سکتی ہے۔ شاعر کی فطرت اور اس کا ذوق جب تک دریائے خوں میں غوطہ نہیں لگاتا یعنی سخت ریاضت اور محنت نہیں کرتا کلام اس کا رنگین نہیں ہوتا ہے۔ غالب نے شاید اس عمل کو ریختہ میں مشکل سمجھ کر اس کا پیچھا چھڑایا۔

اب کچھ اشعار اس دور کے ملاحظہ ہوں:

اسد جان نذر الطافی کہ ہنگام ہم آغوشی
زبان ہر سر مو حالِ دل پر سیدنی جانے

ای خوشا وقتی کہ ساقی یک نیستاں وا کرے
تار و پود فرش محفل پنبۂ مینا کرے

شمار سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بہ یک کفِ بر دن صد دل پسند آیا

بہ شغل انتظار مہو شان در خلوت شبہا
سر تارِ نظر ہے رشتہ تسبیح کوکبہا

کرے گر فکرِ تعمیر خرابیہائے دل گردوں
نہ نکلے خشت مثل استخواں، بیرون قالبہا

کرے ہے حسن خوباں پردہ میں مشاطگی اپنی
کہ ہے تہ بندی خط سبزہ خط در تہ لبہا

اسد کو بت پرستی سے غرض درد آشنائی ہے
نہاں ہے نالۂ ناقوس میں در پردہ یارب ہا

بہ رہن شرم ہے باوصفِ شہرت اہتمام اس کا
نگیں میں جوں شرار سنگ ناپیدا ہے نام اس کا

قطع سفر ہستی و آرام فنا ہیچ
رفتار نہیں، بیشتر از لغزش پا ہیچ

نسخۂ حمیدیہ کی بہت سی غزلیں ایسی ہیں جن کا بیدل کی غزلوں سے موازنہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ بیدل کی غزل سے بے حد متاثر ہو کر انہیں اسی ردیف میں اردو منظوم ترجمہ کا روپ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ مثلاً یہ آخری شعر جس غزل کا ہے بیدل کی غزل اس بحر میں یوں ہے۔

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ
عنقا سر و برگیم مپرس از فقرا ہیچ

طوفان صدائیم درین ساز و صدا ہیچ
زیر و بم و ہم است چہ گفتن چہ شنیدن

سرتا سر آفاق یک آغوش عدم داشت — جز ہیچ نگنجید درین تنگ فضا ہیچ
زینکسوت عبرت کہ معمای حبابست — آخر نکشودیم بجز بند قبا ہیچ
دی قطرۂ من در طلب بحر جنون کرد — گفتند برین مایہ بر و پو بیا ہیچ
مارا چہ خیال است بآن جلوہ رسیدن — او ہستی و مانیستی ، او جملہ و ما ہیچ
یا رب بچہ سرمایہ کشم دامن نازش — دستم کہ ندارد بصد امید دعا ہیچ
موہوی من چون دہنش نام ندارد — گر از تو پرسند بگو نام خدا ہیچ
آبم زنجالت چہ غرور و چہ تعین — بیدل! مطلب جز عرق از شخص حیا ہیچ ۸۲

غالب کی غزل کا پہلا شعر اوپر لکھا گیا۔ بقیہ اشعار ملاحظہ ہوں:

حیرت ہمہ اسرار پہ مجبور خموشی — ہستی نہیں جز بستن پیمان وفا ہیچ
کس بات پہ مغرور ہے اے عجز تمنا — سامان دعا وحشت و تاثیر دعا ہیچ
آہنگ اسد میں نہیں جز نغمہ بیدل — عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

دونوں کے اندر بیان کئے گئے خیالات اور انداز بیان میں بڑی یکسانیت ہے لیکن پہلے شعر میں لفظ ''نہیں'' کو نکال دیا جائے تو کیا رہ جائے گا؟ یہ صورت حال اکثر غزلوں میں ہے۔ لگتا ہے اس دور میں ان کی انتھک کوشش رہی ہے کہ بیدل کے خیال کو بہترین اردو منظوم ترجمے کا روپ دیں اور وہ بھی اسی بحر ورد یف میں۔ حقیقت یہ ہے کہ بیدل جیسے نازک خیال شاعر کے نازک خیالات کو اردو منظوم ترجمے کا روپ دینا کچھ آسان کام نہ تھا۔ اس آخری شعر پر بیدل کا ایک شعر یاد آیا جس میں وہ پیشین گوئی کرتا ہے کہ میرے مصرع پر لوگ تضمین کر کے شعر کہیں گے:

بردہ اند از موج گوہر اشتراک
مصرعہ مارا ز تضمین فرد پیدا کردہ اند

بیدل کی پیروی کا دوسرا مرحلہ:

کم وبیش بیس سالہ انتھک کوششوں کا نتیجہ رایگان نہیں گیا اور غالب کے منظوم ترجمہ کرنے کی سعی بارآور ثابت ہوئی۔ ترجمہ کے بارے میں لوگوں کے مختلف خیال ہیں بعض لوگوں کا خیال ہے شعر کا ترجمہ کرنا ممکن ہی نہیں۔ دراصل نفس ترجمہ ہی ایک بڑا پیچیدہ عمل ہے اور اس پر

بڑی بخشیں ہوئی ہیں۔ مجموعی طور پر اس بات پر اتفاق ہے کہ ترجمہ ایسا ہو کہ اس پر اصل کا گمان ہو۔ یہ کام نثر میں تو آسان ہے مگر نظم میں بہت مشکل ہے خصوصاً جبکہ شعر کا ترجمہ شعر میں کرنا مقصود ہو۔ بعض لوگوں کا خیال ہے شعر کا ترجمہ شعر میں وہی لوگ کرتے ہیں جن کے پاس خود اپنا کوئی علمی سرمایہ نہیں ہوتا۔ یہ بات کسی حد تک درست معلوم ہوتی ہے لیکن کم از کم غالب کے سلسلے میں ہم یہ بات نہیں کہہ سکتے۔ اس نے نہایت خوبصورت اور کہیں آزاد ترجمہ بیدل کے اشعار اور مصرعوں کا کیا ہے اور دوسرے مصرعہ میں، اپنی زبردست قوت مشاہدہ اور زور بیان کی وجہ سے کوئی ایسا نکتہ بیان کر دیا ہے جس سے شعر میں جان آگئی ہے اور ترجمہ پر اصل کا گمان ہوتا ہے۔ چنانچہ کلیات فارسی میں غالب ان امور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

ہزار معنی سر جوش خاص نطق من است
کز اہلِ ذوق دل و گوی از عسل برداست
زرفتگاں بہ یکے گر توارد م رو داد
مداں کہ خوبیِ آرائشِ غزل برداست ۸۳

ہزاروں عمدہ معانی اور مضامین میری شاعری کے ساتھ مخصوص ہیں، جس نے اہل ذوق سے دل اور شہد سے اس کی حلاوت چھین لی ہے۔

گذشتہ شاعروں میں سے کسی کے کلام سے اگر توارد واقع ہوا ہے تو یہ نہ سمجھنا کہ اس نے آرائشِ غزل کی خوبی سلب کر لی ہے۔

اس تفصیل کے بعد بیدل کی بہار ایجادی کے کچھ نمونے ذیل میں دئے جاتے ہیں تاکہ معلوم ہو کہ غالب اس پر کیوں سر دھنتے تھے۔ سب سے پہلے وہ اشعار دئے جاتے ہیں جن کو غالب نے اپنے مختلف خطوط میں پسندیدگی کی مہر کے ساتھ یا اپنے خیال کی تائید میں یا کسی ترکیب کی سند کے طور پر درج کیے ہیں۔

۱۔ بیدل کا شعر مجھ کو مزہ دیتا ہے:

نہ شام مارا سحر نویدی، نہ صبح مارا دم سپیدے
چو حاصل ماست نا امیدی، غبار دنیا بہ فرق عقبیٰ

۲۔ مرزا عبدالقادر بیدل خوب کہتا ہے:

رغبتِ جاہ چہ و لذتِ اسباب کدام
زیں ہوس ہا بگذر یا مگذر می گذرد

۳۔ مرزا عبدالقادر بیدل کا یہ مصرعہ گویا میری زبان سے ہے:

(عنقا سروبر گیم مپرس از فقرا ہیچ)
عالم ہمہ افسانۂ مادارد و ما ہیچ

۴۔ اے صاحب ڈھیل نہ کرو کام میں تعجیل کرو:

(من نمی گویم زیاں کن یا بہ فکرِ سود باش)
اے ز فرصت بیخبر در ہر چہ باشی زود باش

۵۔ بے فکر جو خیال میں آجائے وہ لکھ لو ورنہ فکر کی صعوبت کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ بقول مرزا عبدالقادر بیدل:

جہد ہا درخور توانائیست
ضعف یکسر فراغ می خواہد

۶۔ میرا قدرداں کون کہ میں اس پر ناز کروں:

زندگی در گردنم افتاد بیدلؔ چارہ نیست
چار باید زیستن ناچار باید زیستن

۷۔ اگر اسباب نے مساعدت کی فہوالمراد ورنہ:

(حرص قانع نیست بیدلؔ ورنہ اسباب جہاں)
آنچہ ما درکار داریم اکثری درکار نیست

۸۔ اور یہ جو قبلۂ اہلِ سخن فردوسی علیہ الرحمہ کے یہاں آیا ہے:

ممیراں کسے را وہرگز ممیر

مجاز ہے، امر بھی ہے اور تعدیہ بھی۔ متاخرین میں سے بھی عبدالقادر بیدلؔ کہتا ہے:

بمیر اے سرکش ناپاک تا یکدم بیاسائی

۹۔ اگر تقطیع شعر مساعدت کرجائے ارنی بروزن چمنی گنجائش پائے تو نعم الاتفاق ورنہ قاعدہ تصرف مقتضیِ جواز ہے۔ مرزا عبدالقادر بیدلؔ:

چو رسی بہ طور ہمت ارنی مگو و مگریز
کہ نیرزد ایں تمنا بجواب لن ترانی

اب راقم السطور کے پسندیدہ اشعار ملاحظہ ہوں جن سے غالب بھی متاثر معلوم ہوتے ہیں۔

نشاط ایں بہارم بے گل رویت چہ کار آید
تو گر آئی طرب آید ، بہشت آید ، بہار آید

تیرے پھول سے چہرے کے بغیر اس موسم بہار میں کیا لطف آئے گا۔ اے محبوب ایسے موسم میں اگر تو آجائے تو سمجھوں گا طرب آئی بہشت آئی ، بہار آئی۔ راقم السطور نے اس شعر کا منظوم ترجمہ کرنے کی سعی نا مشکور کی ہے۔

کس کام کی بہار ہے گلرو اگر نہ آئی
تو کیا آئی ، خوشی آئی ، بہشت آئی ، بہار آئی

اس شعر کو پڑھ کر آج کل سنیما میں چلنے والا مشہور گیت یاد آیا۔

''آئے ہو میری زندگی میں تم بہار بن کر'' الخ

....

شگفتن بسکہ دارد آشیاں در ہر بن مویت
تبسم گر بلب وزدی چمنہا در فشار آید

تیرے ہر بُن مو میں بے انتہا شگفتگی سمائی ہوئی ہے۔ ہونٹوں سے اگر تو مسکرا دے تو چمن کے چمن اس کا دباؤ محسوس کریں۔

شرر در سنگ می رقصد ، مے اندر تاک می جوشد
تحیر رشتہ سازست و خاموشی صدا دارد

چنگاری پتھر میں محو رقص ہے ، شراب انگور کی بیل میں جوش زن ہے ، حیرت رشتۂ ساز ہے اور خاموشی میں صدا پنہاں ہے۔

خوں بدل ، خاک بسر ، آہ بلب ، اشک بچشم
بے جمال تو چہا بر من مسکیں آمد

دل میں خون جوش مار رہا ہے، سر پر خاک اڑا رہا ہوں، لب سے آہیں بھر رہا ہوں اور آنکھوں میں آنسو تیر رہے ہیں۔ تیرے حسن و جمال کے بغیر مجھ غریب پر کیا کیا بلائیں ہیں جو نازل نہیں ہوئیں:

بحرف آمدی و زخم کہنہ ام نوشد
بحیرتم چہ نمک بود گفت گوئے ترا

تو نے بات کیا کرنی شروع کی کہ میرا پرانا زخم ہرا ہوگیا۔ حیرت ہے تیری گفتگو میں کس قدر نمک بھرا تھا۔

عیاں نہ شد زکجا مست جلوہ می آئی
فدائے طرز خرامت زخویش رفتنِ ما

جانے تو کہاں سے مست جلوہ چلی آ رہی ہے؟ تیری طرز خرام پر میری بیخودی قربان۔

علاجِ زخم دل از گریہ کے ممکن بود بیدل
بشبنم بخیہ نتواں کرد چاک دامن گل را

زخم دل کا علاج آہ وزاری سے کب ممکن ہے۔ شبنم سے چاک دامن گل کو سیا نہیں جا سکتا ہے۔

بیدل نے محبوب کی چشم وابرو، زلف ورخسار دہن وذقن وغیرہ اعضاء وجوارح پر ایسے خوبصورت اشعار کہے ہیں جن میں بہار کی سی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔

اے چشم تو مہمیز جنوں وحشی رم را
ابروئے تو معراج دگر پایۂ جم را
گیسوئے تو دامیست کہ تحریر خیالش
از نال بزنجیر کشیدست قلم را
باایں قد و عارض بچمن گر بخرامی
گل تاج بخاک افگند و سرو علم را
اسرار دہانت بتامل نہ تواں یافت
از فکر کسے پے نبرد راہ عدم را

عمریست کہ در عالم سودائے محبت
از نالہ من زرخ بلنداست الم را
فردوس دل اسیر خیال تو بودنست
عید نگاہ چشم برویت کشودنست

تیرے تصور میں مگن رہنا دل کے لئے فردوس کی حیثیت رکھتا ہے اور تیرے چہرے کو دیکھتے رہنا آنکھ کے لئے عید کے درجے میں ہے۔

قدح بدست خمستان شوق کیست بہار
کہ گل بچہرہ ساغر کشیدہ می ماند

موسم بہار آج ہاتھ میں قدح لئے کس کے شوق کا خمستان بنا ہوا ہے؟ کیونکہ پھول اپنے چہرے پر ساغر کی تصویر کھینچتا ہوا لگ رہا ہے۔

بہر کجا ناز سر برآرد ، نیاز ہم پایہ کم ندارد
تو و خرامی و صد تغافل، من و نگاہی و صد تمنا

ناز جہاں سر اٹھاتا ہے نیاز بھی اس سے کسی طرح پیچھے نہیں رہتا۔ تو ہے، تیرا خرام ہے اور سیکڑوں تغافل (جان بوجھ کر محبوب سے غفلت برتنا) میں ہوں، نگاہ ہے اور سیکڑوں تمنائیں دل میں لئے ہوں۔

ہر چند دریں گلشن ہر سو گل خود روئیست
از خون شہیدانت در رنگ حنا بوئیست

اس گلشن میں گو کہ ہر طرف خودرو پھول اگے ہوئے ہیں۔ پر تیرے شہیدان عشق کے خون کی بو رنگ حنا میں موجود ہے۔

خندہ لبریز ملاحت ، جلوہ مالا مال حسن
نالہ سرشار جفا ، غمزہ مخمور عتاب

تیری مسکراہٹ میں ملاحت بھری ہے، تیرا جلوہ حسن و جمال سے مالا مال ہے۔ میرا نالہ ظلم و جبر سے جاں بلب ہے تیرا غمزہ عتاب سے مست ہے۔

غارت گر بہار نشاطم شگفتگیست
تاغنچہ بود دل چمن درہ خیال داشت

شگفتگی میری بہارنشاط کوتباہ کرگئی۔ دل جب تک کلی کی طرح بستہ تھا تو اس کے صفحۂ خیال پر چمن براجمان تھا۔

آمدم تا صد چمن بر جلوہ نازاں بینمت
نشہ در سر ، مے بساغر ، گل بداماں بینمت

میں سیکڑوں چمن دربغل آیا ہوں کہ تجھے جلوہ حسن پر نازاں دیکھوں، تیرے سر میں نشہ کی کیفیت، تیرے جام میں شراب بھری اور دامن میں پھول بھرا دیکھوں۔

از برگ گل بہ معنی نکہت رسیدہ ایم
مارا بہ جلوہ ہائے تو کرد آشنا نقاب

پھول کی پتی کو دیکھ کر اس کی خوشبو تک میری رسائی ہوئی ہے، تیرے نقاب نے مجھ کو تیرے جلوہ سے آشنا کردیا۔

تماشائے بہارے کردہ ام بیدلؔ کہ از یادش
نگہ در دیدہ ہا انگشت حیرت درد ہاں دارد

بیدلؔ میں نے ایسی بہار کا تماشا دیکھا ہے کہ اس کی یاد سے نگاہ آنکھوں میں حیرت سے انگشت بدنداں ہے۔

امروز نوبہارست ، ساغر کشاں بیائید
گل جوشِ بادہ دارد تا گلستاں بیائید

آج تازہ بہار کا موسم ہے، میکشو آؤ پھول میں بھی شراب کی سی ابال ہے تاکہ گلستاں کی سیر کرو۔

کہ رسد بحال زارم کہ شود بغم دوچارم
کہ بکوئے بیکسیہا ہمہ کس گذر ندارد

میرے حال زار تک کس کی رسائی ہوسکتی ہے کہ اس کو میرے غم کا علم ہو۔ کیونکہ بے کسی کی گلی میں سب کا گذر نہیں ہوتا ہے۔

تو و تمکین و تغافل ، من و بے صبریِ درد
نہ ترا یاد مروت نہ مرا دل بخشد

زشمع باعث سوز وگداز پرسیدم
بگریہ گفت مپرس از ندامتِ ایجاد

بہ کہ جز بر ورقِ گل نہ نشیند شبنم
بیشتر دست نگارین بتاں جائے دلست

عمریست وفا ممتحنِ ناز ونیاز است
نے تیغ زدستِ تو جدا شدنہ سر ازما

دل صیدِ شوق و دیدہ اسیرِ خیال تست
ویرانہ کشورِ یکہ بہ ایں بندوبست نیست

نے صبر بدل ماند ونہ حسرت بہ نظر ہا
اے سیلِ دل و برق نظر ایں چہ خرامست

بہ ہر طرف نگرم دود دل پرافشانست
کدام سوختہ جاں زیں وادیِ خراب گذشت

اے دل ابرام مکن چشمت اگر جاں طلبد
از مروت مگذر خاطر بیماری ہست

من و سودائے خوباں ، زاہد و اندیشۂ رضواں
دریں حسرت سرا ہر کس سری دارد سری دارد

☆☆☆

باب چہارم

غالب اور بیدل

کے

وہ ہم معنی وہم مضمون اشعار جن میں غالب بیدل کے
خیال کے ترجمان نظر آتے ہیں

یا

اس سے مختلف نظریہ پیش کرتے ہیں

بردہ انداز موج گوہر پیچ وتاب اشتراک
مصرع ما را ز تضمین فرد پیدا کردہ ان
بیدلؔ

طرز بیدل میں ریختہ لکھنا
اسد اللہ خاں قیامت ہے
غالبؔ

اب منتخب دیوان غالب سے غالب و بیدل کے ان ہم معنیٰ وہم مضمون اشعار کی مثالیں دی جاتی ہیں جن میں غالب، بیدل کے خیال کے ترجمان یا اس سے مختلف نظریہ پیش کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

☆☆☆

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج — خیالِ زندگی دردیست بیدل
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک — کہ غیر از مرگ درمانی ندارد

غالبؔ — بیدلؔ

بلندیٔ سر بجیب پستی شد اعتبار جہان ہستی
کہ شمع ایں بزم تا سحر گاہ زندہ دارد مزار خودرا

بیدلؔ

غالب کا مطلب واضح ہے کہ انسان کی زندگی رنج و غم اور حزن والم کا پوٹ ہے اور ایسی صورت میں غم ہستی کا علاج موت کے سوا کسی اور طرح سے ممکن نہیں۔ جس طرح شمع سحر ہونے تک ہر رنگ میں جلتی ہے اسی طرح انسان موت تک ہر طرح دکھ سکھ میں زندگی گذارتا ہے۔ بیدل کا خیال ہے کہ زندگی کا تصور ہی سراپا درد ہے جس کا علاج موت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ دوسرے شعر میں کہتا ہے جہان ہستی کا کل اعتبار بس اسی قدر ہے کہ ابھی سر اٹھایا نہیں تھا کہ پستی میں چلے گئے ،اس بزم ہستی کی شمع صبح تک اپنے مزار کو زندہ کئے رکھتی ہے۔ یہاں بیدل کے دو اشعار کے مفہوم کو غالب نے ایک شعر میں ادا کیا ہے۔ لیکن دوسرے مصرعے میں وہ بیدل کے مفہوم کو پوری طرح ادا نہ کر سکا۔ شمع اور مزار کی باہمی مناسبت کے ساتھ ملحوظ رہے کہ ہستی اپنے انجام کے لحاظ سے مزار ہے۔ ٹھیک جس طرح شمع پگھلتے پگھلتے صبح تک اپنے مزار کی طرف رواں دواں ہے اسی طرح انسانی ہستی بھی اپنے آخری انجام مزار کی طرف رواں دواں ہے کہ ابھی سر اٹھایا بھی نہ تھا کہ پستی میں پہنچ

گئے ۔ غالب نے اسے ہر رنگ میں جلنے سے تعبیر کیا ہے۔ظاہر ہے اونچ نیچ کے ساتھ زندگی گزارنے کو اس نے ہر رنگ سے ادا کیا ہے۔ بیدل نے شمع کی اس خصوصیت کا ایک شعر میں اس طرح ذکر کیا ہے:

اضطراب و طپش و سوختن و داغ شدن
آنچہ دارد پرِ پروانہ ہماں دارد شمع

بے کلی، بے تابی، خودسوزی، داغ باشی یہ خصوصیات پرِ پروانہ کی ہیں اور یہی شمع کی ہیں۔ حالی نے لکھا ہے: اس قسم کی نادر و بدیع تشبیہات سے مرزا کے دونوں دیوان اردو و فارسی بھرے ہوئے ہیں۔ (۸۴) جبکہ موازنہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا سرچشمہ بیدل کا کلام ہے۔

اس نزاکت کا برا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا	از بس قماش دامن دلدار نازکست
ہاتھ آئیں تو انہیں ہاتھ لگائے نہ بنے	دستم اگر بکار رود کار نازکست
غالبؔ	بیدلؔ

بیدل کا خیال ہے کہ دامن دلدار کا کپڑا اتنا زیادہ نازک ہے کہ اول تو وہ ہاتھ نہیں آتا اور کسی طرح ہاتھ لگا بھی تو چھوتے ہوئے ڈر لگ رہا ہے کہ کہیں نزاکت کی وجہ سے وہ تار تار نہ ہو جائے ۔ یہاں بیدل نے محبوب کی نزاکت لباسی کو بیان کیا ہے جبکہ غالب نے معشوق کی نزاکت جسمی یا مزاجی کو بیان کیا ہے کہ وہ میرے حال پر مہربان ہے، اس کے باوجود نزاکت کا یہ عالم ہے کہ اسے ہاتھ لگائے نہیں بنتا۔ مجنوں گورکھپوری کہتے ہیں۔ غالب کا شعر بڑی پست سطح سے کہا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ (۸۵) ڈاکٹر یوسف حسین کے الفاظ میں غالب یہ بھی چاہتے تھے کہ ان کا معشوق توانا اور صحت مند ہو کہ جب وصل کی نوبت آئے تو اس کی نزاکت اور نقاہت مطلب برآری میں رکاوٹ نہ بن جائے ۔ (۸۶) اس طرح وہ اسے غالب کا ایک اچھوتا خیال قرار دینے کی کوشش میں لگے ہیں ۔ جب کہ موازنہ سے واضح ہے کہ اس خیال کا سرچشمہ بیدل کا کلام ہے ۔غالب نے نہ صرف اردو میں بلکہ فارسی میں بھی ایک پوری غزل اسی زمین اور بحر میں کہی ہے، جو بہرحال فارسی گوئی میں بھی بیدل سے ان کے تاثر کو واضح کرتی ہے۔ مطلع یہ ہے:

ما لاغریم گر کمریار نازکست
فرقیست درمیانہ کہ بسیار نازکست (۸۷)

گرنی تھی ہم پہ برق تجلی نہ طور پر — مے در خور ہر قدح دیدہ اند
دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر — زیک دیگر ایں ہر دو جوشیدہ اند
غالبؔ — بیدلؔ

غالب کے خیال کو اچھوتا قرار دے کر حالی لکھتے ہیں: اس شعر میں اس آیت کے مضمون کی طرف اشارہ ہے جس میں ارشاد ہوا ہے کہ ہم نے امانت کو زمین و آسمان اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا مگر وہ اس کے متحمل نہ ہوئے اور ڈر گئے اور انسان نے اس کو اٹھالیا۔ شاعر کہتا ہے کہ برق تجلی کے گرنے کے ہم مستحق تھے نہ کوہ طور کیونکہ شراب خوار کا ظرف دیکھ کر اس کے موافق اس کو شراب دی جاتی ہے۔ پس کوہ طور جو منجملہ جمادات کے ہے وہ کیونکر تجلی الٰہی کا متحمل ہو سکتا ہے۔ یہ خیال بھی مع اس تمثیل کے جو اس میں بیان ہوئی ہے بالکل اچھوتا خیال معلوم ہوتا ہے۔ (۸۸) جبکہ غالب کا دوسرا مصرعہ بیدل کے پہلے مصرعہ کا لفظی ترجمہ ہے، یہ ترجمہ واضح کرتا ہے کہ غالب کے خیال کا سرچشمہ کیا ہے۔؟ یہ شعر بیدل کی مثنوی محیط اعظم میں ''کیفیت نقص وکمال'' کے تحت اشعار سے ماخوذ ہے۔ جن میں کوہ طور پر موسیٰ کی تجلی الٰہی کو دکھانے کی درخواست پر خدا کی طرف سے جو جواب ملا اور جو واقعہ پیش آیا اس کا ذکر ہے۔ اس کے دوسرے اشعار یوں ہیں:

ازیں جاست کز شور مستی کلیم — چو پائے ادب بر گرفت از گلیم
ز دیر مغاں لن ترانی شنید — کہ ہر کام نتواں ایں مے چشید
مے درخور ہر قدح دیدہ اند — زیک دیگر ایں ہر دو جوشیدہ اند (۸۹)

یعنی جب موسیٰ نے مئے وحدت کے نشہ سے سرشار ہو کر پائے ادب اپنی کملی سے باہر نکالا اور خدا سے درخواست کی: خدایا اپنا جلوہ دکھا۔ تو دیر مغاں یعنی آستانہ خداوندی سے ''نہیں دیکھ سکتے'' کی آواز سنی۔ کیونکہ ہر حلق اس مزہ کو چکھنے کا یارا نہیں رکھتا۔ شراب پیالے کی وسعت کو دیکھ کر ہی دی جاتی ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ ۱۸۱۵ء میں یہ مثنوی غالب کے مطالعہ میں تھی۔ اس لئے یقیناً اس کے اس خیال کا سرچشمہ بیدل کے یہ اشعار ہیں۔

غالب نے فارسی میں بھی اسی کے قریب ایک شعر کہا ہے:

ہر رشحہ باندازۂ ہر حوصلہ ریزند　　میخانہ توفیق خم و جام ندارند

میری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی　　ز تعمیر ہر چیز یابی نشاں
ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا　　شکستے است ساز ہیولائے آں
غالبؔ　　بیدلؔ

اپنے اس شعر کی خود غالب نے اس طرح وضاحت کی ہے: پھول کے درخت یا غلہ جو کچھ بویا جاتا ہے، دہقان کو جوتنے بونے، پانی دینے میں مشقت کرنی پڑتی ہے اور ریاضت میں لہو گرم ہو جاتا ہے۔ مقصود شاعر کا یہ ہے کہ وہ وجود محض رنج وعنا ہے۔ مزارع کا وہ لہو جو کشت وکار میں گرم ہوا ہے وہی لالے کی راحت کے خرمن کا برق ہے۔ حاصل موجودیت داغ اور داغ مخالف راحت ہے اور صورت رنج۔''(۹۰)

بیدل کا خیال ہے کہ جہاں کہیں کسی چیز میں تعمیر اور آبادی کی کوئی علامت نظر آتی ہے اس کے ساز ہیولیٰ سے شکست وریخت اور ٹوٹ پھوٹ کی آواز بھی سنائی دیتی ہے۔ غالب کا پہلا مصرعہ بیدل کے پورے شعر کا ترجمہ ہے۔ یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کے خیال کا سرچشمہ بیدل کا کلام ہے بلکہ لفظ ''تعمیر'' اور ''ہیولیٰ'' بھی اس نے بیدل سے مستعار لیا ہے۔ البتہ دوسرے مصرعے میں ایک نئی تشبیہ کے ذریعہ اس میں مزید جان ڈال دی ہے۔

سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں　　خلقے بہ عدم دود دل و داغ جگر برد
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہوگئیں　　خاک ہمہ صرف گل و سنبل شدہ باشد
غالبؔ　　بیدلؔ

فلک در خاک پنہاں کرد یکسر صورت آدم
مصور کردہ می خواہد ازمردم گیا اینجا
بیدلؔ

غالب کا شعر صاف ہے لیکن اس میں بیدل کے دو اشعار کا مفہوم ایک شعر میں سمانے کی کوشش کی گئی ہے۔ بیدل کا خیال ہے کچھ لوگوں نے اپنے ہمراہ دود دل اور داغ جگر لے کر عدم کی راہ لی۔ ان کی مٹی اب گل و سنبل میں بدل چکی ہے۔ دوسرے شعر میں یہ خیال ہے کہ آسمان نے انسانی صورتوں کو سراسر سپرد خاک کر دیا اور اب ان کو گھاس پھونس اور پھل پھول کی شکل میں نمایاں کرنا چاہتا ہے۔ یہاں بیدل کے خیال کو اردو منظوم ترجمہ کی شکل دینے کی غالب کی کوشش نہایت کامیاب ہے۔ اگرچہ بعض نکتے بیان سے رہ گئے ہیں۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا
غالبؔ

بہ ہستی تو امیداست ہیستی مارا
کہ گفتہ اند اگر ہیچ نیست اللہ است
بیدلؔ

غبار ما بصحرائے عدم بال دگر می زد
فضولی از کجا انداخت یارب از کجا مارا
بیدلؔ

یہاں بھی غالب نے بیدل کے دو اشعار کا خیال ایک شعر میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ بیدل کا خیال ہے اے اللہ تیری ہستی اور وجود کے یقین کی وجہ سے مجھے اپنی نیستی اور عدم کی امید ہے۔ کیونکہ مشہور کہاوت ہے اگر کوئی نہیں ہے تو اللہ ہے۔ دوسرے شعر کا مفہوم یہ ہے کہ ہماری گرد تو صحرائے عدم میں اڑ رہی تھی یعنی ہم کچھ نہیں تھے۔ فضولی یعنی ہمارے وجود نے خدایا ہمیں کہاں سے کہاں لا کر گرا دیا۔ غالب کا کمال یہ ہے کہ اس نے دونوں خیالوں کو ایک شعر میں نہایت خوبصورتی سے بیان کر دیا۔ یہ اس کی انفرادیت ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ غالب کے کلام پر بیدل کی چھاپ بھی واضح ہے۔

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا
غالبؔ

یاد آزادیست گلزار اسیران قفس
زندگی گر عشرتے دارد امید مردن است
بیدلؔ

حالی اسے بھی غالب کا ایک انوکھا خیال کہتے ہوئے لکھتے ہیں: نشاط کے معنی امنگ کے ہیں۔ نشاط کار یعنی کام کرنے کی امنگ، یہ بھی جہاں تک کہ معلوم ہے ایک نیا خیال ہے اور نرا خیال ہی نہیں بلکہ فیکٹ ہے کیونکہ دنیا میں جو کچھ چہل پہل ہے وہ صرف اسی یقین کی بدولت ہے کہ یہاں رہنے کا زمانہ بہت تھوڑا ہے۔ یہ انسان کی ایک طبعی خصلت معلوم ہوتی ہے کہ جس قدر فرصت قلیل ہوتی ہے اسی قدر زیادہ سرگرمی سے کام کو سرانجام کرتا ہے۔ جس قدر زیادہ مہلت ملتی ہے اسی قدر کام میں تاخیر و سہل انگاری زیادہ کرتا ہے۔ (۹۱) لیکن موازنہ سے معلوم ہوا کہ اس خیال کا سرچشمہ بیدل کا کلام ہے۔ بیدل کا خیال ہے کہ قیدیوں کے لئے آزادی کی یاد بھی چمن سے کم حیثیت نہیں رکھتی۔ زندگی میں اگر کوئی لطف ہے تو وہ موت کی توقع ہے۔ واضح رہے کہ غالب کا دوسرا مصرعہ ''نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا'' بیدل کے دوسرے مصرعہ ''زندگی گر عشرتے دارد امید مردن است'' کا ترجمہ ہے۔ اور اس میں ایک نکتہ کی آمیزش کر کے نہایت خوبصورتی سے اس مضمون کو ادا کر دیا ہے۔ جس سے اس میں جان آ گئی۔ غالب کے اس شعر کا موازنہ بیدل کے ایک اور شعر سے بھی کیا جاسکتا ہے۔

عالمی در امتحانگاہ ہوس تگ می زند

گر نہ ای قانع تو ہم بیتاب ایں و آں بر آ

یہاں میرے ناقص خیال میں ہوس عشق کے مقابلے پر ہے۔ عشق اغراض کی آلودگیوں سے پاک محبت کا نام ہے۔ جبکہ ہوس نفسانی خواہشات کی تسکین کا نام ہے۔ اس فرق کو سرمد شہید یوں بیان کرتے ہیں۔

سرمد غم عشق بوالہوس را نہ دہند

سوزِ غمِ پروانہ مگس را نہ دہند

سرمد غم عشق بوالہوسوں کو نہیں دیتے۔ پروانہ کے غم عشق کی سوزش مکھی کو نہیں دیتے۔ عشق پروانے کا اور ہوس مکھی کا بیان کر کے سرمد نے دونوں کے درمیان فرق کو واضح کیا ہے۔ اس پس منظر میں ہوس کی نشاط انگیزیاں یہ ہیں کہ انسان اچھا کھانے، اچھا پہننے، زندگی کی تمام آسائشیں حاصل

کرنے کے علاوہ سیکڑوں طرح کی نفسانی خواہشات کی تکمیل کرنے کے لئے اپنی تگ و دو جاری رکھے ہوئے ہے۔ دوسرے مصرعے میں کہتا ہے چونکہ انسان کو مشاہدے سے معلوم ہے کہ زندگی کا سلسلہ ایک نہ ایک دن ختم ہونا ہے اس لئے وہ زندگی کے لمحات سے زیادہ سے زیادہ لطف اندوز ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ بیدل کہتے ہیں ایک دنیا ہوس کی امتحان گاہ میں تگ و دو کر رہی ہے۔ اگر تمہارے اندر بھی قناعت کی صفت نہیں ہے تو تم بھی ادھر ادھر کی ہوس کی تکمیل میں بے قرار رہو۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کا پہلا مصرع ''ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا'' بیدل کے پہلے مصرعہ ''عالمی در امتحان گاہِ ہوس تگ می زند'' کا آزاد ترجمہ ہے۔ اسی کے قریب بیدل کا ایک دوسرا شعر ملاحظہ ہو:

بہوس چوں پرِ طاؤس چمن ہا دارم
داغ صد رنگِ خیالم ، چہ قدر بیکارم

ہوس کی بدولت پرِ طاؤس کی طرح آرزوؤں کے چمن کے چمن ہماری آغوش میں ہیں، طرح طرح کے سیکڑوں خیالات میں ہم گرفتار ہیں۔ کس قدر بیکار ہیں۔

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود	ہمہ غیب است ، شہود اینجا نیست
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں	جملہ اخفاست ، نمود اینجا نیست
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کا پہلا مصرعہ بیدل کے پہلے مصرعے کا ترجمہ ہے۔ دوسرے مصرعہ میں ایک نئی بات پیدا کی ہے جبکہ بیدل کا دوسرا مصرعہ پہلے مصرعہ کا تکرار ہے۔ غالب کے نکتے کی وضاحت حالی کے الفاظ میں ملاحظہ ہو: سالک کو تمام موجودات عالم میں حق ہی حق نظر آئے اس کو شہود کہتے ہیں۔ اور غیب الغیب سے مراد مرتبہ احدیت ذات ہے جو عقل و ادراک و بصر و بصیرت سے وراء الوراء ہے۔ کہتا ہے کہ جس کو ہم شہود سمجھے ہوئے ہیں وہ درحقیقت غیب الغیب ہے۔ اور اس کو غلطی سے شہود سمجھنے میں ہماری ایسی مثال ہے جیسے کوئی خواب میں دیکھے کہ میں جاگتا ہوں پس وہ اپنے تئیں بیدار سمجھتا ہے مگر فی الحقیقت وہ ابھی خواب ہی میں ہے یہ مثال بالکل نئی ہے اور اس سے بہتر

اس مضمون کے لئے مثال نہیں ہے۔ (۹۲) یہی غالب کی انفرادیت ہے ورنہ اس خیال کا سرچشمہ بیدل کا شعر ہے۔

جاتا ہوں داغ حسرتِ ہستی لئے ہوئے　　داغِ محرومی دیدار ز محفل رفتیم
ہوں شمع کشتہ در خور محفل نہیں رہا　　برسانید بہ آئینہ سلامِ دل ما
غالبؔ　　بیدلؔ

چساں آید ز شمع کشتہ بیدل محفل آرائی
زباں در سرمہ خوابیدہ است و من تقریر می خواہم
بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ حسرت ہستی یعنی زندگی کی مزید آرزو کا داغ یا فانی ہستی کے افسوس کا داغ لے کر میں اس دنیا سے رخصت ہوتا ہوں کیونکہ میری حیثیت ایک بجھی ہوئی شمع کی طرح ہے جو محفل میں رہنے کے لائق نہیں ہے۔ بیدل کہتے ہیں محبوب کے دیدار سے محرومی کا داغ لے کر ہم محفل سے رخصت ہو رہے ہیں اس کے باوجود میرے دل کا سلام محبوب کے آئینہ دل تک پہنچا دو۔ اب اگر غور سے دیکھا جائے تو غالب کا مصرعہ ''جاتا ہوں داغ حسرت ہستی لئے ہوئے ''بیدل کے مصرعہ ''داغ محرومی دیدار ز محفل رفتیم'' کا آزاد ترجمہ ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ غالب نے داغ محرومی دیدار کو داغ حسرت ہستی سے بدل دیا ہے۔ دوسرے شعر میں بیدل کہتے ہیں شمع کشتہ سے محفل کی آرائش کیسے ہو سکتی ہے۔ زبان سرمہ میں محو خواب ہے اور میں بولنا چاہتا ہوں ،مطلب یہ ہے کہ سرمہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اگر زبان میں پڑ جائے تو گویائی بند ہو جاتی ہے، اب دیکھا جائے تو غالب کا دوسرا مصرعہ ''ہوں شمع کشتہ در خور محفل نہیں رہا'' بیدل کے مصرعہ ''چساں آید ز شمع کشتہ محفل آرائی'' کا ترجمہ ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ بیدل کے دو شعروں کو سامنے رکھ کر غالب نے یہ شعر کہا ہے۔ اسی کے قریب بیدل کا ایک اور شعر ہے:

سراغِ رنگ ہستی در طلسمِ خود نمی یابم
دریں محفل چو شمع کشتہ داغ رفتنِ خویشم

اے دلِ ناعاقبت اندیش ضبطِ شوق کر	برق جلوۂ حسنش را کراست تابِ نگاہ
کون لاسکتا ہے تابِ جلوۂ دیدار دوست	غنیمت است اگر سیر مہر و ماہ کنید
غالبؔ	بیدلؔ

دل کو ناعاقبت اندیش کہنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب نے حضرت موسیٰ کے کوہ طور پر تجلی الٰہی دیکھنے کی درخواست کو پیش نظر رکھا ہے۔ موسیٰ نے کوہ طور پر اللہ سے درخواست کی تھی کہ اپنا جلوہ دکھا۔ اللہ نے فرمایا میری تجلی کو دیکھنے کی تمھاری آنکھوں میں صلاحیت نہیں ہے۔ اس واقعہ کی طرف اشارہ کر کے غالب کہتے ہیں کہ موسیٰ جب جلوہ یار کی تاب نہ لا سکے تو تیری یا کسی اور کی کیا مجال ہے کہ وہ اس کی تاب لا سکے۔ بیدل کہتے ہیں اس کے جلوہ حسن کے برق کو دیکھنے کی کس کے اندر سکت ہے۔ اس کے بجائے اگر سورج اور چاند کی سیر کرو تو زیادہ بہتر ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کا مصرع ''کون لاسکتا ہے تابِ جلوۂ دیدار دوست'' بیدل کے مصرع ''برق جلوۂ حسنش را کراست تابِ نگاہ'' کا لفظی ترجمہ معلوم ہوگا۔ البتہ دوسرے مصرع میں دونوں الگ ہو گئے۔

اس موازنے سے واضح ہے کہ غالب کے اس شعر کا سر چشمہ بیدل کا درج بالا شعر رہا ہے البتہ غالب نے اپنی انفرادیت کو یا بہتر الفاظ میں اپنی شاعرانہ شناخت کو نبھانے کی خاطر دوسرے مصرع میں اپنا خیال بدل دیا ہے۔

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کروگے لیکن	سر بازی عشاق بہ بزم تو تماشاست
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک	ہر چند نہ باشد بہ میاں پائے تغافل
غالبؔ	بیدلؔ

معشوق سے خطاب کرتے ہوئے غالب کہتے ہیں کہ ہم نے مانا کہ میرے عاشقانہ جذبات وواردات کا پاس لحاظ تم کو مطلوب ہے، اور تم دیدہ ودانستہ اس سے غفلت نہ کروگے لیکن جب تک تم کو میری بے قراری کی خبر ہوگی میں سپرد خاک ہو چکا ہوں گا۔ بیدل کہتے ہیں گو کہ تم تغافل نہ کروگے، تاہم تمہاری بزم میں عاشقوں کی سربازی اور فدا کاری ایک کھیل تماشا کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس شعر میں غالب کا مصرعہ ''ہم نے مانا کہ تغافل نہ کروگے لیکن'' بیدل کے

مصرعہ ''ہر چند نباشد بمیاں پائے تغافل'' کا بالکل لفظی ترجمہ ہے۔ لیکن دوسرے مصرعہ میں بیدل کا خیال ہے کہ اے معشوق تیری بزم میں عاشقوں کی سربازی روزمرہ کا معمول ہے، چاہے تم تغافل کرو یا نہ کرو، جبکہ غالب کا خیال ہے کہ جب تک میری نزاکت حال کی خبر تم تک پہونچے گی میرا وصال ہو چکا ہوگا۔

بیدل !من و بیکاری و معشوق تراشی	دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے دن و رات
جز شوق برہمن صنمی نیست در اینجا	بیٹھے رہیں تصور جاناں کئے ہوئے
بیدلؔ	غالبؔ

غالب کا یہ شعر سادگی و پرکاری کی بہترین مثال ہے جس کے سمجھنے کے لئے ذہن کو زور لگانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا کے دھندوں میں پھنس کر اس قدر عدیم الفرصت ہو گیا ہوں کہ کبھی کبھی اس سے اکتا کر دل فرصت کے ان اوقات کا متمنی ہونے لگتا ہے جب محبوب کے تصور میں کھو جایا کروں۔ بیدل کہتا ہے کہ مجھ کو تو بیکار بیٹھ کر معشوق تراشی سے سروکار ہے۔ یہاں برہمن کے شوق کے سوا کوئی اور بت نہیں ہے۔ برہمن کا شوق یہ ہے کہ بت کو بنا سنوار کر اس کا پوجا پاٹھ کرے اور اس کے دھیان گمان میں لگا رہے۔ میرا بھی عین یہی حال ہے کہ ہر وقت عالم بیکاری میں بیٹھا معشوق تراشی کرتا رہتا ہوں اور اس کے تصور میں گم وکھویا ہوا رہتا ہوں۔ محبوب کے تصور میں گم ہونے کی بات دونوں نے کہی ہے، اس فرق کے ساتھ کہ غالب نے جس چیز کی تمنا کی ہے، بیدل کو وہ چیز ہر وقت حاصل ہے۔

در ساز وفا ناخن تدبیر دگر نیست	تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد
فرہاد ہماں برسر خود تیشہ دواند	سرگشتۂ خمار رسوم و قیود تھا
بیدلؔ	غالبؔ

فرہاد، جو شیریں کا عاشق اور خسرو پرویز کا رقیب تھا، معشوق کی فرمائش پر پہاڑ کھود کر نہر نکالنے میں مصروف تھا کہ اس کو شیریں کی موت کی خبر ملی تو اس نے اسی تیشے سے جس سے پہاڑ کھود

رہا تھا اپنا سر پھوڑ لیا۔ اس واقعہ کی طرف اشارہ کر کے غالب کہتے ہیں کہ اس جانکاہ صدمہ کی تاب نہ لا کر اسے مر جانا تھا، یہ کیا کہ تیشے سے خود کشی کر کے اپنی جان دینے کی پرانی روایت کو دہرا دیا۔ بیدل کہتا ہے فرہاد کا تیشے سے خود کشی کرنا اس بنا پر ہے کہ ساز وفا کو بجانے کیلئے ناخن تدبیر کے پاس اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں رہ گیا تھا کہ اسی تیشے سے اپنا سر پھوڑ لے۔ مطلب یہ ہے کہ وفاداری کا تقاضا تھا کہ ہر حال میں اسے نبھاتا، اور معشوق کی موت کی خبر سن کر اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا۔ اس کے لئے خود اپنے ہی تیشے سے اپنا سر پھوڑ لینے کے سوا کوئی اور راستہ اس کے پاس نہ تھا جسے وہ انجام دیتا۔ مضمون ایک ہے اس فرق کے ساتھ کہ غالب کے نزدیک فرہاد کی خود کشی رسم پرستی پر مبنی تھی جبکہ بیدل کے نزدیک وہ وفاداری کا تقاضا تھا اور یہ بات دل سے زیادہ لگتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ دونوں کے کلام کا موازنہ کرنے سے واضح ہوتا ہے غالب کے خیال کا محرک بیدل ہی کا شعر تھا۔

غالب برا نہ مان گر تجھ کو برا کہے کوئی	سخت دشوارست منظور خلائق زیستن
ایسا بھی ہے کوئی جسے اچھا کہیں سبھی	با ہمہ زشتی اگر در پیش خود خوبم، بس است
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کا خیال ہے کہ اگر کوئی تجھے برا کہے تو اس کا برا نہ مان کیونکہ دنیا میں ایسے لوگ نہیں ہیں جن کی سب لوگ تعریف کیا کریں۔ بیدل کا خیال ہے دنیا میں سب لوگوں کا منظور نظر اور پسندیدہ ہو کر رہنا انتہائی مشکل کام ہے۔ یہ وہی نکتہ ہے جس کو غالب نے دوسرے مصرعہ میں بیان کیا ہے۔ لیکن نتیجہ اخذ کرنے میں غالب نے بیدل سے اختلاف کیا ہے۔ بیدل کا خیال ہے کہ ایسی صورت میں ساری خرابیوں کے باوجود اگر تم خود اپنی نظر میں اچھے ہو تو یہ کافی ہے کسی قسم کا دردسر مول لینے کی ضرورت نہیں۔ غالب نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اگر کوئی برا کہے تو اس کا برا مت مانو، یہاں غالب کی بات بیدل سے زیادہ اپیل کرتی ہے۔ کیونکہ ساری خرابیوں کے باوجود اپنی نظر میں اچھا ہونا کوئی معقول بات نہیں ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کا آئینہ ہوتا ہے، اس لئے اس کی خرابی وخوبی دوسروں کو نظر آسکتی ہے خود اسے نظر نہیں آسکتی۔

لیتا ہوں مکتبِ غم دل میں سبق ہنوز
لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا
غالبؔ

اے دل دیوانہ کارت با غم عشق اوفتاد
در چہ مزرعہ کشت ذوق سینہ چاکی دانہ را
بیدلؔ

غالب کا خیال ہے کہ غم دل جو عبارت ہے غم عشق سے اس کے مکتب میں اب تک یہی سبق دہراتا رہا ہوں کہ دل جو کبھی غم عشق کا مہبط تھا وہ اب ہاتھ سے جاتا رہا۔ جبکہ بیدل کہتا ہے دل دیوانہ! تیرا سابقہ غم عشق سے پڑا ہے۔ بھلا دیکھ تو ذوق سینہ چاکی نے دانے کو کس کھیت میں بویا ہے۔ ظاہر ہے دانہ سے مراد غم عشق ہے، اور کھیت سے مراد دل ہے۔ پس از راہ تعجب کہتا ہے ذوق سینہ چاکی نے دانۂ غم عشق کو دل کے کھیت میں چھڑک دیا۔ اس خیال میں کہ دل کا غم عشق سے سابقہ ہے غالب اور بیدل دونوں مشترک ہیں۔ لیکن غالب اس کی آمد و رفت کا سبق دہراتے ہیں جبکہ بیدل ذوق سینہ چاکی کی مزرعۂ دل میں دانہ افشانی کی کیفیت پر انگشت بدنداں ہیں، یا اس کو اچھی نظر سے دیکھتے ہیں کہ حق بحقدار رسید۔

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا
غالبؔ

گر نہ باشد بے تمیزیہا مآل کار عشق
کوہکن بر صورتِ شیریں نراند تیشہ را
بیدلؔ

غالب کا خیال ہے کہ پھول کھلا ہوا ہے، بلبل عاشقانہ انداز سے اس کی طرف مائل ہو کر ترانہ سازی کر رہی ہے، پھول اس کے عاشقانہ جذبات کا جواب دینے کے بجائے شگفتہ ہو کر اس پر قہقہے لگا رہا ہے۔ اب عقل کا تقاضا تھا کہ جو معشوق عاشق کے جذبات کو ٹھیس پہنچائے اسے چھوڑ دیا جائے، مگر بلبل نے اسے چھوڑا نہیں اس کا مطلب یہ ہوا کہ عشق دماغی خلل کا نام ہے۔ گل و بلبل کے درمیان یکطرفہ عاشقانہ رویے کا ذکر اکثر شاعروں نے کیا ہے، غالب اس سے یہ نکتہ اخذ کرتے ہیں کہ عشق دماغی خلل کا نام ہے۔ بیدل نے بھی اسی خیال کا اظہار کیا ہے کہتے ہیں اگر عشق کا انجام بے تمیزی اور عقل سے دوری نہ ہوتا تو کوہکن شیریں کی صورت پر عاشق ہو کر اپنے سر پر تیشہ نہ چلاتا، مطلب یہ ہے کہ پہاڑ کھود کر نہر بنانا ایک امر محال تھا عقل اس کی کبھی بھی اجازت

نہیں دیتی ہے، مگر کیا کیجئے جسے عشق کہتے ہیں اس کا انجام عقل کے تقاضے کو اٹھا کر الگ رکھ دینا ہے۔ غور سے دیکھئے تو غالب کا مصرعہ " کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا" بیدل کے مصرعہ " گرنہ باشد بے تمیز یہا مآل کار عشق" کا آزاد ترجمہ ہے۔ البتہ مثال الگ الگ دی ہے۔ بیدل نے اس موضوع کو دوسرے انداز سے بھی بیان کیا ہے۔

اے خوش آندیدہ کہ در انجمنِ ناز و نیاز
بال بلبل بنظر دارد و حیران گل است

وہ آنکھ کتنی خوش قسمت ہے جو انجمن ناز و نیاز میں بلبل کے بازو پر نظر رکھتی ہے، اور پھول کی کیفیت دیکھ کر حیران ہے۔

نیاز و ناز باہم بسکہ یکرنگند در گلشن
ز بوئے غنچہ نتواں فرق کرد آواز بلبل را

باغ میں ناز و نیاز باہم یک رنگ ہیں۔ کلی کی خوشبو اور بلبل کی آواز میں فرق نہیں کیا جا سکتا۔

غالب نے اسی شعر کا ایک مصرعہ دوسری جگہ اس طرح استعمال کیا ہے۔

ہے کس قدر ہلاک فریب وفائے گل　　بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل

یہاں بلبل کی سادہ لوحی کو موضوع بنا کر کہتے ہیں کہ وہ یہ سمجھتی ہے پھول کے اندر رنگ وفا ہے یعنی اس کا حسن سدا قائم رہے گا۔

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار　　بوہم ہوش تا کے زحمتِ ایں تنگنا بردن
صحرا مگر بتنگیِ چشمِ حسود تھا　　خوشا دیوانہ ای کز خویش بیروں رفت وصحرا شد
غالب　　بیدل

غالب کے خیال میں قیس کے سوا میدان عشق کا کوئی اور عاشق مرد میداں نظر نہیں آیا۔ صحرا بھی شاید حاسد کی آنکھ کی طرح تنگی چشم کا شکار تھا۔ یعنی صحرا باوجود وسعت وکشادگی کے قیس کے میدان عشق کی طرح کشادہ نہ تھا۔ بلکہ چشم حاسد کی طرح تنگ تھا۔ بیدل کا خیال ہے کہ ہوش وخرد کی قید میں رہ کر انسان کب تک ایک تنگ وتاریک دنیا میں زندگی گزارنے کی

زحمت اٹھاتا رہے۔اس دیوانے کا کیا پوچھنا جو ہوش وخرد سے بیگانہ ہو کر اپنی جولانگاہ کو وسعت دے کر صحرا جیسی کشادگی حاصل کر لیتا ہے۔غالب و بیدل دونوں کا خیال ہے کہ عاشق اور دیوانہ کی جولانگاہ وسیع اور عریض ہوتی ہے۔غالب کے نزدیک ایسا آئیڈیل عاشق قیس کے سوا کوئی نہیں ہے، جبکہ بیدل کے نزدیک کوئی بھی سچا عاشق جو عقل وخرد کی تنگنا سے آپ کو نکال لے گیا اس کی جولانگاہ صحرا کی طرح وسیع ہوسکتی ہے۔اس فرق کے ساتھ کہ غالب نے صحرا کو بھی میدان عشق قیس کے مقابلے پر تنگ کہا ہے۔

نشو نما ہے اصل سے غالب فروع کو
خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیے
غالبؔ

بیدل احیائے معانی بہ خموشی کردم
نفس سوختہ اعجاز مسیحائی داشت
بیدلؔ

اصل جڑ کو اور فروع شاخ کو کہتے ہیں، درخت کی جڑ جس قدر زمین میں پھیلتی جاتی ہے اسی قدر اس کی شاخیں اور ٹہنیں پھیلتے جاتے ہیں، اور یہ کام قدرت خاموشی سے انجام دیتی ہے ۔اس کے لئے شور وغل اور ہلہ ہنگامے کی ضرورت نہیں ہے۔یہاں سے غالب نے یہ نکتہ اخذ کیا کہ نکتہ کی جو بات بھی نکلتی ہے وہ خاموشی سے غور فکر کر کے ہی نکلتی ہے۔بیدل کہتے ہیں کہ خاموشی کی ہی بدولت یا خاموشی سے ہی غور فکر کر کے میں نے معانی کو زندگی بخشی۔اس طرح غالب کا دوسرا مصرعہ ''خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیے'' درحقیقت بیدل کے پہلے مصرعہ ''بیدل احیائے معانی بہ خموشی کردم'' کا ترجمہ ہی ہے۔نفس سوختہ میں مسیحائی اعجاز ہے۔نفس سوختہ اس سانس کو کہتے ہیں جو غور فکر کی محنت گوارا کر کے تازہ بہ تازہ معانی پیدا کرے اس کے اندر مسیحائی اعجاز ہے۔مسیحائی اعجاز کیا ہے؟ حضرت مسیح علیہ السلام خاموشی سے پھونک مارتے تھے تو مردہ بحکم خدا زندہ ہو جاتا تھا، اور مبروص ومجزوم اور گنجے بحکم خدا اچھے ہو جاتے تھے، جس کو ان کا معجزہ کہا جاتا ہے۔ایک اور شعر میں بیدل اسی خیال کی طرف اشارہ کرتا ہے:

تامل رتبۂ افکار پیدا می کند بیدل
بہ خاموشی نفسہا سوخت مریم تا مسیحا شد

غور وفکر خیالات کے رتبے کو بڑھا دیتا ہے، حضرت مریم نے جب خاموشی سے نفس سوزی کی یعنی اللہ کے حکم ''کن فیکون'' پر خاموشی سے صبر کیا تو مسیح علیہ السلام جیسے اولوالعزم پیغمبر پیدا ہوئے۔

ہے خیال حسن میں حسنِ عمل کا سا خیال
خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا
غالب

زشتی اعمال دارد برق نفریں در بغل
شاہد حسن عمل را جوش تحسیں زیور است
بیدلؔ

غالب کے خیال میں افکار وخیالات اگر اچھے ہوں تو عمل بھی اچھے سرزد ہوتے ہیں۔اور خیالات گندے ہوں تو عمل بھی گندے سرزد ہوتے ہیں۔اس لئے غالب کا یہ بیان کہ خیال حسن میں حسن عمل کا سا خیال ہے نہایت معقول ہے۔پھر جو اچھے عمل کرے گا اس کے لئے اس دنیا میں بھی جنت ہے۔اور قبر کے اندر جنت کے دروازے کا کھلنا تو ایسی حقیقت ہے جس کا تذکرہ احادیث میں بھی ہے۔بیدل کہتے ہیں عمل برے ہوں تو لوگوں میں ان کی وجہ سے نفرت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔جس کے لئے وہ ''برق نفریں در بغل'' کی حسین تعبیر اختیار کرتا ہے، اور عمل اچھے ہوں تو لوگ اس کی وجہ سے اس شخص کی تعریف کرتے نہیں تھکتے ،جس کے لئے وہ یہ تعبیر اختیار کرتا ہے کہ حسن عمل کے شاہد (معشوق) کے لئے جوش تحسین زیور کی حیثیت رکھتا ہے۔غور سے دیکھا جائے تو غالب کا پہلا مصرعہ'' ہے خیال حسن میں حسنِ عمل کا سا خیال'' بیدل کے دوسرے مصرعہ''شاہد حسن عمل را جوش تحسیں زیور است'' کا ایک طرح سے آزاد ترجمہ ہے۔

شور پند ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزہ پایا
غالب

بہ منع اضطراب عاشقاں زحمت مکش ناصح
کہ آتش زندگی دارد بہ قدر شوخی تپہا
بیدلؔ

غالب کہتے ہیں ناصح کی پند ونصیحت نے میرے زخم دل پر نمک چھڑکا ،زخم پر نمک چھڑکنے سے تکلیف اور بڑھ جاتی ہے۔اس لئے اس کا مطلب یہ ہوا کہ ناصح نے اپنی پند ونصیحت سے میری تکلیف میں اضافہ کر دیا۔اب کوئی اس سے پوچھے کہ میری ایذا رسانی سے آپ کو کیا

فائدہ پہونچا۔ بیدل کہتے ہیں اے ناصح عاشقوں کی بے کلی اور بے قراری کو روکنے کی کوشش نہ کر کیونکہ آگ میں حرارت جتنی زیادہ ہوگی اسی قدر اس کے اندر چمک دمک ہوگی۔ ایک اور شعر میں کہتا ہے:

نصیحت کار گر نہ بود غریق عشق را بیدل
بہ دریا احتیاج در نباشد گوش ماہی را

دریائے عشق میں ڈوبے ہوئے آدمی پر نصیحت کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ دریا کے اندر سیپ کو موتی کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ دونوں کے یہاں ناصح کو زخم عشق یا اضطراب عشق سے روکنے کی نصیحت کرنے سے باز رہنے کے لئے کہا گیا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ غالب اس کو ایذا رسانی سے تعبیر کر کے پوچھتے ہیں تم کو کیا فائدہ پہنچا۔ جبکہ بیدل کا خیال ہے جس طرح آگ میں اس کی حرارت کے بقدر چمک ہوتی ہے عاشق میں اس کے اضطراب کے بقدر اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ اس لئے اس کو روکنا بے سود ہے۔ اس طرح غالب کے کلام پر بیدل کے کلام کی چھاپ واضح ہے۔

سنگ ہم در کفِ اطفال نگیرد آرام	ہم نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد
دور مجنوں چہ قدر ست نسق می باشد	سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا
بیدلؔ	غالبؔ

غالب کا خیال ہے کہ بچپن میں مجنوں پر پتھر مارنے کے لئے، جیسا کہ عموماً بچوں کی عادت ہوتی ہے، ہم نے پتھر اٹھایا ہی تھا کہ سر یاد آیا، یعنی یہ کہ سر کو پورے جسم میں رفعت و بلندی کے ساتھ انسان کی جسمانی ہیئت اور اس کے قیام میں بڑا دخل ہے۔ چنانچہ اگر کسی کا سر کاٹ دیا جائے تو وہ نہیں بچ سکتا، باقی اعضاء کٹ جائیں تو زندگی بچ سکتی ہے۔ غالب اسی امر کا خیال کر کے سنگ بازی سے باز آگئے۔ بیدل کہتے ہیں بچوں کی خصوصیت ہے کہ پتھر اگر ان کے ہاتھ لگ جائے تو جب تک اسے کہیں مار نہ لیں چین نہیں ملتا، خصوصاً اگر راستے گھاٹ میں کوئی مجنوں یا پاگل نظر آجائے تو اسے نہیں بخشتے۔ اس لئے دوسرے مصرعہ میں کہتا ہے کہ مجنوں کا دور بھی کس قدر ست نسق واقع ہوا ہے۔ یعنی بچوں کی سنگ باری کا جواب پتھر سے دینے میں وہ نا اہل ہے اور ست واقع ہوا ہے۔ اب اگر دونوں کے اشعار کو ملا کر پڑھا جائے تو خیال ایک ہی معلوم ہوگا کہ

بچپن میں بچے کے ہاتھ میں پتھر ہوتو مجنوں کو بخشتے نہیں۔فرق صرف اس قدر ہے کہ غالب نے انسانی جسم میں سر کی شرافت اور اہمیت کو یاد کر کے اسے چھوڑ دیا جب کہ بیدل نے مجنوں کے دور جنوں کو ست نہاد قرار دے کر بچوں کی سنگ باری کا جواب دینے سے عاجز رہے۔اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ غالب کے خیال کا سر چشمہ بیدل کا یہ شعر ہے۔

بے طلب دیں تو مزہ اس میں سوا ملتا ہے	اے خوش آں جود کہ از خجلت وضع سائل
وہ گدا جس میں نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے	لب بہ اظہار نیا رند و بایما بخشند
غالب	بیدل

غالب نے کریم اور سائل دونوں کی عمدہ خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ کریم آدمی سائل کو دست سوال دراز کرنے سے پہلے ہی دے دیں تو اس کا لطف کچھ اور ہی ہوتا ہے ۔اور سائل کی اچھی خصوصیت یہ ہے کہ وہ چاہے اپنی وضع قطع سے سوال کا اظہار کرے پر زبان سے سوال کرنے کی عادت نہ ڈالے،لیکن عام طور پر نہ تو ایسے کریم ہوتے ہیں،اور نہ ہی ایسے سائل ،اس لئے اس نے کہا کہ اگر ایسا ہو جائے تو دونوں کا انداز قابل ستائش ہوگا۔بیدل کہتا ہے وہ کریم کیا ہی اچھا ہے جو سائل کی وضع قطع دیکھ کر شرما جائے اور ہونٹوں سے اس کا تذکرہ کئے بغیر ہی اشارے سے بخش دے۔بیدل کے اس خیال کو کہ سائل کی خستہ حالت دیکھ کر کریم شرما جائے اور بے طلب اسے بخش دے غالب کے اس خیال پر فوقیت ہے کہ بے طلب دینے میں زیادہ مزا ملتا ہے۔یہاں سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کے خیال کا سر چشمہ بیدل کا کلام ہے۔اسی کے قریب غالب کا ایک فارسی مصرعہ:

چشم اہل دل زباندان نگاہ سائل است

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن	من و ساز دکاں فروشیہا چہ حرف است ایں
ہم کو تقلید تنک ظرفی منصور نہیں	جنون ایں فضولی در سر منصور می باشد
غالب	بیدل

منصور حلاج نے انا الحق کا دعویٰ کیا تھا جس پر علمائے وقت کے فتویٰ کے مطابق ان کو

تختہ دار پر چڑھا دیا گیا۔ کہتے ہیں اس وقت بھی وہ انا الحق کا نعرہ بلند کرتے رہے، پھر ان کی بوٹی بوٹی کردی گئی تب بھی اس سے انا الحق کی آواز آتی رہی، پھر ان کو جلا کر ان کی راکھ دریا میں پھینک دی گئی تو دریا سے بھی انا الحق کی آواز آتی رہی۔ اس پس منظر میں غالب کے اس شعر کو سمجھئے کہ منصور حلاج مئے وحدت پی کر ایسے مست اور فنافی اللہ ہو گئے کہ انا الحق کی صدا بلند کی۔ یعنی یہ کہ قطرہ دریا میں مل کر دریا ہو گیا، اس کی الگ سے کوئی شناخت نہیں رہی۔ میری بھی یہی صورت ہے۔ مئے وحدت کا جام پی کر میں بھی فنافی اللہ کے مقام پر پہنچ گیا ہوں اور میرا قطرہ ہستی دریائے وحدت میں گم ہو گیا ہے۔ پر منصور نے ہر جگہ اور ہر حالت میں انا الحق کی صدا بلند کر کے تنگ ظرفی کا ثبوت دیا۔ یعنی خدا کی ہستی میں فنا ہو کر خاموشی اختیار کرنی تھی۔ اس کا ڈھنڈورا نہیں پیٹنا تھا۔ اس لئے میں نے اس کی تنگ ظرفی کی تقلید نہیں کی۔ مطلب یہ ہے کہ وحدت الوجودی ہو کر بھی میں نے اس کا عوام میں چرچا نہیں کیا۔ بیدل کہتے ہیں مجھ کو دوکان فروشی کے ساز سے کوئی واسطہ نہیں، یعنی میں نے جام وحدت نوش کیا پر اس کا ڈھنڈورا نہیں پیٹا جس طرح دوکان فروش اپنا مال فروخت کرنے کے لئے آواز لگاتا ہے۔ اس فضولی دوکان فروشی کا خبط تو منصور کے سر میں سمایا ہوا تھا، جو اپنی بوٹی سے اور راکھ سے دریا میں پھینک دئے جانے کے بعد بھی اس کی صدا لگاتے رہے۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کے خیال کا سرچشمہ بیدل کا یہی شعر ٹھہرتا ہے۔

عرض کیجئے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں	عالمی را وحشت ما چوں سحر آوارہ کرد
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا	چیں فروش دامن صحرائے امکانیم ما
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کے شعر کا مطلب یہ ہے کہ عشق نے میری طبیعت میں ایسی حرارت پیدا کر دی جس کا اظہار ممکن نہیں، وجہ اس کی یہ ہے کہ وحشت کا صرف خیال دل میں آنے سے صحرا جل گیا اگر صحرا نوردی کرتا تو شاید سارا جہاں جل جاتا۔ وحشت اور صحرا کے الفاظ بیدل کے شعر میں بھی اسی طرح استعمال ہوئے ہیں۔ وہ کہتا ہے ہماری وحشت نے ایک دنیا کو سحر کی طرح آوارہ کر دیا۔ ہم دامن صحرائے امکان کے چیں فروش ہیں، وحشت یعنی عوام سے نفرت اور گوشہ گیری عموماً عشق کی

بدولت عاشق کو نصیب ہوتی ہے۔ چنانچہ بیدل ایک جگہ کہتا ہے:

غیر وحشت کیست تا گردد مقیم خانہ ام
سیل ہم بیش از دمے مہمان ایں ویرانہ نیست

ہم عاشقوں کے گھر میں وحشت کے سوا کوئی چیز قیام نہیں کر سکتی ہے۔ سیلاب بھی ایک لمحہ سے زیادہ اس ویرانے کا مہمان نہیں ہے۔ عشق میں وحشت کا راست نتیجہ آوارہ گردی ہے ۔اس طرح بیدل کا مطلب یہ ہے کہ وحشت کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی میری آوارہ گردی نے ایک دنیا کو آوارہ گرد بنا دیا۔اس لئے کہہ سکتے ہیں کہ ہم صحرائے امکان (کائنات) کے دامن کے چیں فروش (دامن کشادہ کرنے والے) ہیں ۔فرق صرف اس قدر ہے کہ غالب کے یہاں وحشت کا خیال آتے ہی صحرا جل گیا جبکہ بیدل کے یہاں اس کی وحشت نے ایک عالم کو آوارہ کردیا۔وحشت اور آوارہ گردی یا صحرانوردی میں چولی دامن کا ساتھ ہے ۔اس لئے وحشت کا خیال آتے ہی صحرا کے جل جانے کی بات کچھ دل سے لگتی ہوئی نہیں معلوم ہوتی ۔

دل سے نکلنا تری انگشت حنائی کا خیال
ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا
غالبؔ

خون حسرت کشتگاں در پردۂ رنگ حناست
دامن قاتل بود دستے کہ سازد یار سرخ
بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ اے معشوق تیری انگشت حنائی کی کشش کا خیال دل سے نکلنا اتنا ہی تکلیف دہ ہے جتنا ناخن کا گوشت سے جدا ہونا، ناخن کا گوشت سے جدا ہونا ناممکن تو نہیں ہے مگر بے انتہا تکلیف دہ ضرور ہے۔اس طرح غالب نے محبوب کی انگشت حنائی سے اپنے دل کی غیر معمولی وابستگی کا تذکرہ کیا ہے۔ بیدل کا خیال ہے کہ محبوب کی حنائی انگلیوں کو دیکھ کر عاشق کے اندر اس کے وصال کی تمنا پیدا ہوتی ہے۔ اگر وہ پوری نہیں ہوئی تو وہ حسرت کشتہ ہے۔ بیدل کہتا ہے ان حسرت کشتگاں کا خون رنگ حنا کے پردے میں چھپا ہے کیونکہ حنائی انگلیاں دامن قاتل کی حیثیت رکھتی ہیں، اصل موضوع حنائی انگلیوں کی کشش ہے، غالب کے نزدیک اس کا دل سے نکلنا انتہائی تکلیف دہ ہے جب کہ بیدل کے نزدیک وہ عاشق کے لئے قاتل ہے۔ یہاں بھی غالب

کے شعر پر بیدل کے خیال کا یک گونہ اثر واضح ہے۔

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا
غالبؔ

در جستجوئے ما نکشی زحمت سراغ
جائے رسیدہ ایم کہ عنقا نمی رسد
بیدلؔ

غالب کا خیال ہے کہ میری تقریر یا گفتگو یا شعر کا مقصد عنقا یعنی ناپید ہے، اس لئے قوت ادراک چاہے جتنی کوشش کر ڈالے اس کے پلے کچھ نہیں پڑ سکتا۔ بیدل کا خیال ہے کہ میں ایسی جگہ پہنچ چکا ہوں جہاں عنقا کی بھی رسائی نہیں ہے۔ اس لئے میری تلاش و جستجو کی زحمت نہ اٹھانا۔ یہاں غالب نے اپنی گفتگو یا شاعری کے مقصد کو عنقا کہہ کر اس کا سراغ لگانے سے باز رہنے کی ہدایت کی ہے جبکہ بیدل نے خود اپنی ہستی کو عنقا قرار دے کر اس کا سراغ لگانے سے لوگوں کو روکا ہے کیونکہ وہ خود کو فنا فی اللہ سمجھتا ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو غالب کے کلام میں بیدل کے کلام کی پرچھائیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ غالب نے اپنے مطلب تک نارسائی اور بیدل نے اپنی شخصیت تک نارسائی کا ذکر کیا ہے۔ خیال قریب قریب ایک ہے انداز مختلف ہیں، بیدل دوسری جگہ اس کو اس انداز سے بیان کرتا ہے۔

در عالمِ عنقا ہمہ عنقا صفتانند
من ہم پئے خود می روم اما اثرم نیست

عالم عنقا میں ہم سب لوگ عنقا صفت ہیں، میں خود بھی اپنے تعاقب میں دوڑ رہا ہوں، پر اس کا کوئی نشان پتہ نہیں ملتا۔ غالب کا ایک فارسی شعر اسی مضمون کا ملاحظہ ہو:

گردید نشانہا ہدف تیر بلاہا
آن ہستی عنقا کہ بجز نام ندارد

زلفِ خیال نازک و اظہار بے قرار
یا رب بیان شانہ کشِ گفتگو نہ ہو
غالبؔ

کو خاموشی کہ شانہ کشِ گفتگو شود
آشفتہ است طرہ زلفِ بیانِ ما
بیدلؔ

غالب کا خیال ہے کہ قوت خیال کی زلف نازک ہے اور اس کو ادا کرنے کا جذبہ بے قرار ہے ایسی صورت میں دعا کرتا ہے خدایا میری قوت بیان زلف گفتگو کی شانہ کشی نہ کرے، کہ مارے نزاکت کے کہیں ٹوٹ پھوٹ نہ جائے۔ بیدل کا خیال ہے، میری قوت بیان کی زلف کا طرہ آشفتہ اور پریشان ہے یعنی میرے مضامین آشفتگی کے شکار ہیں اس لئے وہ خاموشی کو آواز دیتا ہے کہ آ کر زلف گفتگو کی شانہ کشی کرے، مقصد یہ ہے کہ شاعرانہ افکار و خیالات میں، جو اظہار کے لئے شاعر کے دل میں پر تولتے رہتے ہیں، ربط پیدا کرنے کے لئے خاموشی سے ان پر غور کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس طرح بیان کی زلف پریشاں کے آراستہ کرنے کا کام خاموشی کا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب نے اس خیال کو الٹ دیا ہے۔ بیدل کا خیال ہے کہ افکار و خیالات پریشاں ہیں خاموشی سے غور کر کے ان کو ایک مرتب اور مربوط شکل دی جا سکتی ہے جبکہ غالب کا خیال ہے کہ افکار و خیالات نازک ہیں اور قوت بیان ان کے اظہار کے لئے بیچین ہے اس لئے وہ خدا سے اس کی نزاکت کی وجہ سے بیان کی شانہ کشی نہ کرنے کی درخواست کرتا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو بیدل کا خیال غالب سے بہتر نظر آتا ہے۔ کیونکہ خیال اگر نازک ہے تو اس پر بھی خاموشی سے غور کر کے اس کو بیان کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ بیدل کہتا ہے:

بہ خاموشی رساند معنیِ نازک سخن گو را
چو مو از کاسۂ چینی ببالد بے صدا گردد

معنیِ نازک شاعر کو خاموشی سے اس پر غور کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔ چینی کے پیالے میں جب بال پڑ جائے تو اس کی آواز جاتی رہتی ہے۔ غالب نے بھی ایک جگہ کہا ہے: ''خاموشی سے ہی نکلے ہے جو بات چاہئے''۔ یہاں ترکیب ''شانہ کشی گفتگو'' اور لفظ ''بیان'' اور ''زلف'' کا استعمال بتاتا ہے کہ غالب کے نہاں خانۂ دماغ میں بیدل کا یہ شعر موجود تھا۔

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی	غریق بحر ز فکرِ حباب مستغنی است
کچھ ہماری خبر نہیں آتی	رسیدہ ایم بجائے کہ بیدؔل آنجا نیست
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کا خیال ہے کہ ہم عشق کی جولانگاہ میں ایسی جگہ پہنچ گئے ہیں کہ خود ہم کو آپ اپنی خبر نہیں کہ کہاں ہیں۔ بیدل کا خیال ہے جو آدمی دریا میں غرق ہو جاتا ہے اس کو بلبلے کا خیال نہیں رہتا۔ بیدل بھی دریائے عشق میں غرق ہو کر اس مقام پر پہنچ گیا ہے کہ خود اس کو اپنی خبر نہیں ہے ۔غور سے دیکھئے تو غالب کا پورا شعر بیدل کے دوسرے مصرعہ ''رسیدہ ایم بجائے کہ بیدل آنجا نیست'' کا ترجمہ ہے۔ جبکہ پہلے مصرعہ میں اس نے ایک مثال دی ہے جس کو غالب نظر انداز کر گئے ۔فنافی العشق یا فنافی اللہ آدمی ایسا ہی ہے جیسا دریا میں ڈوبا ہوا، جس کو دریا کی سطح پر نمودار ہونے والے بلبلے کی خبر نہیں ۔ یہی حال اس عاشق کا ہوتا ہے جس کو اپنے جسم پر گزرنے والی حالت کی خبر نہیں ہوتی ہے۔

میں نے روکا رات غالب کو وگرنہ دیکھتے
اس کے سیل گریہ میں گردوں کفِ سیلاب تھا
غالب

بہ ایں طوفاں ندانم در تمنائے کہ می گریم
کہ سیل اشک من در قعر دریا راند ساحل را
بیدل

میں نے غالب کو ہجر و فراق یار میں یا تمنائے وصال میں رات کو روتے دیکھا تو اسے روکا ،ورنہ اس کے آنسوؤں کے سیلاب کا عالم یہ تھا کہ آسمان بھی اس کے سیلاب میں بہہ پڑتا۔ بیدل کہتے ہیں جانے کس کی تمنائے وصال میں طوفانی انداز سے زار وقطار رو رہا ہوں کہ میرے آنسوؤں کی باڑھ نے ساحل کو بھی قعر دریا میں پہنچا دیا۔ فراق یار یا تمنائے وصال میں شدت گریہ کا ذکر دونوں نے کیا ہے، غالب نے اس میں اس نکتے کا اظہار کیا ہے کہ شبِ فراق میں اگر اس کو رونے سے روکا نہ جاتا تو آسمان بھی اس کے آنسوؤں کے سیلاب میں بہہ پڑتا ۔بیدل نے اس نکتے کا اظہار کیا ہے کہ تمنائے وصال میں اس شدت سے گریہ وزاری کی کہ آنسوؤں کی باڑھ نے ساحل کو دریا کی گہرائی سے ملا دیا۔

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد
غالب

مرگ صاحب دل جہانی را دلیلِ کلفت است
شمع چوں خاموش گردد داغ محفل می شود
بیدل

غالب کہتے ہیں کہ جس طرح شمع بجھنے پراس سے دھواں اٹھتا ہے جو سیہ پوشی اور سوگواری کی علامت ہے اسی طرح مجھ عاشق صادق کے مرنے کے بعد شعلۂ عشق سیہ پوش یعنی سوگوار ہو جائے گا۔ بیدل کہتے ہیں جس طرح شمع کے بجھنے پر محفل داغدار یعنی سوگوار ہو جاتی ہے۔اسی طرح ایک صاحب دل (عاشق) کی موت پر ایک پوری دنیا درد والم میں گرفتار ہو کر سوگوار ہو جاتی ہے۔غور سے دیکھا جائے تو غالب کا پہلا مصرعہ ''شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے'' بیدل کے دوسرے مصرعہ ''شمع چوں خاموش گردد داغ محفل می شود'' کا آزاد ترجمہ ہے۔ دوسرے مصرعہ میں بیدل نے کہا ہر صاحب دل اور عاشق صادق کے اٹھنے سے پورا جہاں سوگوار ہو جاتا ہے جبکہ غالب نے صرف اپنے کو عاشق صادق مان کر شعلۂ عشق کی سیہ پوشی وسوگواری کا ذکر کیا ہے۔ یہاں بیدل کا خیال غالب کے خیال سے بہتر ہے۔

وہی اک بات جو یاں نفس واں نکہتِ گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے میری رنگیں نوائی کا
غالبؔ

بسکہ چیدم از بہار جلوہ ات گلہائے زرد
جیب دامانِ خیال ما چمن می پرورد
بیدلؔ

غالب کا مطلب یہ ہے کہ نفس یعنی میری رنگیں نوائی یا نغمہ سرائی اور پھول کی خوشبو دونوں اگر چہ بظاہر مختلف چیزیں ہیں لیکن ان کی اصل ایک ہی ہے اور ایک ہی سکہ کے دو رخ ہیں ،اور وہ ہے ''چمن کا جلوہ'' جسے ہم بہار کہتے ہیں، جو پھولوں میں خوشبو اور میرے اندر رنگ تغزل پیدا کرتا ہے۔ بیدل کہتے ہیں کہ اے معشوق تیرے جلوے کی بہار اتنی ہی پرکشش ہے کہ میں نے انگنت زرد پھول اس سے توڑے ہیں اور اپنی قوت خیال کے دامن میں اس طرح بھر لئے ہیں کہ وہ چمن کا سماں باندھ دیتے ہیں۔غالب نے چمن کے جلوے کو رنگیں نوائی کا سبب قرار دیا ہے جبکہ بیدل جلوۂ معشوق کو رنگیں نوائی کا سبب قرار دیتا ہے۔غور سے دیکھا جائے تو غالب کے مصرعہ ''چمن کا جلوہ باعث ہے میری رنگیں نوائی کا'' میں بیدل کے مصرعہ ''بسکہ چیدم از بہار جلوہ ات گلہائے زرد'' کا عکس موجود ہے۔

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے   گر اہلِ سخن بیدل سامانِ غنا خواہند
جو لفظ کے غالب میرے اشعار میں آئے   چوں نسخہ اشعارت گنجینہ نباشد
غالبؔ   بیدلؔ

غالب کا خیال ہے کہ اس کے کلام میں جو لفظ بھی اس کے قلم سے نکل کر صفحۂ قرطاس پر ثبت ہوتا ہے وہ معنی کے گنجینہ اور خزانہ کا طلسم ہوتا ہے۔ بیدل کہتے ہیں کہ اہلِ سخن حضرات کو اگر سامان غنا یعنی ایسا ادبی سرمایہ یا مضامین ومعانی مطلوب ہوں جو ان کو دوسروں سے بے نیاز کردے تو تمہارے دیوان یا کلیات کی طرح کوئی گنجینہ معنی نہ ہوگا۔ یہاں غالب کے کلام میں لفظ ''گنجینہ'' کا استعمال بتاتا ہے کہ تحت الشعور میں بیدل کا یہ شعر تھا، اس فرق کے ساتھ کہ غالب اپنے دیوان میں ہر استعمال ہونے والے لفظ کو گنجینۂ معنی کہتے ہیں جب کہ بیدل اپنے نسخہ اشعار یعنی پورے دیوان کو ''سامان غنا'' اور گنجینۂ معانی سے تعبیر کرتے ہیں۔

نینداس کی ہے، دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں   بیفشاں بر دل ما دامن زلف رسا
جس کے شانے پر تری زلفیں پریشاں ہوگئیں   زیں ادابا سبحہ زنار برہمن می شود
غالبؔ   بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ جس آدمی کے شانے پر اے محبوب تیری زلفیں بکھر گئیں حقیقت میں نیند تو اسی کی ہے، دماغ بھی اسی کا ہے، راتیں بھی اسی کی ہیں، یعنی ہر طرح کی جسمانی ودماغی راحت اسے حاصل ہے۔ بیدل کہتے ہیں اے محبوب اپنی زلف رسا کا دامن ہمارے دل پر پھیلا دے، یہ ادا ایسی قاتلانہ ہے کہ اس کی وجہ سے تسبیح، برہمن کا جنیو بن جاتی ہے یعنی آدمی کا تقدس داؤں پر لگ جاتا ہے۔ زلف رسا یعنی لمبی زلف جو کمر کے نیچے تک ہو، اس کی اہمیت دونوں کے نزدیک مسلم ہے، غالب کے نزدیک وہ عاشق کے دماغی اور جسمانی سکون وراحت کا سبب ہے ۔جبکہ بیدل کے نزدیک وہ ایسی قاتلانہ ادا ہے جو آدمی کے تقدس کو داؤں پر لگا دیتی ہے، اس کے علاوہ غالب نے زلف کے مثبت پہلو پر روشنی ڈالی ہے، جبکہ بیدل نے زلف پر جتنے اشعار کہے ہیں ان میں بیشتر اس کے منفی پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ مثلاً کہتا ہے:

گیسوئے تو دامیست کہ تحریرِ خیالش — از نال بزنجیر کشیدہ است قلم را
بگلشن گر بر افشاند بروئے ناز کاکل را — ہجوم نالہ ام آشفتہ سازد زلف سنبل را

نفیِ خود می کنم اثبات بروں می آید — نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا
تا بکی رنگ تواں باخت ، بہاراست اینجا — دی ہے جائے دہن اس کو دم ایجاد "نہیں"

بیدلؔ — غالبؔ

غالب کا پہلا مصرعہ "نفیِ سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا" بیدل کے پہلے مصرعہ "نفیِ خود می کنم اثبات بروں می آید" کا ترجمہ ہے یعنی جب ہم اپنی ہستی کی نفی کرتے ہیں تو اس سے اس کا اثبات ظاہر ہوتا ہے۔ کیونکہ نفی اسی چیز کی کی جاتی ہے جو موجود ہو، جو چیز موجود نہیں اس کی نفی کے کیا معنی۔ آگے کہتا ہے کہ محبوب کو اس کی پیدائش کے وقت خدا نے منہ کی جگہ لفظ "نہیں" عطا فرمایا، یعنی عاشق کی ہر بات پر وہ "نہیں" کہتا ہے، جس کے پیچھے اثبات یعنی "ہاں" پوشیدہ ہے ۔دوسرے مصرعہ میں غالب اور بیدل کے درمیان مثال پیش کرنے میں فرق ہوگیا۔ غالب کے مطابق محبوب عاشق کی ہر بات پر "نہیں" کہتا ہے کہ گویا دہن کی جگہ خدا نے اس کو بوقت پیدائش لفظ "نہیں" دیا جو اس بات کا ثبوت ہے کہ دہن ہے۔ بیدل کہتے جب تک بہار موجود ہے اس سے اس کا رنگ کیسے اڑسکتا ہے۔ بہار اور رنگ کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ موسم بہار میں انواع واقسام کے رنگ برنگے پھول کھلے ہوتے ہیں، اس لئے جب تک بہار ہے رنگ بھی موجود ہے۔ اس طرح رنگ کی نفی کرنا درحقیقت اس کا اثبات ہے۔

بے عشق محال است بود رونق ہستی — رونق ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے
بے جلوۂ خورشید جہاں نامہ سیاہ است — انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

بیدلؔ — غالبؔ

یہاں غالب کا پہلا مصرعہ "رونق ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے" بیدل کے پہلے مصرعہ "بے عشق محال است بود رونق ہستی" کا بالکل لفظی ترجمہ ہے۔ غالب کا خیال ہے کہ زندگی میں جو کشش اور دلکشی ہے وہ عشق خانہ ویراں ساز ہی کی بدولت ہے۔ بیدل کا بھی یہی خیال ہے

کہ زندگی کی رونق و بہجت عشق و محبت کے بغیر ناممکن ہے۔ بلکہ دوسری جگہ ایسی زندگی کو جس میں محبت نہ ہو ''ننگ عدم'' سے تعبیر کرتا ہے:

''بے محبت زندگانی نیست جز ننگ عدم''

البتہ دوسرے مصرعہ میں دونوں مثال پیش کرنے میں الگ ہو گئے۔ غالب کے مطابق اگر کھلیان میں بجلی نہ گرے تو وہ ایسی انجمن کی طرح بے رونق ہے جس میں شمع نہ ہو۔ جبکہ بیدل کہتے ہیں جس طرح دنیا کی ساری چہل پہل آفتاب کی بدولت قائم ہے اسی طرح زندگی کی ساری چہل پہل عشق و محبت کی بدولت قائم ہے، گویا مقصود دونوں کا ایک ہے، مثال دونوں کی الگ الگ ہے۔ بیدل کی مثال حقیقت سے قریب ہے جبکہ غالب کی مثال غیر حقیقی مفروضہ پر قائم ہے۔ لیکن اس کے خیال کا سرچشمہ بیدل ہی کا کلام معلوم ہوتا ہے۔ غالب کا ایک فارسی شعر اس کے قریب ہے:

در عشق انبساط بہ پایان نمی رسد   چون گردباد خاک شو و در ہوا برقص

احباب چارہ سازی وحشت نہ کر سکے   زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا
غالبؔ

فغاں کہ داد رہائی نداد وحشت ہم   چو رنگ شمع قفس گشتہ پرِ کشادنِ ما
بیدلؔ

بیقراراں جنوں را منع وحشت مشکلست
نامہ را زنجیر ہم سامان رفتن می شود

غالب کہتے ہیں احباب نے میری وحشت کو دور کرنے کے لئے مجھے قید خانے میں ڈال دیا مگر اس سے وحشت کی چارہ سازی نہ ہو سکی، کیونکہ میں نے عالم تصور میں صحرانوردی شروع کردی اگرچہ جسم میرا قید میں تھا۔ بیدل کہتے ہیں ہائے افسوس وحشت نے بھی رہائی کی داد نہ دی۔ یعنی عشق و محبت کے دام سے آزاد نہ کیا۔ ہماری پر کشائی شمع کی طرح ہمارا قفس بن گئی۔ مفہوم دونوں کا ایک ہے کہ عشق میں وحشت ناگزیر ہے اور اس سے رہائی ممکن نہیں، چنانچہ ایک جگہ کہتا ہے ع

وحشت زمحیط عشق آثار رہائی نیست

دوسرے شعر میں بیدل اس بات کو اور واضح الفاظ میں کہتا ہے جو لوگ عشق و جنون کی وجہ سے بیقرار ہیں ان کو وحشت سے روکنا بہت مشکل ہے۔ غالب کے شعر میں لفظ زنداں بیدل

کے لفظ قفس کی جگہ اور غالب کے یہاں ''خیال کی بیاباں نوردی'' بیدل کے ''پر کشادنِ ما'' کی جگہ ہے، یہ ترکیب بتاتی ہے کہ غالب کے تحت الشعور میں بیدل کی چھاپ کتنی گہری تھی۔ یا ایک اور شعر میں اس خیال کی اس طرح وضاحت کرتا ہے:

چارہ اندیشیم از فیض الم محرومیست　　فکر بے دردی اگر رہ نزند درد دواست

دردِ عشق سے ہماری چارہ اندیشی فیض الم سے سراسر محرومی ہے، بیدردی کی فکر اگر راہ زنی نہ کرے تو دردِ عشق خود دوا ہے۔

تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا　　پیش از اجل تہیہ مردن کمال ماست

اڑنے سے پیشتر ہی مرا رنگ زرد تھا　　آں بہ کہ فکر بیگہ خود را بگہ کنید

غالبؔ　　بیدلؔ

غالب کا شعر صاف ہے کہ زندگی میں ہر وقت موت کا اندیشہ لاحق رہتا تھا اور اس کا سایہ سر پر منڈلاتا رہتا تھا کہ کس وقت آ کر وہ مجھے اپنی آغوش میں لے لے، اس لئے اڑنے سے پہلے یعنی دنیا سے رخصت ہونے سے پہلے ہی میرا رنگ زرد رہتا تھا اور زندگی ہی میں اپنے اوپر فنا کا رنگ طاری رہتا تھا۔ بیدل کا خیال ہے کہ موت تو ایک دن آنی ہی ہے، اس کا کھٹکا لگا رہنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ ع:

از مرگ نیست آنہمہ تشویش و باک ما

اس سے پہلے اس کی تیاری کرنا، یہ ہے ہمارا کمال۔ اس لئے کہتا ہے موت سے پہلے موت کی تیاری کی فکر بظاہر ایک بے موقع سی بات ہے مگر اس بے موقع اور بے محل فکر کو بر محل فکر بنانا بہتر ہے، یعنی قبل از وقت موت کی فکر کر کے اس کی تیاری کرو، جیسا کہ حدیث میں بھی آتا ہے، عقلمند آدمی وہ ہے جو مرنے سے پہلے مرنے کی تیاری کرے۔ اس طرح بیدل کا خیال فحوائے حدیث سے ہم آہنگ ہے۔

تالیف نسخہائے وفا کر رہا تھا میں　　بر جبینِ ما نشانِ سجدہ تمغائے وفاست

مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا　　صنعتِ عشق از کلف آرائشِ مہ می کند

غالبؔ　　بیدلؔ

غالب کا مطلب یہ ہے کہ میرے افکار و خیالات کا مجموعہ ابھی پراگندہ اور منتشر تھا، ان میں باہم ربط نہ تھا جو عموماً عہد طفلی میں ہوا کرتا ہے۔ اس وقت بھی عشق میں وفاداری کا نسخہ میں لکھ رہا تھا۔ گویا ایام طفولیت ہی سے عشق میں اپنی وفاداری کا ثبوت دیتا رہا ہوں۔ بیدل کہتے ہیں میری پیشانی پر سجدے کا جو نشان ہے وہ عشق حقیقی میں وفاداری کا تمغہ (نشان) ہے۔ صنعتِ عشق کلف یعنی چاند کے گرد کی سیاہی سے چاند کی آرائش کرتی ہے جس طرح چاند کے گرد کی سیاہی اس کی آرائش و زیبائش کا سبب ہے اسی طرح میری پیشانی پر سجدے کا نشان عشق میں میری وفاداری کا تمغہ ہے۔ عشق میں وفاداری اور پائیداری کا مضمون غالب و بیدل دونوں نے باندھا ہے۔ انداز بیان البتہ الگ ہے۔ بیدل کا بیان قرآنی اسلوب سے ہم آہنگ ہے، جہاں صحابہ کے عشق کی تعریف میں اللہ نے فرمایا ہے، سیما ھم فی وجوھھم من اثر السجود، یعنی کثرت سجدہ کی وجہ سے ان کی پیشانیوں پر سجدے کے نشانات پڑ گئے ہیں۔ غالب کے تحت الشعور میں بیدل کا یہ خیال موجود تھا۔

یہ لاش بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے	عریانی از مزاج جنونم نمی رود
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا	ہر چند زیر خاک روم در کفن نیم
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ میں ایک آزاد اور مست مولا قسم کا عاشق تھا جس کو اپنے تن بدن کا ہوش نہیں رہتا ہے، اس لئے آج اس کی لاش بغیر کفن کے لاوارث پڑی ہوئی ہے، اللہ اس کی مغفرت کرے۔ یا یہ مطلب ہے کہ اسدِ خستہ جاں درحقیقت ایک عاشق صادق تھا کہ مرنے کے بعد بھی دنیاوی علائق سے آزاد رہا۔ بیدل کہتے ہیں میرے عاشقانہ مزاج سے عریانی و آزادی جانے کا نام نہیں لیتی ہے، اگر چہ میں زیر زمین دفن ہو جاؤں گا پھر بھی کفن سے آزاد رہوں گا۔ خیال دونوں کا تقریباً ایک ہی ہے، غالب کے نزدیک اس کی آزاد منشی اور عاشق مزاجی کی انتہا یہ ہے کہ اس کی لاش بغیر کفن کے پڑی ہے، جب کہ بیدل کے نزدیک اس کے جنون کی برہنہ مزاجی کی انتہا یہ ہے کہ زیر خاک پہنچ کر بھی وہ کفن سے آزاد ہے۔ بہر حال غالب کے شعر میں بیدل کے خیال کا ارتعاش موجود ہے۔

رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج | رنجہا در عالم تسلیم راحت می شود
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں | شمع از خارِ قدم سامان مژگاں کرد و رفت

غالبؔ　　　　　　　　　　بیدلؔ

غالب کہتے ہیں انسان اگر تکلیف جھیلنے کا عادی ہو جائے تو تکلیف کا احساس جاتا رہتا ہے چنانچہ ہم پر بھی اتنی مصیبتیں پڑیں کہ ان کا سہنا ان کے خوگر ہونے کی وجہ سے ہمارے لئے آسان ہو گیا۔ اگر چہ بیدل نے بھی ایک جگہ اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ تکرار عمل سے آدمی اس کا عادی ہو جاتا ہے　ع

ہر چہ آری بتکرار عمل خو می شود

لیکن یہاں بیدل اس مضمون کو اس سے بہتر انداز سے بیان کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ تکلیف کا عادی ہو کر اس کا احساس مٹ جانا کوئی خاص بات نہیں ہے، بلکہ ''شیوۂ تسلیم ورضا'' کو اپناؤ جس کی خصوصیت یہ ہے کہ رنج و غم نہ صرف مٹ جاتا ہے بلکہ راحت میں بدل جاتا ہے۔ ''اللہ کو یہی منظور تھا'' یہ کہہ کر آدمی یک گونہ دلی سکون محسوس کرتا ہے، جس طرح شمع اپنے خار قدم یعنی خوش خرامی سے پلکوں کا سامان (آنسو) بہم پہنچا کر رخصت ہو جاتی ہے۔ اس خیال کو بیدل نے دوسرے انداز سے بھی بیان کیا ہے:

رنج جہان بہمت مردانہ راحت است　　　گر بار می کشی کمرت استوار ہیچ

غالب کا ایک فارسی شعر اسی کے قریب ہے　ے

گر بود مشکل مرنج ای دل کہ کار
چون رود از دست آسان می شود

جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی | درکیش عشق ساز رہائی ندامت است
دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا | افسوس طائر یکہ بدام تو بال داشت

غالبؔ　　　　　　　　　　بیدلؔ

غالب کا خیال ہے کہ غم عشق کی کشمکش کبھی ختم نہیں ہوتی، یعنی اس سے کسی حال میں

رہائی نہیں، دل اگر سینے میں ہے تو اس کا ہونا بیقراری کا سبب ہے، اور اگر سینے سے باہر ہے تو اس کا جانا اپنی جگہ خود درد کا سبب ہے۔ بیدل کہتے ہیں کہ مذہب عشق میں عاشق کی غم عشق سے رہائی کی نغمہ سرائی سراسر پشیمانی کی بات ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دام عشق سے رہائی تو دور رہی، اس کا تصور بھی باعث ندامت و پشیمانی ہے۔ اس پرندے پر افسوس ہوتا ہے جو تیرے دام میں پھنس کر بھی اپنے بازو برقرار رکھتا ہے، گویا عشق کامل سپردگی کا تقاضا کرتا ہے، غم عشق سے عدم رہائی کا مضمون دونوں کے یہاں ہے، البتہ غالب نے اس کو عاشق کی مجبوری قرار دی ہے جبکہ بیدل نے اس کے تصور کو بھی عاشق کے لئے موجب ندامت قرار دیا ہے۔ چنانچہ دوسری جگہ کہتا ہے:

محبت پیشہ ای بگداز وخون شو
کہ درد عشق درمانی ندارد

تم نے محبت کو اپنا پیشہ بنایا ہے تو سوز و گداز پیدا کرو، اور خون ہو جاؤ، کیونکہ درد عشق کا کوئی علاج نہیں ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کا پہلا مصرعہ ''جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہ عشق کی،'' میں بیدل کے پہلے مصرعہ ''در کیش عشق ساز رہائی ندامت است'' کا عکس موجود ہے۔

ہوں ترے وعدہ نہ کرنے پہ بھی راضی کہ کبھی
گوش منت کشِ گل بانگ تسلی نہ ہوا
غالبؔ

دل بذوق وعدۂ فرداست مغرور امل
عشق گوید چشم واکن فرصت ایں مقدار نیست
بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ محبوب کے وعدۂ وصل نہ کرنے پر بھی میرے دل کو کوئی صدمہ نہیں پہنچا، بلکہ یہ سوچ کر کہ اس میں بھی خیر کا کوئی پہلو ہوگا خوشی ہوئی۔ کیونکہ میرے کان تیری تسلی بخش آواز کے احسان مند نہیں ہونا چاہتے تھے۔ بیدل کہتا ہے کہ محبوب نے جو کل ملنے کا وعدہ کیا ہے اس کے ذوق میں دل اپنی امیدوں پر پھولا نہیں سماتا ہے۔ یعنی اس امید پر اسے غرور و گھمنڈ ہے جب کہ عشق کہتا ہے آنکھیں کھول کر دیکھو تم کو اتنی بھی فرصت حاصل نہیں ہے۔ محبوب کے مستقبل میں وعدۂ وصل کا موضوع دونوں کے یہاں مشترک ہے، اس فرق کے ساتھ کہ غالب نے وعدہ وصل نہ کرنے پر بھی خوشی کا اظہار کیا ہے، اس لئے کہ کان تسلی کے احسان مند نہیں ہونا چاہتے

ہیں، اور بیدل نے وعدۂ وصل کی امید پر دل کو مغرور ہونے سے روکا ہے کیونکہ عشق میں اتنی مہلت بھی حاصل نہیں ہوتی ہے۔

کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجئے	بیدل دگر تظلم حرماں کجا برم
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا	من جرأتی ندارم و او مست می رود
غالب	بیدل

غالب کا خیال ہے کہ اپنی بدنصیبی سے تنگ آکر ہم نے مرنے کی تمنا کی، پر وہ تمنا بھی پوری نہ ہوئی، اب اپنی قسمت کی محرومی کی شکایت کس سے کریں۔ بیدل کہتا ہے کہ اپنی محرومی ر بدنصیبی کی فریاد کس کے سامنے لے جاؤں میرے اندر اتنی جرأت نہیں ہے اور اس کا عالم یہ ہے کہ مست چلا جا رہا ہے۔ یہاں غالب نے بدنصیبی پر مرنے کی تمنا کی تھی جس کے پوری نہ ہونے پر بدنصیبی کی شکایت کر ڈالی۔ جبکہ بیدل نے بدنصیبی کی شکایت اس لئے نہیں کی کہ محبوب مست جا رہا تھا اور اس سے فریاد کرنے کی جرأت اس میں نہیں تھی۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کا پہلا مصرعہ ''کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجئے'' بیدل کے پہلے مصرعہ ''بیدل دگر تظلم حرماں کجا برم'' کا ترجمہ ہے۔

دل گذر گاہ خیالِ مے و ساغر ہی سہی	چو زاہد آنہمہ نتواں ز درد تقویٰ مرد
گر نفس جادۂ سرِ منزلِ تقویٰ نہ ہوا	اگر نہ طبع سقیمی چہ جائے پرہیز است
غالب	بیدل

غالب کا خیال ہے کہ تقویٰ سے دل کو پاکی اور سرور حاصل ہوتا ہے چونکہ مجھے یہ سرور مے و ساغر سے حاصل ہے اس لئے میرا دل اگر تقویٰ کی طرف مائل نہیں ہے تو کوئی حرج نہیں ۔ بیدل کہتے ہیں زاہد کی طرح تقویٰ کے درد سے مرا نہیں جا سکتا۔ اگر تمہاری طبیعت میں سقم اور بیماری نہیں ہے تو پرہیز کی کیا ضرورت ہے۔ تقویٰ کے عدم لزوم میں غالب اور بیدل دونوں متفق ہیں لیکن اسباب کے بیان میں مختلف ہیں۔ غالب کے نزدیک تقویٰ سے مطلوب سرور ہے جو مئے

وساغر سے حاصل ہے، اس لئے اس کی ضرورت نہیں۔ جبکہ بیدل کے نزدیک تقویٰ سے مطلوب داخلی پاکی اور برائی سے پرہیز ہے اور طبیعت میں سقم نہیں ہے تو اس کی ضرورت نہیں ہے۔

ہنوز اک پرتو نقش خیال یار باقی ہے	دل صید شوق و دیدہ اسیرِ خیال تست
دلِ افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا	ویران کشور یکہ بایں بندوبست نیست
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں خیال یار کا نقش مٹانے کے باوجود نہ مٹ سکا اور ہنوز صفحہ دل ودماغ پر وہ باقی ہے اور یہ اسی پرتو کا نتیجہ ہے کہ میرا دل افسردہ یوسفؑ کے قید خانے کے حجرے کی طرح دلکش نظر آتا ہے۔ بیدل کا خیال ہے کہ دل عشق محبوب میں گرفتار ہے اور دیدہ اس کے خیال کا اسیر اور قیدی ہے، گویا دل ودیدہ دونوں محبوب کے ہاتھ قیدی ہو چکے ہیں۔ جس ملک میں اس قسم کا بندوبست اور نظم ونسق نہ ہو وہ ملک گویا ویران ہے، کیونکہ دل ودیدہ ہی عاشق کا کل سرمایہ ہے، اور وہ سرمایہ محبوب کے حوالے ہے، اس لئے وہ آباد ہے۔ غالب کہتے ہیں کہ محبوب کے خیال کا نقش مٹانے کے باوجود اس کا پرتو ہنوز دل کے صفحہ پر باقی ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ عاشق کیسا ہے جس نے صفحۂ دل سے نقش خیال یار کو مٹا دیا۔ جبکہ اسی سے اس کی آبادی ہے۔ یہ فرق ہے دونوں کے طرز فکر کا۔ غالب کا ایک فارسی شعر اس کے قریب ہے:

از چشم ما خیال تو بیرون نمی رود　　　گوئی بدام تار نگاہش گرفتہ ایم

کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے	حیرت دمیدہ ام گل داغم بہانہ ایست
کرے جو پرتو خورشید عالم شبنمستاں کا	طاؤس جلوہ زار تو آئینہ خانہ ایست
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں اے محبوب تیرے جلوے نے آئینہ خانۂ دل کا وہ نقشہ کیا یعنی اس کی وہ حالت کر دی جو آفتاب کا پرتو شبنم کے ساتھ کرتا ہے۔ شبنم کے قطروں پر جب آفتاب کا پرتو پڑتا ہے تو وہ فنا کے گھاٹ اتر جاتا ہے۔ یہی حال تیرے جلوے کا ہے کہ جب دل کے آئینہ خانہ پر اس

کی جھلک پڑتی ہے تو وہ ہاتھ سے جاتا رہتا ہے۔ بیدل کا خیال ہے کہ میں سراپا حیرت کا پتلا ہوں جیسا کہ دوسری جگہ کہتا ہے:

''سراپا حیرتم حیرت نمی دانم چہ فہمیدم''

میرے داغ عشق کا پھول تو ایک بہانہ ہے تیرا طاؤس جلوہ گاہ ایک آئینہ خانہ ہے۔ طاؤس کہتے ہیں مور کو جس کے پروں میں مختلف رنگوں کا حسین امتزاج ہوتا ہے جو اس کی دلکشی اور دل آویزی کا سبب ہوتا ہے۔ شاعر کہتا ہے تیرے جلوہ زار کا طاؤس یعنی تو جہاں اپنے جلوے دکھاتا ہے اس کی مختلف ادائیں (اور اگر معرفت کی طرف لے جائیں تو مراد خدا کی مختلف شانیں ہوسکتی ہیں) ایک آئینہ خانہ ہے جس میں چاروں طرف سے رنگ برنگی شکلیں اور ادائیں نظر آتی ہیں مطلب یہ ہے کہ محبوب تیرے کرشمے یا اے خدا تیری قدرت کے کرشمے چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں جنہیں دیکھ کر میں حیرت کا پتلا بنا ہوا ہوں۔ اس شعر میں بیدل خدا کی قدرت کے بوقلموں اور رنگا رنگ نشانات کی طرف اشارہ کرتا ہے جو آسمان اور زمین میں پھیلے ہوئے ہیں، اور جن پر غور فکر کے بعد انسان حیرت واستعجاب کا پتلا بن جاتا ہے جیسا کہ شاہ کابلی نے اسے درس دیتے ہوئے کہا تھا۔ ''اینجا کشاد چشم جز حیرت چیزی دگر ندارد'' اب بیدل اور غالب کے یہاں ایک مشترک نکتہ'' معشوق کی جلوہ آرائی'' ہے۔ بیدل کہتا ہے کہ تیرے جلوے خود آئینہ خانے ہیں جن پر غور وفکر سے حیرت کے سوا کچھ حاصل نہیں۔ غالب کے نزدیک تیرے جلوے نے دل کو جو آئینہ خانہ تھا ہاتھ سے لے لیا جس طرح آفتاب کی کرنیں، شبنم کے وجود اور اس کی ہستی کا صفایا کر دیتی ہیں۔ یہاں بیدل کا شعر معرفت اور عشق حقیقی کی طرف لے جاتا ہے جبکہ غالب کا شعر عشق مجازی کی طرف لے جاتا ہے۔

اگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر
مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا
غالب

چہ سحر بود کہ افسون بے نیازی عشق
مرا بہ خاک نشاند و ترا تماشا کرد
بیدل

غالب کہتے ہیں عشق نے مجھے اس درجہ برباد اور میرا گھر ویران کر دیا کہ ہر طرف گھاس اگ آئی ہے۔ گویا میرا گھر صحرا بن گیا ہے۔ اے معشوق اس ویرانی کا تماشہ دیکھ۔ دربان کا کام گھر

کی حفاظت کا تھا مگر اب اس کا کام گھاس کھود کر صاف ستھرا کرنے کا رہ گیا ہے۔اس میں غالب نے عشق کی خانہ ویران سازی کا ذکر کیا ہے۔ بیدل کہتے ہیں وہ بھی کیا جادو تھا کہ بے نیازیِ عشق کی پھونک نے مجھ کو خاک نشیں بنا دیا، یعنی برباد کر کے دفن کر دیا، اور تم کو اس کا تماشائی بنا دیا، عشق کی بے نیازی کا کرشمہ ہے کہ عاشق کو ویران کر کے معشوق کو اس کا تماشا دکھاتی ہے۔ واضح ہے کہ غالب نے یہ مضمون بیدل ہی سے لیا ہے البتہ اپنے مخصوص انداز سے اس میں ایک نکتہ پیدا کر دیا۔ غالب کے پہلے مصرع ''اگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر'' میں بیدل کے پورے شعر کی جھلک موجود ہے۔

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں	آرزو خوں گشتہ نیرنگ وضع نازکیست
چراغ مردہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا	غمزہ دارد دور باش و جلوہ می گوید بیا
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں میری خاموشی میں لاکھوں آرزوئیں پنہاں ہیں جو خون ہو گئیں یعنی پوری نہیں ہو سکیں۔ گویا میں بے زبان گورِ غریباں کا بجھا ہوا چراغ ہوں، اس طرح غالب نے اس میں عاشق کی بے کسی کا تذکرہ کیا ہے۔ بیدل کہتا ہے کہ محبوب کی نزاکت وضع کے سبب میری آرزوؤں کا خون ہو گیا ہے۔ اس کے غمزے اور اشارے کہتے ہیں دور رہو، جبکہ اس کے جلوے کہتے ہیں قریب آؤ، گویا بیدل کے نزدیک محبوب کے غمزے اور جلوے کے دو متضاد تقاضے عاشق کی آرزوؤں کے خون ہونے کا سبب ہیں۔ جیسا کہ دوسری جگہ کہتا ہے: ع

محبت غیرِ خوں گشتن نمی دانم چہ می باشد

جبکہ غالب کے نزدیک عشق کی بے بسی عاشق کی لاکھوں آرزوؤں کے خون ہونے کا باعث ہے ۔ یہاں آرزوؤں کے خون ہونے میں دونوں متفق ہیں لیکن سبب کے بیان میں مختلف ہیں۔

صد جلوہ رو برو ہے جو مژگاں اٹھایئے	نگاہ شوق پیدا کن تماشا ہا تماشا کن
طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھایئے	دو عالم جلوہ است و بے بصر دشوار می بیند
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں اگر پلکیں اٹھا کر کائنات پر نظر کریں تو خدائے جل جلالہ کی تجلیوں کے سیکڑوں جلوے نظر آئیں گے، پر ہماری نگاہ نازک و ناتواں واقع ہوئی ہے اس لئے ان کے دید کا احسان نہیں اٹھا سکتی۔ بیدل کہتے ہیں ساری دنیا بلکہ دونوں جہاں ذات وحدہ لاشریک لہ کی جلوہ گاہ ہے اور ہر طرف اس کی تجلیوں کے جلوے بکھرے پڑے ہیں۔ لیکن جن میں بصیرت کی آنکھ نہیں ہے انہیں وہ مشکل سے نظر آتے ہیں اس لئے پہلے نگاہ شوق پیدا کرو، پھر ہر طرف اس کا تماشا دیکھو، گویا غالب کے نزدیک قوت بینائی ناتواں ہونے کے باعث جلوے نظر نہیں آسکتے، جبکہ بیدل کے نزدیک صرف بصیرت کی آنکھ ان کو دیکھ سکتی ہے۔ بیدل کا ایک دوسرا شعر اسی کے قریب ہے:

شش جہت آئینہ دارِ شوخیِ اظہار اوست
نیست جز مژگاں حجابی را کہ برداریم ما

چھ جہتیں یعنی پوری کائنات اس کی شوخی اظہار کی آئینہ دار ہیں۔ پلکوں کے سوا کوئی حجاب نہیں ہے جس کو ہم اٹھائیں، مطلب یہ ہے کہ خدا کی شوخیِ اظہار یعنی اس کے حسن تخلیق کے کرشمے چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں، ان کو دیکھنے میں اگر کوئی چیز حائل ہے تو وہ ہماری پلکیں ہیں۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کا مصرعہ ''صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھائیے'' بیدل کے اس پورے شعر کا ترجمہ ہے۔ غالب کا ایک اور شعر بیدل کے اس خیال کے قریب ہے:

نقش فریادی ہے کس کی شوخی اظہار کا   کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہ فنا غالب   بیدل رہِ دیار فنا بسکہ روشن است
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا   چوں شمع چشم بستہ رود کاروان ما
غالبؔ   بیدلؔ

غالب کہتے ہیں راہ فنا کا سماں سدا ہماری نظر کے سامنے پھرتا رہتا ہے کیونکہ یہ دنیا کے اجزائے پریشاں کا شیرازہ ہے، یعنی دنیا جب ختم ہو جائے گی اور ہر چیز فنا ہو گی تو ایک ساتھ محشر میں اٹھنے کی وجہ سے سب ایک جگہ اکٹھے ہوں گے اس طرح وہ اجزائے پریشاں شیرازے کی شکل اختیار کرلیں گے۔ بیدل کہتے ہیں دیار فنا کی راہ بالکل واضح اور روشن ہے اس لئے شمع کی طرح

آنکھیں بند کر کے ہمارا قافلہ فنا کی طرف رواں دواں ہے۔غور سے دیکھا جائے تو غالب کا پہلا مصرعہ ''نظر میں ہے ہماری جادۂ راہ فنا غالب'' بیدل کے پہلے مصرعے ''بیدل رہِ دیار فنا بسکہ روشن است'' کا آزاد ترجمہ ہے۔دوسرے مصرعہ میں دونوں الگ ہو گئے۔غالب کے مطابق راہِ فنا اجزائے عالم کا شیرازہ بننے کی جگہ ہے۔جبکہ بیدل کے مطابق شمع کی طرح انسانی قافلہ آنکھ بند کر کے ادھر گامزن ہے۔غالب کی یہ بات کہ راہِ فنا اجزائے پریشان عالم کا شیرازہ ہے، کچھ دل سے لگتی ہوئی بات نہیں ہے، کیونکہ شیرازہ کی جگہ اور مقام تو روز قیامت ہے۔قرآن کہتا ہے کہ قیامت کے دن سب لوگ قبروں سے زندہ اٹھ کر اپنے رب کی طرف دوڑ رہے ہوں گے۔(فاذا هم من الاجداث الیٰ ربهم ینسلون ،سورۂ یٰسین)۔

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا	بوہم ہوش تا کے زحمت ایں تنکنا بردن
حباب موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا	خوشا دیوانہ ای کز خویش بیروں رفت وصحرا شد
غالب	بیدل

غالب کہتے ہیں میرا ذوق صحرانوردی ایک بیاباں ماندگی یعنی بیاباں نوردی سے حاصل ہونے والا تکان سے کم نہ ہوا۔میرا نقش قدم حباب موجۂ رفتار ہے یعنی بلبلے کی طرح لگاتار سرگرم صحرانوردی ہے۔بیدل کہتے ہیں عقل وہوش کے وہم میں گرفتار ہو کر کب تک اس تنکنا (تنگ جگہ مراد عقل) کی گھٹن برداشت کرتا رہوں وہ دیوانہ کیا ہی اچھا ہے جو بیخود ہو کر سراپا صحرا بن گیا جو نہایت وسیع وعریض ہوتا ہے۔صحرانوردی اور دیوانگی میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔جب انسان پر جنونی کیفیت طاری ہوتی ہے تو وہ صحرانوردی کرتا ہے۔غالب اور بیدل کے یہاں ''حالت جنون میں صحرانوردی'' کا مسئلہ تو متفق علیہ ہے، فرق یہاں ہے کہ غالب کے مطابق ایک بیاباں کا چکر کاٹ کر حاصل ہونے والا تکان مجنوں کی صحرانوردی کے ذوق میں رکاوٹ نہیں بنتا ہے۔جبکہ بیدل کے نزدیک مجنوں نے عالمِ بیخودی میں اس قدر صحرانوردی کی کہ سراپا صحرا بن گیا ہے، جیسا کہ دوسری جگہ بیدل کہتا ہے ع:

عشق مشتِ خاکِ مارا سر بہ صحرا زدہ است

عشق نے ہماری مشت خاک کو سر بہ صحرا کر دیا ہے۔ اس لئے یہاں تکان کا مسئلہ ہی نہیں ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ غالب کے شعر میں بیدل کے شعر کی پرچھائیں موجود ہے۔ غالب کا پہلا مصرعہ ''نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا'' بیدل کے دوسرے مصرعہ ''خوشا دیوانہ ای کز خویش بیروں رفت وصحرا شد'' کا تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ ایک آزاد ترجمہ ہے۔

سراپا رہنِ عشق و ناگزیر الفت ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا
غالب

پر فشانست نفس لیک ز خود رستن کو
باہمہ شور جنوں در قفسِ ہوش خودم
بیدل

غالب کے خیال کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم عاشق اپنے عشق میں ایسا کھو گئے ہیں کہ گویا مجسم عشق ہو گئے۔ لیکن دوسری طرف اپنی ہستی کی محبت بھی ہے گویا ایک طرح کی کشمکش میں ہوں اور ہماری حالت اس آدمی کی طرح ہے جو بجلی کی عبادت کرتا ہے اور جب وہ کھلیان میں اکٹھے غلے کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے تو اس کا افسوس بھی اسے ہوتا ہے گویا ہم عشقِ محبوب اور الفت ہستی کی کشمکش میں گھرے ہوئے ہیں۔ بیدل کا خیال ہے کہ سانس پر فشانی کر رہی ہے لیکن انسان لاکھ اپنی ہستی کے احساس سے نکلنا چاہے تو نہیں نکل سکتا۔ جنون و دیوانگی کے تمام تر شور و ہنگامے کے باوجود ہوش و خرد کی قید میں ہوں۔ یعنی ایک طرف عشق کا دعویٰ بھی ہے اور دوسری طرف ہوش و خرد کی قید سے رہائی بھی نہیں ہے۔ اس میں عشق و عقل کی باہمی کشمکش کا ذکر ہے جبکہ غالب کے یہاں عشق محبوب اور الفت ہستی کی کشمکش کا ذکر ہے۔ یہاں بیدل کا بیان حقیقت سے قریب تر ہے۔ چنانچہ ایک جگہ کہتا ہے: ع

محبت تا کجا سازد دوچارِ الفتِ خویشم

غور سے دیکھا جائے تو غالب کا مصرعہ ''سراپا رہنِ عشق و ناگزیر الفت ہستی'' بیدل کے مصرعہ ''باہمہ شور جنوں در قفسِ ہوش خودم''۔ کا تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ آزاد ترجمہ ہے۔

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا
غالب

کثرت حجابِ جلوۂ وحدت نمی شود
مژگاں بہر چہ باز کنی دیدہ محو اوست
بیدل

غالب کا خیال ہے کہ نواہائے راز سے تو واقف نہیں ہے، نواہائے راز سے مراد کائنات کے وہ سربستہ راز ہیں جو مظاہر قدرت کی شکل میں چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں اور جو اس کی قدرت کے نمونے ہیں جن پر غور وفکر سے خدا کی عظمت دل میں بیٹھتی ہے۔ حقیقت ذات باری کی ہے اور اس کو ساز فرض کریں تو یہ مظاہر اس کے نغمے قرار پائیں گے اور اس کے وجود خارجی کا اعلان کر رہے ہیں۔ حجاب یعنی آڑ اور پردۂ ساز سے مراد وہ پردہ ہے جو کسی ساز پر بندھا ہوتا ہے۔ پردے پر انگلی رکھ کر ساز چھیڑتے ہیں تو اس سے مخصوص سر اور لے پیدا ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ کائنات کی چیزیں جن کو تو حجاب سمجھتا ہے وہ مظاہر قدرت ہیں جن سے حقیقت باری تعالٰی ظاہر ہو رہی ہے اور ہر چیز اس کی ہستی کی گواہی دے رہی ہے۔ بقول سعدی:

برگ درختان سبز در نظرِ ہوشیار
ہر ورقی دفتریست معرفتِ کردگار

بیدل کہتے ہیں یہ دنیا، دنیائے کثرت ہے۔ جو مظاہر قدرت سے عبارت ہے۔ مگر ہر جگہ کارفرما ہستی صرف ایک خدا کی ہے۔ گویا ہر جگہ خدا ہی خدا ہے اس لئے یہ کثرت جلوۂ وحدت کا حجاب نہیں ہوسکتی۔ جس چیز پر نظر ڈالو گے نگاہ اسی ہستی کے اندر محو ہو جائے گی۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے اینما تولوا فثم وجہ اللہ ''غور سے دیکھا جائے تو اس میں بیدل کے خیال کی پرچھائیں پوری طرح موجود ہے، خصوصیت سے غالب کا دوسرا مصرعہ: ''یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا'' میں بیدل کے دوسرے مصرعہ: ''مژگاں بہر چہ بازکنی دیدہ محو اوست'' کا عکس موجود ہے۔ اس کے علاوہ بیدل کے درج ذیل شعر کا عکس بھی غالب کے اس شعر میں موجود ہے:

ہر گز ندارد ہیچکس پروائے فہمِ خویشتن
رازی وگرنہ اینقدر نا محرمِ رازی چرا

رنگِ شکستہ ، صبح بہار نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا
غالبؔ

دریں گلشن شکستِ رنگ و بوسطریست از حالم
پیام بے نوایاں ، نامۂ برگِ خزاں دارد
بیدلؔ

غالب محبوب کے حسن کی تاثیر پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں عاشق کا رنگ پریدہ یا

شکستہ یعنی اس کی پریشانی اور آشفتگی صبح کے وقت پھول چننے کے دلکش منظر سے ملتی جلتی معلوم ہوتی ہے۔ یہ وقت گلہائے ناز کے کھلنے ،یعنی محبوب کے ناز وادا کے اظہار کا ہے۔ بیدل کہتے ہیں اس گلشنِ دنیا میں شکست رنگ و بو بھی ہم عاشقوں کی سرگذشت کی ایک سطر ہے، برگ خزاں کا خط یا خزان نامہ بے نوایوں اور عاشقوں کے پیغام کا حامل ہوتا ہے۔ غالب کے نزدیک رنگ شکستہ یعنی عاشق کے چہرے کا وہ رنگ جو اڑ جائے دوسرے الفاظ میں اس کا پژمردہ چہرہ موسم بہار کی صبح کا دلکش منظر پیش کرتا ہے جبکہ بیدل کے نزدیک وہ عاشقوں کی مختلف کیفیات میں سے ایک کیفیت کا نام ہے یہ حالت درحقیقت عاشق کا ایک پیغام ہے جس کا حامل ''نامۂ برگ خزاں'' یا خزاں نامہ ہے یعنی کبھی وصال کبھی ہجر، کبھی خوشی اور کبھی غم کا سلسلہ لگا رہتا ہے اس لئے عاشق کو اس سے متاثر نہیں ہونا چاہئے۔ یہاں بیدل کی بات دل سے لگتی ہوئی معلوم ہوتی ہے چنانچہ ایک جگہ کہتا ہے:

رنگ شکستہ آئینہ بے خودی ماست
یارب زبان ما نہ شود ترجمان ما

رنگ شکستہ ہماری بیخودی کا آئینہ دار ہے خدایا ہماری زبان ہماری ترجمان نہ ہو جائے۔ یہاں غالب و بیدل دونوں نے ''رنگ شکستہ عاشق'' کو موضوع بنایا ہے لیکن نتیجہ دونوں نے الگ الگ نکالا ہے۔

تو اور سوئے غیر نظر ہائے تیز تیز	ما ئیم و پاسبانی خلوت سرائے چشم
میں اور دکھ تری مژہ ہائے دراز کا	بیروں روا ے نگاہ کہ ایں خواب گاہ اوست
غالب	بیدل

غالب جذبۂ رقابت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے محبوب تو غیروں کی طرف تیز تیز نگاہوں سے دیکھتا ہے جب کہ یہ نظر عنایت مجھ جیسے عاشق صادق پر ہونی تھی۔ میں ہوں اور تیری لمبی پلکوں کا دکھ ہے یعنی جذبہ رقابت کی وجہ سے یہ پلکیں میرے دل میں چبھ رہی ہیں۔ بیدل بھی اسی جذبۂ رقابت کا اظہار کرتا ہے لیکن انداز بیان غالب سے بہتر ہے۔ بیدل نگاہ کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ یہ ''خلوت سرائے چشم'' محبوب کی خواب گاہ ہے جس کی پاسبانی کا کام ہم انجام

دے رہے ہیں۔ سوائے نگاہ! تو میرے اور محبوب کے درمیان حائل مت ہو اور یہاں سے نکل لے۔ یہاں نگاہ کو اپنا رقیب ٹھہرایا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی شاعر نے کہا ہے:

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن نہ دہم
گوش را نیز حدیث تو شنیدن نہ دہم

یعنی میرے اور محبوب کے درمیان یہ آنکھ اور کان کیوں حائل ہیں۔ میری غیرت انہیں دیکھنے اور سننے نہیں دے گی۔

صرفہ ہے ضبط آہ میں میرا وگرنہ میں
طعمہ ہوں ایک ہی نفسِ جاں گداز کا
غالبؔ

مبادا نالہ ربط داغہائے دل زند برہم
مشوراں اے جنوں ایں شعلہ زنجیر در پا را
بیدلؔ

غالب کہتے ہیں غم عشق میں جو آہ و نالے پر کنٹرول کر رہا ہوں اس میں میرا ہی فائدہ ہے۔ اس کی بدولت میں زندہ ہوں ورنہ ایک جانگداز سانس کا لقمہ ہوں گویا ضبطِ آہ و نالہ میرے حق میں سودمند ہے۔ بیدل کہتے ہیں خدا نہ کرے میرے آہ و نالے داغہائے دل کے ربط کو درہم برہم کریں، اس لئے وہ جنون کو خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس ''شعلہ زنجیر در پا'' میں شورش نہ پیدا کر۔ ''شعلہ زنجیر در پا'' سے مراد وہ آہ و نالے ہیں جن پر کنٹرول کیا ہوا ہے، کیا خوبصورت تعبیر ہے۔ آہ و نالہ گویا ایک شعلہ ہے جب تک ان کو کنٹرول میں رکھیں ان کے پاؤں میں بیڑی پڑی ہے۔ خیال دونوں کا ایک ہے ''ضبط آہ'' کے لئے بیدل ''شعلہ زنجیر در پا'' کی تعبیر اختیار کرتا ہے گویا ضبط آہ میں غالب کے نزدیک یہ فائدہ ہے کہ اس کی زندگی برقرار ہے۔ اور بیدل کے نزدیک یہ فائدہ ہے کہ داغ ہائے دل باہم مربوط ہیں جو عاشق کو محبوب ہیں۔ یہاں سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کے پیش نظر بیدل کا یہ خیال تھا البتہ اس نے اپنا انداز بدل دیا۔

ہیں بس کہ جوش بادہ سے شیشے اچھل رہے
ہر گوشہ بساط ہے سر شیشہ باز کا
غالبؔ

زنام مے زبانم مست و بیخود دردہاں افتد
نگاہم رنگ مے پیدا کند از دیدۂ مینا
بیدلؔ

غالب کہتے ہیں شراب میں اس قدر ابال آیا ہوا ہے کہ اس کی وجہ سے شراب کی بوتلیں اچھل کود میں لگی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ شیشہ باز کا سر ہر گوشہ بساط ہے۔ شیشہ باز اس کو کہتے ہیں جو سر پر بوتلیں رکھ کر رقص کرتا ہے پر وہ نہیں گرتی ہیں۔ گویا میخانے کا فرش کیا ہے شیشہ باز کا سر ہے۔ اس میں غالب نے ''جوش بادہ'' کی خصوصیت پر خاص طور سے زور دیا ہے۔ بیدل کہتے ہیں شراب تو خیر شراب ہے یہاں عالم یہ ہے کہ صرف اس کا نام سن کر میری زبان منہ کے اندر مست و بیخود ہو جاتی ہے۔ اور مینا دیکھ کر میری نگاہوں میں شراب کا رنگ پھر جاتا ہے۔ گویا شراب کے نام سے زبان میں مستی اور دیدار جام سے آنکھوں میں اس کا رنگ سما جاتا ہے۔ غالب اور بیدل نے ایک ہی خیال ''شراب کی کیف پرور کرشمہ سازی'' کو بیان کیا ہے، اس فرق کے ساتھ کہ غالب کے نزدیک شراب کے ابال کو دیکھ کر شیشے اچھلنے لگے۔ جبکہ بیدل کے نزدیک اس کے نام ہی سے مستی پیدا ہو گئی۔ یہاں غالب بیدل کی نازک بیانی تک نہیں پہنچ سکے۔

کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز
ناخن پہ قرض اس گرہِ نیم باز کا
غالبؔ

می دہد زخم دل از بیداد شمشیرت نشاں
می تواں فہمید مضمون کتاب از بابہا
بیدلؔ

غالب کہتے ہیں میرا دل ناخن سے کدو کاوش یعنی زخم کو کھودنے کریدنے کا تقاضا کر رہا ہے۔ جس طرح قرض خواہ مقروض سے قرض کی وصولیابی کا تقاضا کرتا ہے گویا کاوش قرض کے درجے میں ہے۔ جس کی ادائیگی ناخن پر واجب ہے۔ گرہ نیم باز سے مراد دل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرے دل کی خواہش ہے کہ ناخن غم زخم دل کو کھود کرید کر اتنا بڑھا دے کہ میرا دل مجسم زخم بن جائے جو عاشق کی معراج ہے۔ بیدل کہتا ہے اے محبوب تیرے عشق کی وجہ سے جو زخم دل کو پہنچا ہے وہ تیری تلوار کے ظلم و جبر کا پتہ دیتا ہے۔ ٹھیک جس طرح ابواب سے کتاب کے مضمون کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ غالب اور بیدل دونوں نے عشق میں دل پر پہنچنے والے زخم کا تذکرہ کیا ہے اس فرق کے ساتھ کہ بیدل کے نزدیک زخم دل محبوب کی بیدادگری کی نشانی ہے جبکہ غالب کے نزدیک زخم دل نہ صرف مطلوب ہے بلکہ اسے بڑھا کر سراپا زخم بن جانے کی تمنا ہے جو عشق کی معراج ہے۔ یہاں غالب

نے ایک نئی بات پیدا کی ہے اور غالب کا خیال بیدل کے خیال سے بہتر معلوم ہوتا ہے۔

تاراج کاوشِ غمِ ہجراں ہوا اسد	شب ہجراں چہ جوئی طاقتِ صبر از من بیدل
سینہ کہ تھا دفینہ گہر ہائے راز کا	کہ آہم می کند سنگِ فلاخن سخت جانی را
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں میرا سینہ جو محبوب کے گہر ہائے راز کا دفینہ تھا جس طرح موتی دفینہ میں پوشیدہ رہتا ہے، تاراج غم ہجراں ہوا یعنی راز عشق جو سینہ میں پوشیدہ تھا غم جدائی کی کلفتوں سے برباد ہوا۔ اور غم ہجراں کی سختی کی وجہ سے وہ راز عشق فاش ہو گیا۔ بیدل کہتے ہیں کہ جدائی کی رات کی سختی کا عالم یہ تھا کہ میرے صبر کا پیانہ چھلکا پڑ تا تھا۔ میری آہ سخت جانی کو سنگ فلاخن بنا رہی تھی۔ سنگ فلاخن اس پتھر کو کہتے ہیں جسے گوپھن میں رکھ کر دشمن پر پھینکتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ میں عاشق چاہے جتنا سخت جان ہوں اور حالات سے نبرد آزما ہونے کی مجھ میں چاہے جتنی سکت ہو، میری آہ اس سے زیادہ سخت واقع ہوئی ہے، کہ اس سخت جان عاشق کو بھی گوپھن کا پتھر بنا کر پھینک دیتی ہے۔ یہاں غالب اور بیدل دونوں نے شب جدائی کے غم کی سختی اور نا قابل تحمل ہونے کا رونا رویا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ غالب نے شدت غمِ جدائی کو راز عشق کے فاش ہونے کا ذریعہ قرار دیا۔ جبکہ بیدل کے نزدیک شب ہجراں کی سختی سے پیدا ہونے والی آہ بڑے بڑے سخت جان عاشق کے صبر کا پیانہ چھلکا دیتی ہے غور سے دیکھا جائے تو بیدل کے شعر کا عکس غالب کے شعر میں موجود ہے۔

گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب	در جنوں حسرتِ عیشِ دگر از بیخبریست
آستین میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں نشتر کھلا	موئے ژولیدہ ہماں سایہ بیدست اینجا
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں اگر چہ میں عاشق و دیوانہ ہوں پر عقل و ہوش سے بیگانہ بھی نہیں ہوں کہ محبوب کی فریب دہی کا شکار ہو جاؤں، جس کے ہاتھ میں نشتر کھلا ہوا ہے، جو دیوانگی کو دور کرنے

کے لئے لگایا جاتا ہے، اور ہمدردی کی علامت ہے، پر اس کی آستین میں خنجر چھپا ہوا ہے۔ یعنی منافق ہے۔ اس لئے منافق دوست محبوب سے میں ہمیشہ محتاط رہتا ہوں۔ بیدل کہتے ہیں کہ عالم دیوانگی میں کسی اور عیش کی تمنا کرنا درحقیقت عشق کی اہمیت سے بیخبری اور لاعلمی کی علامت ہے۔ یہاں تو زلف ژولیدہ یعنی عاشق کی الجھی ہوئی زلف سایۂ بید کی حیثیت رکھتی ہے۔ بید ایک درخت کا نام ہے جس میں میوہ نہیں ہوتا ہے اور سایہ دار ہوتا ہے۔ اس کو مجنوں سے تشبیہ دیتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح بید ہرا بھرا اور سبز و شاداب رہتا ہے اسی طرح عالم جنوں میں زلف ژولیدہ بھی سبز و شاداب نظر آتی ہے۔ بیدل کے نزدیک جنون کی حد وہ ہے جہاں عقل کی کارفرمائی موقوف ہو جاتی ہے۔ غالب کے نزدیک جنون کے عالم میں بھی عاشق عقل سے بیگانہ نہیں ہوتا، یہاں بیدل کا خیال زیادہ درست معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ عشق و عقل میں سدا تضاد رہا ہے، بیدل نے حضرت بلال اور ان جیسے دوسرے بزرگوں کے بابت کہا ہے:

عقل و حس، سمع و بصر، جان و جسد
ہمہ عشق است ھو اللہ احد

عقل و حس اور سمع و بصر کا تقاضا تھا کہ جان بچانے کے لئے کلمہ کفر زبان سے نکال لیتے اور شریعت اس کی اجازت بھی دیتی ہے مگر عشق ھو اللہ احد تقاضائے عقل و حس پر غالب رہا۔

گو نہ سمجھوں اس کی باتیں گو نہ پاؤں اس کا بھید
پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھلا
غالب

تمکیں کجا کہ سعی خرامت رضا دہد
کم نیست اینکہ نام تو ام بر زباں گذشت
بیدل

غالب کہتے ہیں محبوب کی باتیں گو ہمارے پلے نہ پڑیں اور اس کے رازہائے سربستہ کا سراغ گو مجھے نہ ملے پر یہ امر بھی کیا کم اہم ہے کہ وہ پری پیکر مجھ سے کھلا یعنی بے تکلف ہو کر اس نے مجھ سے بات چیت کی۔ بیدل کہتے ہیں اے محبوب تیری تمکنت (غرور حسن) چل کر مجھ تک آنے کی تجھے کہاں اجازت دے گی۔ پر یہ کیا کم ہے کہ تیری زبان پر میرا نام آ گیا۔ خیال دونوں کا ایک ہے لیکن تعبیر الگ الگ ہے۔ محبوب کی بات کا نہ سمجھنا اور اس کا راز نہ پانا درحقیقت اس کی

تمکین کا نتیجہ ہے۔لیکن بیدل کے خیال میں ایسی حالت میں اس کی زبان پر عاشق کا نام آجانا ہی بہت بڑی بات ہے۔جبکہ غالب کے خیال میں اس کا بے تکلف ہوکر بات کرنا بڑی بات ہے۔اس میں غالب کے مصرعہ

"پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھلا"

کو بیدل کے مصرعہ

کم نیست اینکہ نام تو ام برزباں گذشت

سے موازنہ کرکے دیکھئے تو اس کی چھاپ صاف نظر آئے گی۔راقم السطور نے بیدل کے شعر کا منظوم ترجمہ کرنے کی سعی غیر مشکور کی ہے۔

تمکیں کہاں سے دے گی اجازت خرام کی
ہے کم نہیں زبان پہ تری نام ہے مرا

منہ نہ کھلنے پر وہ عالم ہے کہ دیکھا ہی نہیں	از برگ گل بہ معنیِ نکہت رسیدہ ایم
زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا	مارا بجلوہ ہائے تو کرد آشنا نقاب
غالب	بیدلؔ

غالب کے خیال کا خلاصہ یہ ہے کہ نقاب میں زلف سے زیادہ کشش ہوتی ہے۔محبوب نے رخ سے نقاب نہیں ہٹایا اس پر بھی اس کے حسن و جمال کا عالم یہ ہے کہ کہیں اور نظر نہیں آتا۔اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس شوخ کے منہ پر نقاب کی کشش زلف کی کشش سے کہیں بڑھ کر ہے۔بیدل کہتے ہیں جس طرح پھول کی پنکھڑی سے اس کی خوشبو تک ہماری رسائی ہوتی ہے اسی طرح تیرے نقاب نے تیرے جلوے کا تعارف مجھ سے کرادیا۔بیدل اور غالب دونوں نے نقاب کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔لیکن غالب کے کلام میں زیادہ لطف ہے۔بیدل نے نقاب کو حسن رخ محبوب کا تعارف کرانے والا قرار دیا۔جبکہ غالب نے ایک موازنہ کے ذریعہ نقاب کی اہمیت واضح کی کہ محبوب کے چہرے پر زلف پریشاں بکھری ہو تو اس کی اتنی کشش نہیں ہوتی ہے جتنی نقاب کی وجہ سے اس میں کشش ہوتی ہے۔یہاں غالب کے مصرع "زلف سے بڑھ کر نقاب

اس شوخ کے منہ پر کھلا'' کو بیدل کے مصرع ''مارا بجلوہ ہائے تو کرد آشنا نقاب'' سے موازنہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ غالب کے تحت الشعور میں بیدل کی یہ فکر کام کر رہی تھی۔

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا	ز دستِ لطف و عتابت در آتش و آبم
جتنے عرصے میں میرا لپٹا ہوا بستر کھلا	بہشت و دوزخ من کردہ اندخوئے ترا
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کے خیال کا خلاصہ یہ ہے کہ محبوب نے میری درخواست پر اپنے آستانے پر قیام کی اجازت تو دے دی لیکن جب لپٹا ہوا بستر کھولا تو اپنی بات سے مکر گیا اور وہاں سے اٹھ جانے کا حکم دیا۔ بیدل کہتے ہیں اے محبوب تیرے لطف و عتاب کی متضاد عادت نے مجھے پانی اور آگ میں بٹھا رکھا ہے۔ تیری اس عادت نے میرے لئے بہشت اور دوزخ کو جنم دیا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب نے بھی محبوب کی اسی متضاد عادت کا تذکرہ کیا ہے۔ غالب کے مصرعہ ''در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا'' کو بیدل کے مصرعہ ''ز دستِ لطف و عتابت در آتش و آبم'' سے ملا کر پڑھئے تو واضح ہوگا کہ غالب کے خیال کا سرچشمہ بیدل کا یہ شعر ہے۔ لیکن غالب کا بیان زیادہ خوبصورت ہے۔

کیا رہوں غربت میں خوش جب ہو حوادث کا یہ حال	دوروزی با غم و رنج حوادث صبر کن بیدل
نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھلا	غریبی در دیارِ بیکسی یادِ وطن دارد
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کے خیال کا خلاصہ یہ ہے کہ پردیس میں کیونکر ہنسی خوشی زندگی گذار سکتا ہوں جبکہ حوادث کے نزول کا عالم یہ ہے کہ قاصد اکثر خطوط کو کھلا لایا کرتا ہے۔ قاصد کی معرفت جو خطوط بھیجے جاتے ہیں وہ عموماً مہر بند ہوتے ہیں لیکن کھلا لانے کا مطلب ہے کوئی وحشت ناک خبر ہے۔ بیدل کہتا ہے کہ ایک مسافر کو پردیس میں عالم بیکسی میں وطن کی یاد آتی ہے اے بیدل دو دن حوادث کے رنج و غم پر صبر کر۔ عالم غربت کو بیدل دیار بیکسی کہتا ہے جہاں خوشی و مسرت کے بجائے

رنج وغم سے سابقہ پڑتا ہے۔ اور یہ بات قرین قیاس ہے۔ اس لئے کہتا ہے کہ ان دو روزہ تکلیف پر صبر کر۔ جبکہ غالب عالم غربت میں خوشی کے امیدوار ہیں۔ مگر خلاف توقع مصائب کا نزول ہے یہاں غالب اور بیدل دونوں کے یہاں ''غربت''، ''وطن'' اور ''حوادث'' کے الفاظ کا استعمال ہوا ہے۔ جس سے غالب کی بیدل کے کلام سے اثر پذیری واضح ہوتی ہے۔ البتہ دونوں کا اپروچ الگ الگ ہے۔

اس کی امت میں ہوں میں، میرے رہیں کیوں کام بند
واسطے جس شہ کے غالب گنبد بیدر کھلا

غالب

دو روزی فرصت آموزد درود مصطفیٰ مارا
کہ پیش از مرگ در دنیا بیامرزد خدا مارا

بیدلؔ

غالب کا خیال ہے کہ چونکہ ہم اس رسول برحق کی امت میں ہیں جن کیلئے معراج کے وقت آسمان کا یہ گنبد بیدر کھلا، اس لئے میرے کام کیوں بند ہوں یعنی میرا ہر کام بنے گا اور اس میں رکاوٹ نہیں ہوگی۔ حالانکہ آپ کی امت میں ہونے سے لازم نہیں آتا کہ انسان کے سارے کام بن جائیں، خود غالب کے سارے کام نہیں بنے۔ کتنے مسائل ہیں جن سے زندگی بھر وہ الجھتے رہے۔ چنانچہ کہتے ہیں:

فکر دنیا میں سر کھپاتا ہوں
میں کہاں اور یہ وبال کہاں

۱۸۲۸ء سے ۱۸۶۸ء تک بلا مبالغہ فکر دنیا میں سر کھپاتے رہے۔ بیدل کہتے ہیں اس دنیا میں ہم کو صرف دو دن کی مہلت ملی ہوئی ہے۔ اس دو دن کی مہلت ہم کو یہ سکھاتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود وسلام بھیجنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ دیں۔ تا کہ اس کے طفیل اللہ تعالیٰ موت سے پہلے اس دنیا ہی میں ہمارے گناہ بخش دے۔ یہاں بیدل اور غالب دونوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں ہونے کا ذکر کیا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ غالب نے آپ کی امت میں ہونے کی وجہ سے اپنے کام بند نہ ہونے کی آس لگائی جبکہ بیدل نے اپنی دو روزہ فرصت زندگی میں اپنی بخشائش کے لئے حضورؐ پر درود وسلام کی اہمیت جتائی۔

واں کرم کو عذر بارش تھا عناں گیر خرام	من و در خاک غلطیدن، تو و حالم نہ پرسیدن
گریہ سے یاں پنبہ بالش کفِ سیلاب تھا	بعاشق آنچناں زیبد، بہ دلدار ایں چنیں باید
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کے خیال کا خلاصہ یہ ہے کہ محبوب آنا چاہتا تھا مگر اس کی تشریف آوری میں بارش کا عذر اس کے لئے مانع خرام تھا۔ ادھر اس کی جدائی میں میری گریہ وزاری کا یہ عالم تھا کہ تکیہ کی روئی کفِ سیلاب کی شکل اختیار کرگئی۔ یعنی شدت گریہ سے روئی بھیگ کر بہہ رہی ہے جس طرح سیلاب کا جھاگ بہتا رہتا ہے۔ بیدل کہتے ہیں کہ تیری جدائی میں میرا حال یہ ہے کہ میں خاک لوٹ پلٹ کررہا ہوں اور تیرا حال بے نیازی میں یہ ہے کہ میری مزاج پرسی بھی تجھے گوارا نہیں۔ بات یہ ہے کہ عاشق کو وہی زیب دیتا ہے اور معشوق کو یہی مناسب ہے۔ غالب اور بیدل دونوں نے ''عاشق ومعشوق کے واردات'' کی ترجمانی کی ہے پر بیدل کا بیان فطری معلوم ہوتا ہے کیونکہ معشوق ہمیشہ اپنی بے نیازی اور عاشق اپنی نیازمندی کے لئے مشہور ہے۔ اس لئے معشوق کا بارش کے عذر سے نہ آنے کا تذکرہ اس کی بے نیازی کو ظاہر نہیں کرتا۔ چنانچہ بیدل کا ایک شعر ہے:

صد قیامت گر برآید بر نخواہد آمدن
عاشق از ذوق طلب معشوق از استغنای حسن

واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال	اینجا جواب نامہ عاشق تغافل است
یاں ہجومِ اشک میں تارِ نگہ نایاب تھا	بیہودہ انتظار خبر می کشیم ما
غالبؔ	بیدلؔ

غالب نے محبوب کے انتظار میں عاشق کی شدت گریہ کا تذکرہ کیا ہے کہ ادھر معشوق کو خود آرائی کی خاطر بالوں میں موتی پرونے کی فکر سوار تھی ادھر عاشق شدت گریہ کی وجہ سے آنسوؤں کے موتی کو تارِ نگہ میں پرو رہا تھا۔ اور اس کثرت سے اس نے موتی پروئے کہ تارِ نگہ نظروں سے اوجھل ہوگیا، گویا عاشق محبوب کے انتظار میں شدت گریہ میں مبتلا تھا۔ بیدل کہتے ہیں عاشق کی نیازمندی اور معشوق کی بے نیازی کی بنا پر عاشق کے محبت نامے کا جواب معشوق کی طرف سے تغافل

یعنی دانستہ غفلت برتتا ہے پھراس کی آمد یااس کے خط کے جواب کا انتظار کرنا ایک بیہودہ اور عبث فعل ہے۔ چنانچہ دوسری جگہ کہتا ہے:

درمحبت آرزو را اعتبار دیگراست
ایں حریفاں وصل می خواہند و بیدل انتظار

محبت میں آرزو کا کچھ اور ہی اعتبار ہے۔ احباب وصل کے خواہاں ہیں مگر بیدل انتظار کا طالب ہے۔

جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آب جو
یاں رواں مژگانِ چشم تر سے خونِ ناب تھا
غالبؔ

دل را غم وداع تو در خوں نشاندہ بود
حالی خوشی نداشت کہ گویم چہ حال داشت
بیدلؔ

غالب کہتے ہیں محبوب نے ادھر اپنے جلوے سے نہر کو چراغاں کر رکھا تھا اور ادھر مجھ عاشق کا حال جدائیِ محبوب میں یہ تھا کہ میری اشک بار آنکھوں کی پلکوں سے آنسو نہیں بلکہ خالص خون بہہ رہے تھے۔ یعنی میں اس کی جدائی میں خون کے آنسو بہا رہا تھا۔ بیدل کہتے ہیں اے محبوب تیری جدائی کے غم نے دل کو خون کے آنسو بہانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کی کوئی اچھی حالت نہ تھی کہ کہوں اس کا کیا حال ہے۔ غالب کا دوسرا مصرع "یاں رواں مژگاں چشم تر سے خوں ناب تھا" بیدل کے پہلے مصرع "دل راغم وداع تو درخوں نشاندہ بود" کا آزاد ترجمہ ہے۔ غالب نے اسی خیال کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے کہ معشوق کا وہ حال تھا اور عاشق کا یہ حال۔

یاں سرِ پرشور بے خوابی سے تھا دیوار جو
واں فرقِ ناز محو بالشِ کمخواب تھا
غالبؔ

صد قیامت گر بر آید بر نخواہد آمدن
عاشق از ذوق طلب معشوق از استغنائے خویش
بیدلؔ

یہاں عاشق و معشوق کی متضاد حالت کا نقشہ کھینچتے ہوئے غالب کہتے ہیں کہ ادھر عاشق کا حال یہ تھا کہ اس کا پرشور سر بے خوابی کے عالم میں در و دیوار سے ٹکرانا چاہتا تھا اور ادھر محبوب کے ناز کا حال یہ تھا کہ کمخواب کے تکیے پر سر رکھ کے خواب شیریں کے مزے لے رہا تھا گویا عاشق کے

نیاز اور معشوق کی بے نیازی کا تذکرہ منظور ہے۔ بیدل کہتے ہیں اگر سو قیامت بھی برپا ہو جائے تو عاشق ذوق طلب سے اور معشوق اپنی بے نیازی کی کیفیت سے باہر نہیں نکل سکتا۔ یعنی دونوں کے اندر نیاز و ناز کی فطری خصوصیت کو کسی بھی قیمت پر دور نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ بیدل کہتے ہیں:

عمریست وفا ممتحن ناز و نیاز است
نے تیغ ز دستِ تو جدا شد ، نہ سر از ما

وفاداری ایک عرصہ سے ناز و نیاز دونوں کا امتحان لے رہی ہے۔ نہ تو تلوار تیرے ہاتھ سے جدا ہوئی نہ سر ہمارے ہاتھ سے الگ ہوا۔

غالب نے اس مضمون کو شاعرانہ انداز سے پیش کیا ہے جبکہ بیدل نے نہایت سادگی سے بیان کیا ہے۔ لیکن جگر کا ایک شعر اس کے خلاف ہے۔

نیاز و ناز کے جھگڑے مٹائے جاتے ہیں ⠀⠀ وہ ہم میں اور ہم ان میں سمائے جاتے ہیں

یاں نفس کرتا تھا روشن شمع بزم بیخودی ⠀⠀ از دور باشِ ادب محرمی مپرس
جلوۂ گل واں بساطِ صحبت احباب تھا ⠀⠀ با غیر جلوہ سازد و با آشنا نقاب
غالبؔ ⠀⠀ بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ محبوب کی جدائی میں ادھر عاشق کی سانس بیقراری کی شمع روشن کئے تھی اور ادھر محبوب دوست احباب یا رقیبوں کے ساتھ گفتگو میں محو ہو کر زندگی کا لطف لے رہا تھا۔ بیدل کہتے ہیں ادب محرمی کی دور باشی کا حال مجھ سے مت پوچھو محبوب غیر کے ساتھ جلوہ آرائی کرتا ہے اور دوست آشنا کے سامنے منہ پر نقاب ڈالے رہتا ہے۔ ادب محرمی کی دور باشی کیا ہے؟ میرے ناقص خیال میں عشق میں ادب کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اس کی آگ میں جلے پر زبان سے کچھ نہ کہے، جیسا کہ پروانے کی اس خصوصیت کے بارے میں شیخ سعدی نے کہا ہے کہ:

اے مرغ سحر عشق ز پروانہ بیاموز
کاں سوختہ را جاں شد و آواز نیامد

اس ادب محرمی کا تقاضا تھا کہ اگرچہ محبوب غیر کے ساتھ جلوہ آرائی اور مجھ سے پردہ پوشی کر رہا ہے پر

زبان سے اس کا گلہ نہ کرتا۔ دیکھا جائے تو غالب کا پورا شعر بیدل کے مصرع ''باغیر جلوہ ساز دو با آشنا نقاب'' کا آزاد ترجمہ ہے۔

ناگہاں اس رنگ سے خونابہ ٹپکانے لگا	زباغ عافیت رنگ امیدی نیست عاشق را
دل کہ ذوق کاوش ناخن سے لذت یاب تھا	محبت غیر خوں گشتن نمی دانم چہ می باشد
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ میرا دل جو عشق ومحبت کے ناخن کی کاوشوں سے مزہ لے رہا تھا اچانک اس انداز سے خون کے آنسو بہانے لگا۔ یہاں خونابہ دردناک اشعار سے بھی کنایہ ہوسکتا ہے، تب مطلب یہ ہوگا کہ عاشق کا دل جو غم عشق کے ناخن کے کریدنے سے لطف لے رہا تھا اچانک اب دردناک اشعار کہنے لگا۔ یعنی غزل گوئی کا محرک ثابت ہوا۔ بیدل کہتا ہے عاشق کو باغ عافیت کی کوئی امید نہیں ہوتی یعنی وہ صدا بیتاب و بے قرار رہتا ہے۔ جسے عشق ومحبت کہتے ہیں وہ خون کے آنسو بہانے کے سوا کسی اور چیز کا نام ہے، مجھے نہیں معلوم۔ یہاں ''عشق میں خون کے آنسو بہانے'' کی بات دونوں کے یہاں مشترک ہے بلکہ غالب کے پہلے مصرع ''ناگہاں اس رنگ سے خونابہ ٹپکانے لگا'' میں بیدل کے دوسرے مصرع ''محبت غیر خوں گشتن نمی دانم چہ می باشد'' کی چھاپ ہے۔ لیکن غالب نے اس میں اپنے مخصوص انداز سے نکتہ آفرینی کرکے اس مضمون کو زیادہ دلکش بنادیا۔

مقدمِ سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے	دوش سیلابِ خیالت می گذشت از خاطرم
خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا	خانۂ دل برسرِ رہ بود، ویراں کرد و رفت
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ گھر میں سیلاب کی آمد سے گھر کی تباہی اور ویرانی کو دیکھ کر میرا دل بہت خوش تھا۔ گویا وہ جلترنگ تھا جس سے پانی کے چلنے کی آواز اور نغمے نکل رہے تھے۔ اور میرا دل اس سے خوش ہورہا تھا۔ بیدل کہتے ہیں رات کو تیرے خیال کا سیلاب جب میرے دل سے

گذرا تو خانۂ دل چونکہ سرِ راہ واقع تھا اسے ویران کر کے روانہ ہو گیا۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کے کلام میں بیدل کے اس خیال کی چھاپ پوری طرح موجود ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ بیدل کے نزدیک سیلاب کا تصور خانۂ دل کو جو سرِ راہ واقع تھا بہا لے گیا۔ جبکہ غالب کے نزدیک سیلاب نے خانۂ عاشق کو تباہ کر کے اپنی صدائے آب سے عاشق کا دل خوش کر دیا۔ یہاں لفظ سیلاب، خانہ عاشق، خانہ دل وغیرہ الفاظ کا استعمال بتاتا ہے کہ غالب کے نہاں خانۂ دماغ میں بیدل کا یہ شعر موجود تھا۔

نازشِ ایامِ خاکستر نشینی کیا کہوں
پہلوئے اندیشہ وقفِ بسترِ سنجاب تھا
غالبؔ

کافرم گر مخمل و سنجاب می باید مرا
سایہ بیدی کفیلِ خواب می باید مرا
بیدلؔ

غالب کا خیال ہے خاکستر نشینی (راکھ پر بیٹھنا) یعنی قناعت و سیر چشمی کے دونوں پر مجھے فخر ہے اس کا تذکرہ کیا کروں بس یہ سمجھئے کہ پہلوئے اندیشہ سنجاب کے بستر پر محوآرام ہے۔ سنجاب کہتے ہیں سمور کو جس کی کھال مخمل کی طرح نرم و گداز ہوتی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ قناعت و سیر چشمی کے عالم میں خود کو فرش مخمل پر محو خواب سمجھتا تھا۔ بیدل کہتے ہیں اگر کہوں کہ مجھے مخمل اور سنجاب کا فرش چاہئے تو میں کافر کہلاؤں، مجھے تو سونے کے لئے سایۂ بید کافی ہے یعنی بید کے سایہ تلے میں بے تکلفی سے محو خواب ہو جاتا ہوں۔ پر تکلف اور عیش پرستانہ زندگی مجھے پسند نہیں ہے۔ غالب اور بیدل دونوں سادہ اور بے تکلف زندگی پر قناعت کے قائل ہیں۔ غالب کے نزدیک یہ بات باعث فخر و مباہات ہے جبکہ بیدل کے نزدیک اس کی زندگی کا اصول ہے، جس پر چل کر اس نے دکھا دیا۔ غالب کے نزدیک وہ قابل فخر سہی مگر زندگی بھر وہ امیرانہ زندگی کی کوشش میں لگے رہے۔

کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے ورنہ یاں
ذرہ ذرہ روکشِ خورشید عالم تاب تھا
غالبؔ

بیدل از شیوۂ کیفیتِ خورشید مپرس
حق نہاں نیست ولے خیرہ نگاہاں کورند
بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ محبوب کا جلوہ اور اس کی وحدت کی نشانی تو ہر جگہ موجود تھی مگر میرا عشق ہی نارسا تھا جس کی وجہ سے وہ ہر ذرے کو جو خورشید عالم تاب سے مستفید تھا اور اس کا پرتو بنا ہوا ہے، نہ دیکھ سکا۔ بیدل کہتے ہیں کہ خورشید کی کیفیت کے انداز کے بابت مجھ سے مت دریافت کرو۔ حق نظروں سے اوجھل نہیں ہے لیکن جن کی آنکھیں چندھیا گئی ہیں وہ اندھے ہیں اسے دیکھ نہیں پاتے۔ مضمون ایک ہے کہ خدا کی وحدت وقدرت کا جلوہ ہر جگہ موجود ہے لیکن غالب کے نزدیک ہمارا جنوں نارسا ہے اس لئے اسے دیکھ نہیں پاتے اور بیدل کے نزدیک ہم اپنی خیرہ نگاہی اور بے بصری سے اسے دیکھ نہیں پاتے۔ ع

دو عالم جلوہ است و بے بصر دشوار می بیند

اب اگر جنون نارسا یا خیرہ نگاہ پر غور کیجئے تو نتیجہ ان دونوں کا ایک ہی نکلے گا۔ بلکہ غالب کے پورے شعر میں بیدل کے شعر کی جھلک پوری طرح موجود ہے۔

آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے	شیوۂ تغافل خوشست ورنہ ایں برق حسن
کل تلک تیرا بھی دل مہر وفا کا باب تھا	تاتو نظر کردہ ای آئینہ خاکستر است
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کل تک تیرا دل مہر وفا کا باب تھا یعنی عشق ومحبت میں وفاداری کو نبھا رہا تھا اور اپنے چاہنے والوں کے عاشقانہ جذبات کا حسب خواہ جواب دے رہا تھا۔ آج اپنے عاشقوں کی تجھے کچھ بھی پروا نہیں، ایسا کیوں ہوا۔ یعنی محبوب کے تغافل کا شکوہ ہے۔ بیدل کہتے ہیں شیوۂ تغافل اچھی بات ہے ورنہ اس برق حسن پر جب تک تم نظر ڈالو گے آئینہ دل خاکستر ہوجائے گا۔ اسی کے قریب غالب نے فارسی میں کہا ہے:

تغافلہای یارم زندہ دارد ورنہ در بزمش
بہ جرم گریہ بی اختیارم می توان کشتن

ایک دوسرے شعر میں بیدل نے کہا ہے:

اینجا جوابِ نامۂ عاشق تغافل است
بیہودہ انتظار خبر می کشیم ما

عاشق کے خط کا جواب تغافل ہے بلاوجہ ہم اس کے جواب کا انتظار کر رہے ہیں۔ غالب نے محبوب کے تغافل کا شکوہ کیا ہے، جبکہ بیدل اسے اس کی ایک لائق تعریف خصوصیت قرار دیتا ہے کیونکہ اس کے برق حسن کی تاب لانے کی صلاحیت عاشق کے اندر نہیں ہے۔

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن	سر بازیِ عشاق بہ بزم تو تماشاست
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک	ہر چند نباشد بمیاں پائے تغافل
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کے شعر کا مطلب واضح ہے کہ اے محبوب ہم نے تسلیم کیا کہ تم کو جب ہماری نازک حالت کی خبر ہوگی تو دانستہ غفلت نہ برتو گے۔ پر جب تک ہماری نازک حالت کی خبر تم کو پہنچے گی ہم خاک میں مل چکے ہوں گے۔ بیدل کہتے ہیں عاشقوں کی سربازی اور فداکاری اے محبوب! تیری بزم میں ایک تماشا ہے، گو کہ اس میں تیرے تغافل کا پہلو نہ ہو۔ اب غور سے دیکھا جائے تو غالب کا مصرعہ ''ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن'' بیدل کے مصرعہ ''ہر چند نباشد بمیاں پائے تغافل'' کا بالکل لفظی ترجمہ ہے لیکن دوسرے مصرع میں غالب اور بیدل الگ ہو گئے۔ غالب کہتے ہیں تم کو جب تک میری خبر پہنچے گی ہم خاک میں مل چکے ہوں گے۔ بیدل کہتے ہیں تیری بزم میں عاشقوں کی فداکاری روز مرہ کا ایک تماشا اور معمول ہے، گو اس میں تیرے تغافل کا دخل نہ ہو۔ صاف واضح ہے کہ غالب کے نہاں خانہ دماغ میں بیدل کا یہ شعر تھا۔

یاد کر وہ دن کہ ہر اک حلقہ تیرے دام کا	دلبراں را تنگ دارد فکر صید عاشقاں
انتظار صید میں اک دیدۂ بیخواب تھا	غنچہ سر تا پا قفس شد از برائے عندلیب
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں اے محبوب وہ دن بھی یاد کر جب تیرے دام زلف کا ہر حلقہ شکار کے انتظار میں دیدۂ بیخواب بنا ہوا تھا۔ یعنی لوگوں کو اپنے دام عشق میں پھنسانے کی فکر ہر وقت تیری نیند اڑائے دیتی تھی۔ بیدل کہتے ہیں عاشقوں کو دام عشق میں گرفتار کرنے کی فکر حسینوں کو سدا

پریشان کیے رہتی ہے۔ چنانچہ بلبل اور گل میں جو معاشقے کا رشتہ ہے اس کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہتا ہے کہ کلی بلبل کے لئے سراپا قید خانہ ثابت ہوئی۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کا پورا شعر بیدل کے ایک مصرع "دلبراں رانتگ دارد فکر صید عاشقاں" کا کچھ اضافہ کے ساتھ آزاد ترجمہ ہے۔

ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا
غالب

بہ خوں می غلطم از اندیشۂ نازِ سیہ مستی
کہ چشمِ شوخِ او در جامِ مئے حل کرد افیوں را
بیدل

غالب کا خیال ہے کہ میرے پاس خونِ جگر کا جو سرمایہ تھا وہ درحقیقت محبوب کی پلکوں کی امانت تھی۔ اس لئے ایک ایک قطرے کا مجھے حساب دینا پڑا کہ اسے کہاں صرف کیا۔ اس میں "خونِ جگر کا حساب" موضوع ہے۔ بیدل کہتا ہے اس کی سیہ مستی (غیر معمولی مستی) کے ناز کا محض تصور کر کے میں خون میں تڑپ رہا ہوں کیونکہ اس کی شوخ آنکھوں نے جامِ مئے میں افیون گھول دیا ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ محبوب کی نشیلی آنکھوں کا جادو عاشقوں پر چلتا ہے۔ اور عاشق اس کے تیر نگاہ کا گھائل ہو کر خون میں تڑپتا ہے۔ چنانچہ بیدل نے ایک شعر میں اس طرف اشارہ کیا ہے۔

تیغ مژگانت بآب ناز دامن می کشد
چشم مخمورت بخونِ تاک می بندد حنا

غالب کا یہ کہنا کہ خونِ جگر مژگان یار کی امانت تھی اس لئے اس کے ایک ایک قطرے کا مجھے حساب دینا پڑا، ایک ایسا نکتہ ہے جو سراسر مفروضے پر قائم ہے جبکہ بیدل کا خیال حقیقت سے ہم آہنگ ہے۔

اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو
توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا
غالب

رہِ آوارگی عمریست می پویم نشد یارب
کہ چوں تمثال یک آئینہ وارم دل شود پیدا
بیدل

غالب کہتے ہیں تو نے آئینہ دل کو کیا توڑا ایک ایسی چیز توڑ دی جس میں تیری تمثال رہتی تھی۔لہٰذا اب میں ایک پورے شہر آرزو کا ماتم کر رہا ہوں۔ بیدل کہتے ہیں خدایا ایک عرصہ سے آوارگی کی راہ طے کر رہا ہوں، پر اس کا سلسلہ ختم ہونے میں نہیں آتا کیونکہ دل تمثال آئینہ کی طرح ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ آئینہ میں جو عکس نظر آتا ہے اسے تمثال کہتے ہیں۔ چنانچہ بیدل کہتا ہے ''چیز یکہ در آئینہ تواں دید مثال است'' آئینہ کے سامنے جتنی شکلیں آتی رہیں گی ان کا عکس اس میں نمایاں ہوتا رہے گا۔ بیدل کہتا ہے دل اگر ٹوٹ گیا تو تمثال آئینہ کی طرح وہ پھر نمایاں ہو گیا۔اس طرح دل کے ہاتھوں ایک عرصہ سے آوارہ ہوں، اور اس کا سلسلہ ختم ہوتا نظر نہیں آتا۔غور سے دیکھا جائے تو غالب کے دوسرے مصرعہ ''توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا'' میں بیدل کے دوسرے مصرعہ ''کہ چوں تمثال یک آئینہ وارم دل شود پیدا'' کا عکس موجود ہے۔مگر نتیجہ دونوں نے الگ الگ نکالا۔غالب کے نزدیک تمثال دار آئینۂ دل کے ٹوٹنے سے تیری تمثال بھی جاتی رہی۔اس لئے ماتم کناں ہوں۔ بیدل کہتے ہیں تمثال آئینہ کی طرح دل برابر نمایاں ہوتا رہتا ہے اس لئے اس کے ہاتھوں آوارگی کا سلسلہ بھی غیر منتہی ہو گیا ہے۔

عمریست وفا ممتحنِ ناز و نیاز است	موجِ سراب دشت 'وفا' کا نہ پوچھ حال
نے تیغ ز دست تو جدا شد نہ سر از ما	ہر ذرہ مثل جوہرِ تیغ آبدار تھا
بیدلؔ	غالبؔ

غالب کہتے ہیں دشت وفا کی موج سراب کا حال نہ پوچھو، یہاں وفا کو دشت سے تشبیہ دی ہے۔ پھر دشت میں سراب یعنی ریت ہوتی ہے جس پر دور سے دریا کا گمان ہوتا ہے۔اس طرح لفظ سراب دھوکا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ عشق میں وفاداری اور پائیداری کے دھوکے کا حال نہ پوچھو۔اس کا ہر ذرہ تیغ آبدار کے جوہر کی حیثیت رکھتا تھا یعنی بہت ہی تکلیف دہ تھا۔ بیدل کہتے ہیں وفاداری ایک عرصہ سے ناز و نیاز کا ممتحن بنی ہوئی ہے نہ تو تلوار تیرے ہاتھ سے جدا ہوتی ہے اور نہ سر ہمارے قبضہ سے الگ ہوتا ہے۔محبوب کے ناز کا تقاضا ہے کہ ہر وقت تیغ بہ کف عاشق کو قتل کرنے پر آمادہ رہے اور عاشق کی نیازمندی کا تقاضا ہے

کہ وہ اپنا سر سامنے لئے کھڑا رہے۔اس طرح دیکھا جائے تو وفاداری معشوق کے ناز اور عاشق کے نیاز دونوں کا امتحان لے رہی ہے۔یہاں ''عشق میں وفاداری'' کا مضمون غالب اور بیدل دونوں کے یہاں ہے، پر بیدل کے یہاں زیادہ اچھوتے انداز میں ہے۔کیونکہ وفاداری دونوں طرف سے مطلوب ہے،اور وفاداری کا امتحان دونوں طرف سے ہوتا ہے، یہ موج سراب کی طرح کوئی دھوکے کی چیز نہیں ہے جس کا ہر ذرہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔

کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو پر اب
دیکھا تو کم ہوئے پہ غمِ ورزگار تھا
غالب

اے دلِ دیوانہ کارت با غمِ عشق اوفتاد
در چہ مزرع کشت ذوقِ سینہ چاکی دانہ را
بیدل

غالب کا خیال ہے کہ غم عشق کو ہم کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے،خیال تھا کہ عاشق کو اس سے تو واسطہ پڑتا ہی رہتا ہے۔لیکن جب اس سے پالا پڑا اور اسے جانچا پرکھا تو کم ہونے پر بھی غم روزگار کی طرح سخت معلوم ہوا۔بیدل کہتے ہیں اے دل دیوانہ تیرا واسطہ غم عشق سے پڑا ہے، بھلا دیکھ تو تیرے ذوق سینہ چاکی نے دانۂ عشق کو کس کھیت میں بویا ہے۔یعنی غم عشق کو معمولی نہ سمجھو۔ذوق سینہ چاکی نے دانۂ عشق کو دل کے کھیت میں بویا ہے۔اور دانہ جب بویا جاتا ہے تو اس سے پودا نکل کر پروان چڑھتا رہتا ہے اور اس سے شاخ و برگ نکلتے ہیں،اس طرح بیدل یہ کہنا چاہتے ہیں کہ غم عشق ہلکا ہونے کے بجائے بڑھتا چلا جاتا ہے۔''غم عشق کی سختی اور فزونی'' کا مضمون دونوں نے بیان کیا ہے۔لیکن بیدل کا بیان فطری تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔یہاں غالب کے کلام پر بیدل کے کلام کی چھاپ بالکل واضح ہے۔

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا
غالب

لطفی، امدادی، مداراتی، نیازی، خدمتی
اے زمعنی غافل آدم شو بایں مقدار ہا
بیدل

غالب کا خیال ہے کہ ہر کام خصوصاً آدمی کا انسانی خصوصیات کا حامل ہونا بہت مشکل

کام ہے کیونکہ آدمی بیشتر صورتاً تو انسان لگتے ہیں لیکن سیرتاً شیطان ہوتے ہیں۔مولانا حالی فرماتے ہیں بادی النظر میں یہ ایک معمولی بات معلوم ہوتی ہے مگر غور سے دیکھا جائے تو بالکل اچھوتا خیال ہے۔دعویٰ یہ ہے کہ دنیا میں آسان کام بھی دشوار ہے اور دلیل یہ ہے کہ آدمی جو عین انسان ہے اس کا بھی انسان بننا مشکل ہے۔یہ منطقی استدلال نہیں ہے بلکہ شاعرانہ استدلال ہے (۹۳)۔بعض شارحین کا خیال ہے کہ یہاں انسان سے انسان کامل مراد ہے۔مطلب یہ ہے کہ ہر آدمی انسان ہے لیکن انسان کامل بننا آسان نہیں ہے۔بیدل کہتے ہیں آدمی کے معنی ہیں لطف، امداد، مدارا، نیاز اور خدمت، جس کے اندر یہ خصوصیات پائی جاتی ہیں وہی آدمی ہے باقی سب صورتاً آدمی ہیں۔حقیقت میں یہ وہ انسانی خصوصیات ہیں جن کو ہم انسانیت اور مروت سے بھی تعبیر کرتے ہیں اور یہ خصوصیات پیدا کرنا کچھ آسان کام نہیں ہے۔اس لئے دیکھا جائے تو غالب کے مصرع ''آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا'' میں بیدل کے پورے شعر کا عکس موجود ہے۔

گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانہ کی	داغ می نالد کہ دل خلوتگہِ جمعیت است
در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا	نالہ می نالد کہ اینجا جائے آسائش کجاست
غالبؔ	بیدلؔ

عشق میں ناکامی کی وجہ سے عاشق کو سدا آہ وزاری سے سابقہ رہتا ہے۔اس کا حوالہ دے کر غالب کہتے ہیں کہ آہ وزاری میرے کاشانہ کی بربادی کا تقاضا کرتی ہے اور تباہی کا عالم یہ ہے کہ میرے مکان کے درودیوار پر بیاباں یعنی ویران اور سنسان ہونے کا احساس ہوتا ہے۔بیدل کہتے ہیں داغ کی آہ وزاری اس بات پر ہے کہ دل جمعیت اور سکون کی خلوت گاہ تھا اس کا سکون کیوں غارت ہو گیا۔نالہ کو اس بات پر آہ وزاری ہے کہ یہاں میرے آرام وراحت اور سکون وآسائش کی جگہ کہاں ہے۔یہاں جمعیت اور بے سکونی کا مقابلہ ہے۔غالب کے مصرع ''گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانہ کی'' کو بیدل کے مصرع ''نالہ می نالد کہ اینجا جائے آسائش کجاست'' سے موازنہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ بیدل کے کلام کی چھاپ اس پر موجود ہے۔

وائے دیوانگیٔ شوق کہ ہر دم مجھ کو
آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا
غالبؔ

ہجوم شوق ندانم چہ مدعا دارد
کہ سینہ تا سرِ کویت غبار فریاد است
بیدلؔ

غالب کہتے ہیں شوق کی دیوانگی کا بھی عجیب عالم ہے کہ عاشق جذبہ عشق سے سرشار ہوکر خود ہی کوئے معشوق کی طرف جاتا ہے اور خود ہی وہاں سے حیران واپس آتا ہے، وہاں پہنچ کر جب اندازہ ہوتا ہے کہ اس تک رسائی نہیں ہے تو حیران ہوکر دل سے پوچھتا ہے میں یہاں کیوں آیا ہوں۔ بیدل کہتے ہیں ہجوم شوق کا آخر مقصد کیا ہے مجھے نہیں معلوم، بس اتنا جانتا ہوں کہ سینہ سے لے کر تیری گلی تک فریاد کی گرد فضا میں اڑ رہی ہے۔ عاشق کو سدا معشوق سے شکایت رہتی ہے کہ وہ اس کے عاشقانہ جذبات کا پاس ولحاظ نہیں رکھتا اور بے اعتنائی برتتا ہے۔ اس شکوے کو وہ فریاد سے تعبیر کرتا ہے۔ جس کا سلسلہ اس کے سینے سے لے کر معشوق کی گلی تک دراز ہے۔ یہاں غالب نے ''ہجوم شوق'' کو ''دیوانگیٔ شوق'' سے بدلا۔ دیوانگیٔ شوق سے بہتر ہجوم شوق کی تعبیر ہے۔ کیونکہ دیوانگی، جنون اور عشق وشوق سب ایک ہی چیز کے چند نام ہیں۔ شوق کا ہجوم یعنی اس کی بے پایانی وبیکرانی کا تقاضا ہے کہ عاشق سدا فریاد کرتا رہے۔ جس کا سلسلہ اس کے سینے سے لے کر معشوق کی گلی تک دراز رہے۔ یہ بات زیادہ قرین قیاس ہے اس کے مقابلے میں کہ جذبہ عشق سے سرشار ہوکر عاشق معشوق کی طرف جائے اور اس کی بے توجہی یا اس تک عدم رسائی کو دیکھ کر حیران واپس آئے۔ غالب کا ایک فارسی شعر اسی کے قریب ہے۔

ہر ذرہ خاکم ز تو رقصاں بہوائیست
دیوانگیٔ شوق سرانجام ندارد

جلوہ از بس کہ تقاضائے نگہ کرتا ہے
جوہر آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا
غالبؔ

جلوہٴ او داد فرمانِ نگہ آئینہ را
ہالہ کرد آخر بروئے ہمچو ماہ آئینہ را
بیدلؔ

غالب کا خیال ہے کہ محبوب کا جلوہ نگاہ سے دیکھنے کا تقاضا کرتا ہے یہ شعر مجاز وحقیقت دونوں کی طرف جاسکتا ہے۔ چنانچہ آئینہ کا جوہر بھی پلک بننا چاہتا ہے۔ آئینہ کا جوہر اس کا صیقل

ہے۔اب مطلب یہ ہوا کہ جلوۂ محبوب کو دیکھنے کے لئے آئینے کا جوہر مژگاں بن کر اس کا تماشا دیکھنا چاہتا ہے۔ بیدل کہتے ہیں محبوب کے جلوے نے آئینہ دل کو دیکھنے کا حکم صادر کیا ۔چاند کی طرح اس جلوے نے آئینہ دل کے رخ کا ہالہ کرلیا یعنی اسے اپنے گھیرے میں لے لیا ۔غور سے دیکھا جائے تو غالب کا مصرعہ ''جلوہ از بس کہ تقاضائے نگہ کرتا ہے'' بیدل کے مصرعہ ''جلوۂ اوداد فرمانِ نگہ آئینہ را'' کا ترجمہ ہے۔لیکن غیر بلیغ ترجمہ ہے۔کیونکہ بیدل کہتا ہے اس محبوب کا جلوہ آئینہ دل کو بصیرت کی نگاہ سے دیکھنے کا حکم صادر کرتا ہے، جو قرآن کے فحوا سے ہم آہنگ ہے۔افلا ینظرون الی الخ۔وفی انفسکم افلا تبصرون الخ۔

لے گئے خاک میں ہم داغ تمنائے نشاط	جہانی آرزوہا پخت و سیر آمد ز ناکامی
تو ہو اور آپ بصد رنگ گلستاں ہونا	تنورِ سرد ایں مطبخ بخامی سوخت نانہارا
غالب	بیدل

غالب کہتے ہیں ہم دنیائے نشاط کی تمنا کا صدمہ لے کر دنیا سے رخصت ہوئے ہیں۔ پر تیرے لئے دعا کرتے ہیں کہ تو صد رنگ گلستاں ہو یعنی انواع واقسام کی نعمتوں اور لذتوں سے لطف اندوز ہو۔ بیدل کہتا ہے کہ ایک دنیا نے محبوب سے ملنے کی تمنا کی لیکن وصال میں ناکامی کے سبب وہ اس سے اوب گئی۔اس رسوئی کے سرد تنور نے اپنی خامیوں کی وجہ سے روٹیوں کو جلا کر رکھ دیا۔غور سے دیکھا جائے تو غالب کا مصرعہ ''لے گئے خاک میں ہم داغ تمنائے نشاط'' بیدل کے مصرعہ ''جہانی آرزوہا پخت وسیر آمد زناکامی'' کا آزاد ترجمہ ہے،لیکن دوسرے مصرع میں بیدل اور غالب الگ ہوگئے۔غالب نے ناکامی کے باوجود محبوب کو دعا دی۔ بیدل نے ایک مثال سے اپنے دعویٰ کی توثیق کی ہے۔

عشرتِ پارۂ دل زخم تمنا کھانا	بیدل از زخم بود رونقِ دل
لذتِ ریشِ جگر غرق نمکداں ہونا	خندۂ گل نمکِ گلزار است
غالب	بیدل

غالب کا خیال ہے کہ عاشق کی تمنائے وصال اگر پوری نہیں ہوئی اور اس ناکامی کا زخم اس کے دل کو پہنچتا ہے تو یہ بھی اس کے لئے عیش و آرام کے درجے میں ہے اور اگر اس کے زخم پر معشوق نمک چھڑ کے تو اس سے بھی زخم جگر کو لذت ہی ملتی ہے۔ بیدل کہتے ہیں دل کی رونق تو زخم کی بدولت ہی ہے یعنی وصال میں ناکامی کے زخم سے دل کی چمک دمک اور رونق میں اضافہ ہوتا ہے جس طرح پھول کا مسکرانا چمن کے لئے نمک کی حیثیت رکھتا ہے۔ نمک کی چاشنی اگر کھانے میں نہ ہو تو چاہے جتنا لذیذ پکا ہوا ہو بے مزہ ہوتا ہے، ایسے ہی خندۂ گل چمن کے لئے نمک کی چاشنی کے درجے میں ہے جس سے وہ دلکش اور دلفریب ہو جاتا ہے یہاں غالب کے مصرعہ ''عشرتِ پارۂ دل زخم تمنا کھانا'' میں بیدل کے پہلے مصرعہ ''بیدل از زخم بود رونقِ دل'' کا پورا عکس موجود ہے۔ بلکہ ایک طرح سے اس کا آزاد ترجمہ ہے۔

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ	ز افسوس کہ دارد عبرتِ خونِ شہیدِ من
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا	حنائی می کند سودن کفِ دست نگارم را
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کا خیال ہے کہ محبوب نے مجھ بے گناہ کو قتل کرنے کے بعد اس پر ندامت کا اظہار کرتے ہوئے ظلم سے توبہ کی۔ مجھے اس زود پشیماں کی اس پشیمانی پر افسوس ہوتا ہے۔ اس میں ایک طرح سے طنز ہے کہ ایسی توبہ سے مجھے کیا فائدہ بلکہ میرے رقیب کو ہنسنے کا موقع ملے گا۔ کیونکہ ظلم سے پہلے توبہ کی ہوتی تو اس کا فائدہ مجھ کو پہنچتا۔ بیدل کہتے ہیں مجھ شہید کے خون سے عبرت حاصل کرتے ہوئے محبوب کو جو افسوس ہو رہا ہے اس کی بنا پر اس کا کفِ افسوس ملنا اس کے ہاتھ کو حنائی بنا رہا ہے۔ گویا عاشق کو قتل کرنے کے بعد معشوق کو پشیمانی اور ندامت یا عبرت کی وجہ سے جو افسوس ہوا اس کفِ افسوس نے معشوق کے ہاتھ کو حنائی یعنی اور حسین بنا دیا، کیونکہ حنا سے ہاتھ پیر کو خوبصورت اور دلکش بنانا مقصود ہوتا ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو غالب اور بیدل دونوں اس مضمون میں متفق ہیں کہ عاشق کو قتل کرنے کے بعد معشوق کو افسوس ہوا اور ندامت ہوئی۔ غالب کے نزدیک اس کے افسوس نے اسے توبہ کی توفیق دی جبکہ بیدل کے نزدیک اس کے کف افسوس

ملنے نے اس کی ہتھیلی کو حنائی بنا دیا۔ یہاں بھی غالب کے کلام پر بیدل کے کلام کی چھاپ نظر آتی ہے، خصوصاً غالب کے پہلے مصرعہ "کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ" میں بیدل کے پہلے مصرعہ "زافسوی کہ دارد عبرتِ خون شہید من" کی پوری جھلک موجود ہے۔

یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا	ہر کرا دیدیم درس وحشت از بر می کند
جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا	محفلِ آفاق طفلانِ جنون را مکتب است
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں وحشت یعنی عشق کی محفل میں قدم رکھنے سے کائنات کی حقیقت مجھ پر واشگاف ہوئی۔ جادۂ وحشت گویا شیرازہ ثابت ہوا کہ اس کی وجہ سے دونوں جہاں کے اجزائے پریشان یعنی واقعات وحوادث میں ایک ربط سا پیدا ہوا۔ بیدل کہتے ہیں جس کو دیکھا وہ وحشت کا درس یاد کرتا ہوا نظر آیا۔ دنیا کی محفل طفلانِ جنوں کے لئے مکتب کی حیثیت رکھتی ہے۔ "طفلاں جنوں" سے مراد وہ لوگ ہیں جو مکتب جنون و وحشت میں اس کا درس پڑھ رہے ہیں اور ابتدائی حالت میں ہیں۔ یہاں یہ لفظ طفل مکتب درس کی مناسبت سے استعمال کیا گیا ہے۔ بیدل نے وحشت کی وضاحت درج ذیل اشعار میں بھی کی ہے۔

وحشت آنست کہ نا آمدہ از خود برویم
ورنہ تا عزم شتاب است درنگست اینجا

وحشت اس بات کا نام ہے کہ شعور کی قید میں آئے بغیر ہم بیخود ہو جائیں۔ جب تک ہم جلدی مچائیں گے تاخیر ہو چکی ہوگی۔

وحشت ز محیط عشق آثار رہائی نیست
امواج بزنجیر اند از چیدنِ داماںہا

عشق کے سمندر سے وحشت کی رہائی کے آثار نہیں ہیں۔ یہاں لہریں جس قدر اپنا دامن سمیٹتی ہیں اسی قدر وہ بیڑی میں جکڑتی چلی جاتی ہیں۔

رمیدنہا ز اوضاع جہاں طرز دگر دارد
بوحشت پیش باید برد ازیں صحرا غزالی را

ان اشعار کی روشنی میں معلوم ہوتا ہے کہ عشق اور وحشت میں چولی دامن کا ساتھ ہے، اور وحشت نام ہے اوضاعِ عالم سے فرار حاصل کر کے عشق کی پناہ میں آنے کا۔

مانعِ وحشت خرامی ہائے لیلیٰ کون ہے	حسن بے پرواست اینجا قاصدی درکار نیست
خانۂ مجنوں صحرا گرد بے دروازہ تھا	نامۂ احوال مجنوں طرہ لیلیٰ بس است
غالبؔ	بیدلؔ

غالب استفہام انکاری کے طور پر کہتے ہیں کہ لیلیٰ کی وحشت خرامی میں آڑے کون سی چیز آ رہی ہے۔ یعنی کوئی چیز نہیں ہے۔ صحرا کی گردش کرنے والے مجنوں کے گھر کا دروازہ ہی نہ تھا جو کوئی دربان وہاں ہوتا، اور اندر داخل ہونے سے روکتا، پھر لیلیٰ کو مجنوں کے پاس آنے سے کس چیز نے روکا۔ لیلیٰ اور مجنوں کے روابط پر بیدل نے جس طرح روشنی ڈالی ہے وہ دل کو اپیل کرتی ہے، اور منطقی لگتی ہے۔ بیدل کہتے ہیں معشوق تو بے پرواہ و بے نیاز ہے۔ یہاں قاصد کی ضرورت نہیں ہے۔ مجنوں کے حالات معلوم کرنا چاہو تو لیلیٰ کی زلف دیکھ لو یہی کافی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مجنوں صحرا گرد زلف لیلیٰ کی طرح پریشان ہوتا ہے جبکہ لیلیٰ بے نیاز رہتی ہے۔ چنانچہ بیدل دوسری جگہ کہتا ہے:

چرا مجنوں مارا در پریشانی وطن نبود
کہ از چشمِ غزالاں خانہ بر دوش است صحرا را
حسابی نیست با وحشت جنون کاملِ مارا
مگر لیلیٰ بدوش جلوہ بندد محمل مارا

غالب نے مجنوں کو صحرا گرد ثابت کیا ہے۔ یہ درست ہے مگر لیلیٰ کو بھی وحشت خرام قرار دیا ہے۔ یہ بات قرین قیاس نہیں ہے۔ کیونکہ عاشق کے اندر نیاز اور معشوق کے اندر ناز ایک مسلمہ اصول ہے اور یہ اس اصول کے خلاف ہے۔ چنانچہ بیدل کہتا ہے:

صد قیامت گر برآید برنخواہد آمدن
عاشق از ذوق طلب، معشوق از استغنائے خویش

پوچھ مت رسوائیِ اندازِ استغنائے حسن — حسن مستغنیست از شہرت نوایہائے عشق
دست مرہونِ حنا رخسار رہنِ غازہ تھا — ہیچکس گل را نمی خواند برائے عندلیب
غالبؔ — بیدلؔ

معشوق کے انداز بے نیازی کی رسوائی کا عالم مت پوچھو یعنی ساری دنیا میں اس کی بے نیازی کی شہرت ہے مگر یہ لوگ بھی اپنی آرائش اور بناؤ سنگار کے لئے ہاتھ میں مہندی اور رخسار پر غازہ کے محتاج ہیں۔ بیدل کہتے ہیں عاشق کی شہرت نوائیوں سے معشوق بے نیاز ہے، کوئی آدمی بلبل کے لئے پھول کو نہیں آواز دیتا ہے۔ بیدل نے ایک عام مشاہدے کی بات کہی ہے کہ عاشق کے اندر نیاز اور معشوق میں ناز ہوتا ہے۔ اور اس کا ناز عاشق سے اسے بے نیاز کرتا ہے۔ لیکن غالب نے نکتہ آفرینی سے کام لیتے ہوئے یہ بات کہی ہے کہ معشوق تمام تر بے نیازی کے باوجود اپنی آرائش کے لئے ہاتھ میں حنا اور رخسار پر غازے کا محتاج ہے۔ اس طرح اس کے شیوۂ استغنا کو کتنی رسوائی اور ذلت اٹھانی پڑی مت پوچھو۔ یہ غالب کی انفرادیت ہے۔

نالۂ دل نے دئے اوراق لختِ دل بباد — بسعیِ نالہ و افغاں غم دل کم نمی گردد
یادگارِ نالہ اک دیوانِ بے شیرازہ تھا — گذشت از چرخ و بگرفت آبلہ چشم ثریارا
غالبؔ — بیدلؔ

غالب کہتے ہیں نالہ دل نے دل کے سیکڑوں ٹکڑے کر کے اسے تباہ و برباد کر دیا۔ ان ٹکڑوں کو اوراق سے تشبیہ دے کر کہتا ہے یہی لخت ہائے دل نالہ کی یادگار تھے مگر افسوس کہ نالوں نے اس دیوان بے شیرازہ کو برباد کر دیا۔ بیدل کہتے ہیں آہ و نالہ کی کوشش سے غم دل کسی طرح کم نہیں ہوتا ہے۔ میرے آہ و نالے نے جو آبلے کی شکل کے ہیں آسمان کو پار کر کے چشم ثریا کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ مقصد یہ ہے کہ میرے آہ و نالے چاہے جتنی بلندی پر پہنچ جائیں اور چاہے جتنی شدت اس میں ہو ان کی وجہ سے غم دل کسی طرح کم نہیں ہوتا جو عاشق کی معراج ہے اور اسی سے ان کی رونق ہے۔ چنانچہ دوسری جگہ کہتا ہے:

بیدل از زخم بود رونق دل
خندہ گل نمک گلزار است

جبکہ غالب کہتے ہیں کہ آہ و نالے نے دل کے سیکڑوں ٹکڑے کرکے اسے برباد کر دیا۔اس میں شکوہ کا انداز ہے۔

بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا
غالبؔ

داغم ز جلوہ ای کہ غرورِ تغافلش
آئینہ خانہا کند ایجاد و ننگرد
بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ اے محبوب آپ کی بے نیازی اور تغافل شعاری حد سے بڑھ گئی ہے۔آخر میرا حالِ دل سن کر کب تک کہتے رہیں گے کہ کیا کہا پھر کہو۔ بیدل کہتے ہیں میں جلوۂ محبوب کے ہاتھوں پریشانی میں گرفتار ہوں جس کے تغافل کا غرور عاشق کے اندر آئینہ خانے تو ایجاد کرتا ہے پر اس پر نظر نہیں ڈالتا۔ بیدل و غالب دونوں نے محبوب کی حد سے بڑھی ہوئی بے نیازی اور تغافل شعاری کا ذکر کیا ہے۔ غالب نے ایک انوکھا انداز اختیار کیا کہ میں دل کی کیفیت بیان کرتا ہوں اور وہ بار بار پوچھتا ہے: کیا کہا۔ جبکہ بیدل کے مطابق محبوب نے عاشق کے دل میں اپنے جلوے سے آئینہ خانے تو بنائے جس میں اس کی شکل دیکھی جا سکتی ہے پر اپنے غرورِ تغافل سے وہ اس پر نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھتا۔اس سے وہ غم زدہ ہے۔

حضرتِ ناصح اگر آئیں دیدہ و دل فرشِ راہ ہے
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا
غالبؔ

بمنعِ اضطرابِ عاشقاں زحمت مکش ناصح
کہ آتش زندگی دارد بقدرِ شوخیِ تبہا
بیدل

غالب کا مطلب یہ ہے کہ میں عاشق واقع ہوا ہوں اور حضرت ناصح آ کر مجھے اس سے باز رہنے کا مشورہ دینا چاہتے ہیں اگر وہ آنا چاہتے ہیں تو شوق سے آئیں لیکن کوئی ہمیں یہ بتائے کہ وہ آخر مجھے کیا سمجھائیں گے یعنی ان کی نصیحت کا اثر مجھ پر نہیں ہونے والا ہے۔ بیدل کہتے ہیں اے ناصح عاشقوں کے اضطراب کو روکنے کی زحمت نہ کیجیے، کیونکہ آگ کی حرارت میں جتنی شوخی ہوگی آگ کی زندگی اسی قدر تابناک اور بہتر ہوگی۔ غالب اور بیدل دونوں نے ناصح کو نصیحت سے

باز رہنے کی تاکید کی ہے یہ کہہ کر کہ ان کی نصیحت کارگر نہیں ہوگی۔ غالب نے سوالیہ انداز میں پوچھا کہ وہ کیا سمجھائیں گے، اور یہ نصیحت کارگر نہیں ہوگی جبکہ بیدل فلسفیانہ انداز میں کہتے ہیں آتش عشق میں جتنی زیادہ حرارت ہوگی اسی قدر اس کی چمک دمک بڑھے گی اس لئے سمجھانے کی زحمت گوارانہ کریں۔ یہاں بیدل کا اسلوب زیادہ بہتر معلوم ہوتا ہے۔

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں	در دماغ شوق دود حسرتی پیچیدہ است
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا	کیست جز تیغ تو تا فہمد چہ سر داریم ما
غالب	بیدل

غالب کہتے ہیں معشوق کو مجھے قتل کرنے میں دو عذر ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ مرنے کے لئے تیار نہیں ہوں اس لئے تجھے کیا قتل کریں اس کے جواب میں کہا کہ سر سے کفن باندھے ہوئے آیا ہوں دوسرا عذر یہ ہے کہ میرے پاس تلوار نہیں ہے، اس لئے کیسے قتل کروں۔ اس کا جواب یوں دیا کہ تلوار ساتھ لے کر آیا ہوں۔ ایسی صورت میں میرے قتل کا کوئی عذر اس کے پاس نہ رہا۔ بیدل کہتے ہیں عاشق کا شوق یہ ہے کہ محبوب کی تلوار سے اس کی گردن نپے اور شہید عشق کہلائے اس کا حوالہ دے کر کہتا ہے دماغ شوق میں محبوب کے ہاتھوں قتل کی آرزو کروٹیں لے رہی ہے لیکن اے محبوب تیری تلوار کے سوا کون ہے جو میرے سر کی اس کیفیت کو سمجھے، گویا بیدل اور غالب دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ عاشق محبوب کے ہاتھوں قتل ہونے کے لئے آمادہ اور اس کا آرزومند ہے۔ پر غالب کے مطابق معشوق کے پاس دو عذر ہیں جس کا تدارک عاشق نے کر دیا ہے۔ بیدل کے مطابق عاشق کے سر میں قتل کی جو آرزو سمائی ہوئی ہے اس کو سمجھنے کی صلاحیت صرف محبوب کی تلوار میں ہے۔

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی	نصیحت کارگر نبود غریق عشق را بیدل
یہ جنون عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا	بہ دریا احتیاج در نباشد گوش ماہی را
غالب	بیدل

غالب کا مطلب واضح ہے کہ عشق سے باز رہنے کے لئے اگر ناصح نے ہم کو قید و بند میں رکھا تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے بھلا ہمارے جنون عشق کے یہ انداز ہم سے رخصت ہو جائیں

گے۔ بیدل کہتا ہے جو آدمی عشق کے دریا میں غرق ہو گیا اس کو کسی قسم کی پند ونصیحت کارگر نہیں ہوتی۔ یعنی نصیحت سے وہ عشق سے باز نہیں آ سکتا۔ گوش ماہی یعنی سیپ کو دریا میں موتی کی ضرورت نہیں رہتی کیونکہ موتی تو خود اس کے اندر موجود ہے۔ عشق سے باز رہنے کی ناصح کی کوشش سدا ناکام رہتی ہے۔ اس مضمون کو غالب اور بیدل دونوں نے بیان کیا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کا پورا شعر بیدل کے پہلے مصرع ''نصیحت کارگر نہ بود غریق عشق را بیدل'' کا کسی قدر اضافے کے ساتھ آزاد منظوم ترجمہ ہے۔ جبکہ بیدل نے ایک مثال سے اس دعوے کی وضاحت کی ہے۔ یہاں غالب کے کلام پر بیدل کی چھاپ بالکل واضح ہے۔

خانہ زاد زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں	شور زنجیر جنوں از نفسِ ما پیداست
ہیں گرفتار وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا	نکہتِ زلف کہ پیچیدہ بر سرِ اندیشۂ ما
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ ہم تو پہلے ہی سے معشوق کی زلف گرہگیر کے اسیر ہیں اور اس کی بیڑی میرے پاؤں میں پڑی ہے بھاگ کر کہاں جائیں گے۔ ہم تو وفاداری کا عہد کئے بیٹھے ہیں جسے ہر حال میں نبھانا ہے۔ پھر قید خانے سے گھبرا کر اضطراب کا اظہار کیوں کریں۔ بیدل کہتے زنجیر جنوں کا شور ہماری سانس سے واضح ہے، جانے کس نے ہماری قوت فکریہ پر زلف کی خوشبو مل دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ معشوق نے چونکہ میری قوت اندیشہ پر اپنی زلف کی خوشبو مل دی ہے اس لئے میری ہر سانس سے زنجیر جنوں کے بجنے کی آواز بلند ہوتی رہتی ہے۔ یہاں محبوب کی زلف گرہگیر کی زنجیر میں گرفتار ہونے اور اس سے آزاد نہ ہونے کی بات دونوں نے کہی ہے۔ انداز بیان مختلف ہے۔ بیدل نے ''نکہتِ زلف کہ پیچیدہ بر سر اندیشۂ ما'' کے حسین اور خوبصورت تعبیر سے جو لطف پیدا کیا ہے وہ غالب کے یہاں مفقود ہے۔ غالب کے پہلے مصرع میں اس تعبیر کی ایک معمولی جھلک پائی جاتی ہے۔ اس مفہوم کو بیدل نے ایک اور انداز سے بیان کیا ہے:

ما معنی مسلسل زلف تو خواندہ ایم
مشکل کہ مرگ قطع کند داستانِ ما

ہم نے تیری زلف مسلسل کا مفہوم سمجھ لیا ہے ہماری داستان معاشقہ یا داستان گرفتاری زنجیر زلف کو موت بھی مشکل ہی سے قطع کر سکتی ہے۔

ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غم الفت اسد
ہم نے مانا کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا
غالبؔ

صد شکر کہ برد نامہ ام رنگ قبول
بیدل بودم ہزار دل گردیدم
بیدلؔ

غالب دلی والوں کی شکایت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اب اس آبادی میں غم الفت کا قحط ہے یعنی لوگ بظاہر ملتے ہیں پر خلوص و محبت نہیں رکھتے۔ ایسی صورت میں اگر دلی میں سکونت اختیار کروں تو سوال پیدا ہوگا کہ کھائیں گے کیا۔ غالباً یہ شعر غالب کا اس وقت کا ہے جب غدر ۱۸۵۷ء کے بعد دلی اجڑ گئی اور دوست آشنا سب مارے گئے یا دلی چھوڑ کر سب ادھر ادھر نکل گئے جیسا کہ ان کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے۔ خوش قسمتی سے بیدل کو دہلی میں ایسا اتفاق نہیں ہوا۔ بلکہ ۱۰۷۶ھ /۱۶۶۲ء میں دہلی پہنچنے کے بعد اس وقت کے نواب عاقل خاں رازی سے رابطہ قائم کیا اور ان سے سرپرستی کا طالب ہوا۔ نواب کے مثبت جواب پر بیدل اتنا خوش ہوا کہ خدا کا بے انتہا شکر ادا کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میرے خط کو قبولیت حاصل ہوئی میں تو بیدل یعنی بیکس و بے یار و مددگار تھا اب ہزاروں دل کا ہو گیا ہوں یعنی میرے حوصلے بڑھ گئے اس کے بعد نواب کے داماد شکر اللہ خاں اور ان کے پورے خاندان نے بیدل کی وہ سرپرستی کی کہ ان کو دہلی میں قیام و طعام کی کمی یا معاش کی فکر دامنگیر نہیں ہوئی۔

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا
غالبؔ

در محبت آرزو را اعتبار دیگر است
ایں حریفاں وصل می خواہند و بیدل انتظار
بیدلؔ

غالب کہتے ہیں ہم اتنے خوش نصیب عاشق تو نہ تھے کہ محبوب کا وصال مجھے حاصل ہوتا۔ اب تو خیر مر رہے ہیں لیکن زندگی اگر اور طویل ہو جاتی تو بھی وصال کا انتظار ہی رہتا۔ بیدل کہتے ہیں محبت میں آرزوئے وصال کا کچھ اور ہی لطف ہوتا ہے۔ ہمارے احباب وصل کے خواہاں

ہیں جبکہ بیدل انتظار کا متمنی ہے۔ دونوں کے انداز فکر میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ غالب کو وصال یار سے محرومی کا دکھ ہے جبکہ بیدل کے نزدیک محبت میں انتظار کا کچھ اور ہی لطف ہے۔ اس کے نزدیک جو مزہ انتظار میں ہے وہ وصال یار میں نہیں ہے۔ چنانچہ کہتا ہے ع

اعتبار درد عشق از وصل برہم می خورد

وصل سے درد عشق کی ساکھ گر جاتی ہے۔

تیرے وعدے پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا	تا شوی آگاہ فرصت رفتہ است
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا	وعدۂ وصل انتظاری بیش نیست
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں تیرے وعدہ وصل کے بعد بھی اگر ہم زندہ سلامت بچ رہے ہیں تو اس کا سبب یہ ہے کہ تیرے وعدے پر اعتبار نہیں۔ اگر اعتبار ہوتا تو مارے خوشی کے ہم اللہ کو پیارے نہ ہو گئے ہوتے۔ بیدل کہتے ہیں جب تک ہماری حالت کی تم کو خبر ہوگی موقع ہاتھ سے نکل چکا ہوگا۔ وعدہ وصل انتظار سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ یعنی جس طرح انتظار میں عاشق کو اضطراب اور بے کلی رہتی ہے وعدۂ وصل پر بھی وہی بیقراری اور بے کلی رہتی ہے۔ غالب کے نزدیک محبوب کا وعدۂ وصل ناقابل اعتبار ہے جبکہ بیدل کے نزدیک وعدۂ وصل بھی ایک طرح سے انتظار ہی ہے۔ غالب کا یہ خیال کہ اگر تیرے وعدۂ وصل پر اعتبار ہوتا تو مارے خوشی کے مر نہ جاتے، بیدل کے خیال کے برعکس ہے جو کہتا ہے ع: ''مرگ تسکین نہ دہد منتظر وصل ترا'' تیرے وصل کے منتظر کو موت سے بھی سکون نہیں حاصل ہوتا۔

تیری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا	دل بذوق وعدۂ فرداست مغرور امل
کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا	عشق گوید چشم واکن فرصت ایں مقدار نیست
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ اے محبوب تو نے وصال کا وعدہ کر کے اسے توڑ دیا تو اس میں تیری کوتاہی کا دخل نہیں تھا بلکہ اس کا سبب اصل میں یہ تھا کہ تیری نزاکت کے سبب عہد ہی بہت لچر اور

کمزور واقع ہوا تھا۔ اگر وہ مضبوط ہوتا تو تجھ سے کبھی نہ ٹوٹتا۔ بیدل کہتے ہیں کہ معشوق نے جو کل ملنے کا وعدہ کیا ہے اس کی وجہ سے دل کو اس امید پر بڑا غرور ہے جب کہ عشق کا کہنا ہے کہ آنکھیں کھول کر دیکھو تم کو تو کل تک کی مہلت بھی حاصل نہیں ہے۔ محبوب کے وعدہ وصل پر دونوں متفق ہیں اس فرق کے ساتھ کہ غالب کے نزدیک وعدہ کمزور تھا ٹوٹ گیا، جبکہ بیدل کے نزدیک عاشق کو معمولی فرصت بھی حاصل نہیں ہے اس لئے وعدۂ وصل فردا کے پورے ہونے کا امکان ہی نہیں ہے۔

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیر نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا
غالب

چشمت بغلط سوئے دل انداخت نگاہی
تیریکہ ازاں شست خطا شد چہ بجا شد
بیدلؔ

تیر نیم کش اس تیر کو کہتے ہیں جسے چلاتے وقت کمان کو آدھی قوت سے کھینچا جائے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ نشانے پر لگتا تو ہے لیکن اسے مارتا نہیں ہے۔ تیر سے پلکوں کا تیر مراد ہے۔ نیم کش کنایہ ہے معشوق کی نیچی نظر سے۔ غالب کہتے ہیں کہ اے معشوق تیرے تیر نیم کش نے جگر کو نشانہ بنایا اور اس میں پیوست ہو کر ابدی خلش کا ذریعہ بن گیا۔ اس خلش سے دل کو جو لطف مل رہا ہے اسے کچھ میرا دل ہی جانتا ہے۔ اس لئے کہہ سکتا ہوں کہ اچھا ہوا کہ تیرا تیر جگر کے پار نہ ہوا۔ بیدل کہتے ہیں کہ تیری آنکھ نے غلطی سے میرے دل پر نظر ڈالی۔ جو تیر تیرے اس کمان سے نکل کر غلطی سے میرے دل کو لگا وہ بہت ہی بجا اور برمحل تھا۔ دونوں کے کلام کے موازنہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب کے ذہن میں بیدل کا یہ خیال تھا کہ جو تیر نگاہ معشوق دل عاشق پر پڑتا ہے وہ بڑا ہی برمحل ہوتا ہے۔ البتہ غالب نے اس میں نکتہ آفرینی سے کام لیتے ہوئے اس کے تیر نیم کش سے حاصل ہونے والی خلش کو لذت قلب کا ذریعہ قرار دیا۔ یہ اس کی انفرادیت ہے۔

یہ کہاں کہ دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا
غالب

تا کے برقم تازہ کنم شکوۂ احباب
خشکی ز دماغ قلم نال بر آورد
بیدلؔ

غالب کہتے ہیں شکوے کا مقام ہے کہ جن احباب سے غم عشق میں چارہ سازی اور غم گساری کی امید تھی وہ الٹے مجھ کو ترک محبت کی نصیحت کرتے ہیں یہ تو دشمنی ہوئی۔ چاہئے تو یہ تھا کہ

میری ہمدردی کرتے اور وصال یار کی کوئی شکل نکالتے ۔ بیدل کہتے ہیں کہ احباب، جو آڑے وقتوں خصوصاً غم عشق میں ہماری چارہ سازی کرتے طوطا چشم ہو گئے ۔ کب تک ان کی شکایت دہراتا رہوں ۔ ان کا شکوہ لکھتے لکھتے قلم کے دماغ میں خشکی پیدا ہوگئی اور خشکی نے اس سے باریک سوت کی طرح کے تراشے نکالے جسے نال کشی کہتے ہیں۔غور سے دیکھا جائے تو غالب کا پورا شعر بیدل کے پہلے مصرع ''تا کے برقم تازہ کنم شکوۂ احباب'' کا کسی قدر اضافے کے ساتھ آزاد اور خوبصورت ترجمہ ہے۔

رگ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا	بیدل ز درد عشق لبی خون گریستی
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا	تر کرد شرم اشک تو دامان تاک ما
غالب	بیدل

غالب غم عشق کی تباہ کاری کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ پتھر میں چنگاری کی جگہ اگر غم نہاں ہوتا تو پتھر جیسی سنگین چیز سے بھی اس قدر خون ٹپکتا کہ تھمنے کا نام نہ لیتا۔غرض غم عشق ایسی چیز ہے جس سے پتھر کا جگر جو جمادات میں ہے، بھی خون ہو کر بہہ جاتا۔انسان تو پھر انسان ہے۔ پتھر سے خون نکلتا یا نہ نکلتا لیکن قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض پتھر ایسے ہوتے ہیں جس سے چشمے پھوٹ پڑتے ہیں اور بعض خشیت الٰہی سے اوپر سے نیچے آ رہتے ہیں۔(سورۂ بقرہ)۔ بیدل کہتے ہیں درد عشق یا غم عشق کی وجہ سے تو نے اس قدر خون کے آنسو بہائے کہ تیرے آنسوؤں کی شرم نے دامن تاک (انگور کی بیل) کو بھی تر کر دیا۔غم عشق کی تاثیر کو غالب اور بیدل دونوں نے بیان کیا ہے۔ غالب کے مطابق اگر پتھر میں یہ غم آتا تو اس سے نہ تھمنے والا خون بہہ پڑتا۔ بیدل کے مطابق غم عشق کی وجہ سے اس کے خون کے آنسو نے دامن تاک کو بھی تر کر دیا۔

غم اگر چہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے	نشاط و رنج ما تبدیل اوضاع
غم عشق اگر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا	بلند و پست ما تغیر حالات
غالب	بیدل

غالب کہتے ہیں غم چاہے جیسا ہو جان لیوا ہوتا ہے کیونکہ دل اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا ہے اور دل ہر آدمی کے پاس ہے۔اس لئے کہتا ہے جس کے سینے میں دل ہے وہ غم سے

کہاں نجات پا سکتا ہے۔ع:

"دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں"

اب اگر غم عشق نہ ہوتا تو غم روزگار ہوتا اور اس طرح غموں کا سلسلہ جاری رہتا۔ لیکن بیدل کے نزدیک غم کا فلسفہ کچھ اور ہے۔ وہ کہتے ہیں دکھ سکھ، غم وخوشی اور بلندی وپستی یہ سب ایک دوسرے کے متعاقب حالات وکیفیات ہیں جن سے انسان کو آئے دن سابقہ رہتا ہے۔ اس لئے ان سے متاثر ہو کر غم سے گھبرانا اور خوشی پہ اترانا نہیں چاہئے۔ چنانچہ دوسری جگہ واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ دنیا دو دن کی ہے یہاں کے رنج وغم پر صبر کرو۔ یہ دنیا آخر ایک دن آنسو کی طرح نظروں سے اوجھل ہو جائے گی۔

دو روزی با غم و رنج حوادث صبر کن بیدل
جہاں آخر چو اشک از دیدہ ات یکباری افتد

زخم دل ضبط نفس می خواہد	زخم نے داد نہ دی تنگیِ دل کی یارب
غنچہ را بستنِ لب بہبود است	تیر بھی سینۂ بسمل سے پر افشاں نکلا
بیدؔل	غالبؔ

"زخم نے تنگی دل کی داد نہ دی" یعنی اس نے دل کی تنگی کو دور نہیں کیا۔ "تیر پر افشاں نکلا" یعنی بے تاب رہا۔ غالب نے خود اس شعر کا مطلب یہ بیان کیا ہے: تیر تنگی دل کی داد کیا دیتا ہے (یعنی) زخم کو کشادہ کر کے تنگی کو کیا زائل کرتا وہ تو خود ضیق مقام سے گھبرا کر پر افشاں وسراسیمہ ہو کر نکلا" (۹۴)۔ بیدل کہتے ہیں 'زخم دل' ضبط نفس کا تقاضا کرتا ہے۔ غنچہ کی لب بندی اس کے حق میں بہبودی ہے۔ زخم دل کو دونوں نے موضوع بنایا ہے۔ معشوق کے تیر نگاہ سے عاشق کا دل جب گھائل ہوتا ہے تو اس کو زخم دل سے تعبیر کرتے ہیں۔ بیدل کہتے ہیں یہ زخم ہم سے مطالبہ کرتا ہے کہ آہ وواویلا نہ کریں بلکہ صبر وضبط سے کام لے کر اسے برداشت کریں۔ جبکہ غالب کے خیال میں یہ زخم اس کے دل کی تنگی کو تو کیا دور کرتا وہ خود تنگی مقام کا گرفتار ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا دل تنگ ہے کہ اس کو کشادہ کرنے کی ضرورت ہے۔ بلکہ جدید تحقیق کی رو سے دل کا بڑھا ہوا یا کشادہ

ہونا بیماری کی علامت ہے۔ ''دل تنگی'' کا تذکرہ بیدل نے درج ذیل شعر میں بھی کیا ہے۔

وحشتم آخر ز زندانگاہ دل تنگی رہاند
خانہ صحراست از بس دیدۂ آہو شدم

میری وحشت نے بالآخر دلی تنگی یا تنگی دل کے قید خانے سے مجھے آزاد کر دیا میں اسی قدر دیدہ آہو بن گیا کہ گھر صحرا میں بدل گیا۔ گویا دل کی تنگی کو وسعت عطا کرنے والی چیز وحشت ہے نہ کہ زخم دل۔

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے؟ شب غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا
غالبؔ

شب ہجراں چہ جوئی طاقت صبر از من بیدل
کہ آہم می کند سنگ فلاخن سخت جانی را
بیدلؔ

شب غم سے مراد ہجر کی رات ہے۔ عاشق کے لئے ہجر کی رات بہت گراں گزرتی ہے اس لئے اس کو شب غم سے تعبیر کرتا ہے۔ غالب کہتے ہیں میں کس سے کہوں کہ شب غم کیا ہے۔ بس یہ سمجھو کہ بہت بری بلا ہے۔ اور یہ بلا ایسی ہے کہ بار بار اس سے سابقہ پڑتا ہے اس لئے ایک بار مر کے بار بار کی اس اذیت سے بچ جاتا تو کیا ہی اچھا ہوتا۔

بیدل کہتے ہیں جدائی کی رات میری بے کلی کا وہ عالم تھا کہ میرے صبر کا پیمانہ چھلکا پڑتا تھا اور میری طاقت صبر جواب دینے لگی تھی۔ اگر چہ میں اتنا سخت جان واقع ہوا ہوں کہ اس کے غم سے متاثر نہیں ہوتا ہوں۔ مگر میری آہ اتنی طاقتور تھی کہ میری سخت جانی کو بھی گوپھن میں رکھ کر اس نے پھینک دیا۔ یعنی شب ہجراں ناقابل برداشت تھی۔ غالب اور بیدل دونوں نے ''شب ہجراں کی سختی'' کو بیان کیا ہے لیکن غالب نے اس پر یہ اضافہ کیا کہ ایک بار مر کے سلسلہ ختم ہو جاتا تو اچھا تھا۔ بیدل نے صرف اس کی ناقابل برداشت خصوصیت کی بات کہی ہے۔ یہاں غالب کا بیان زیادہ پرکشش ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کے مصرع ''کہوں کس سے میں کہ کیا ہے، شب غم بری بلا ہے'' میں بیدل کے مصرع ''شب ہجراں چہ جوئی طاقت صبر از من بیدل'' کا عکس موجود ہے۔

غالب کا ایک اور شعر شب غم سے وابستہ ہے۔

کیا کہوں تاریکی زندان غم، اندھیر ہے
پنبہ نور صبح سے کم جس کے روزن میں نہیں

ہوئے مر کے ہم جو رسوا، ہوئے کیوں نہ غرق دریا	نشانہا نیست غیر ازنام وننگ آنہم توئی بیدل
نہ کبھی جنازہ اٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا	جہانی دیدہ ای بشمارنقش بال عنقا را
غالب	بیدل

غالب کہتے ہیں مرنے کے بعد حسب دستور مجھے کفنایا گیا، میرا جنازہ اٹھایا گیا اور مزار بھی بنایا گیا۔اس طرح میری ذلت ورسوائی کا پورا انتظام ہوا۔اس کے بجائے اگر دریا میں ڈوب جاتا تو کسی کو خبر نہ ہوتی نہ جنازہ اٹھتا اور نہ کہیں مزار بنتا۔گویا آرزوئے گمنامی ہے۔بیدل کہتے ہیں دنیا میں نام وننگ کے سوا کسی چیز کا نشان باقی نہیں ہے۔یعنی اگر اچھے کام کیے ہیں تو نام ہے اور برے کیے ہیں تو ننگ ورسوائی ہے۔چنانچہ سعدی کا بھی یہی خیال ہے۔

قاروں ہلاک شد کہ چھل خانہ گنج داشت
نوشیرواں نمرد کہ نام نکو گذاشت

قارون جس کے چالیس گھروں میں خزانے تھے اپنی بخالت کی وجہ سے بدنامی کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوا، جبکہ نوشیرواں اپنی عدالت گستری اور رعایا پروری کی وجہ سے مرکر بھی نیک نامی کے ساتھ زندہ ہے۔بیدل! تم نے دنیا کو اسی شکل میں دیکھا ہے تو تم بھی بال عنقا کے نقوش گنو۔عنقا ایک پرندے کا نام ہے جس کا وجود تو ہے پر کہیں کوئی نام ونشان اس کا نہیں ہے،اس لئے معدوم اور گمنام اشیا کے لئے عنقا کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔اب نقش بال عنقا کو شمار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنی گمنامی کا تصور کرو۔گمنامی کا مضمون دونوں کے یہاں ہے لیکن بیدل کا انداز یہاں منطقی اور مدلل ہے۔نیز عزت وذلت کے معیار بھی دونوں کے یہاں مختلف ہیں۔

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے و یکتا	چہ امکانست گرد غیر ازیں محفل شود پیدا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا	ہماں لیلیٰ شود بی پردہ چوں محمل شود پیدا
غالب	بیدل

اس شعر میں غالب نے وحدت الوجود کے مسئلے پر روشنی ڈالی ہے اور الفاظ ایسے استعمال کئے ہیں جس نے کلام میں لطف پیدا ہو گیا ہے۔ یگانہ و یکتا اور دوئی و دوچار کی مناسبت واضح ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا یگانہ و یکتا ہے۔ اس کا کوئی شریک و ساجھی نہیں۔ اور لا یدرکہ الابصار کے مطابق آنکھیں اسے دیکھ نہیں سکتیں۔ دیکھنے کے لئے دوئی یعنی غیر کا وجود شرط ہے۔ جب پوری کائنات میں اس کے سوا کوئی موجود ہی نہیں ہے تو غیر کو دیکھنے کا سوال کیا پیدا ہوتا ہے دوچار ہونا دوئی کا تقاضا کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا میں غیر کا وجود ہوتا تو اللہ سے کہیں نہ کہیں تو اس کی ملاقات ہوتی جب غیر ہے ہی نہیں تو اس سے دوچار ہونے کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے۔ بیدل کہتے ہیں کہ اس محفل کائنات میں کیا یہ ممکن ہے کہ غیر خدا کی گرد بھی اڑے۔ اگر محمل نمایاں ہوگا تو لیلیٰ ہی نظر آئے گی۔ جب خدا کے سوا کسی کا وجود ممکن ہی نہیں تو جدھر دیکھئے محمل کائنات میں لیلیٰ یعنی خدا ہی خدا کا جلوہ دکھائی دے گا۔ چنانچہ دوسری جگہ کہتا ہے:

دوئی کجاست ز نیرنگ احولی بگذر
کہ یک نگاہ میانِ دو چشم مشترک است

دوئی کہاں ہے؟ بھینگے پن کے فریب سے باہر آؤ۔ غور سے دیکھو تو دو آنکھوں کے بیچ میں ایک ہی نگاہ کام کرتی ہے۔ غالب کا دوسرا مصرع ''جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا'' بیدل کے شعر دوئی کجاست الخ، کا ترجمہ ہی نظر آتا ہے۔ بیدل نے اس مسئلے پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے اس کا یہاں موقع نہیں ہے۔ ایک شعر مزید حاضر ہے:

با ہمہ کثرت شماری، غیر وحدت باطل است
یک یک آمد برزباں از صد ہزار اعداد ہا

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب	جامی ز خمخانہ عرفان بدست آوردہ ام
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا	صاف گردیدن زہستی بادۂ ناب من است
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں تو نے تصوف کے مسائل پر ایسے دل کش انداز سے بحث کی ہے کہ اگر تو مے نوشی نہ کرتا تو تیرے کلام کے قاری تجھے ولی سمجھتے۔ بیدل کہتا ہے خمخانہ عرفان کا ایک جام میرے ہاتھ لگا ہے میری خالص شراب کی خصوصیت فنا فی اللہ ہو جانا ہے۔ غالب اور بیدل دونوں

نے مسائل تصوف بیان کرنے کا تذکرہ کیا ہے اس فرق کے ساتھ کہ غالب کا انداز بیان ایسا ہے کہ اگر وہ بادہ نوش نہ ہوتا تو اسے قارئین ولی سمجھتے۔ بیدل نے خمخانہ عرفان کا ایسا جام پیش کیا ہے جس میں اپنی ہستی سے صاف ہوجانے یعنی فنا کا بادۂ ناب موجود ہے۔ بیدل کے نزدیک تصوف اصل میں فنافی اللہ کے مقام پر رسائی کا نام ہے۔ چنانچہ کہتا ہے:

در جناب کبریا جز نیستی مقبول نیست
خدمت اندیشیدن ما موجب تقصیر شد

غالب بھی کہتے ہیں:

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

فنافی اللہ کے نتیجہ میں حاصل ہونے والے نظریۂ وحدت الوجود کو تصوف کا بنیادی مسئلہ قرار دیتا ہے ،کہتا ہے:

غیر وحدت بر نتابد ہمت عرفان ما''

☆

از و عمرہا شد سخن می کنم
دماغی بہ حسرت چمن می کنم
(مثنوی محیط
اعظم)

تجاہل پیشگی سے مدعا کیا | کجا تک اے سراپا ناز کیا کیا
غالب

تغافلت نازم | ادائی حسن
کہ یاد او گلہ ناز می کند گلہ را
بیدل

غالب کہتے ہیں اے سراپا ناز معشوق! تیرے تجاہل عارفانہ سے تیرا کیا مقصد ہے۔ میری ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر آخر کب تک کہتا رہے گا کیا کہا۔ تجاہل کے معنی ہیں جان بوجھ کر انجان بننا ''سراپا ناز'' محبوب کے لئے مناسب ترکیب ہے۔ کیونکہ اس کے ناز نے ہی اسے تجاہل

پیشہ بنا دیا۔ بیدل کہتے ہیں تیرے حسن تغافل کی کج ادائی پر مجھے ناز ہے کہ اس کی یاد بھی گلہ کو گلۂ ناز بنا دیتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ محبوب کی دانستہ غفلت شعاری اور تجاہل عارفانہ کے دلکش اور حسین انداز پر جسے کج ادائی سے بھی تعبیر کرتے ہیں مجھے ناز ہے۔ جس کی یاد بھی شکوہ کو شکوۂ ناز بنا دیتی ہے۔ یعنی شکایت تو بہر حال شکایت ہے لیکن اس شکایت پر مجھے ناز ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو ''کج ادائی حسن تغافل'' کی جگہ غالب نے ''تجاہل پیشگی'' کی ترکیب اختیار کی جس سے غالب پر بیدل کا اثر واضح طور پر معلوم ہوتا ہے۔ البتہ غالب نے استفہامیہ انداز سے اس کی غفلت شعاری کو بیان کر کے اس میں مزید لطف پیدا کر دیا ہے۔

فروغ شعلہ خس یک نفس ہے	عشق را کردیم بیدل تہمت آلود ہوس
ہوس کو پاسِ ناموس وفا کیا	در سوادِ کشورِ ما سایہ دارد آفتاب
غالبؔ	بیدلؔ

غالب ہوس اور عشق کے فرق کو واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہوس نام ہے نفسانی خواہشات کی تسکین کا، جس میں مطلب براری کے بعد معشوق سے واسطہ نہیں رہتا ہے۔ اس ہوس کو وفاداری نبھانے کا پاس ولحاظ کب رہ سکتا ہے یعنی نہیں رہتا۔ پھر ایک مثال سے اس کو واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں، تنکے میں آگ لگنے کے بعد اس سے شعلہ اٹھتا ہے۔ اس شعلے کی چمک ایک سانس لینے کے برابر ہے۔ ہوس پرستوں کی خواہش کا بھی یہی عالم ہے کہ جہاں پوری ہوئی معشوق سے کوئی سروکار نہیں رہتا۔ بیدل کہتا ہے کہ عشق کو ہم نے تہمت آلود ہوس کر دیا، مطلب یہ ہے کہ عشق وفاداری چاہتا ہے یعنی ہر حالت میں محبت کو نبھانا اور کسی بھی مرحلے پر اس میں غرض کی آمیزش کا نہ ہونا اب اگر کوئی آدمی کسی سے عشق کا دعویٰ کرتا ہے اور اس میں غرض کی آمیزش کر دی تو اس کا عشق تہمت آلود ہوس ہو گیا۔ پھر کہتا ہے ہمارے ملک میں آفتاب سایہ دار ہوتا ہے جس طرح انسان چلتے چلتے جب تھک جاتا ہے تھوڑی دیر کے لئے سائے میں سستا لیتا ہے پھر آگے چل پڑتا ہے۔ ٹھیک یہی حال ہے ہمارے ملک میں عاشق کا، کہ تھوڑی دیر رک کر اپنی خواہش پوری کرتے ہیں پھر آگے بڑھ کر کہیں اور منھ مارتے ہیں۔ آج پورے ملک کیا بیرون ملک میں بھی بالکل یہی

صورت حال ہے اوراس کا نام لوگوں نے عشق رکھا ہے۔اب اگر غور سے دیکھا جائے تو غالب کے مصرع ''ہوس کو پاسِ ناموس وفا کیا'' میں بیدل کے پہلے مصرعہ ''عشق را کردیم بیدل تہمت آلودہوس'' کا عکس پوری طرح نظر آئے گا۔

نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں
تغافل ہائے تمکیں آزما کیا
غالب

ہر چند نگاہِ تو حیات دو جہان است
من کشتۂ تمکینم و رسوائے تغافل
بیدل

غالب کہتے ہیں اے معشوق مجھے تیری بے تکلف نگاہ کرم چاہئے لیکن تو میرے صبر واستقامت کی آزمائش کرنے کے لئے مجھ سے تغافل کر رہا ہے۔تیری یہ بے توجہی مجھے ناگوار ہے۔بیدل کہتے ہیں تیری نگاہ گوکہ دونوں جہان کے لئے حیات بخش ہے مگر میں تمکین کا مارا اور تغافل کا رسوا ہوں یعنی تیری نگاہ کرم میری طرف نہیں اٹھتی جس کے لئے صبر کرتے کرتے تھک گیا اور تیرے تغافل سے رسوا ہو گیا۔غور سے دیکھا جائے تو غالب کے پورے شعر میں بیدل کے خیال کی پرچھائیں موجود ہے۔غالب کے مطابق محبوب کی بے تکلف نگاہ کرم چاہئے جو عاشق کو محبوب کے صبر آزما تغافل کی وجہ سے حاصل نہیں ہے۔جبکہ بیدل کے مطابق اس کی نگاہ کرم دونوں جہاں کے لئے حیات بخش ہے پر میری طرف نہیں ہے۔اس لئے خود کو ''تمکین کا مارا اور تغافل کا رسوا'' سے تعبیر کرتا ہے غالب نے اس کو ''تغافل ہائے تمکین آزما'' سے تعبیر کیا ہے ۔بیدل کا ایک اور شعر اسی مفہوم کو ادا کرتا ہے:

تو و تمکیں و تغافل ، من و بے صبری درد
نہ ترا یاد مروت ، نہ مرا دل بخشند

تجھ کو تغافل پر پائیداری سے واسطہ ہے اور مجھ کو بے صبری درد سے، نہ تجھے انسانیت اور مروت یاد ہے نہ مجھے سہنے والا دل عطا کیا گیا ہے۔غالب کا ایک فارسی شعر اسی مضمون کا درج ذیل ہے:

نازِ تو فراواں بود و صبر من اندک
تو دست و دلی داری و من پائے ندارم

نفس موجِ محیط بیخودی ہے	بیخودی عمریست از دل می کشد رخت نفس
تغافلہائے ساقی کا گلہ کیا	تا برون خود جہانی دیگر آرائیم ما
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں نفس عاشق بیخودی کے سمندر کی لہر ہے۔ سمندر سے بیخودی کا مفہوم غالب کے دوسرے کلام کی روشنی میں لاشعوری ہے۔

مئے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہئے

بیخودی یعنی لاشعوری و سرخوشی کیونکہ شعور کے ہاتھوں انسان کو اذیت ہوتی ہے غالب کہتے ہیں کہ جب میری سانس محیط بیخودی ہے یعنی مجھے پہلے ہی سے بیخودی اور لاشعوری کی حالت حاصل ہے تو ساقی کے تغافل کا گلہ کیوں کروں۔ بیدل کہتے ہیں ایک مدت سے بیخودی میرے دل سے سانس کا بوریا بستر باندھے ہوئے ہے، یعنی کوچ کے لئے تیار ہے، تا کہ اپنی ذات سے باہر کوئی اور دنیا سجائیں۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کا پہلا مصرع ''نفس موجِ محیط بیخودی ہے'' بیدل کے پہلے مصرع ''بیخودی عمریست از دل می کشد رخت نفس'' کا ترجمہ معکوس ہے۔ کیونکہ غالب کے مطابق سانس بیخودی کا سمندر ہے جو اسے شروع سے حاصل ہے اس لئے ساقی نے دانستہ غفلت برتی تو کوئی فرق نہیں پڑا جبکہ بیدل کے مطابق عالم بیخودی نے رخت ہائے نفس کو دل سے نکال دیا کیونکہ سانس جب تک چلتی رہے گی شعور کے ہاتھوں اذیت پہنچتی رہے گی۔ چنانچہ بیدل ایک نثر میں لکھتا ہے:

''اہل زندگی را تا کشاکشِ نفس باقیست بستگی ابواب تردد محال است''۹۵

زندوں میں سانس کی کشاکش کا سلسلہ جب تک باقی ہے پریشانی کے دروازے کا بند ہونا محال ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو بیدل کی بات زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

دل ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر	دوری از اسباب ما و من بحق پیوستن است
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا	قطرہ را از خود گسستن دل بہ دریا بستن است
غالبؔ	بیدلؔ

ز محو عشق غیر از عشق نتواں یافت آثاری
بہ دریا قطرہ چوں گردید گم مشکل شود پیدا

غالب کہتے ہیں ہر قطرہ زبان حال سے انا البحر کی نغمہ سرائی کر رہا ہے یعنی میں بظاہر قطرہ ہوں پر حقیقت میں سمندر ہوں اسی طرح انسان زبان حال سے انا الحق کی آواز لگا رہا ہے۔ یعنی وہ بظاہر ایک مخلوق ہے پر فنا فی اللہ ہونے کی حیثیت سے خالق ہے۔ دوسرے مصرع میں اس کی وضاحت کرتا ہے کہ ہم کیا ہیں اور ہماری حقیقت کیا ہے؟ ہماری ذات پر نظر کرو تو غیر ہے اور وجود کا اعتبار کرو تو عین ہے۔ اس طرح غالب نے یہاں وحدت الوجود میں عین و غیر کے مسئلے پر روشنی ڈالی ہے اور جز و کل کی بحث چھیڑی ہے۔ بحر اصل ہے اور قطرہ جز ہے اور جز تعینات کے دائرے میں ہے، اس لئے الگ لگتا ہے۔ لیکن جب تعین کا پردہ ہٹا دیجئے تو وہ سمندر ہے۔ بیدل کہتے ہیں ''ما و من'' کے قیود سے جب ہم دوری اختیار کرتے ہیں یعنی تعینات کا پردہ ہٹاتے ہیں تو حق سے وابستہ ہو جاتے ہیں، جیسے قطرہ جب اپنی جزوی حیثیت سے رشتہ ختم کر لیتا ہے تو دریا سے وابستہ ہو جاتا ہے۔ دوسرے شعر میں بیدل کہتا ہے جو آدمی عشق میں محو ہو گیا یعنی فنا فی العشق کے مقام پر پہنچ گیا اس کے اندر عشق کے سوا کسی اور چیز کا اثر نہیں پایا جاتا۔ دریا میں جب قطرہ گم ہو جاتا ہے تو اس کا ظہور جو تعین کا روپ رکھتا ہے ناپید ہو جاتا ہے۔ یعنی جز جب کل سے وابستہ ہو گیا تو جز کا وجود جاتا رہا۔ وحدت الوجود میں عین و غیر اور جز و کل کے مسئلے پر بڑی لمبی بحث بیدل نے کی ہے۔ یہاں اس کا موقع نہیں ہے لیکن دونوں کے اشعار کے موازنے سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کے کلام پر بیدل کے کلام کی پوری چھاپ ہے۔ بیدل کے دو اشعار اس سلسلے کے ملاحظہ ہوں۔

عالمِ ایجاد مشرب خانۂ جز و کل است
در بہار رنگ ہر جا چشم وا گردد گل است
میتواں در تخم دیدن شاخ و برگِ نخل را
جزو چوں کامل شود آئینۂ حسنِ کل است

محابا کیا ہے؟ میں ضامن ادھر دیکھ　　شہیدان ادبگاہ وفارا خوں نمی باشد
شہیدان نگہ کا خونبہا کیا　　مگر رنگ حنائی از کف قاتل شود پیدا
غالبؔ　　بیدلؔ

غالب کہتے ہیں اے معشوق بلا جھجک میری طرف نظر التفات کر، اگر میں تیرے تیز نگاہ کا شہید ہو گیا تو اس بات کی ضمانت لیتا ہوں کہ کوئی تجھ سے اس کا خونبہا یعنی بدلہ نہیں لے گا۔ بدلہ تو تب لیا جاتا جب تو تلوار سے قتل کرتا۔ بیدل کہتے ہیں، عشق میں وفاداری نباہنے والے اگر تیری نگاہ کے شہید بھی ہوں تو ان کی شہادت سے بہنے والا خون خون نہیں ہوتا ہے بلکہ وہ رنگ حنا ہوتا ہے جو قاتل کی ہتھیلی سے ظاہر ہوتا ہے۔ اب اگر غور سے دیکھا جائے تو غالب کے مصرع ''شہیدان نگہ کا خونبہا کیا؟'' میں بیدل کے مصرع ''شہیدان ادب گاہ وفارا خون نمی باشد'' کا عکس پوری طرح موجود ہے۔ کیونکہ نتیجہ کے طور پر دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے۔ غالب کے مطابق شہیدان نگہ کا خوں بہا نہیں دینا پڑتا ہے یعنی اگر عاشق کا خون بہتا ہے تو اس کا بدلہ نہیں ہے۔ بیدل کے مطابق شہیدان وفا کا خون خون نہیں ہوتا بلکہ حنائی رنگ ہوتا ہے۔ اس لئے بدلے کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔

سن اے غارتگر جنسِ وفا سن　　بدل نقشی نمی بندد کہ باوحشت نہ پیوندد
شکستِ قیمت دل کی صدا کیا؟　　نمی دانم کدامیں بیوفا آئینہ چید اینجا
غالبؔ　　بیدلؔ

غالب کہتے ہیں اے محبوب تو نے جنس وفا کی قدر نہ کر کے دل کی قیمت گھٹا دی، یعنی میرا دل توڑ دیا، پر تجھے خبر نہ ہوئی کہ میری جان کو تو نے کس ظلم و ستم کی مشقگاہ بنایا۔ شاید اس وقت تجھے کچھ احساس ہو جب دل کے ٹوٹنے کی آواز تیرے کان تک پہنچے۔ مگر دل کے ٹوٹنے کی آواز نہیں آتی۔ بیدل کہتے ہیں اے محبوب تیری کوئی تصویر دل میں نہیں ابھرتی جس کے ساتھ وحشت بھی جڑی نہ ہو، جانے کس بیوفا نے یہاں آئینہ دکھلایا۔ بیوفا محبوب کی بہترین تعبیر ہے مطلب یہ ہے کہ جانے کس بیوفا محبوب نے میرے دل پر جلوہ آرائی کی، کہ بجائے اس کے کہ اس میں محبت پیدا ہو اس پر وحشت طاری ہو گئی۔ یہاں غالب نے محبوب کو ''غارت گر جنس وفا'' سے تعبیر کیا ہے

جبکہ بیدل نے صرف ''بیوفا'' سے تعبیر کیا ہے۔ غالب نے محبوب کے سامنے جنس وفا کی ناقدری کی بات کہی ہے بیدل نے اسے بیوفا محبوب کے وحشت آمیز نقش سے تعبیر کیا ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو غالب کے شعر میں بیدل کے اس خیال کی جھلک موجود ہے۔ نیاز فتحپوری نے اس شعر کی دوسرے انداز سے تشریح کی ہے وہ لکھتے ہیں:

> ''میرے دل میں جو نقش ابھرتا ہے وہ آخر کار وحشت انجام ہی نظر آتا ہے اس لئے حیران ہوں کہ وہ کون بیوفا ہے جس نے میرے دل کو آئینہ تمثال بنا کر اس عذاب میں مبتلا کر دیا۔ مدعا یہ ہے کہ دل میں اب سوائے جلوۂ دوست کے کسی اور چیز کی گنجائش نہیں ہے، اور اس کے علاوہ جو خیال پیدا ہوتا ہے وہ باعث وحشت ثابت ہوتا ہے۔''۹۶

کیا کس نے جگر داری کا دعویٰ	تا از نفس غباریست باید زباں کشیدن
شکیبِ خاطر عاشق بھلا! کیا	در وادیِ محبت جز العطش نباشد
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں اے محبوب میں نے تو کبھی بھی جگر داری یعنی صبر وشکیبائی کا دعویٰ نہیں کیا بھلا عاشق کو کبھی محبوب کے بغیر قرار وسکون مل سکتا ہے۔ بیدل کہتے ہیں جب تک سانس چل رہی ہے زبان بھی چلتی رہنی چاہئے۔ محبت کی وادی میں انسان کی پیاس کبھی نہیں بجھتی بلکہ وہ العطش العطش کی صدا لگائے رہتا ہے چنانچہ ایک جگہ کہتا ہے:

جور حسن و صبر عاشق تو ام یکدیگر ند
با خدنگ او دل من ہمچو پیکاں آشناست

معشوق کا ظلم اور عاشق کا صبر دونوں جڑواں واقع ہوئے ہیں۔ میرا دل پیکان کی طرح اس کے تیر سے آشنا ہے۔ چنانچہ دوسری جگہ کہتا ہے:

سوختن در ہر صفت منظور عشق افتادہ است
عاشقاں در سایۂ برقِ بلا افتادہ اند

غور سے دیکھا جائے تو غالب کا مصرع ''شکستِ خاطرِ عاشق بھلا کیا'' میں بیدل کے دوسرے مصرع ''در وادیٔ محبت جز العطش نباشد'' کا عکس موجود ہے۔

یہ قاتل وعدہٗ صبر آزما کیوں فرصت کمین وعدہٗ فردا دماغ کیست
یہ کافر فتنہ طاقت ربا کیا اے گل بہار رفت برائے خدا بخند
غالب بیدل

غالب کہتے ہیں اے محبوب تو مجھ سے ایسا وعدہ کیوں کرتا ہے جس میں میرے صبر و قرار کی آزمائش ہو۔ اس قسم کا وعدہ میرے عشق میں ایک فتنہ طاقت ربا ہے مطلب یہ ہے کہ میرے اندر اتنی سکت نہیں کہ تیرے ایفائے عہد تک میں بقید حیات بھی رہوں گا۔ بیدل کہتے ہیں کس کا دل و دماغ ہے کہ وعدہٗ وصل فردا کی فرصت کا انتظار کرے۔ اے پھول بہار رخصت ہو چکی ہے خدا کے لئے مسکرا دے۔ مطلب یہ ہے کہ اے محبوب تو نے کل ملنے کا وعدہ کیا ہے تجھ کو خبر ہے کہ کل ہمیں یہ مہلت بھی ملے گی؟ اس بنا پر ابھی ہنس بول لے اگرچہ بہار رخصت ہو چکی ہے۔ محبوب کے وعدہ وصل کا تذکرہ غالب اور بیدل دونوں نے کیا ہے۔ غالب محبوب کے اس وعدہ کو صبر آزما قرار دے کر طاقت ربا فتنہ قرار دیتا ہے۔ جبکہ بیدل کا خیال ہے وعدہ وصل فردا کی فرصت کے انتظار کا کس کے اندر بوتا ہے جو نتیجے کے طور پر صبر آزما اور طاقت ربا بھی ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو غالب کے کلام میں بیدل کے کلام کا عکس موجود ہے۔ بلکہ غور سے دیکھا جائے تو غالب کا پورا شعر بیدل کے ایک مصرع ''فرصت کمین وعدہٗ فردا دماغ کیست'' کا آزاد اور خوبصورت ترجمہ ہے۔

بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات تبسم ، تکلم ، تغافل ، ترحم
عبارت کیا ، اشارت کیا ، ادا کیا نمی زیبد الا بروئے نکویش
غالب بیدل

غالب کہتے ہیں محبوب کی ہر ادا، ہر اشارہ، ہر غمزہ حتیٰ کہ ہر بات عاشق کے لئے بلائے جان یعنی دلکش ہے اس معنی میں کہ عاشق وارفتہ اس پر اپنی جان چھڑکتا ہے اور دیوانہ وار اس پر

نچھاور ہوتا ہے۔ بیدل کہتے ہیں تبسم، تکلم، تغافل اور ترحم وغیرہ صفات تو صرف محبوب کے حسین چہرے کو ہی زیب دیتی ہیں، یہاں بیدل نے حسین چہرے کی چار خصوصیتوں کا ذکر کیا ہے جو عاشق وارفتہ کے لئے دلکش و دلآویز ہے: مسکرانا، بات کرنا، دانستہ غفلت برتنا اور ترس کھانا۔ حسینوں کی قاتل اداؤں کا اگر استیعاب کریں تو ان چار خصوصیتوں میں ان کو سمیٹ سکتے ہیں۔ کبھی ان کی مسکراہٹ جان لیوا ہوتی ہے کبھی ان کا انداز گفتگو قاتل ہوتا ہے، کبھی اس کی دانستہ غفلت ولاپرواہی گھائل کرتی ہے اور کبھی عاشق کے حال پر ترس کھا کر اس کی عنایت اسے خوش کر دیتی ہے ۔ غالب نے اپنے مخصوص انداز سے اس مضمون کو اردو شعر کا بہترین قالب عطا کر دیا لیکن پھر بھی تبسم، تغافل اور ترحم کا ذکر نہ آ سکا، اس لئے اس کا یہ کہنا درست ہے:

طرز بیدل میں ریختہ لکھنا
اسداللہ خاں قیامت ہے

عتاب لالہ رخاں عرض جوہر ذاتیست
ز شعلہا نتواں برد گرمی خو را
بیدلؔ

در خور قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا
پھر غلط کیا ہے جو ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا
غالبؔ

غالب کا مطلب ہے کہ محبوب نے ہمارے سوا کسی کو اپنے ظلم وستم کا نشانہ بنانے کے لائق نہیں سمجھا۔ دنیا کے سارے انسانوں میں صرف مجھے اس مقصد کے لئے انتخاب کیا۔ اس لئے اگر ہم یہ کہیں کہ ہم جیسا کوئی نہیں پیدا ہوا تو غلط نہ ہوگا۔ بیدل کہتے ہیں لالہ رخ حسینون کی خصوصیت ہی نہیں بلکہ ان کی سرشت اور ان کا جوہر ذاتی ہے کہ اپنے چاہنے والوں پر غصہ گرمی کا اظہار کریں۔ بھلا شعلے سے اس کی گرمی اور حرارت کی خصوصیت کو دور کیا جا سکتا ہے؟ محبوب کے اپنے عاشق پر قہر و عتاب کا ذکر غالب اور بیدل دونوں نے کیا ہے، اس فرق کے ساتھ کہ غالب کے مطابق محبوب نے اس کے سوا کسی کو اس لائق نہیں سمجھا اس لئے وہ ایک لاثانی شخصیت بن گئے ۔ جبکہ بیدل کا خیال ہے کہ حسینوں کی یہ ایک ذاتی خصوصیت ہے اور تمام عاشقوں کے ساتھ ان کا یہی رویہ رہتا ہے کسی خاص فرد و بشر کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ دیکھا جائے تو بیدل کا خیال حقیقت پر مبنی ہے۔ چنانچہ ایک دوسری جگہ کہتا ہے:

مروت از دل خوباں ندارید
فرنگستاں مسلمانی ندارد

حسینوں کے دل سے آپ مروت وانسانیت کی توقع نہ رکھیں ۔وہ حقیقت میں فرنگستان ہیں اور فرنگستان میں مسلمان نہیں ہوتے ۔ بیدل کے زمانے میں انگریز ہندوستان میں قدم رکھ چکے تھے اور یہ سب عیسائی تھے ان کی عورتیں حسین ہوتی تھیں جس کا تذکرہ بیدل نے کئی جگہ اپنے اشعار میں کیا ہے۔اس کا خیال تھا کہ انگلینڈ میں مسلمان بالکل نہیں ہوتے ۔

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا
غالب

نے ز طاعت بہرہ ای بردم نہ ذوقی از گناہ
در ہمہ کارم تصورِ نیستی معذور کرد
بیدل

غالب کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی بندگی میں بھی میں اس قدر آزاد اور خوددار واقع ہوا ہوں کہ اگر عبادت کے لئے کعبہ کا دروازہ کھلا نہ ملا تو واپس لوٹ آئیں اور دروازے پر دستک دینا بھی گوارا نہ کریں ۔مقصد اپنی خودداری کا اظہار ہے ورنہ ظاہر ہے کعبہ کا دروازہ بند کب ہوتا ہے جو اس کے نہ کھلنے کی وجہ سے لوٹ جانے کا سوال پیدا ہو۔ یہ غالب کا مزاج تھا۔اس کے مقابلے پر بیدل متواضع اور منکسر مزاج تھا۔اس لئے اس نے صاف اقرار کیا کہ میں نے نہ تو بندگی کی اور نہ ہی گناہ کا ذوق میرے اندر رہا۔فنا کے احساس نے جو ہر وقت دماغ میں مستحضر رہتا تھا مجھ کو سارے کاموں سے معذور رکھا۔

سب کو مقبول ہے دعویٰ تری یکتائی کا
روبرو کوئی بتِ آئینہ سیما نہ ہوا
غالب

یکتائی آفرید لب خود ستائے عشق
در نقطہ دہن الفی داشت میم "ما"
بیدل

غالب کہتے ہیں اے محبوب تجھ کو جو اپنے واحد حسین ترین شخص ہونے کا دعویٰ ہے اس کا اعتراف سب لوگ کرتے ہیں اور آئینے کی طرح کوئی حسین اور روشن بت بھی تیرے مقابلے کی جرات نہیں کرسکتا۔ بیدل کہتے ہیں کہ عشق کے لب خودستا نے یکتائی پیدا کی۔ "ما" کا میم اپنے نقطہ دہن

میں ''الف'' رکھتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب ہم ''ما'' (ہم) کہتے ہیں تو ما کے اندر موجود ''میم'' درحقیقت ایک نقطۂ دہن ہے جس کے اندر ''الف'' یکتائی کی نمائندگی کرتا ہے جیسا کہ دوسری جگہ کہتا ہے: ع

عشق بیتاب عرض یکتائیست

عشق یکتائی کو پیش کرنے کے لئے بیتاب و بیقرار ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کے اس پورے شعر میں بیدل کے دونوں شعر کی چھاپ پائی جاتی ہے اور اسے حقیقت اور مجاز دونوں کی طرف لے جایا جا سکتا ہے۔

کم نہیں نازش ہمنامی چشمِ خوباں
ترا بیمار برا کیا ہے اگر اچھا نہ ہوا
غالبؔ

از تغافل تا نگاہِ چشمِ خوباں فرق نیست
نشہ یک رنگست درد و صافِ جام را
بیدلؔ

غالب کا مطلب یہ ہے کہ تیرا بیمار یعنی عاشق صحت یاب نہ ہوا تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، کیونکہ اپنی بیماری میں اس کے دل کو کم از کم اس بات سے تسلی ہے کہ اسے چشم خوباں کی ہم نامی کا شرف حاصل ہے۔ شعرا معشوق کی آنکھ کو اکثر بیمار باندھا کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ اگر میں بیمار ہوں تو حسینوں کی آنکھ بھی بیمار ہے اس طرح ہم دونوں ہم نام ہیں۔ بیدل کہتے ہیں حسینوں کے تغافل اور نگاہ دونوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ دونوں کے اندر ایک ہی قسم کی مستی اور سرخوشی ہوتی ہے۔ جس طرح تلچھٹ اور شراب میں ایک ہی قسم کا نشہ ہوتا ہے۔ گویا بیدل کے نزدیک چشم خوباں کی مستی اہمیت رکھتی ہے، عاشقوں سے اس کی ہم نامی کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ چنانچہ اکثر اشعار میں اس نے اسی نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے:

خیالِ مستی آنچشم ہرجا مئے فروش آمد
عرق بیروں کشد شرم از جبینِ روشن مینا

بچشم آئینہ تا جلوہ گر شد چشمِ مخمورت
ز مستی چوں مژہ بر یک دگر افتاد جوہر ہا

مستِ خیال میکدہ نرگسِ تو ایم
شور جنوں کند قدح ما شراب را

سینے کا داغ ہے وہ نالہ کہ لب تلک نہ گیا	مباد نالہ ربط داغہائے دل زند برہم
خاک کا رزق ہے وہ قطرہ کہ دریا نہ ہوا	مشوراں اے جنوں ایں شعلہ زنجیر در پا را
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کا مطلب ہے کہ محبوب کی جدائی میں عاشق نالہ وشیون کرتا ہے اور نالہ کشی کا لطف اس میں ہے کہ وہ خوب دل کھول کر آہ وزاری کرے۔ وہ نالہ جو لب تک نہ آئے یعنی معشوق کے کان تک نہ پہنچے سینے کا داغ ہے۔ وہ نالہ کہلانے کے لائق ہی نہیں۔ اسی طرح لطف اس میں ہے کہ عاشق کی آنکھوں سے آنسو کا دریا بہہ جائے۔ اگر ایک دو آنسو پر ہی اس نے بس کیا تو وہ رائگاں چلا جائے گا۔ بنیادی خیال یہ ہے کہ نالہ اور آنسو در حقیقت وہ ہے جو معشوق کو متاثر کر سکے، نہیں تو ایک سینے کا داغ ہے تو دوسرا خاک کا رزق ہے۔ بیدل کہتے ہیں آہ و نالہ تو کرنا چاہئے پر اس قدر نہیں کہ دل میں جو عشق کے داغ ہیں ان کا باہمی ربط درہم برہم ہو جائے۔ (بیدل نے ''داغ دل'' سے عشق کی سوزش مراد لی ہے چنانچہ ایک جگہ کہتا ہے: داغ سودائے تو دود انگیخت از بنیاد دل) پھر ان داغہائے دل کو شعلہ زنجیر در پا (ایسا شعلہ جس کے پاؤں میں بیڑی پڑی ہوئی ہے) سے تشبیہ دے کر کہتا ہے کہ اے عشق اس شعلہ کو نہ بھڑکا، یعنی اسے اپنی جگہ رہنے دے۔ دوسری جگہ اور صاف الفاظ میں کہتا ہے:

زاں نالہ ای کہ زنجیر در پائے شوق دارد
فرزانہ را ندامت دیوانہ را عرویت

جو نالہ پائے شوق میں بیڑی ڈالے ہوئے ہو عقلمند کے لئے باعث ندامت ہے اور دیوانہ کے لئے باعث خوشی و مسرت۔ گویا غالب کے مطابق اسی نالہ کی اہمیت ہے جو معشوق کے کان تک پہنچے اور بیدل کے مطابق اس نالہ کی اہمیت ہے جو عاشق کے داغہائے دل کو مربوط رکھے۔

نام کا میرے ہے جو دکھ کہ کسی کو نہ ملا	شکوہ تقدیر نتواں دستگاہ کفر کرد
کام میں میرے ہے جو فتنہ کہ برپا نہ ہوا	قابل چیزی کہ من بودم ہمانم کردہ اند
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کا مطلب یہ ہے کہ کارکنان قضاوقدر نے ہروہ دکھ جو کسی بناپر دوسروں کے حصے میں نہیں آئی میرے نام یا میری تقدیر میں لکھ دیا ہے۔ اسی طرح ہروہ فتنہ جو دنیا میں کہیں اور برپا نہ ہوا اور دوسروں کو اذیت نہ دے سکا وہ میرے کام میں ہے یعنی میری ایذارسانی پر مامور ہوا۔ غرض کہ مصائب وفتن کا مجھے محور ومرکز بنادیا۔ بیدل کہتے ہیں ہم جس سکھ دکھ کے اہل تھے ہمیں ویسا ہی بنادیا گیا، اس لئے تقدیر کا شکوہ کر کے کفر نہیں بکا جاسکتا۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کا پورا شعر بیدل کے ایک مصرع ''قابل چیزی کہ من بودم ہمانم کردہ اند'' کا معکوس ترجمہ ہے۔

عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالبؔ	بسینہ داغ و بدل نالہ و بدیدہ سرشکم
جو بجھائے نہ بجھے اور لگائے نہ لگے	مجسّم ہمہ جا شعلہ کار سوختگیہا
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کا مطلب واضح ہے کہ عشق ایک ایسی آگ ہے جو لگ جاتی ہے لگائی نہیں جاتی اور بجھانے سے بجھتی نہیں، اس آگ پر کنٹرول کرنا کسی کے بس کی بات نہیں۔ بیدل کہتے ہیں عشق ومحبت کا معاملہ بھی عجیب وغریب ہے۔ ہرجگہ اس کا عمل ''شعلہ کار سوختگی'' یعنی جلا کر بھسم کرنے کا ہے۔ چنانچہ سینہ میں داغ بن کر تو دل میں نالہ بن کر اور آنکھوں میں آنسو بن کر وہ اپنی سوزش کا عمل جاری رکھے ہوئے ہے۔ دیکھا جائے تو غالب اور بیدل دونوں نے عشق کی تاثیر کو موضوع بنایا ہے ۔غالب کے مطابق عشق ایک آگ ہے جس کو کنٹرول کرنا کسی کے بس کی بات نہیں۔ بیدل کے مطابق بھی عشق ایک آگ ہے جس نے عاشق کے سینہ، دل اور دیدہ سب کو مختلف انداز سے جلا کر رکھ دیا ہے۔ درج ذیل اشعار میں بھی بیدل نے اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے:

بطبع کارگہ عشق آتش افتادہ است
کسی چہ آب دہد آشیانِ فاختہ را
التفات عشق آتش ریخت در بنیاد دل
سیل شد تردستی معمار ایں ویرانہ را

عشق کے کارخانے میں آگ لگی ہوئی ہے فاختہ کے آشیانے پر پانی کون چھڑکے۔

قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل	میتواں در تخم دیدن شاخ و برگ نخل را
کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا	جزو چوں کامل شود آئینۂ حسن کلست
غالبؔ	بیدلؔ

غالب نے اس شعر میں مسئلہ وحدت الشہود پر روشنی ڈالی ہے، جو شخص عارف اور خدا شناس ہے اسے قطرے میں دریا اور جز میں کل نظر آتا ہے۔ اگر خداشناس کو ہر ایک شئے اور ذرے میں خدا کا جلوہ نظر نہ آئے تو کہا جاسکتا ہے کہ اس کا دیدہ بینا ایک لغو اور مہمل چیز ہے۔ بیدل بھی مسئلہ وحدت الشہود پر بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تخم میں کھجور کی شاخ اور پتوں کو دیکھا جاسکتا ہے جزو جب کامل ہوتا ہے تو وہ حسن کل کا آئینہ ہوتا ہے۔ کھجور کے درخت کا بیج بظاہر بیج ہے لیکن اس کے اندر کھجور کا پورا درخت مع شاخ و برگ کے موجود ہے جو اس کے اجزا ہیں۔ جب یہ اجزا اپنے بلوغ کو پہنچتے ہیں تو وہ آئینہ حسن کل ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ساری دنیا جو اجزاء کی حیثیت رکھتی ہے، ذات وحدہ لاشریک لہ کی، جو کل کی حیثیت رکھتی ہے، جلوہ گاہ ہے۔ ع

عالم ہمہ جلوہ ذات احد است

اب اگر غور سے دیکھا جائے تو غالب کا مصرع ''قطرے میں دریا دکھائی نہ دے اور جزو میں کل'' بیدل کے مصرع ''میتواں در تخم دیدن شاخ و برگ نخل را'' کا مفہوم مخالف کے ساتھ آزاد ترجمہ ہے۔ دوسرے مصرع میں بیدل نے غالب سے الگ ہٹ کر ایک بات کہی ہے کہ جز جب کامل ہوجاتا ہے تو حسن کل کا آئینہ ہوجاتا ہے اس مفہوم میں بیدل کے دوسرے اشعار ملاحظہ ہوں:

ز جیب ریشہ اسرار چمن گل می کند آخر
کمال جزو دارد دستگاہ معنی کل را

اجزائے جہان کل کیفیت کل دارد
ہر قطرہ کہ در دریاست باشد ہمہ تا باشد

عالم ایجاد عشرت خانہ جزو و کل است
در بہار رنگ ہر جا چشم وا گردد گل است

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے   شیوہ تغافل خوشست ورنہ بایں برق حسن
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا   تا تو نظر کردہ ای آئینہ خاکستر است
غالبؔ   بیدلؔ

غالب کا مطلب ہے کہ لوگوں میں اس بات کا چرچا تھا کہ ستم پیشہ محبوب بڑی بے رحمی سے غالب کے تکے بوٹی کرنے والا ہے چنانچہ ہم بھی یہ تماشا دیکھنے گئے پر افسوس کہ قاتل نے غالب کو اس لائق ہی تصور نہ کیا۔ بیدل کہتے ہیں تیرا انداز تغافل اور دانستہ بے اعتنائی اپنی جگہ اچھی بات ہے ورنہ اس برق حسن کے ساتھ جب تو مجھ پر نظر کرتا تو آئینہ دل خاکستر ہو چکا ہوتا۔ غالب اور بیدل دونوں نے محبوب کی بے اعتنائی کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کے مطابق محبوب نے غالب کے پرخچے اڑائے جانے کے لئے ناقابل اعتنا سمجھ کر اسے چھوڑ دیا۔ بیدل کے مطابق عاشق سے محبوب کا دانستہ غفلت برتنا ایک اچھا فعل تھا ورنہ حسن کی جو بجلی گرتی تو عاشق کا آئینہ دل خاکستر ہو جاتا: ع

قیامت ریخت بر آئینہ ام برق تماشایش

پئے نذرِ کرم تحفہ ہے شرم نارسائی کا   بہ امید فضل تو نازنیں ہمہ را نثار دلست و دیں
بخوں غلطیدہ صد رنگ دعویٰ پارسائی کا   من بیدل و عرق جبیں کہ چہ در طبق کنم از حیا
غالبؔ   بیدلؔ

غالب کا مطلب ہے کہ بارگاہ الٰہی میں نذر کرم پیش کرنے کیلئے نارسائی کی شرم کا تحفہ ہے یعنی اس بات کی شرم کا کہ ہم بارگاہ ایزدی تک پہنچنے سے عاجز اور درماندہ ہیں۔ اس عاجزی اور نارسائی کے سوا کوئی اور طریقہ کرم کے استدعا کا نہیں ہے۔ خدا کی بارگاہ میں پارسائی یعنی طاعت وعبادت کی جگہ عذر تقصیر خدمت پارسائی کے غلط دعویٰ لے کر آیا ہوں مطلب یہ ہے کہ اس اقرار کے ساتھ کہ مجھ سے بندگی نہ ہو سکی اسی اعتراف گناہ کو تحفہ کے طور پر پیش کرتا ہوں۔ بیدل کا مطلب یہ ہے کہ اے خدا! اور لوگوں کے پاس تو دل ودین کا سرمایہ ہے جو تیری عنایتوں کی امید میں تجھے نذر کر سکتے ہیں میں تو بیدل وبیکس وبے یارومددگار ہوں میرے پاس کوتاہیوں کی شرم سے پیشانی کے پسینے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ بھلا اس کو طبق میں رکھ کر مارے شرم کے آپ کو کس

طرح پیش کروں۔ یہاں غالب نے دربار خداوندی میں شرم نارسائی کا تحفہ پیش کر دیا جبکہ بیدل نے شرم بے کسی کا تحفہ پیش کیا۔غور سے دیکھا جائے تو غالب کا مصرعہ'' پئے نذر کرم تحفہ ہے شرم نا رسائی کا'' میں بیدل کے دوسرے مصرعہ'' من بیدل وعرق جبیں کہ چہ در طبق کنم از حیا'' کے خیال عکس موجود ہے اس کے علاوہ بیدل نے متعدد اشعار میں بارگاہِ الٰہی تک پہنچنے میں اپنی عاجزی اور نارسائی کا بھی ذکر کیا ہے۔

مقیم انجمن نارسائیم بیدل
بہر کجا نہ رسد سعی پیش مرا دریاب
بوصل لغزش پائے رسیدہ ام بیدل
بیا کہ داد سعی نارسا اینجاست

فروغ حسن سے ہوتی ہے حل مشکلِ عاشق	بیتو در ظلمت سرائے چشم کے بودی فروغ
نہ نکلے شمع کے پا سے نکالے گر نہ خار آتش	پرتوِ مہر تو ایں ویرانہ را آباد ساخت
غالبؔ	بیدلؔ

غالب نے پہلے مصرعہ میں دعویٰ کیا ہے کہ معشوق کے حسن کی آب وتاب سے عاشق کی مشکل حل ہوتی ہے، جیسے آتش اگر خار شمع نہ نکالے تو شمع کے پاؤں سے اس کے نکلنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔شاعر نے شمع کی بتی کو پائے شمع کا کانٹا قرار دیا ہے۔شمع جب روشن ہوتی ہے تو بتی جل جاتی ہے۔اس کو خار کے نکل جانے سے تعبیر کیا ہے۔بیدل کہتے ہیں۔اے محبوب تیرے بغیر چشم کی ظلمت سرا میں روشنی کہاں سے آسکتی تھی، تیرے مہر حسن کے پرتو نے اس ویران دل کو آباد کیا۔غور سے دیکھا جائے تو غالب کے مصرعہ''فروغ حسن سے ہوتی ہے حل مشکلِ عاشق'' میں بیدل کے مصرعہ''بیتو در ظلمت سرائے چشم کے بودی فروغ'' کا عکس موجود ہے۔

زکوٰۃ حسن دے اے جلوۂ بینش کہ مہ آسا	تو کریمِ مطلق و من گدا چہ کنی جز اینکہ بخوانیم
چراغ خانہ درویش ہو کاسہ گدائی کا	درِ دیگری منما کہ من بکجا روم چو برانیم
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں اے جلوہ بینش (یعنی اے خدا) تو اپنے حسن یعنی کرم اور فیض ہائے انوار الٰہی کی جھلک میرے دل پر ڈال دے تا کہ کاسۂ گدائی یعنی دل عاشق چراغ خانہ درویش ہو جائے یعنی میری پوری شخصیت چاند کی طرح روشن ہو جائے۔ بیدل کہتے ہیں اے خدا تو کریم مطلق ہے اور میں گدا ہوں، مجھ پر اپنی کریمانہ نوازش کے سوا اور کیا کرے گا۔ کوئی اور در نہ دکھا کیونکہ اگر تو نے راندہ درگاہ کر دیا تو کہاں جاؤں گا۔ غالب اور بیدل دونوں نے خدا سے کرم اور عنایت کی بھیک مانگی ہے۔ انداز بیان الگ الگ ہے۔ غالب کہتے ہیں اے خدا تو اس قدر کرم فرما کہ میری شخصیت روشن ہو جائے۔ بیدل کہتے ہیں اے خدا تو کریم ہے اور میں گدا ہوں مجھ پر اپنی عنایتوں کے سوا آخر کیا کرے گا۔ یہاں غالب کے شعر میں بیدل کے کلام کی چھاپ بالکل واضح ہے۔

نہ مارا جان کر بے جرم قاتل تیری گردن پر	کجا بکشتن ما حسن می کند تقصیر
رہا مانند خونِ بے گنہ حق آشنائی کا	کہ زیر تیغ نشاندہ است نرگس اورا
غالبؔ	بیدلؔ

حالیؔ اس شعر کا مطلب لکھتے ہیں کہ تو نے مشتاق قتل کو بے جرم سمجھ کر اس لئے قتل نہیں کیا کہ خون بے گناہ اپنی گردن پر نہ لے۔ مگر اب تیری گردن پر بجائے خون بے گناہ کے حق آشنائی کا رہے گا۔ (۹۷) بیدل کہتے ہیں محبوب میرے قتل کرنے میں بھلا کیوں کوتاہی کرنے لگا کیونکہ اس کی نرگسی آنکھ نے عاشق کو سدا تلوار کے نیچے رکھ چھوڑا ہے محبوب کا اپنی آنکھوں کے غمزے اور اشارے سے عاشق کو قتل کرنے کا مضمون اکثر شاعروں نے باندھا ہے۔ خود بیدل کے کلام میں اس طرح کے شواہد موجود ہیں:

چشمت بہ غلط سوئے دل انداخت نگاہی
تیریکہ ازاں شست خطا شد چہ بجا شد
بہ خون می غلطم از اندیشہ ناز سیہ مستی
کہ چشم شوخ او در جام مئے حل کرد افیون را

یہاں بیدل نے عام مشاہدے میں جو صورت حال پیش آتی ہے اس کا تذکرہ کیا ہے جبکہ غالب نے اس میں ایک نکتہ آفرینی سے کام لیا۔ یہ غالب کی انفرادیت ہے۔

تمنائے زباں محوِ سپاسِ بے زبانی ہے ‏ ‏ نیست با حسنت مجالِ گفتگو آئینہ را
مٹا جس سے تقاضا شکوہ بے دست و پائی کا ‏ ‏ سرمہ می ریزد نگاہت در گلو آئینہ را

غالب ‏ ‏ ‏ ‏ بیدل

غالب کہتے ہیں تمنائے زبان یعنی قوت گویائی کی تمنا بے زبانی کی شکرگزاری میں محو ہے۔ مطلب یہ ہے کہ محبوب سے میں اپنی بیچارگی اور بے کسی کا شکوہ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن زبان نے میری اس تمنا کا ساتھ نہ دیا۔ اس لئے خاموش رہا۔ اس بے زبانی کا نتیجہ یہ نکلا کہ بے دست و پائی کے شکوہ کا تقاضا ہی مٹ گیا اس بنا پر میری تمنائے گویائی بے زبانی کی مشکور و ممنون ہے۔ بیدل کہتے ہیں آئینہ دل کو تیرے حسن سے گفتگو کرنے کی جرأت نہیں ہے۔ تیری نگاہ آئینہ کے گلے میں سرمہ انڈیل رہی ہے۔ گلے میں سرمہ ڈال دینے سے گویائی بند ہو جاتی ہے۔ اس لئے سرمہ ریزی کنایہ ہے قوت گویائی کو ختم یا موقوف کر دینے سے۔ بیدل کہتا ہے کہ جب آئینہ دل عاشق کے گلے میں تیری نگاہ نے سرمہ ڈال دیا یعنی اس کی قوت گویائی ختم کر دی تو اس میں حسن (معشوق) سے گفتگو کرنے کا یارا نہ رہا۔ گویا بیدل نے حسن کی مرعوب کرنے والی خصوصیت کی وجہ سے خاموش رہنے کا ذکر کیا جبکہ غالب نے بیچارگی کا شکوہ کرنے میں زبان کی عدم رفاقت کی وجہ سے خاموش رہنے کا اور بے زبانی کا ممنون ہونے کا تذکرہ کیا۔ بیدل نے دوسرے اشعار میں اس امر کا تذکرہ کیا ہے کہ حسینوں سے شکوہ کرنا کشورِ حسن کے اصول و آئین نیز عاشق صادق کے طور طریقے کے خلاف ہے:

شکوہ خوباں مکن بیدل کہ در اقلیم حسن
رسم و آئینہ جفا خاصیت روئے نکوست
مپندارید عاشق شکوہ پردازد بہ بیدادش
کہ لب واکردن امکانیست زخم تیر الفت را

یہ خیال بھی نہ کرو کہ عاشق معشوق کے ظلم و ستم کا شکوہ کرے گا۔ کیونکہ جو آدمی تیغ الفت

کا زخمی ہے ممکن نہیں کہ وہ اپنا لب بھی کھولے اس لئے غالب کا یہ کہنا کہ بیدست و پائی کے شکوہ کا تقاضا ہی مٹ گیا، بے محل سا معلوم ہوتا ہے۔

عدم تک بیوفا چرچا ہے تیری بیوفائی کا	دہان ہر بت پیغارہ جو زنجیر رسوائی
غالبؔ	
ز چاکِ دانہ خرما شد ایں قدر معلوم	کہ از وفا دلِ سخت شکر لباں خالیست
بیدلؔ	

غالب کہتے ہیں اے بیوفا! تیری بیوفائی کا چرچا دنیا کے ہر بت پیغارہ جو (لعن طعن کرنے والا محبوب) کی نوک زباں پر ہے اور چونکہ ان کے حلقہائے دہن سے رسوائی نے ایک زنجیر کی شکل اختیار کرلی ہے۔ اس لئے تیری بیوفائی کا سلسلہ عدم تک پہنچ گیا ہے۔ بیدل کہتے ہیں دانۂ خرما کی چاک سے یہ نکتہ واضح ہے کہ شکرلب حسینوں کا سخت دل وفا سے خالی ہوتا ہے۔ بیدل اور غالب دونوں نے محبوب کی بیوفائی کا تذکرہ کیا ہے۔ غالب کے مطابق اس کی بیوفائی کا چرچا عدم تک طول پکڑ گیا ہے۔ جبکہ بیدل کا خیال ہے شکرلب حسینوں کا دل سدا بیوفا رہتا ہے۔ مثال کتنی بلیغ دی ہے کہ خرما شیریں اور خوش مزہ ہوتا ہے مگر اس کی گٹھلی کی چاک میں مٹھاس نہیں ہوتی جو اس کے سخت دل کے حکم میں ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کا مصرعہ ''عدم تک بے وفا چرچا ہے تیری بیوفائی کا'' میں بیدل کے مصرعہ ''کہ از وفا دلِ سخت شکر لباں خالیست'' کا عکس موجود ہے البتہ انداز بیان جدا ہے۔

نہ دے نالہ کو اتنا طول غالب مختصر لکھ دے	کہ حسرت سنج ہوں عرض ستمہائے جدائی کا
غالبؔ	
کردم رقم بہ کلک نفس مد نالہ را	دادم بباد شعلۂ شوقت رسالہ را
بیدلؔ	

غالب کہتے ہیں معشوق کے نام اپنے خط کو زیادہ طول نہ دے، صرف اتنا لکھ دے کہ میرے دل میں ستمہائے جدائی کو بیان کرنے کی بہت حسرت اور تمنا ہے۔ بیدل کہتے ہیں سانس کے قلم سے میں نے نالہ کی درازی ضبط تحریر میں لائی اور تیرے شعلہ شوق کو میں نے ہوا کے حوالے کر دیا (یا بھڑکا دیا)۔ بیدل نے غالب کے برعکس نالہ کو بجائے مختصر کرنے کے طول دیا اور

ستمہائے جدائی کو بیان کرنے کی جگہ شعلہ شوق کو ہوا کے حوالے کیا (یا ضایع کیا)۔ گویا بیدل کے مقابلے پر غالب اختصار نالہ کے حق میں نظر آتے ہیں۔ درحقیقت بیدل درد عشق کو برقرار رکھنے اور نالہ کے ذریعہ نرخ الم کو بلند رکھنے کے خواہاں ہیں چنانچہ کہتے ہیں:

عمریست کہ در عالم سودائے محبت
از نالہ من نرخ بلند است الم را

ایک عرصہ سے سودائے محبت کی دنیا میں میرے نالہ سے درد والم کا بھاؤ بڑھا ہوا ہے۔

شب ہجراں چہ جوئی طاقت صبر از من بیدل	گریہ اندوہ شب فرقت، بیان ہو جائے گا
کہ آہم می کند سنگ فلاخن سخت جانی را	بے تکلف داغ مہ، مہر دہاں ہو جائے گا
بیدلؔ	غالبؔ

غالب کا مطلب یہ ہے کہ غم دل بیان کر دینے سے اس کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ اب اگر غم جدائی بیان نہ کیا گیا اور خاموش رہا تو چاند کے داغ کی طرح غم کا نشان سدا کے لئے رہ جائے گا اور عیاں بھی رہے گا۔ دوسرے مصرع میں کہتا ہے: مہر دہاں بے تکلف داغ مہ ہو جائے گا یعنی خاموشی داغ کی طرح دائمی ہو جائے گی۔ بیدل کہتے ہیں جدائی کی رات کی گریہ وزاری میں مجھ بیدل سے صبر وقرار کی توقع مت کرو، یعنی وہ رات ناقابل برداشت تھی۔ کیونکہ میری آہ وزاری میری سخت جانی کو گوپھن کا پتھر بنا کر پھینک دیتی تھی۔ غالب کے مطابق شب ہجراں کے غم کو بیان کر دینے سے اس کا اثر ہلکا اور قابل برداشت ہو جاتا ہے۔ جبکہ بیدل کے نزدیک شب ہجراں کا غم ناقابل برداشت ہے۔ حتیٰ کہ اگر عاشق سخت جان بننے کی کوشش کرے تو بھی اس کی آہ اسے سنگ فلاخن بنا کر پھینک دے گی۔ یہاں غالب کا خیال حقیقت سے قریب ہے۔ کیونکہ مشہور ہے اگر کسی کو صدمہ پہنچے تو بیان کر دینے سے غم ہلکا ہو جاتا ہے اور اگر خاموش رہے تو اس کا اثر دل پر زیادہ پڑتا ہے۔ غالب کا ایک اور شعر شب ہجر سے متعلق اس طرح ہے۔

بیکسی ہائے شبِ ہجر کی حسرت ہے ہے
سایۂ خورشید قیامت میں ہے پنہاں مجھ سے

لے تو لوں سوتے میں اس پاؤں کا بوسہ مگر	بیدل مرا بوس و کنار احتیاج نیست
ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا	با عندلیب جلوہ گل آشنا بس است
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ اگر محبوب حالت خواب میں میرے پاس آئے تو میں اس کے پاؤں کا بوسہ لے سکتا ہوں مگر ڈر یہ ہے کہ میرے اس فعل سے کہیں وہ بدگمان نہ ہو جائے اور خواب میں آنا بھی چھوڑ دے۔ بیدل کہتے ہیں کہ عاشق کو جلوۂ محبوب کی آشنائی حاصل ہو جائے یہی بہت بڑی بات ہے۔ بوس و کنار کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ عشق نام ہے بے لوث محبت کا، جبکہ ہوس میں نفسانی خواہشات کی تسکین منظور ہوتی ہے۔ اور بوس و کنار نفسانی خواہش کی تسکین ہے۔ بوس و کنار پر غالب کا ایک فارسی شعر بیدل کے شعر کے مقابلے پر ملاحظہ ہو:

تکلف بر طرف ، لب تشنۂ بوس و کنارستم
ز راہم باز چیں دامِ نوازشہائے پنہاں را

دل کو ہم صرف وفا سمجھے تھے ، کیا معلوم تھا	عرض وفا مباد وبال دگر شود
یعنی پہلے ہی نذر امتحاں ہو جائے گا	اے نالہ عبرتی کہ دل یار نازکست
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ میرا خیال تھا کہ ہمارا دل زندگی بھر عشق کے معاملے میں ساتھ دے گا اور وفاداری نبھائے گا۔ لیکن اس نے تو پہلے ہی آزمائش میں گھٹنے ٹیک دئے لہذا اب حیران ہوں کہ عاشقانہ زندگی کس طرح بسر ہوگی۔ بیدل کہتے ہیں کہ خدا نہ کرے عرض وفا دوسرا وبال بن جائے۔ اے نالہ عبرت ہو کہ دوست کا دل نازک ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وفاداری کی پیشکش بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ عشق میں وفاداری عاشق و معشوق دونوں سے مطلوب ہے۔

عمریست وفا ممتحنِ ناز و نیاز است
نے تیغ زدست تو جدا شد نہ سر از ما

اور محبت تو درحقیقت وفاداری کے نبھانے کا ہی نام ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ کہتا ہے:

بہ دل گفتم کدامیں شیوہ دشوار است در عالم
نفس در خود طپید و گفت : ''پاسِ آشنائیہا''

دل سے پوچھا کہ دنیا میں سب سے مشکل کام کیا ہے؟ سانس نے تپ کر کہا: محبت کا نبھانا، جسے ہم وفاداری کہتے ہیں۔ لہذا وفاداری کی جو یہ پیشکش کی ہے خدانخواستہ کہیں وبال نہ بن جائے اس لئے نالہ کو خطاب کر کے کہتا ہے کہ عبرت حاصل کرتے ہوئے زیادہ زور نہ دکھا کہ دل یار نازک ہے اس سے متاثر ہو جائے گا۔ غالب اور بیدل دونوں نے وفاداری کا تذکرہ کیا ہے غالب کے مطابق دل اسے نبھا نہ سکا۔ جبکہ بیدل کے مطابق اس میں اعتدال سے کام لیا جائے تو نبھ سکتی ہے۔

سب کے دل میں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہوا	بیدل بہر تاب و تب ممنون التفاتی است
مجھ پہ گویا اک زمانہ مہرباں ہو جائے گا	نا مہرباں بیائید یا مہرباں بیائید
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کا مطلب ہے ہر آدمی تجھ سے محبت کرتا ہے اس لئے اگر تو مجھ پر مہربان ہو جائے تو سمجھوں گا کہ ایک زمانہ مجھ پر مہربان ہو گیا۔ بیدل کہتے ہیں اے محبوب ہر تب و تاب پر میں آپ کی توجہ کا احسان مند ہوں چاہے آپ مہربان بن کر آئیں یا نا مہربان بن کر۔ محبوب کے عاشق پر مہربان ہونے کی بات غالب اور بیدل دونوں نے کی ہے غالب کے نزدیک شرطیہ جملے کے ساتھ ہے کہ اگر محبوب مہربان ہو جائے تو ایک زمانہ مہربان ہو جائے گا، جبکہ بیدل کے نزدیک محبوب مہربان رہے یا نامہربان، ہر حال میں اس کی توجہ، مثبت انداز میں ہو چاہے منفی انداز میں، میرے حال پر ہے۔ اس لئے میں اس کا ممنون اور شکر گذار ہوں۔ غالب کی بات اگر مجاز کے بجائے حقیقت سے تعلق رکھے تو حدیث سے ہم آہنگ ہو جائے گی۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ جس کو خدا دوست رکھتا ہے اس کی محبوبیت ساری دنیا میں پھیلا دیتا ہے۔ غالب کا ایک فارسی شعر اسی مضمون کا یوں ہے:

طاق شد طاقت ز عشقت برگراں خواہم شدن
مہرباں شو ورنہ برخود مہرباں خواہم شدن

واۓ گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو
اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جاۓ گا

غالبؔ

مپندارید عاشق شکوہ پردازد بہ بیدادش
کہ لب واکردن امکانیست زخم تیرِ الفت را

بیدلؔ

غالب کا مطلب یہ ہے کہ میں نے اب تک اس امید پر تیرے ظلم کو برداشت کیا کہ مرنے کے بعد روز محشر میں اللہ تعالیٰ میرے ساتھ انصاف فرماۓ گا۔لیکن اگر یہ صورت حال پیش نہ آئی تو میرا ٹھکانا کہاں ہوگا۔ بیدل کہتے ہیں یہ نہ سمجھنا کہ عاشق محبوب کے ظلم کا شکوہ کرے گا کیونکہ جو تیغ الفت کا زخم خوردہ ہے ممکن نہیں کہ وہ لب کشائی بھی کرے۔ یہاں بیدل اور غالب دونوں نے محبوب کے ظلم و بیداد کو موضوع بنایا ہے۔غالب کے نزدیک عاشق کو اظہار گلہ کے ساتھ قیامت میں انصاف ملنے کی توقع ہے۔ جبکہ بیدل کے نزدیک اس کا شکوہ کرنا ہی غلط ہے۔ کیونکہ جو آدمی تیرِ عشق کا گھائل ہوتا ہے اس کے لئے لب کھولنا ہی ممکن نہیں وہ محبوب کے ظلم وستم کا شکوہ کیا کرے گا۔

فائدہ کیا ؟ سوچ آخر تو بھی دانا ہے اسد
دوستی ناداں کی ہے جی کا زیاں ہو جاۓ گا

غالبؔ

از دور باشِ غیرتِ خوباں حذر کنید
گل خارہا نشاندہ بہ آزار عندلیب

بیدلؔ

غالب کہتے ہیں اے اسد تم خود بھی سمجھدار ہو، ذرا سوچ کر بتاؤ کہ ایک ناسمجھ اور سادہ لوح معشوق کی محبت سے تمہیں کیا فائدہ پہنچے گا۔ بلکہ ایک نہ ایک دن اس کے چکر میں تجھے جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ بیدل کہتے ہیں غیرت خوباں کی صداۓ دور باش سے بچ کر رہنا۔ کیونکہ پھول نے بلبل کی ایذا رسانی کے لئے کانٹے لگا رکھے ہیں۔محبوب کی دوستی اور نزدیکی کا تذکرہ دونوں نے کیا ہے ۔غالب کے نزدیک سادہ لوح اور نادان معشوق کی محبت نقصان دہ ہے جبکہ بیدل کے نزدیک حسینوں کی قربت نقصان دہ ہے، کیونکہ ان کی غیرت کا تقاضا ہے کہ وہ عاشق کے راستے میں طرح طرح کی رکاوٹیں کھڑی کرتی رہیں اس لئے اس سے بچتے رہنے کا مشورہ دیا ہے۔یہاں غالب کے مصرعہ ''دوستی ناداں کی ہے جی کا زیاں ہو جاۓ گا'' میں بیدل کے دوسرے مصرعہ ''گل خارہا نشاندہ بہ آزار

عندلیب'' کا عکس موجود ہے۔

درد منت کشِ دوا نہ ہوا   با نشۂ حلاوت درد آشنا نہ ای
میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا   چوں نے بہ نالہ پیچ و سراپا شکر برآ
غالبؔ   بیدلؔ

غالب کہتے ہیں اگر میں دردِ عشق سے صحت یاب نہ ہو سکا تو یہ افسوس نہیں بلکہ خوشی کا مقام ہے کہ کسی معالج کے علاج کا احسان میری گردن پر نہیں رہا۔ بیدل کہتے ہیں دردِ عشق کے اندر کتنی حلاوت ہے تم اس کے نشے سے واقف نہیں ہو۔ بانسری کی طرح نالے کے اندر پیچ وتاب کھاؤ اور سراپا شکر بن کر نکلو۔ یہاں غالب اور بیدل دونوں نے ''دردِ عشق'' کا تذکرہ کیا ہے۔ لیکن دونوں کی سوچ الگ الگ ہے۔ اس لئے انداز بیان میں بھی اختلاف ہے۔ بیدل کے نزدیک دردِ عشق میں حلاوت کا نشہ ہے، اس لئے اس کے علاج کرنے اور کسی معالج کا احسان نہ لینے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ چنانچہ ایک جگہ صاف طور پر کہتا ہے۔

تا توانی مشق دردی کن کہ در دیوان عشق
نیست خطی جز دریدن نامہ ہائے سادہ را

جہاں تک ہو سکے دردِ عشق کو سہنے کی مشق کرتے رہو، کیونکہ دیوانِ عشق میں سادہ خطوں کو چاک کر دیا جاتا ہے۔ جبکہ غالب کے نزدیک دردِ عشق علاج طلب ہے مگر اس سے صحت یاب نہ ہو سکا تو کسی معالج کا احسان گردن پر نہ ہونے کی خوشی ہے۔

ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں   در دماغ شوق دود حسرتی پیچیدہ است
تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا   کیست جز تیغ تو تا فہمد چہ سر داریم ما
غالبؔ   بیدلؔ

غالب کا خیال ہے کہ اے محبوب عاشقوں کو تہ تیغ کرنا تیرا روزمرہ کا معمول ٹھہرا اور ہر دم تجھے یہی خبط سوار رہتا ہے کہ کس کی گردن ماریں، تجھ جیسا سفاک اور خونریز جب میرے قتل

کرنے پر آمادہ نہ ہوا تو سمجھنا چاہئے کہ دنیا میں شاید ہی کوئی اور آدمی میرے قتل پر اقدام کر سکے گا۔ بیدل کہتے ہیں دماغ شوق میں حسرت یعنی آرزوئے قتل کا دھواں پیچ و تاب کھا رہا ہے۔ تیری تلوار کے سوا کون ہے جو سمجھے کہ میرے پاس کیسا سر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرے دماغ شوق میں یہ تمنا کروٹ لے رہی ہے کہ تو اپنی تلوار سے مجھے قتل کرے۔ لیکن میری اس تمنا یا جذبے کو سمجھنے کی صلاحیت تیری تلوار کے سوا کسی چیز میں نہیں ہے۔ یہاں بیدل اور غالب دونوں نے ''محبوب کی تلوار سے قتل کئے جانے کی آرزو'' کا تذکرہ کیا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ غالب کے نزدیک یہ اس کا مشغلہ ہے پھر بھی وہ عاشق کو قتل نہیں کرتا، اس لئے اس کا شکوہ کیا ہے کہ میں اپنی قسمت کہاں آزمانے جاؤں، بیدل کے نزدیک معشوق کے روزمرہ کے مشغلہ کے بجائے عاشق کی تمنا ہے جس کو معشوق کی تلوار ہی سمجھتی ہے۔

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا
غالبؔ

دشنامی ازاں لعل شنیدم کہ مپرسید
می خواست بہ سنگم زند آخر بہ گہر زد
بیدلؔ

محبوب کی شیریں لبی کا تذکرہ کرتے ہوئے غالب کہتے ہیں کہ تیرے ہونٹ کی حلاوت کا یہ عالم ہے کہ تو نے رقیب کو جو گالیاں دی ہیں وہ بھی ان کی تاثیر سے شیریں ہو گئیں، اسی وجہ سے گالیاں کھا کر بھی رقیب کبیدہ خاطر نہ ہوا۔ بیدل کہتے ہیں محبوب کے ان سرخ ہونٹوں سے ایسی مغلظ گالیاں سنی ہیں کہ پوچھو مت۔ بات یہ ہے کہ وہ مجھے پتھر سے مارنا چاہتا تھا مگر موتیوں سے مار رہا ہے۔ یہاں غالب اور بیدل دونوں نے ''محبوب کی اپنے لبوں سے دشنام طرازی'' کا تذکرہ کیا ہے۔ غالب کے نزدیک اس نے رقیب کو گالی دی اور چونکہ اس میں لب شیریں کی حلاوت شامل تھی اس لئے وہ بدمزہ نہ ہوا۔ جبکہ بیدل کے نزدیک اس نے عاشق کو گالی دی جو سنگ زنی کے مشابہ تھی مگر اس نے اس کو گہر باری سے تعبیر کر کے خوش دلی سے انگیز کیا۔ یہاں بھی غالب کے کلام پر بیدل کے کلام کی چھاپ واضح ہے البتہ اس کو اپنے انداز سے بدل دیا۔

ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
غالبؔ

ہمہ را ربودہ ز دست خود اثر نوید رسیدنت
ز وداع ما چہ خبر دہد بہ دل شکستہ سروش ما
بیدلؔ

غالب شوخی کے انداز میں کہتے ہیں کہ محبوب کے آنے کی خبر گرم تھی مگر بدقسمتی سے آج ہی ہمارے گھر میں بوریا نہ ہوا۔ گویا اپنی بے بسی اور خستہ حالی کا تذکرہ کیا ہے کہ چارپائی تو کجا بوریا جیسی معمولی چیز بھی نہیں ہے، جس پر محبوب کو بیٹھنے کی زحمت دوں۔ بیدل کہتے ہیں کہ اے محبوب! تیری آمد کی خوشخبری نے سب کو بیخود اور مست کر دیا اور مجھے تو اس نے ایسا بیخود کر دیا کہ ہماری اس بیخودی کی خبر ہمارے فرشتے نے جو جان لینے پر تعینات ہے میرے دل شکستہ کو بھی نہیں دی۔ محبوب کی آمد کی خبر پر دونوں متفق ہیں مگر غالب کے نزدیک اپنی خستہ حالی کے سبب اس کا استقبال کیسے کریں یہ مسئلہ درپیش ہے۔ جبکہ بیدل کے نزدیک اس خوشخبری سے بیدل سمیت سب عاشقوں پر بیخودی کا عالم طاری ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ غالب کے تحت الشعور میں بیدل کا یہ کلام رہا ہے البتہ اپنی نکتہ آفرینی سے دوسرے مصرعہ میں اس نے خستہ حالی کا اظہار کیا ہے۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
غالبؔ

ادب گاہِ وفا، آنگہ پر افشانی، چہ ننگ است ایں
طپیدن خاک بر سر کرد آخر بسمل ما را
بیدلؔ

غالب کا خیال واضح ہے کہ اگر ہم نے اللہ کی راہ میں اپنی جان دی تو اس پر کوئی احسان نہیں کیا کیونکہ یہ جان اسی کی عطا کردہ تھی۔ مطلب یہ ہے کہ اگر اس کی عطا کردہ جان ہم نے مر کر اسے واپس کر دی تو کوئی قابل تعریف بات نہیں تھی کیونکہ یہ اس کی امانت تھی اور امانت تو واپس کرنے کی ہی ہوتی ہے۔ ہاں ہمارا فرض تھا کہ خدا کے اس عظیم احسان کا حسن عمل کے ذریعہ حق ادا کرتے لیکن یہ سب کچھ نہ کیا۔ بیدل کہتے ہیں کہ عشق میں وفاداری کے ادب کا تقاضا تھا کہ محبوب کے ظلم و بیداد کو خوش دلی سے برداشت کرتے حتیٰ کہ اگر وہ قتل کرتا تو بھی نہ تڑپتے۔ یہ کیا کہ ایک طرف تو وفاداری کا دعویٰ ہے اور دوسری طرف تڑپ بھی رہے ہیں۔ اس تڑپ نے آخر کار بسمل

کو سر پر خاک اڑانے پر مجبور کر دیا جو شرم کی بات ہے۔ بیدل کے شعر میں مجاز اور حقیقت دونوں کی گنجائش ہے۔ جبکہ غالب کے شعر میں صرف حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ بیدل کے شعر کو اگر ہم حقیقت کی طرف لے جائیں تو مطلب اس کا وہی نکلے گا جو غالب کے شعر کا ہے۔ کہ خدا سے عشق میں وفاداری کا تقاضا تھا کہ اگر اس کی راہ میں جان دینے کی نوبت آتی تو خوش دلی سے دے دیتے اور ہاتھ پیر نہ مارتے۔ ہاتھ پیر مارنا اور اٹھا پٹخ کرنا شرم و عار کی بات ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو دونوں نے راہِ خدا میں جان دینے کی بات کہی ہے اس فرق کے ساتھ کہ غالب کے نزدیک جان اس کی عطا کردہ چیز تھی جسے اس کی راہ میں نچھاور کر کے اس پر احسان نہیں کیا جبکہ بیدل کے نزدیک وفاداری کا تقاضا تھا کہ خوش دلی سے جان اس کی راہ میں دے کر خاموش ہو جاتے۔ اپنی بیتابی کا اظہار نہ کرتے۔

کچھ تو پڑھئے کہ لوگ کہتے ہیں	آرزوئے نظم و نثرے داشت طبع روشنش
آج غالب غزل سرا نہ ہوا	شوق گرد انگیخت تا ایں جلوہ ہا شد آشکار
غالبؔ	بیدلؔ

بیخود دہلوی سے یہ روایت ہے کہ ایک مرتبہ قلعہ معلیٰ میں کسی شہزادے کے یہاں مشاعرہ ہو رہا تھا غالب بھی شریک ہوئے تھے مگر طرحی غزل نہیں کہی تھی اس لئے یہ غزل وہاں پڑھ دی تھی مقطع کا انداز بتا رہا ہے کہ غالب سے لوگوں نے یہ کہا ہوگا کہ اگر طرحی غزل نہیں کہی ہے تو غیر طرحی کلام ہی سنایئے ۹۸)۔ بیدل کو بھی کچھ ایسا ہی اتفاق ہوا۔ ایک دفعہ اکبرآباد میں نواب مرزا کامگار خاں کے یہاں تشریف فرما تھے اور دوسرے شعرا بھی موجود تھے۔ نواب موصوف نے کہا ''غبار'' کے موضوع پر آپ لوگ نظم و نثر پر مشتمل ایک مقالہ لکھئے یا سنایئے۔ بیدل نے بھی اس ادبی مقابلے میں شرکت کی اور اس کا گھوڑا سب سے آگے رہا۔ اسی کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ نواب کامگار خاں کی طبع روشن نظم و نثر کی متمنی تھی شوق نے گرد انگیزی کی تا آنکہ یہ جلوہ آشکارا ہوا۔ یہاں فی البدیہہ نثر نگاری اور شعر گوئی پر بیدل کی قدرت کا پتہ چلتا ہے۔ غالب اور بیدل میں کہاں کہاں اور کتنی مماثلتیں ہیں اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اضطراب موج آخر محوِ گوہر می شود	گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیِ جا کا
در کمینِ ما دلِ بے مدعا افتادہ است	گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا
بیدؔل	غالبؔ

غالب کا مطلب ہے کہ دریا میں لہریں اٹھتی ہیں جو اس کے اضطراب کو ظاہر کرتی ہیں مگر وہی پانی جب موتی کی شکل اختیار کر لیتا ہے تو اس کا اضطراب سکون میں بدل جاتا ہے۔ لیکن شوق یا تمنائے محبوب کا اضطراب اس قدر شدید ہوتا ہے کہ عاشق کے دل میں اس کی تمام تر وسعت کے باوجود نہیں سما سکتا۔ یہاں شدت اضطراب شوق کو بیان کرنا مقصود ہے۔ بیدل کہتے ہیں دریا کا اضطراب آخر کار گوہر میں محو ہو جاتا ہے، اسی طرح ہماری ہنگامہ خیزیوں کی تاک میں دلِ بے مدعا پڑا ہوا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کا مصرعہ ''گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا'' بیدل کے مصرعہ ''اضطراب موج آخر محوِ گوہر می شود'' کا ترجمہ ہے۔

ایں جا جواب نامہ عاشق تغافل است	یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخِ مکتوب
بیہودہ انتظار خبر می کشیم ما	مگر ستم زدہ ہوں شوق خامہ فرسا کا
بیدؔل	غالبؔ

غالب کہتے ہیں میں نے جو مکتوب شوق اے محبوب تجھے لکھا ہے اس کا جواب تو کیا دے گا مجھے خوب پتہ ہے، مگر کیا کروں شوق خامہ فرسا کا ستم زدہ ہوں یعنی تو جواب دے یا نہ دے میرا شوق مجھے لگاتار لکھتے رہنے پر مجبور کرتا ہے۔ بیدل کہتے ہیں عاشق کے مکتوب عشق کا جواب معشوق کی طرف سے سدا تغافل یعنی دانستہ غفلت شعاری کی شکل میں ملتا ہے۔ اس لئے اس کے جواب کا انتظار کرنا بے سود ہے۔ یہاں بیدل اور غالب مکتوب شوق لکھنے میں تو متفق ہیں مگر اس کے جواب کے سلسلے میں مختلف ہیں۔ غالب کے نزدیک جواب سے مکمل مایوسی کے باوجود شوق کے ہاتھوں عاشق مسلسل خط لکھنے پر مجبور ہے۔ جبکہ بیدل کے نزدیک اس کے شیوۂ تغافل کا خیال کر کے عاشق کو اس کے جواب کا انتظار کرنا بے سود ہے۔ یہاں غالب کا بیان زیادہ دلکش ہے لیکن اسی کے ساتھ غالب کے کلام پر بیدل کی چھاپ بھی نظر آتی ہے۔ بیدل کا ایک شعر اسی کے قریب ہے:

ہیچ کس از معنی مکتوب شوق آگاہ نیست
ورنہ جائے نامہ پیشِ یار مارا خواندنیست

عاشق کے مکتوب شوق کے مفہوم سے لوگ نابلد ہیں۔ ورنہ خط کی جگہ مجھ کو دوست کے سامنے بلانا تھا۔

حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی
دوامِ کلفتِ خاطر ہے عیشِ دنیا کا
غالب

بادستگاہِ عشرت پُرتوام است کلفت
چشم تری نشستہ است بر قاہ قاہ مینا
بیدلؔ

غالب کا مطلب یہ ہے کہ بہار اگرچہ خزاں کے اسباب میں ہے کیونکہ خزاں سامان بہار کے طلب کرنے کا نام ہے۔ لہذا یہ بہار خزاں کے پاؤں کے مہندی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی طرح دنیا کے سامان عیش وعشرت ہیں جو اس لحاظ سے کہ ایک دن ان کو فنا ہونا ہے، دائمی کلفت کا سبب ہے۔ جس طرح بہار نہ ہوتو خزاں کا تصور نہیں کیا جا سکتا اسی طرح عیش دنیا نہ ہوتو دوام کلفت خاطر کا بھی تصور نہیں کیا جا سکتا۔ بیدل کہتے ہیں دستگاہ عشرت کے ساتھ کلفت بھی جڑی ہوئی ہے۔ یعنی آرام کے ساتھ تکلیف اور خوشی کے ساتھ غم کا سلسلہ دنیا میں لگا ہوا ہے۔ قرآن پاک بھی اسی خیال کا اظہار کرتا ہے کہ ہر تنگی کے ساتھ آسانی ہے اور ہر آسانی کے ساتھ تنگی ہے۔ یہاں کی کوئی چیز دائمی نہیں ہے۔ اس کے بعد بیدل ایک مثال کے ذریعے اس دعویٰ کی توثیق کرتا ہے کہ مینا یعنی جام شراب کے قہقہوں پر چشم تر بھی براجمان ہے۔ جام میں شراب جوش مار رہی ہوتو اس کی ہیئت کدائی قہقہے کی ہوتی ہے۔ لیکن اس کی آنکھیں بھی اشک بار ہیں جس کو چشم تر سے تعبیر کیا ہے۔ پورے شعر کا ماحصل یہ ہے کہ اس دنیا میں آرام وتکلیف ایک دوسرے کے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ غور سے دیکھئے تو غالب کا مصرعہ ''دوامِ کلفتِ خاطر ہے عیش دنیا کا'' بیدل کے مصرعہ ''بادستگاہِ عشرت پرتوام است کلفت'' کا آزاد ترجمہ ہے۔ بالکل اسی کے قریب بیدل کے دو اور شعر ہیں:

انجام بہار ایں ہمہ پامال خزانیست
آئینہ مپرداز کہ رنگیست دریں باغ
حذر کنید ز انجام عیش ایں محفل
کدام شیشہ کہ آخر نزد بسنگ شراب

غم فراق میں تکلیف سیرِ باغ نہ دو
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا
غالبؔ

در خندہ گل بوئے سلامت نتواں یافت
گر قلقلِ میناست ترنگیست دریں باغ
بیدلؔ

غالب دوست سے مخاطب ہوکر کہتے ہیں محبوب کی جدائی کا غم جب مجھ پر سوار ہوتو باغ کے سیر وتفریح کی زحمت مجھے نہ دو۔ میرے اندر خندہ ہائے بیجا کو برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ حالی مرحوم لکھتے ہیں خندہ گل کو خندہ بیجا اس لئے کہا کہ کچھ سمجھ کر ازراہ تعجب نہیں ہنستا۔ لہذا اس کا خندہ بے محل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایسی صورت میں پھول کی شگفتگی خندۂ بے محل نظر آئے گی، اس کی بناپر بجائے خوشی کے غم اور بجائے آرام کے تکلیف ہوگی۔ بیدل کہتے ہیں پھول کی ہنسی یعنی شگفتگی میں سلامتی کی بو نہیں پائی جاسکتی۔ اس باغ میں اگر قلقل مینا (صراحی سے شراب انڈیلنے کی آواز کنایہ ہے تکلیف سے) ہے تو ترنگ (جام کے باہم ٹکرانے کی آواز جو کنایہ ہے بزم عیش سے) بھی ہے۔ یعنی یہاں تکلیف وآرام اور غم وخوشی دونوں توام ہیں۔ اس مفہوم کو بیدل نے اور واضح طور پر ایک دوسرے شعر میں کہا ہے:

غارتگر بہار نشاطم شگفتگیست
تا غنچہ بود دل چمن در خیال داشت

شگفتگی میری بہار نشاط کو غارت کرنے والی ہے۔ دل جب تک غنچے کی شکل میں تھا تو اس کی قوت خیال میں ایک پورا چمن موجود تھا۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کے مصرعہ ''مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا'' میں بیدل کے مصرعہ ''در خندہ گل بوئے سلامت نتواں یافت'' کی صدائے بازگشت موجود ہے۔ دوسری جگہ اور واضح الفاظ میں کہتا ہے:

بجام خندہ گل مستِ عشرتی بیدل
نہ رفتہ ای بخیالِ تبسمِ لبِ گور

بیدل تم خندہ گل کے جام میں ایسے مست عشرت ہوگئے ہو کہ تم کو لب گور کے تبسم کا خیال ہی نہیں آتا۔ کیا عمدہ نزاکتِ خیال اور تشبیہ بے مثال ہے۔

ہنوز محرمِ حسن کو ترستا ہوں — شوخیِ حسنش برونست از خط تسخیر ما
کرے ہے ہر بن مو کام چشمِ بینا کا — پرتو مہ میزند آتش کمند ہالہ را
غالب — بیدلؔ

غالب کا مطلب یہ ہے کہ محبوب کے حسن کا جلوہ دیکھنے کے لئے اگر چہ میرے بال کی جڑ چشم بینا (دیکھنے والی آنکھ) بن جاتی ہے یعنی میں سراپا نگاہ بن جاتا ہوں لیکن حسن کی حقیقت ہنوز مجھ پر پوری طرح ظاہر نہیں ہوئی۔ محرمی حسن سے مراد حسن کی حقیقت سے واقفیت ہے۔ بیدل کہتے ہیں محبوب کے حسن کی شوخی ہمارے خط تسخیر سے پرے یعنی دائرۂ فہم سے باہر ہے۔ چاند حسین ہے، پر اس کی جھلک اس سیاہی کو جو اس کے اردگرد ہے نذر آتش کئے ہوئے ہے۔ یعنی اس سے محروم کر رکھا ہے۔ اسی طرح محبوب کے حسن کی شوخی کو سمجھنے سے ہم قاصر ہیں۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کا مصرعہ ''ہنوز محرمِ حسن کو ترستا ہوں'' میں بیدل کے مصرعہ ''شوخیِ حسنش برونست از خط تسخیر ما'' کی صدائے بازگشت موجود ہے۔ بلکہ ایک طرح سے اس کا آزاد ترجمہ ہے۔

دل اس کو پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے — کجا بکشتن ما حسن می کند تقصیر
ہمیں دماغ کہاں حسن کے تقاضا کا — کہ زیر تیغ نشاندہ است نرگس او را
غالب — بیدلؔ

غالب کہتے ہیں ناز وادا کے اظہار سے محبوب کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ عاشق اس کو اپنا دل دے بیٹھے۔ لیکن اسے گوارہ نہیں کہ محبوب تقاضا کرے تب اس کو دے، اس لئے ناز وادا کے اظہار سے پہلے ہی اس نے اپنا دل محبوب کو دے دیا۔ بیدل کہتے ہیں محبوب کو اگر موقع ملے تو ہمیں قتل کرنے میں کوئی کوتاہی نہ کرے۔ کیونکہ اس کی نرگسی آنکھ نے عاشق کو تلوار کے نیچے رکھ چھوڑا ہے۔ آنکھ سے غمزہ واشارہ کیا جاتا ہے اس لئے۔ بیدل کا مطلب یہ ہے کہ محبوب کے غمزے اور اشارے عاشق کو قتل کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کرتے، اس لئے اس کے اظہار غمزہ وادا سے پہلے ہی دل دے دینا تو ممکن ہی نہیں چنانچہ غالب نے دوسری جگہ کہا ہے:

بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

نہ کہہ کہ گریہ بمقدارِ حسرتِ دل ہے	نالہ ام بیدل بقدرِ دودِ دل پر می زند
مری نگاہ میں ہے جمع و خرچ دریا کا	نبض را گر اضطرابی نیست در خورد تب است
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں اے دوست! یہ نہ سمجھنا کہ گریہ حسرتِ دل کے بقدر ہے یعنی میں اسی قدر روتا ہوں جتنا رونا چاہتا ہوں۔ میرے سامنے تو دریا کا جمع خرچ ہے، یعنی میں تو دریا کے حساب سے رونا چاہتا ہوں یا روتے روتے دریا بہانا چاہتا ہوں۔ بیدل کا مطلب یہ ہے کہ میری آہ وزاری کا سلسلہ دل کے دھواں کے بقدر ہے۔ یعنی دل میں عشق کی آگ لگی ہے، آگ سے پہلے دھواں اٹھتا ہے۔ پس جس قدر دھواں اٹھتا ہے اسی قدر میری آہ وزاری کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔ نبض میں اگر اضطراب نہ ہوتو اس کا مطلب ہے کہ اسے بخار آنے والا ہے۔ اب غالب کے مصرعہ ''نہ کہہ کہ گریہ بمقدارِ حسرتِ دل ہے'' کو بیدل کے مصرعہ ''نالہ ام بیدل بقدرِ دودِ دل پر می زند'' سے ملا کر پڑھئے تو بیدل کے کلام کا اثر اگر چہ منفی شکل میں نظر آئے گا۔ غاؔلب نے دودِ دل کی جگہ حسرتِ دل لکھا اور بیدل کے خیال سے اختلاف کیا۔ ''دود دل'' پر بیدل کا ایک اور اچھا شعر ہے۔

بہ ہر طرف نگرم دودِ دل پر افشانست
کدام سوختہ زیں وادی خراب گذشت

نظر اٹھا کر جدھر دیکھتا ہوں دل کا دھواں فضا میں بکھرتا دکھائی دیتا ہے۔ اس وادی ویراں سے جانے کون دل جلا گذرا ہے۔

فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اس کو یاد اسد	ز محو یاد تو آزار کس چہ امکانست
جفا میں اس کی ہے انداز کارفرما کا	مژہ نہ دید گرانی ز خواب سنگینم
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کا مطلب ہے کہ فلک بھی ظلم ڈھاتا ہے اور اس کے ظلم میں محبوب کی جفاؤں کا انداز ہوتا ہے، اس لئے آسمان کو دیکھ کر محبوب کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ بیدل کہتے ہیں اے محبوب

جو تیری یاد میں محو اور غرق ہو اسے کوئی اذیت پہنچنے کا امکان ہی نہیں۔ خواب سنگین سے پلکوں کو گرانی نہیں ہوتی ہے۔ بیدل اور غالب دونوں کو محبوب کی یاد آئی۔ غالب کو فلک کے ظلم و جفا کو دیکھ کر محبوب کی یاد آئی کیونکہ دونوں جفا کار ہیں۔ بیدل کو محبوب کی یاد سے کسی قسم کی کسی کی طرف سے کوئی اذیت نہیں پہنچی۔

قطرۂ مے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا	تب و تاب سبحہ بہل، رشتۂ زنار گسل
خط جامِ مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا	قطرہ مے جوش زن و بر خط پیانہ بر آ
غالب	بیدل

غالب کا مطلب یہ ہے کہ ساغر مے جب لب یار سے ہمکنار ہوا تو قطرۂ مے فرط حیرت سے منجمد ہو کر گویا گوہر بن گیا۔ اس لئے خط جام مے سراسر رشتہ گوہر کی طرح ہو گیا۔ بیدل کہتے ہیں تسبیح کی چمک دمک سے کنارہ کشی کرو اور زنار کا دھاگا بھی توڑ ڈالو۔ قطرہ مے کی طرح جوش مارو اور خطِ پیانہ کی طرح نمایاں ہو جاؤ۔ شراب کے قطرے کا جوش مارنا کنایہ ہے قطرہ مے کا کثرت سے جام کے اندر ٹپکتے رہنے سے۔ پورے شعر کا ماحصل یہ معلوم ہوتا ہے کہ تسبیح اور زنار کا استعمال جو بظاہر مقدس ہستیوں کا اصول ہے اسے ترک کرو۔ مے نوشی پر اتر آؤ جیسے شراب کے قطرے کثرت سے جام کے اندر ٹپکتے ہیں اور آخر میں خطوط کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اب اگر بیدل کے مصرعہ ''قطرہ مے جوش زن و بر خط پیانہ بر آ'' کو غالب کے پورے شعر (خصوصاً قطرۂ مے اور خط جام کی ترکیب کو سامنے رکھ کر) سے موازنہ کر کے دیکھیں تو بیدل کے کلام کی چھاپ پوری طرح نمایاں ہو گی البتہ غالب نے نکتہ آفرینی سے کچھ اضافہ کیا ہے۔

اعتبار عشق کی خانہ خرابی دیکھنا	عشق نبود بہ نمارت گری عقل شریک
غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا	سیل از کف ندہد صنعت ویرانی را
غالب	بیدل

غالب کا مطلب ہے کہ محبوب کو میرے عشق کا یقین ہو گیا لیکن اس یقین کا نتیجہ میرے حق میں صحیح نہیں نکلا۔ اگر کبھی رقیب بھی آہ کرتا ہے تو یہ یہی سمجھتا ہے کہ میں نے آہ کی اس لئے مجھ

سے ناراض رہتا ہے۔ بیدل کہتے ہیں عشق عقل کی عمارت گری میں شریک نہیں ہوتا ہے۔ سیلاب صنعت ویرانی کو ہاتھ سے نہیں دیتا۔ مطلب یہ ہے کہ عقل کی خصوصیت ہے عمارت گری اور عشق کی خصوصیت ہے خانہ ویرانی، جیسے سیلاب کی خصوصیت ہے خانہ ویرانی۔ جس طرح سیلاب اپنی اس خصوصیت سے دستبردار نہیں ہوتا ہے اسی طرح عشق بھی اپنی اس خصوصیت سے دستبردار نہیں ہوتا۔ غالب نے عشق کی اس خصوصیت کا تذکرہ تو کیا لیکن اس کی بنا پر رقیب کی آہ کو خود عاشق کی آہ سمجھنے سے وابستہ کر دیا جو غیر فطری عمل ہے۔

جب بہ تقریب سفر یار نے محمل باندھا	بس عام است در وحشت سرای دہر بیتابی
تپشِ شوق نے ہر ذرہ پہ اک دلِ باندھا	دلِ ہر ذرہ دارد در قفس چندیں تپید نہا
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کا مطلب یہ ہے کہ جب محبوب نے سفر کا ارادہ کیا تو ہر ذرہ شوق نظارہ جمال میں ایک دل بیتاب بن گیا یعنی ہر ذرہ مشتاق دید ہو گیا۔ بیدل کا مطلب ہے کہ یہ دنیا عشق کی ایک وحشت کدہ ہے، جہاں لوگوں کے اندر بیتابی اور بیقراری ایک عام بات ہے۔ حتیٰ کہ ہر ذرے کے اندر کئی تپش اور تڑپ موجود ہے۔ غالب نے محبوب کے عزم سفر پر اس کے جمال کے دیدار کے لئے ہر ذرے کی تپش اور بیتابی کا ذکر کیا ہے۔ جبکہ بیدل نے عشق کی وحشت سرا میں ہر آدمی حتیٰ کہ ہر ذرے کی بیتابی کا تذکرہ کیا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کے مصرعہ ''تپشِ شوق نے ہر ذرہ پہ اک دل باندھا'' میں بیدل کے مصرعہ ''دلِ ہر ذرہ دارد در قفس چندیں تپید نہا'' کی چھاپ پوری طرح موجود ہے۔

اہل بینش نے بہ حیرت کدہ شوخیِ ناز	بیدل اندر جلوہ گاہِ حسن طاقت سوز اوست
جوہر آئینہ کو طوطیِ بسمل باندھا	جوہر حیرت زبانِ عذر خواہ آئینہ را
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کا مطلب ہے کہ محبوب کی شوخی ناز سے تماشائیوں پر ایسا عالمِ حیرت طاری ہو گیا ہے کہ انہوں نے آئینہ کے جوہر (صیقل) کو ایک طوطی بسمل سمجھ لیا۔ مطلب یہ ہے کہ دیکھنے

والوں کو ایسا لگ رہا تھا کہ محبوب کی شوخی ناز ان عاشقوں کو جو جوہر آئینہ کی طرح ہیں تڑپا رہی ہے۔ بیدل محبوب کے غیر معمولی حسن کی، جس کو دیکھنے کی کوئی عاشق تاب نہیں لاسکتا، تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس کی جلوہ گاہ میں حیرت، آئینہ کی زبان عذر خواہ ہے۔ آئینہ اور حیرت کا تلازمہ ہے چنانچہ بیدل کہتا ہے:

آئینہ را بقسمتِ حیرت قناعت است

حیرت آئینہ اور آئینہ حیرت کی ترکیب بیدل کے یہاں بہت زیادہ استعمال ہوئی ہے اس لئے اس کو ہم بیدل کے ایک نثر پارہ سے اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ اس نے ایام طفولیت کی نگاہ کا تذکرہ کرتے ہوئے چہار عنصر میں ایک جگہ لکھا ہے:

"نگاھی بود چوں حیرت آئینه بے نیازِ جوھر شناسی" (۹۹)

یعنی ایام طفولیت کی نگاہ، حیرت آئینہ کی طرح، جوہر شناسی سے بے نیاز تھی۔ آئینہ کے سامنے جو چیز آتی ہے اس کا صرف ظاہری عکس اس میں دکھائی دیتا ہے۔ ع:

چیزی کہ در آئینہ تواں دید مثال است

حقیقت نظر نہیں آتی۔ اس طرح آئینہ حیرت کا مظہر ہے یہاں بیدل کا مقصد یہ ہے کہ محبوب کے حسن کی جلوہ گاہ بھی ایک آئینہ ہے جس میں اس کا عکس تو نظر آتا ہے پر حقیقت نہیں دکھائی دیتی اس لئے حیرت کے سوا کوئی چیز ہاتھ نہیں لگی اس طرح یہ کہنا کہ حیرت آئینہ کی زبان عذر خواہ ہے درست ہے چنانچہ ایک جگہ کہتا ہے:

در چار سوئے دہر گذر کرد خیالم
لبریز شد از حیرت آئینہ دکانہا

میرے خیال نے چاروں سمتوں کا دورہ کیا آخر اسے دوکانیں حیرت آئینہ سے لبریز نظر آئیں۔

نہ بندھے تشنگیِ شوق کے مضموں غالب	شوق تا گرم عناں نیست فسردن بر جاست
گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا	گر بہ راحت نہ زند ساحلِ ما ہم دریاست
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں شوق کی پیاس بجھانے کے لئے اگر دریا کو بھی ساحل کی طرح خشک اور ناکافی سمجھا جائے تو بھی تشنگی شوق کی فراوانی کا صحیح اور کامل نقشہ نہیں کھینچا جا سکتا۔ مطلب یہ ہے کہ شوق کی پیاس اتنی شدید ہوتی ہے کہ اسے دریا بھی نہیں بجھا سکتا۔ بیدل کہتے ہیں شوق جب تک سرگرم عمل نہیں ہے فسردگی اور تعطل برقرار رہے گا۔ ساحل علامت ہے سکون وراحت کی جبکہ دریا علامت ہے اضطراب اور بے سکونی کی۔ بیدل کہنا چاہتا ہے کہ اگر شوق میرے سکون کو درہم برہم کردے تو ساحل بھی دریا کی طرح رواں دواں اور مضطرب نظر آئے گا۔ شوق کی بے پایانی وبیکرانی غالب اور بیدل دونوں کا موضوع ہے، انداز بیان البتہ جداگانہ ہے۔ غالب کے شعر میں شوق ،دریا اور ساحل کے الفاظ جو بیدل کے شعر میں بھی ہیں، کا استعمال بتاتا ہے کہ اس کے ذہن میں بیدل کا یہ شعر تھا البتہ تعبیر اور نتیجہ بدل دیا ہے۔

میں اور تیری بزم سے یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ، ساقی کو کیا ہوا تھا
غالب

تہی دستیم چوں ساغر خدارا ساقیا رحمی
بروے بخت ما بکشا درِ گنجینۂ مینا
بیدل

غالب کا مطلب یہ ہے کہ یہ افسوس کی بات ہے کہ مجھ جیسا بدمست شرابی تیری بزم مے سے تشنہ کام واپس لوٹے۔ مانا کہ میں نے مے کشی سے توبہ کر لی تھی مگر ساقی کا کیا فرض ہوتا تھا۔ وہ شراب پلانے کے اپنے وظیفے سے کیوں غافل ہو گیا۔ مطلب یہ ہے کہ وہ زبردستی پلا دیتا۔ بیدل کہتے ہیں اے ساقی ساغر کی طرح ہم خالی ہاتھ ہیں، میرے پاس شراب کا کوئی سرمایہ نہیں ہے۔ خدارا ہم پر ترس کھا کر ہمارے پیالے میں شراب انڈیل دے اور ہماری قسمت پر شراب خانے کا دروازہ کھول دے کہ خوب پی کر بدمست رہوں۔ غالب اور بیدل دونوں نے ساقی سے مے نوشی کرانے کا مطالبہ کیا ہے مگر غالب نے ایک بہترین نکتہ پیدا کیا جب کہ بیدل نے سادگی سے اس مفہوم کو ادا کر دیا ہے۔

ہے اک تیر جس میں دونوں چھدے پڑے ہیں
وہ دن گئے کہ اپنا دل سے جگر جدا تھا
غالب

چشمت بغلط سوے دل انداخت نگاہی
تیریکہ ازیں شست خطا شد چہ بجا شد
بیدل

غالب کا مطلب ہے کہ محبوب کے ایک تیر نگاہ نے میرے دل اور جگر دونوں کو نشانہ بنا کر زخمی کر دیا اس لئے اب دونوں کی کیفیت یکساں ہے۔ دونوں یکساں تڑپ رہے ہیں۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ دونوں کبھی ایک جگہ اکٹھے تھے اب الگ ہو گئے ہیں بلکہ تڑپ اور اضطراب میں دونوں یکساں ہو گئے ہیں۔ بیدل کہتے ہیں اے محبوب تیری آنکھ نے غلطی سے میرے دل پر نظر ڈالی، اس کمان سے جو تیر غلطی سے چلا وہ بالکل نشانے پر آ کر لگا۔ محبوب کے تیرِ نگاہ سے دل کے گھائل ہونے کا ذکر غالب اور بیدل دونوں نے کیا ہے مگر بیدل نے ایک عمدہ نکتہ پیدا کیا کہ محبوب نے غلطی سے یہ تیر چلا کر دل کو زخمی کیا ہے۔ اس کا ارادہ ایسا نہ تھا۔ غلطی تو بہر حال غلطی ہوتی ہے لیکن یہ غلطی بڑی برمحل اور بجا واقع ہوئی ہے۔ کیونکہ عاشق اسی کے انتظار میں رہتا ہے۔ غالب نے اس مضمون کو نہایت سیدھے سادے انداز میں بیان کر دیا۔ جبکہ بیدل کے بیان میں دلکشی ہے۔

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا	التفاتِ عشق آتش ریخت در بنیاد دل
بحر اگر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا	سیل شد تردستی معمار ایں ویرانہ را
غالب	بیدلؔ

غالب کے مطابق ناصح کا کہنا ہے کہ اگر تم اس قدر گریہ وزاری نہ کرتے تو تمہارا گھر ویران نہ ہوتا۔ اس کے جواب میں عاشق کہتا ہے کہ چونکہ ہم عاشق ہیں اس لئے فطری طور پر ہمارے گھر کی ویرانی ضروری ہے۔ اب تو خیر زیادہ گریہ وزاری سے گھر ویران ہوا ہے اور اگر گریہ وزاری نہ کرتے بلکہ صحرانوردی کرتے تو بھی ہمارے پیچھے ہمارا گھر ویران ہوتا۔ دوسرے مصرعہ میں مثال دے کر سمجھایا کہ اگر سمندر نہ ہوتا تو اس کی جگہ بیاباں ہوتا، اسی طرح ہمارا گھر بھی کثرتِ اشک باری سے سمندر بنا ہوا ہے۔ اگر سمندر نہ ہوتا تو ہماری صحرانوردی سے وہ ویران ہوتا۔ بیدل کہتے ہیں کہ دل کی طرف عشق کی توجہ نے اس کی بنیاد کو نذرِ آتش کر دیا چنانچہ اس ویرانے یعنی دل کو جس قدر مہارت سے آباد کرنے کی معمار یعنی عاشق نے کوشش کی، اس کی ساری کوششیں سیلاب کی طرح تباہ کن ثابت ہوئیں۔ غالب اور بیدل دونوں نے عاشق کی خانہ ویرانی کا ذکر کیا ہے۔ بیدل نے اسے سادگی سے ادا کر دیا جبکہ غالب نے اسے ایک نرالے انداز سے بیان کیا ہے جس میں خاص لطف پیدا ہو گیا۔

تنگیِ دل کا گلہ کیا ، یہ وہ کافر دل ہے   یکدل اینجا فارغ از تشویش نتواں یافتن
کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا   ایں منازل یکسر از آشفتگیہا جادہ اند
غالبؔ   بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ تنگیِ دل کی غمگینی کی ہم اے محبوب تم سے کیا شکایت کریں؟ یہ تو وہ کافر دل ہے کہ اسے راحت سے نفرت ہے اگر تنگ نہ ہوتا تو بھی پریشان ہوتا یعنی ہر صورت میں کسی نہ کسی طرح رنج وغم میں گرفتار ہوتا۔ بیدل کہتے ہیں ایک دل بھی اس دنیا میں آشفتگی اور پریشانی سے خالی نظر نہیں آسکتا ہے۔ زندگی کی منزلیں اپنی آشفتگیوں کی وجہ سے سراسر راہ بن گئی ہیں۔ غالب اور بیدل دونوں نے دل کی پریشانی اور آشفتگی کو موضوع بنایا ہے۔ غالب نے تنگی کو پریشانی کے مقابلے پر رکھ کر کہا ہے کہ دل اگر تنگ اور غمگین نہ ہوتا تو پریشان ہوتا اور اس طرح اس کے رنج وغم کا سلسلہ جاری رہتا۔ اس لئے اس کی شکایت کیا کریں۔ غالب نے فارسی میں اس مضمون کو اس انداز سے ادا کیا ہے:

محو آسودگی گر مرد راہی کاندریں وادی
چو خار از پا برآمد باز داماں بر نمی آید

بیدل نے آشفتگی اور زندگی کو لازم ملزوم کہنے کے علاوہ ایک دوسرے شعر میں دل کی پریشانی کو دلِ سرگشتہ کے لئے عیش وآرام قرار دیا جس طرح طوفان میں گرفتار کشتی کے لئے ہوا ناخدا کا رول ادا کرتی ہے۔

عیش داند دلِ سرگشتہ پریشانی را
ناخدا باد بود کشتیِ طوفانی را

ہوئی مدت کہ غالب مرگیا پر یاد آتا ہے   با کہ باید گفت بیدل ماجرائے آرزو
وہ ہر ایک بات پہ کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا   آنچہ دلخواہ من است از عالمِ ادراک نیست
غالبؔ   بیدلؔ

مطلب یہ ہے کہ غالب کو دنیا سے رخصت ہوئے اگرچہ ایک عرصہ ہوگیا پر ہر موقع اور مناسبت سے اس کا یہ کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا یعنی یہ کام اس انداز سے ہوتا یا اس طرح ہوتا

تو کیا اچھا ہوتا یا کیا فائدہ ہوتا، اب تک یاد آتا ہے۔ مقصد یہاں آرزو کی فراوانی اور اس کی بے ثباتی ہے۔ بیدل کہتے ہیں آرزو کا معاملہ بھی عجیب و غریب ہے اس کی بے پایانی اور تسلسل ایسا امر ہے جو کسی سے کہتے نہیں بنتا۔ مختصر یہ کہ جو چیز میری حسب خواہ اور دل پسند ہے وہ دائرۂ ادراک سے باہر ہے۔ نارسائی منزل اور آرزو کی فراوانی اور رنگارنگی دونوں کے ہاں موجود ہے۔ پر انداز دونوں کا الگ ہے۔ بیدل کہتے ہیں کہ میں نے بے شمار آرزوئیں کیں لیکن اپنی پسند کی آرزو ماورائے ادراک ہے۔ جیسا کہ دوسرے شعر میں کہتے ہیں:

در زمینِ آرزو بیدل املہا کاشتیم
لیک غیر از حسرتِ نشو و نمائے برنخاست

آرزو کی زمین میں میں نے بڑی بڑی امیدیں باندھیں لیکن حسرت نشو و نما کے سوا کوئی چیز ہاتھ نہیں لگی۔ غالب نے بھی ''یوں ہوتا تو کیا اچھا ہوتا'' کی تمنا کر کے حسرت کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ دونوں کے اشعار کے موازنہ سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کے اس شعر پر بیدل کے شعر کی چھاپ موجود ہے۔

ایک ذرۂ زمیں نہیں بیکار باغ کا
یاں جادہ بھی فتیلہ ہے لالہ کے داغ کا
غالبؔ

ہر سبزہ دریں دشت شد انگشت شہادت
تا از گلِ خود روے تو دادند نشانہا
بیدلؔ

غالب کا خیال ہے کہ دنیا کی ہر چیز حسن آفرینی میں ایک دوسرے کی معاون ہے بظاہر لالہ کے خوبصورت داغ کو نشان راہ یعنی جادہ سے کوئی نسبت نہیں ہے۔ لیکن غالب یہ کہہ کر جدت طرازی کا ثبوت دے رہے ہیں کہ یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ باغ کائنات کا ہر ذرہ حسن آفرینی میں لگا ہوا ہے یہاں تک کہ جادہ بھی لالہ میں داغ پیدا کر کے فتیلہ کا کام کرتا ہے۔ یہ شعر غالب کی جدت فکر کی بہت عمدہ مثال بتائی جاتی ہے اسی مفہوم کا غالب کا ایک فارسی شعر درج ذیل ہے:

ہر ذرہ محو جلوۂ حسنِ یگانہ ایست
گوئی طلسم شش جہت آئینہ خانہ ایست

یعنی کائنات کا ہر ذرہ حسن یکتا کے جلوے میں ایسا محو اور غرق ہے کہ گویا وہ ایک آئینہ خانہ ہے جس میں جس گوشے اور جس زاویے سے دیکھیے نظر وہیں آ کر ٹھہرتی ہے۔

بے مے کسے ہے طاقتِ آشوب آگہی	رستن ز دور گردوں بے مے کشی محال است
کھینچا ہے عجزِ حوصلہ نے خط ایاغ کا	وزدیدہ ام ز مینا سر در پناہ مینا
غالب	بیدل

غالب کہتے ہیں شعور کے ہاتھوں جو پریشانیاں لاحق ہوتی ہیں اور جن افکار و آلام سے سابقہ پڑتا ہے ان کو مے کشی کے بغیر دور نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ دوسری جگہ کہتا ہے:

مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو
یک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

عالمِ بیخودی میں انسان سارے دکھوں کو بھول جاتا ہے لیکن ہم اتنے کم حوصلہ ہیں کہ شراب کو پیالے میں ناپ ناپ کر پیتے ہیں اس لئے وہ آلام دور نہیں ہوتے۔ اگر بے اندازہ پیتے تو آشوب آگہی کا مقابلہ کر سکتے تھے۔ غالب کا ایک فارسی شعر اسی مضمون کا درج ذیل ہے:

جز دفع غم زبادہ نبودست کامِ ما
گوئی چراغ روز سیاہ است جامِ ما

بیدل کہتے ہیں مے کشی کے بغیر گردش زمانہ سے رہائی ممکن نہیں اس لئے ایک مینا سے نکل کر دوسرے مینا کی پناہ میں آتا ہوں مطلب یہ ہے کہ جام پر جام لنڈھاتا رہتا ہوں۔ مے کشی کے ذریعے گردشِ زمانہ یا شعور کے ہاتھوں پہنچنے والی فکروں سے رہائی دونوں کا موضوع ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کا مصرعہ ''بے مے کسے ہے طاقتِ آشوب آگہی'' بیدل کے مصرعہ ''رستن ز دور گردوں بے مے کشی محال است'' کا آزاد ترجمہ ہے۔ غالب نے دور گردوں کی جگہ آشوب آگہی استعمال کیا ہے۔ کیونکہ انسان شعور کے ہاتھوں تکلیف اٹھاتا ہے۔ شراب پی کر جب شعور سے عاری ہو جائے گا تو تکلیف کا احساس بھی جاتا رہے گا۔ فرق یہاں ہے کہ بیدل اس بیخودی کے لئے جام پر جام چڑھا رہا ہے۔ غالب اپنی کم حوصلگی کی وجہ سے ناپ ناپ کر پی رہے ہیں۔ اس لئے مطلوبہ بیخودی حاصل نہیں ہو رہی ہے۔

تازہ نہیں ہے نشۂ فکر سخن مجھے	مارا ز فکر معنیِ باریک چارہ نیست
تریاکیِ قدیم ہوں دودِ چراغ کا	در صید گاہ ما ہمہ نخچیر لاغر است
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں شاعری کا جونشہ مجھ پر سوار رہتا ہے وہ کوئی نیا نہیں ہے بلکہ بہت عرصہ سے مجھے اس کا چسکا لگا ہوا ہے میں تو دودِ چراغ کا بہت پرانا تریاکی یعنی افیونی ہوں۔ پہلے زمانے میں لوگ جب بجلی عام طور سے نہیں تھی چراغ کی روشنی میں نوشت وخواند کا کام کرتے تھے اور چراغ سے دھواں اٹھتا تھا اور اُسے بخوشی برداشت کرتے تھے۔ غالب کہتے ہیں چراغ کے سامنے بیٹھ کر اور اس کا دھواں برداشت کرنے کا میں عادی رہا ہوں۔ بیدل کہتے ہیں باریک مضامین ومعانی پیش کرنے کی فکر میں ہم بے بس اور لاچار ہیں۔ ہماری شکارگاہ میں تمام شکار لاغر اور دبلے پتلے ہیں مطلب یہ ہے کہ میں سدا باریک اور نازک معانی کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہوں۔ چنانچہ دوسری جگہ کہتا ہے:

فکر نازک گشت بیدل مانعِ آسایشم

مجھ کو اس کی ایسی لت لگ گئی ہے کہ اس کے بغیر مجھے چین نہیں چنانچہ میری فکر کی شکارگاہ میں جتنے شکار پھنستے ہیں سب لاغر اور دبلے پتلے ہیں۔ غالب اور بیدل دونوں نے فکرِسخن کی قدیم خو اور عادت کا تذکرہ کیا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کے مصرعہ ''تازہ نہیں ہے نشہ فکرِسخن مجھے'' میں بیدل کے مصرعہ ''مارازفکرمعنیِ باریک چارہ نیست'' کا عکس موجود ہے۔ غالب کا ایک فارسی شعر اسی مفہوم کا ملاحظہ ہو:

بسکہ فکرِ معنیِ نازک ہمیں کاہد مرا
شلہِ اندیشہ را موئے میاں خواہم شدن

سو بار بند عشق سے آزاد ہم ہوئے	تاکی شود جنوں نفسی فارغ از تلاش
پر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا	بستہ است زندگی کمرِ ما بکین ما
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں بند عشق میں گرفتار ہونے کے بعد میں نے بار ہا اس سے توبہ کی اور آزاد ہونے کی کوشش کی پر اس کو کیا کروں کہ دل سکون و آرام کا دشمن ہے۔ غم عشق کی بے سکونی اور بے کلی ہی اسے مقصود ہے، اور دل غم عشق سے فارغ نہیں ہونا چاہتا۔ بیدل کہتے ہیں جنوں نفسی تلاش سے کب فارغ ہوتی ہے، زندگی نے ہماری کمر کو ہماری عداوت سے باندھ رکھا ہے۔ جنوں نفسی سے مراد میرے ناقص خیال میں وہ عاشقانہ جذبات ہیں جس کا سلسلہ سدا جاری رہتا ہے، اور ظاہر ہے اس کا انجام پریشانی کے سوا کیا ہے اس لئے کہتا ہے زندگی نے ہماری کمر کو دشمنی سے باندھ رکھا ہے یعنی عشق کی بدولت ہم سراسر پریشانیوں اور کلفتوں میں گرفتار ہیں۔ چنانچہ دل کی اس کیفیت کو بیدل نے ایک اور شعر میں بڑے دلکش انداز سے واضح کیا ہے:

دل را نشانِ ناوکِ آفات کردہ اند
ہر دم زدن بخانۂ آئینہ ماتم است

دل کو ناوک آفات کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ اس لئے ہر لحہ اس خانۂ آئینہ میں ماتم اور سوگواری کا سلسلہ جاری ہے۔ غالب کے اس شعر میں بیدل کے شعر کا ارتعاش پوری طرح موجود ہے۔

بے خونِ دل ہے چشم میں موجِ نگہ غبار
یہ میکدہ خراب ہے مے کے سراغ کا
غالب

بہ خوں می غلطم از اندیشہ نازِ سیہ مستی
کہ چشمِ شوخ او در جامِ مے حل کردافیوں را
بیدل

غالب کا خیال ہے کہ میری آنکھوں کی ساری کشش اور جاذبیت خالص خون کی بدولت ہے۔ اگر میں خون کے آنسو نہ بہاتا تو میری آنکھوں میں خاک اڑنے لگتے۔ یعنی اس کی رونق و بہجت جاتی رہتی۔ جس طرح میکدہ کی ساری کشش شراب کی بدولت ہے اگر وہاں شراب نہ ہو تو خاک اڑنے لگے۔ اسی طرح میری آنکھوں کی ساری کشش خونِ دل کی بدولت ہے چونکہ خون دل ختم ہو چکا اس لئے موج نگہ غبار بن گئی۔ یعنی آنکھوں کی رونق جاتی رہی۔ بیدل کہتے ہیں اس کی حد سے بڑھی ہوئی مستی کے ناز کا خیال کر کے خون میں لت پت ہو رہا ہوں یا خون کے آنسو رو رہا ہوں۔ کیونکہ اس کی شوخ نگاہوں نے شراب کے پیالے میں افیون گھول دیا ہے۔ غالب کا

خیال ہے کہ عاشق کی آنکھ اگر معشوق کی جدائی میں خوں فشانی نہ کرے تو بے رونق ہے۔ بیدل کے مطابق اس کی چشم شوخ سے حاصل ہونے والی بدمستی کے ناز کے تصور ہی سے عاشق خون کے آنسو بہا رہا ہے۔ یہاں بیدل کا خیال غالب کے خیال سے زیادہ نازک ہے۔

باغ شگفتہ تیرا بساط نشاط دل
ابر بہار خم کدہ کس کے دماغ کا
غالبؔ

بے تو در ظلمت سرائے جسم کے بودی فراغ
پرتو مہر تو ایں ویرانہ را آباد داشت
بیدلؔ

غالب کہتے ہیں اے محبوب تیرا شگفتہ باغ یعنی حسین چہرہ یا حسن و جمال ہمارے دل کے لئے باعث سرور و نشاط ہے۔ ابرِ بہار (موسمِ بہار میں برسنے والا بادل جس کی وجہ سے ہر طرف پھول کھل اٹھتے ہیں اور پیڑ پودے ہرے بھرے ہو جاتے ہیں) میرے دماغ کا شراب خانہ ہے۔ یعنی میرے لئے باعث نشاط و سرور ہے۔ گویا محبوب کا حسن و جمال موجب نشاط ہے۔ بیدل کہتے ہیں تیرے بغیر جسم کی اس ظلمت سرا میں روشنی کہاں سے آسکتی ہے۔ تیرے آفتاب حسن کے پرتو سے اس ویرانے (دل) کی آبادی ہے۔ اس شعر کی تائید میں بیدل کے دو شعر اور ہیں:

بے جمالش بسکہ بیدل بزم مارا نور نیست
ناخنہ از موج ما آورد چشم جامہا

اس کے حسن جمال کے بغیر ہماری بزم بے انتہا بے رونق ہے۔ ناخنہ (آنکھ کا ایک مرض جس میں آنکھ کے اندر خون کا ایک نقطہ پڑ جاتا ہے) ہماری موج سے چشم جام لائی۔

نشاط ایں بہارم بی گلِ رویت چکار آید
تو گر آئی طرب آید، بہشت آید، بہار آید

اس بہار کی خوشی تیرے پھول سے چہرے کے بغیر میرے کس کام کی ہے۔ تو کیا آئی؟ خوشی آئی، بہشت آئی، بہار آئی۔ غالب کے شعر میں بیدل کے ان تمام اشعار کا عکس پایا جاتا ہے۔

وہ میری چین جبیں سے غم پنہاں سمجھا
راز مکتوب بہ بے ربطی عنواں سمجھا
غالبؔ

راز عشق از دل بروں افتاد و رسوائی کشید
شد پریشاں گنج تا غافل شد از ویرانہا
بیدلؔ

غالب کا خیال ہے کہ جس طرح مضمون خط میں بے ربطی سے نامہ نگار کے اندرونی کرب کا پتہ چلتا ہے اسی طرح میری پیشانی پر پڑے بل سے میرے غم پنہاں کا پتہ چلتا ہے۔ بیدل کہتے ہیں عشق ایک راز ہے، جب تک دل میں ہے محفوظ اور معزز ہے جب وہ دل سے نکل کر فاش ہوا تو اسے ذلت اور رسوائی اٹھانی پڑتی ہے۔ جس طرح خزانہ جب تک ویرانے میں پوشیدہ ہے محفوظ ہے۔ جب وہاں سے نکلا تو پریشان ہوا۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کے پورے شعر پر بیدل کی شعر کی ہلکی چھاپ موجود ہے۔

شرح اسباب گرفتاریِ خاطر مت پوچھ	دلِ افسردہ از ما غیر بیکاری نمی خواہد
اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا	حنا بستہ است ایں یک قطرہ خوں سرتا بپا مارا
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں دل کی گرفتاری یا افسردگی دل کے اسباب کیا ہیں، اس کی تفصیل مجھ سے مت پوچھو۔ بس یہ سمجھو کہ افسردگی خاطر یا تنگی دل کا یہ عالم ہے کہ میں نے اس کو قید خانے کی تنگ و تاریک کوٹھری سمجھ لیا۔ بیدل کہتے ہیں دل افسردہ ہم سے بیکاری کے سوا کسی اور چیز کا طالب نہیں ہے اس ایک قطرہ خون نے سر سے پاؤں تک میرے جسم میں مہندی لگا دی ہے۔ ظاہر ہے پاؤں میں مہندی لگی ہو تو آدمی چل پھر نہیں سکتا۔ اسی طرح دل افسردہ ہو تو سارے اعضاء بیکار اور معطل ہو جاتے ہیں۔ ''دل کی افسردگی'' کا تذکرہ غالب اور بیدل دونوں نے کیا۔ غالب غیر معمولی افسردگی کی وجہ سے حاصل ہونے والی تنگی کی بنا پر دل کو قید خانہ سمجھتے ہیں جبکہ بیدل اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ انسان اس کی بنا پر نکما ہو جاتا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو افسردگی یا تنگی دل کی کثرت کی وجہ سے اس کا زنداں ہونا بھی بیکاری پر منتہی ہوتا ہے۔ کیونکہ آدمی اگر کام کا ہوتا ہے تو قید خانے پہنچ کر نکما ہو جاتا ہے۔ اس طرح غالب کے پورے شعر میں بیدل کے ایک مصرعہ ''دلِ افسردہ از ما غیر بیکاری نمی خواہد'' کا عکس پوری طرح جلوہ گر ہے۔

بدگمانی نے نہ چاہا اسے سرگرمِ خرام	خرامش در دلِ ہر ذرہ صد طوفان جنوں دارد
رخ پہ ہر قطرہ عرق دیدۂ حیراں سمجھا	عناں گیرید ایں آتش بہ عالم افگنِ مارا
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں میری بدگمان طبیعت نے محبوب کا سرگرم خرام ہونا پسند نہیں کیا۔ کیونکہ چلنے سے اسے پسینہ آیا اور اس کے قطرے اس کے چہرے پر جم گئے تو میں نے ہر قطرے کو رقیب کی چشم حیراں سمجھا کہ اس کے چہرے پر جم کر رہ گئی ہے۔ بیدل کہتے ہیں اس کے خرام نے ہر ذرہ کے دل میں سیکڑوں طوفان جنوں برپا کر دیے ہیں۔ ہماری اس آگ کی لگام کو قابو میں کرو جس نے دنیا کو نذر آتش کر دیا ہے۔ محبوب کے خرام دلکش کو روکنے کا تذکرہ غالب اور بیدل دونوں نے کیا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ غالب کے نزدیک عاشق کی بدگمان طبیعت محبوب کو سرگرم خرام ہوتا اس لئے نہیں دیکھنا چاہتی کہ اس سے پسینہ چھوٹے گا جو چہرے پر جمے گا اور عاشق اسے رقیب کی چشم حیراں تصور کرے گا۔ جبکہ بیدل کے نزدیک محبوب کے خرام دلکش سے ہر ذرہ کے دل میں غیر معمولی جنونی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اس لئے کہتا ہے کہ اس آگ کی باگ اگر روکی نہ گئی تو ساری دنیا جل جائے گی۔

سفرِ عشق میں کی ذوق نے راحت طلبی	در رہِ عشق ز دل فکر سلامت غلط است
ہر قدم سائے کو میں اپنے شبستاں سمجھا	گر ہمہ سنگ بود شیشہ بہ چنگست اینجا
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں عشق کا سفر جب شروع کیا تو جسمانی کمزوری اس میں آڑے آگئی اور آرام و راحت کی خواہاں ہوئی۔ چنانچہ جو قدم بھی ہم نے اس راستے میں اٹھایا اس میں سائے کو شبستاں (رات کی خواب گاہ) یعنی منزل سمجھ کر جدوجہد ختم کر دی۔ بیدل کہتے ہیں عشق کی راہ میں دل کی طرف سے سلامتی کی فکر ہی غلط ہے۔ عشق تو ایک پرخطر راستہ ہے چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے:

در رہِ منزلِ لیلیٰ کہ خطرہاست بجاں
شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

عشق کی راہ میں جان کے لالے پڑتے ہیں اس لئے پہلی شرط ہے کہ مجنوں ہو جاؤ۔ اگر سراسر پتھر ہو تو بھی شیشہ چنگل میں ہے۔ شیشہ وسنگ کے درمیان کیسا رشتہ ہے، ایک بالکل نازک ہے تو دوسرا بالکل سخت ٹھوس، اور تصادم کے وقت سنگ جو قوی ہے شیشہ پر جو ضعیف ہے غالب آ جاتا ہے۔ اس مفہوم کو دوسری جگہ یوں کہتا ہے:

در کار گاہِ عشق سلامت چہ می کند

اینجا بہ طبعِ شیشہ خزیدہ است سنگ ہم

عشق کے کارخانے میں سلامتی کا کیا کام، یہاں تو شیشہ کی طبیعت میں پتھر بھی آہستہ سے گھسا ہوا ہے، یعنی دو متضاد چیزیں جب ایک جگہ جمع ہوں گی تو ان میں جو قوی ہو گا وہ ضعیف پر غالب آئے گا۔ دوسرے شعر میں بیدل کہتا ہے:

داغ عشقم نیست الفت با تن آسانی مرا

پیچ و تابِ شعلہ باشد نقش پیشانی مرا

میں تو عشق میں گرفتار ہوں مجھے تن آسانی سے کیا تعلق؟ میری پیشانی پر شعلہ کی سی پیچ وتاب کے نقوش کندہ ہیں۔ سفر عشق دونوں کا موضوع ہے مگر نتیجہ میں دونوں دو متضاد سمتوں میں گئے ہیں۔

تھا گریزاں مژۂ یار سے دل تا دم مرگ	نالہ کفرست در طریق وفا
دفع پیکان قضا اس قدر آساں سمجھا	بر قضا شکوۂ قضا مبرید
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں میں آخری دم تک محبوب کی پلکوں سے بچنے کی کوشش کرتا رہا مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ کیونکہ محبوب کی پلک تو تیر قضا ہے اور تیر قضا سے کوئی بچ کر نہیں نکل سکتا۔ میرا دل بھی کس قدر نا سمجھ تھا کہ تیر قضا کو دفع کرنا آسان سمجھا۔ بیدل کہتے ہیں عشق میں وفاداری کا تقاضا ہے کہ آہ و نالہ نہ کریں اور اگر کرتے ہیں تو وہ شریعت عشق میں کفر ہے۔ قضا و قدر کے فیصلے پر شکایت مت کرو۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کے مصرعہ "دفع پیکان قضا اس قدر آساں سمجھا" میں بیدل کے مصرعہ "بر قضا شکوۂ قضا مبرید" کی چھاپ موجود ہے۔

دل را نشانِ ناوک آفات کردہ اند	پھر مجھے دیدہ تر یاد آیا
ہر دم زدن بخانہ آئینہ ماتم است	دل جگر تشنۂ فریاد آیا
بیدلؔ	غالبؔ

غالب کہتے ہیں کہ میرا دل عشق میں آہ وفغاں کے لئے امڈا چلا آرہا ہے، اور اس کی فریاد کشی کی تشنگی بڑھتی جارہی تھی۔ ظاہر ہے جب صورت حال یہ ہوتو دیدۂ تر یعنی گریہ وزاری لازم ہو جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پھر وہی مصیبت کا پہاڑ ٹوٹتا دکھائی دیتا ہے۔ بیدل کہتے ہیں دل کی ساخت ہی ایسی بنائی ہے کہ وہ تیر آفات کا نشانہ بنے اس لئے ہر سانس میں خانۂ آئینہ یعنی دل میں ماتم وسوگواری اور آہ وفغاں کا سلسلہ جاری ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کے پورے شعر میں بیدل کے اس شعر کا ارتعاش موجود ہے۔ البتہ انداز بیان الگ ہے۔

دلدار رفت و من بہ وداعی بہ سوختم	دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
یارب چہ برق برمن آتش بہ جاں گذشت	پھر ترا وقت سفر یاد آیا
بیدلؔ	غالبؔ

حالی اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: دوست کو رخصت کرتے وقت جو دردناک کیفیت گذرتی ہے اور اس کے چلے جانے کے بعد رہ رہ کر یاد آتی ہے اس میں جو کبھی کبھی وقفہ ہو جاتا ہے اس کو قیامت کے دم لینے سے تعبیر کیا ہے۔ ایسے بلیغ شعر اردو زبان میں کم دیکھے گئے ہیں جو حالت فی الواقع ایسے موقع پر گذرتی ہے ان دو مصرعوں میں اس کی تصویر کھینچ دی ہے۔ جس سے بہتر اسلوب بیان میں مضمون ادا نہیں ہو سکتا۔'' (۱۰۰) غالب کا خیال ہے کہ ابھی جدائی کے اضطراب میں کمی نہیں ہونے پائی تھی کہ پھر تیرا وقت سفر یاد آیا اور پھر وہی قیامت مجھ پر گذر گئی جو تجھے رخصت کرتے وقت مجھ پر گذری تھی۔ بیدل کہتے ہیں کہ دل میں عشق کی آگ تو پہلے سے سلگ ہی رہی تھی محبوب کی جدائی کے وقت ایک اور بجلی مجھ آتش بجاں پر گری جو میرے وجود کو جلا کر بھسم کر گئی، اس لئے خدا سے پوچھتا ہے کہ الٰہی آخر وہ کیسی بجلی تھی۔ مفہوم دونوں کے شعر کا قریب قریب ایک ہی ہے۔ یہاں غالب کے کلام میں بیدل کے اس خیال کا عکس موجود ہے۔

سادگی ہائے تمنا یعنی	شب محو انتظار تو بودم دمید صبح
پھر وہ نیرنگ نظر یاد آیا	گشتم بیاد روئے تو قربان آفتاب
غالبؔ	بیدلؔ

تمنا کی سادگی کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی آرزوؤں میں ناکام ہونے کے باوجود مزید تمنا کرنے سے پیچھے نہیں ہٹتا۔ اس حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے غالب کہتے ہیں کہ وصال محبوب اگر چہ ممکن نہیں پھر بھی اس نیرنگ نظر محبوب کو یاد کئے جارہا ہوں۔ بیدل کہتے ہیں رات تیری راہ تکنے میں ایسا محو ہوا کہ صبح نمودار ہوگئی آخر تیرے حسین چہرے کی یاد میں میں آفتاب پر قربان ہوگیا۔ یہاں غالب اور بیدل کے خیال میں بڑی حد تک یکسانیت ہے کیونکہ عاشق کا معشوق کی راہ تکنا بھی برائے وصال ہوتا ہے۔ رات پوری بیت گئی اور وصال نصیب نہ ہوتو کم از کم معشوق کی یاد ہی سے دل بہلا رہے ہیں۔ اس طرح دیکھا جائے تو غالب کے اس کلام میں بھی بیدل کے کلام کا عکس موجود ہے کہ وصال نہ ہونے پر یاد کئے جا رہے ہیں۔

زندگی یوں بھی گذر ہی جاتی	نیرنگ طلب ما را ایں در بدری آموخت
کیوں ترا راہگذر یاد آیا	قمری بسرِ سرو است آوارۂ کوکوہا
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ ہم بلاوجہ تیرے کوچے میں دربدر کی ٹھوکریں کھاتے رہے کہ یہاں پہنچ کر بھی تیرے آستانے تک رسائی نہ ہوسکی۔ اس سے تو بہتر یہی تھا کہ زندگی اپنے گھر رہ کر گذار دیتا۔ یہاں آ کر کیا فائدہ جب تجھ تک رسائی نہ ہوسکی۔ بیدل کہتے ہیں میں اپنے گھر میں آرام سے بیٹھا تھا، عشق کی نیرنگیوں نے مجھے معشوق تک رسائی کے لئے دربدر کی ٹھوکریں کھلائیں۔ جس طرح قمری معشوق کی طلب میں سرو کے پیڑ پر کوکو کرتی ہوئی ماری پھرتی ہے۔ عشق میں دربدری کا مفہوم دونوں کے یہاں ہے۔ مگر وہ نکتہ جو بیدل کے کلام میں پوشیدہ تھا غالب نے اس کو واضح طور پر بیان کر دیا۔ یہاں بھی غالب کے کلام پر بیدل کے کلام کا اثر واضح ہے۔

دل گم گشتہ سراغیست ز کیفیت شوق	پھر ترے کوچے کو جاتا ہے خیال
نشہ بالد اگر از دست رود شیشہ ما	دل گم گشتہ مگر یاد آیا
بیدلؔ	غالبؔ

غالب کہتے ہیں ہم اپنا دل تیرے کوچے کی گردش کرتے ہوئے ہاتھ سے دے بیٹھے تھے اس لئے بار بار تیرے کوچے کا خیال آتا ہے۔ بیدل کہتے ہیں دل گم گشتہ عاشقانہ کیفیات کا ایک سراغ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حالت عشق میں عاشق پر مختلف قسم کی کیفیات طاری ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک کیفیت یہ ہے کہ اس کا دل ہاتھ سے نکل کر معشوق کے پاس یا اس کے کوچے میں پہنچ جاتا ہے۔ دوسرے مصرعہ میں کہتا ہے کہ شیشہ اگر ہاتھ سے گر جائے تو نشہ اور بڑھ جاتا ہے۔ بیدل کہتا ہے کہ اس کے گرنے سے نشہ میں کمی کے بجائے زیادتی ہوتی ہے اسی طرح دل گم گشتہ بھی عاشقانہ جذبات میں جو نشہ ہوتا ہے اس میں اضافے کا پتہ دیتا ہے۔ غالب کے شعر میں بیدل کے اس خیال کا عکس موجود ہے۔

بیدل زبس سراسر ایں دشت کلفت است	کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
جز گرد بر نخاست بہر جا زدیم پا	دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا
بیدلؔ	غالبؔ

غالب کے اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے حالی لکھتے ہیں: اس شعر سے جو معنی فوراً متبادر ہوتے ہیں یہ ہے کہ جس دشت میں ہم ہیں وہ اس قدر ویران ہے کہ اس کو دیکھ کر گھر یاد آتا ہے یعنی خوف معلوم ہوتا ہے۔ مگر غور کرنے کے بعد اس سے یہ بھی مطلب نکلتا ہے کہ ہم جو اپنے گھر ہی کو سمجھتے تھے کہ ایسی ویرانی کہیں نہ ہوگی، مگر دشت بھی اس قدر ویران ہے کہ اس کو دیکھ کر گھر کی ویرانی یاد آتی ہے(۱۰۱)۔ آثر لکھنوی لکھتے ہیں مجھے وحشت میں ایسے مقام کی تلاش ہوئی جو گھر سے زیادہ ویران ہو، لہذا دشت کا رخ کیا وہاں پہنچ کر اندازہ ہوا کہ یہ ویرانی تو کچھ بھی نہیں ہے اس سے زیادہ تو میرا گھر ویران ہے(۱۰۲)۔ بیدل کا خیال ہے کہ دنیا ایک ایسی دشت ہے جہاں کلفتوں اور زحمتوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس لئے جہاں بھی ہم نے قدم رکھا وہاں سے

گرد اٹھتے دیکھا۔ گرد وہیں اڑتی ہے جہاں دور دور تک کسی پیڑ پودے کا نام ونشان نہ ہو۔ ایسے لق ودق میدان کی ویرانی کا کیا پوچھنا، اور اس میں چلتے چلتے انسان کا تھک ہار کر بھوکے پیاسے رہنے کی کلفتوں کا سہنا سب کو معلوم ہے۔ یہاں دشت کی ویرانی میں غالب اور بیدل دونوں شریک ہیں لیکن غالب کے نزدیک ان کا گھر عالمِ وحشت میں دشت سے زیادہ ویران تھا۔

تم سے بیجا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ
اس میں کچھ شائبہ خوبیِ تقدیر بھی تھا
غالبؔ

می خواست دل ز شکوہ خوے تو دم زند
دودِ سپند گشت سخن در دہان ما
بیدلؔ

غالب کے خیال کا خلاصہ یہ ہے کہ میں تمھارے عشق میں تباہ وبرباد ہوا لیکن اپنی بربادی کا ذمہ دار تم کو نہیں ٹھہراتا ہوں کیونکہ اس میں ایک حد تک میری بدقسمتی کا بھی دخل ہے۔ بیدل کہتے ہیں دل تمہاری خوے بیدادگری کا شکوہ کرنا چاہتا تھا کہ سخن ہمارے منہ میں دودِ سپند ہوگیا۔ سپند کالے دانے کو کہتے ہیں جو آگ پر رکھنے سے اچھل کر باہر نکل آتا ہے۔ اب سخن کا منہ کے اندر دودِ سپند ہونے کا مطلب یہ ہوا کہ میری قوت گویائی نے دل کی ہم زبانی سے انکار کر دیا۔ غالب اور بیدل دونوں نے محبوب سے گلہ کو موضوع بنایا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ غالب کے نزدیک اپنی تباہی کا گلہ ہی بیجا ہے کیونکہ اس میں شومیِ تقدیر کا دخل ہے۔ بیدل کے نزدیک زبان نے دل کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔

قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد
ہاں کچھ اک رنج گرانباریِ زنجیر بھی تھا
غالبؔ

فکر زلفت سینہ چاکاں را زبس پیچیدہ است
می تواں از قالب ایں قوم خشتِ شانہ ریخت
بیدلؔ

غالب کے خیال کے مطابق یہ حقیقت ہے کہ بیڑیوں کے بوجھ تلے مجھے کتنی جسمانی تکلیف اٹھانی پڑی مگر وہ دلی کلفت اس سے کہیں بڑھ کر ہے جو تیری زلفوں کی یاد میں ہو رہی ہے۔ بیدل کہتے ہیں تیری زلف کے فکر نے سینہ چاکوں یعنی عاشقوں کو بے انتہا پیچ وتاب میں گرفتار

کرر کھا ہے۔ یہاں تک کہ اس قوم کے قالب سے کنگھے کے دندانے بنائے جا سکتے ہیں۔ غالب کے نزدیک زلف معشوق کی یاد اور بیدل کے نزدیک زلف معشوق کی فکر موضوع شعر ہے۔ غالب کے نزدیک زلف معشوق کی یاد عاشق کو قید خانے میں بھی سہارا دئے ہوئے ہے کہ زنجیر کے بوجھ تلے دبے ہیں پر جسمانی تکلیف برداشت کر رہے ہیں۔ بیدل کے نزدیک زلف معشوق کے تصور نے عاشقوں کو پیچ و تاب میں مبتلا کر رکھا ہے، یا الجھا رکھا ہے۔ جس طرح زلف الجھی ہوتی ہے، اس لئے کہتا ہے کہ اس طبقہ عاشق کے قالب سے کنگھے کی خشت بنا کر اسے سلجھایا جا سکتا ہے۔ اس کو دوسرے انداز سے یون کہتا ہے۔

عقدۂ دل را ز زلفش باز کردن مشکل است
بیدل اینجا ناخن از انگشتہائے شانہ ریخت

دل کی گرہ کو اس کی زلف سے کھولنا مشکل کام ہے یہاں کنگھے کی انگلیوں یعنی دندانے سے ناخن گر چکا ہے۔

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا	نگاہ از چشمِ حیرانم چو دود از داغ می جوشد
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا	قیامت ریخت بر آئینہ ام برقِ تماشایش
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کا مطلب یہ ہے کہ محبوب نے صرف ایک جھلک مجھے دکھا دی تو اس سے میری تشنگی دور نہیں ہوئی۔ مزہ تو جب تھا کہ وہ دو گھڑی میرے پاس بیٹھتے تا کہ میں انہیں دل بھر کر دیکھتا، اور ان کی گفتگو سے لطف اندوز ہوتا۔ بیدل کہتے ہیں جس طرح گرم لوہے پر پانی ڈالنے سے دھواں جوش مارتا ہوا اٹھتا ہے اسی طرح چشمِ حیراں (قدرت کی بوقلمونیوں کو دیکھ کر حیران ہونے والی آنکھ) سے نگاہ جوش مارتی ہوئی اٹھتی ہے۔ خصوصیت سے معشوق کے جلوے پر جو نظر پڑی تو اس کے برق تماشا نے میرے آئینہ دل پر قیامت برپا کر دی۔ محبوب کے حسین جلوے کو دیکھ کر آنکھوں کے سامنے بجلی کوندنے کو غالب اور بیدل دونوں نے موضوع بنایا ہے۔ غور سے دیکھئے تو غالب کے اس مصرعہ: ''بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا'' میں بیدل کے مصرعہ

''قیامت ریخت بر آئینہ ام برقِ تماشایش'' کا عکس پوری طرح موجود ہے۔لیکن جو زور بیدل کے مصرعہ میں ہے وہ غالب کے مصرعہ میں نہیں ہے۔حتیٰ کہ دور حاضر کے ایک مشہور ایرانی نقاد اور شاعر شفیعی کدکنی نے بیدل کے اس مصرعہ کو اس قدر پسند کیا کہ اپنا سارا مجموعۂ کلام اس کے سامنے ہیچ سمجھتے تھے۔لکھتے ہیں:

''من ترجیح دہم ہماں مصرعہ بنام من ماند و نہ آں مجموعہ عظیم کلیشہ ہا و با کلمات پوک''۔(۱۰۳)

تو مجھے بھول گیا تو پتہ بتلا دوں
کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا
غالبؔ

دل ز دامِ حلقۂ زلفت چساں آید بروں
مہرہ را نتواں گرفتن از دہان ما رہا
بیدلؔ

محبوب کو خطاب کرتے ہوئے غالب کہتے ہیں اگر تیرے صفحۂ ذہن سے میری یاد محو ہو چکی ہے تو آ تجھے یاد دلاؤں کہ کبھی کوئی شکار تیرے فتراک (تسمہ) زلف میں گرفتار ہوا تھا میں وہی شکار ہوں۔مطلب یہ ہے کہ ایک عرصہ سے تیری زلف گرہگیر کا قیدی ہوں۔بیدل کہتے ہیں دل بھلا تیرے حلقۂ زلف کے دام سے کیونکر آزاد ہوسکتا ہے۔مہرہ (سانپ کا منکا) کو سانپ کے منہ سے نہیں نکالا جاسکتا ہے۔زلف محبوب میں عاشق کی اسیری کا مضمون غالب اور بیدل دونوں نے باندھا ہے۔غالب نے نکتہ آفرینی سے کام لیتے ہوئے معشوق کے ذریعے عاشق کی فراموشی کا ذکر کر کے اس کو یاد دلایا ہے کہ میں وہی عاشق ہوں جو کبھی تیری زلف کا اسیر تھا۔بیدل نے ایک مثال کے ذریعے زلف معشوق میں عاشق کی نہ ختم ہونے والی اسیری کے مضمون کو پختہ کر دیا۔جس طرح مہرہ کو سانپ کے منہ سے نکالا نہیں جاسکتا اسی طرح تیری زلف کی اسیری سے دل کا نکلنا بھی ممکن نہیں ہے۔

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پہ ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا
غالبؔ

بعد مردن کار با فضل است با اعمال نیست
ہر کہ زیں نجات سرا رفتہ است بے غم رفتہ است
بیدلؔ

غالب شوخی کے انداز میں خدا سے کہتے ہیں کہ فرشتوں کے لکھے پر اے خدا آپ نے ہماری گرفت کر لی جبکہ دمِ تحریر ہمارا کوئی آدمی وہاں موجود نہ تھا۔ یہ تو یکطرفہ کاروائی ہوئی اور سب کو معلوم ہے کہ فریق ثانی کا بیان سنے بغیر سزا دینا انصاف کا خون کرنا ہے۔ بیدل کہتے ہیں مرنے کے بعد معاملہ خدا کے فضل و مہربانی پر موقوف ہے اعمال پر نہیں۔ اس خجلت سرا یعنی دنیا سے جو روانہ ہوا وہ بغیر غم کے روانہ ہوا۔ بیدل کا خیال ہے کہ آخرت کے ثواب و عذاب کا معاملہ تمام تر فضل الٰہی پر موقوف ہے اعمال سے اس کا تعلق نہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ خدا کا فضل اور اس کی رحمت اس کے عذاب پر غالب ہے۔ اس لئے اس دنیا سے چاہے جتنا بڑا گنہگار جائے وہ بغیر غم کے جاتا ہے۔ بیدل کا یہ خیال کسی حد تک تو درست ہے کیونکہ حدیث میں آتا ہے حضورؐ نے فرمایا ''الاان یتغملنی الله برحمته ''یعنی ہمیں بھی اس دن خلاصی اور نجات اس بنا پر ہوگی کہ اللہ اپنی رحمت سے ہم کو ڈھانپ لے۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ خدا کی رحمت پر بھروسہ کر کے انسان گناہوں پر جری ہو جائے اور اعمال کی طرف سے بے پروا ہو جائے۔ اعمال، ظاہری سبب ہے اور حقیقی سبب خدا کی رحمت ہے۔ قرآن کہتا ہے ''یا ایها الناس ما غرك بربك الكريم الذي خلقك (پ: ۳۰ سورۃ انفطار) اے لوگو! اپنے رب کریم سے کس چیز نے تمھیں دھوکے میں رکھا ہے یعنی اس کی کریمی کے بھروسے گناہ کئے جا رہے ہو اور یہ نہیں سوچتے کہ وہ قہار و جبار بھی ہے۔ بیدل نے اس فرق کو ملحوظ نہیں رکھا۔ اور یہاں تک کہہ گیا:

کو خجلت عصیاں کہ محیط کرمش را
آرایش موج از عرقِ شرم گناہ است

گناہ کی ندامت! تو کہاں ہے؟ کیونکہ اس کے دریائے کرم کی موج کی آرایش شرم گناہ کے پسینے سے ہے۔ گناہ پر صرف ندامت کافی نہیں ہوتی ہے بلکہ اس کے ساتھ قرآن کی رو سے توبہ بھی شرط ہے۔ غالب نے خدا سے شوخی کے انداز میں جو بات کہی ہے اس کی حیثیت ایک تو شرعی ہے اور ایک ظریفانہ۔ جہاں تک شرعی حیثیت کا تعلق ہے تو ہمیں معلوم ہے کہ صرف فرشتوں کی لکھے پر باز پرس نہیں ہوگی۔ عدالت الٰہی میں پیشی ہوگی، فرد جرم پیش ہوگا، نقد و جرح ہوگی، گواہ گواہی دیں گے، گواہ ہمارے ہاتھ پیر ہوں گے۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے آج ہم ان کے منہ پر مہر لگا دیں گے اور ان کے ہاتھ پاؤں ہم سے باتیں کریں گے اور وہ گواہی دیں گے جو کچھ وہ کرتے رہے

تھے۔ گویا فرشتوں کے دم تحریر خود ہمارے اعضائے بدن گواہ کے طور پر موجود تھے اور ظریفانہ حیثیت کے لئے شاید کوئی گنجائش نکل آئے کیونکہ مشہور کہاوت ہے کہ رسول سے شوخی نہیں کی جاسکتی ہے خدا سے کی جاسکتی ہے۔

ہمہ نا امیدی ہمہ بدگمانی
میں دل ہوں فریب وفا خوردگاں کا
غالب

آنقدر بر یاس پیچیدم کہ امیدی نماند
پائے تا سر یک گرہ شد رشتہ ام از تابہا
بیدل

فریب وفا خوردگاں سے مراد وہ عاشق ہیں جنہوں نے محبوب سے وفاداری نبھائی پر اس کا کچھ صلہ ان کو نہ ملا۔ ظاہر ہے جس کو اس کو وفاداری کا صلہ نہ ملے گا وہ سراپا مایوس اور بدگمان بن جائے گا۔ غالب کا مطلب یہ ہے کہ میں سرتاپا ناامید اور بدگمان ہوں، دوسرے لفظوں میں یوں سمجھو میں فریب وفا کھائے ہوئے لوگوں کا دل ہوں، جو مایوسی اور بدگمانی سے بھرا ہوا ہے۔ بیدل کہتے ہیں مایوسی پر میں اس قدر پیچ تاب کھاتا رہا کہ میری امیدوں پر پانی پھر گیا۔ سر سے پاؤں تک ایک گرہ بن گیا ہوں۔ یا دوسری جگہ کہتے ہیں:

عمر رفت و دامن نومیدی از دستم نرفت
ناز بسیار ست بر من بخت واژون مرا

زندگی بیت گئی اور ناامیدی کا دامن میرے ہاتھ سے نہیں گیا، میری بدقسمتی اور بدبختی کو مجھ پر بڑا ناز ہے۔ بیدل اور غالب دونوں نے ''عاشق کی مایوسی'' کو موضوع بنایا ہے غالب نے البتہ ایک نکتہ کے ذریعے مایوسی کی انتہا کا ذکر کیا ہے۔ کہ میں فریب وفا کھائے لوگوں کا دل ہوں جو مایوسی سے بھرا ہوا ہے۔ جبکہ بیدل نے پہلے شعر میں مایوسی پر اس قدر پیچ تاب کھایا کہ سراپا گرہ بن گئے۔ دوسرے شعر میں مایوسی کی وجہ سے اپنے بخت برگشتہ کو اپنے اوپر ناز کرتے دکھایا ہے۔

تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا
اوروں پہ ہے وہ ظلم جو مجھ پر نہ ہوا تھا
غالب

شکوہ خوباں مکن بیدل کہ در اقلیم حسن
رسم و آئین جفا خاصیتِ روئے نکوست
بیدل

غالب کا مطلب یہ ہے کہ اے ستم پیشہ معشوق! تو کبھی کسی کا دوست نہیں ہوا، اگر میرا نہ ہوا تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ حتیٰ کہ جو ظلم مجھ پر ہوا وہ اوروں پر نہیں ہوا۔ یعنی مجھ پر تو نے سب سے زیادہ ظلم ڈھائے ہیں۔ بیدل کہتے ہیں معشوقوں کی بیدادگری کا شکوہ مت کرو، کیونکہ کشورِ حسن میں ظلم و جفا کی رسم تو حسین چہروں کی خصوصیت ہے۔ دوسری جگہ کہتا ہے:

مپندارید عاشق شکوہ پردازد بہ بیدادش
کہ لب وا کردن امکاں نیست زخم تیغ الفت را

یہ نہ سمجھو کہ عاشق معشوق کے ظلم و بیداد کا شکوہ کرے گا۔ کیونکہ جو آدمی تیغ الفت کا زخمی ہوتا ہے ممکن نہیں کہ وہ لب کشائی کرے۔ شکوہ کرنا تو دور کی بات بیدل کا ایک اور شعر اسی مفہوم میں ہے:

نشانِ مردمی بیدل چہ جوئی از سیہ چشماں
وفا کن پیشہ و زیں قوم آئینِ جفا بنگر

شکوۂ معشوق غالب اور بیدل دونوں کا موضوع ہے۔ مگر دونوں کے خیال دو متضاد سمتوں میں ہیں۔

بیدلؔ	غالبؔ
زند گر شمع با حسن تو لافِ گرم بازاری	چھوڑا مہ نخشب کی طرح دست قضا نے
بہ آہی می توانم قفل بر در زد دکانش را	خورشید ہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا

غالب کے شعر کی تشریح میں حالی لکھتے ہیں: اس شعر میں آفتاب کو اس لحاظ سے کہ وہ حسن محبوب کے مقابلے میں اس کو ناقص الخلقت قرار دیا ہے۔ ماہ نخشب (مصنوعی چاند جس کو حکیم ابن عطا المعروف بہ ابن مقنع نے بنایا تھا) کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ (۱۰۴) یعنی جب کارکنانِ قضا وقدر نے یہ دیکھا کہ ہماری انتہائی کوشش کے باوجود خورشید حسن و جمال کے اعتبار سے غالب کے محبوب کا مدمقابل نہیں ہو سکے گا تو اسے انہوں نے یونہی ناتمام اور ادھورا چھوڑ دیا۔ گویا محبوب کے حسن کے مقابلے پر خورشید کی تنقیص کی ہے۔ بیدل کہتے ہیں اگر شمع تیرے حسن کے ساتھ گرم بازاری کی لاف زنی کرے یعنی تیرے حسن کا مقابلہ کرے تو اپنی ایک آہ سے اس کی دکان کے دروازے پر تالا لگا دوں۔ بیدل نے محبوب کے حسن کا شمع سے موازنہ کرکے شمع کو اس سے نہایت

کمتر درجے کا قرار دیا۔ جبکہ غالب نے سورج سے موازنہ کیا۔ اور اسے ماہ نخشب کی طرح ناقص قرار دیا۔ شاعر خیال کی دنیا میں کہاں تک جا سکتا ہے اس کا ایک نمونہ یہ ہے ورنہ ظاہر ہے سورج اور چاند منجملہ نشاناتِ عظمتِ الٰہی ہیں اور قرآن کہتا ہے: ہم نے سورج کو ایک چمکتا ہوا چراغ بنایا بھلا وہ ناقص الخلقت کہاں ہو سکتا ہے۔ دوسری جگہ قرآن پاک کہتا ہے غور سے دیکھو اللہ کی مخلوقات میں کوئی نقص اور خامی بھی نظر آتی ہے (سورہ تبارک الذی) اس لئے غالب کے مقابلے پر بیدل کا بیان حقیقت سے زیادہ قریب ہے۔

توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے	دل وفا، بلبل نوا، واعظ فسوں، عاشق جنوں
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا	ہر کسی در خورِ ہمت پیشہ پیدا می کند
غالب	بیدل

حالی لکھتے ہیں: بالکل نیا اور اچھوتا اور باریک خیال ہے، اور نہایت صفائی اور عمدگی سے اس کو ادا کیا گیا ہے۔ اگر کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو اس کی فہم کا قصور ہے۔ دعویٰ یہ ہے کہ جس قدر ہمت عالی ہوتی ہے اسی کے موافق اس کی تائید غیب سے ہوتی ہے اور ثبوت یہ ہے کہ قطرہ اشک جس کو آنکھ میں جگہ ملی ہے، اگر اس کی ہمت جبکہ وہ دریا میں تھا موتی بننے پر فائض ہو جاتی تو اس کو ظاہر ہے یہ درجہ یعنی آنکھوں میں جگہ ملنے کا حاصل نہ ہوتا۔ (۱۰۵) بیدل کہتے ہیں دل کو وفا، بلبل کو نوا، واعظ کو فسوں یعنی جادوگری اور عاشق کو جنون مبارک ہو۔ ہر آدمی یا ہر چیز اپنی ہمت کے مطابق ہی پیشہ اختیار کرتی ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کا مصرعہ ''توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے'' بیدل کے مصرعہ ''ہر کسی درخورِ ہمت پیشہ پیدا می کند'' کا منظوم ترجمہ معلوم ہوگا۔ اس لئے حالی کا یہ کہنا کہ بالکل انوکھا اور اچھوتا خیال ہے، درست نہیں معلوم ہوتا ہے البتہ مثالیں دونوں نے الگ الگ دی ہیں۔ بیدل کے مطابق دل، بلبل، واعظ اور عاشق سب کا پیشہ اپنی اپنی ہمت کے مطابق ہے۔ جبکہ غالب کے مطابق آنکھوں میں تیرنے والے قطرۂ اشک نے اپنی ہمت کی وجہ سے آنکھوں میں عزت پائی۔

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم ۔۔۔ ایکہ بر نقشِ قدش دل بستہ ای ہشیار باش
میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا ۔۔۔ سایۂ ایں سرو آشوبِ قیامت پرور است
غالبؔ ۔۔۔ بیدلؔ

غالب کہتے ہیں میرا خیال تھا کہ مردے قبروں سے اٹھ کر زندہ نہیں ہو سکتے اس لئے مجھے قیام کے قیامت کا یقین نہیں تھا۔لیکن جب دیکھا کہ محبوب کے قدوقامت سے مردے زندہ ہوتے ہیں تو مجھے پختہ یقین ہو گیا کہ قیامت کا آنا یقینی ہے۔یعنی مردہ زندہ ہو سکتے ہیں۔بیدل کہتے ہیں اے عاشق! تو نے اس کے قدوقامت کے نقوش سے اپنے دل وابستہ کر لئے ہیں،یا ان سے دل لگایا ہے،ہوشیار رہنا اس سرو کا سایہ بھی آشوب قیامت پرور ہے۔محبوب کے قدوقامت کو دونوں نے موضوع بنایا ہے۔غالب کے نزدیک اس کے قدوقامت نے قیامت کا یقین دل میں پیدا کر دیا۔بیدل کے نزدیک اس کے قدوقامت تو دور رہے اس کے سائے نے ایسی آشوبی کیفیت عاشق کے اندر پیدا کر دی ہے کہ اس سے قیامت کا سماں نگاہوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔بیدل نے محبوب کے قدوقامت کی تعریف کرتے ہوئے اپنے ایمان بالآخرۃ کا بھرم رکھا جبکہ غالب اس حد تک چلے گئے کہ آخرت پر ان کا یقین اس سے پہلے متزلزل معلوم ہوتا ہے۔بہر حال غالب کے شعر میں بیدل کے شعر کا ارتعاش موجود ہے۔

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک ۔۔۔ بیدل از حد گذشت معاصی و من ہماں
میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا ۔۔۔ رد نیستم اگر بدرش التجا برم
غالبؔ ۔۔۔ بیدلؔ

حالی مرحوم غالب کے اس شعر کی شرح میں لکھتے ہیں: گناہ کرنے میں ہمارا حوصلہ اس قدر فراخ ہے کہ باوجود یکہ دریائے معاصی خشک ہو گیا مگر ابھی ہمارے دامن کا پلہ تک نہیں بھیگا۔(۱۰۶)یعنی جتنے گناہ ہو سکتے تھے سب کیے،مگر ابھی تک دل نہیں بھرا۔بیدل کہتے ہیں میرے گناہ گو حد سے بڑھ چکے ہیں،پر میرا حال یہ ہے کہ اگر اس کے آستانے پر گناہوں سے توبہ کی درخواست کروں تو محروم واپس نہیں لوٹوں گا۔یعنی حد سے زیادہ گناہ کرنے کے باوجود

میں اس کی رحمت سے مایوس نہیں ہوں۔ یہ بات قرآنی آیت سے بھی ہم آہنگ ہے۔ جس میں اللہ نے فرمایا ''اے لوگو! جنھوں نے گناہ کر کے اپنے اوپر ظلم کیا ہے میری رحمت سے مایوس نہ ہو''۔ بیدل کا اسی کے قریب ایک دوسرا شعر ہے:

بر امید ابر رحمت دامنی آلوده ام
می کند آب از حیا بے برگی عصیاں مرا

ابر رحمت کی امید میں اپنے دامن کو گناہوں سے آلودہ کئے ہوئے ہوں۔ میرے گناہوں کی بے سروسامانی نے شرم سے مجھے پانی پانی کر دیا۔ غالب اور بیدل میں یہ فرق ہے کہ بیدل اعتدال کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتا، اور زبان کو کنٹرول میں رکھتا ہے۔ غالب کو یہ کنٹرول حاصل نہیں۔ کہتے ہیں جتنے گناہ ہو سکتے تھے سب کر ڈالے پھر بھی دل نہیں بھرا۔ یعنی ابھی اور گناہ کرنے کی تمنا ہے۔ توبہ کرنے یا معافی مانگنے یا رحمت کی امید کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ لیکن فارسی کلام میں توبہ کا ذکر اس طرح کیا ہے: ع

عہدِ جوانی گذشت توبہ نکردم ہنوز

کیا کہوں بیماریِ غم کی فراغت کا بیاں
جو کہ کھایا خونِ دل بے منتِ کیموس تھا
غالبؔ

نشاطِ جاوداں خواہی دلی را صید الفت کند
کہ مستیہاست موقوف بدست آوردن مینا
بیدلؔ

غالب طنزیہ انداز میں کہتے ہیں جب سے مرض عشق میں گرفتار ہوا ہوں کیا بتاؤں کیسا اطمینان قلب حاصل ہے۔ یعنی اب غذا کھانے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ صرف خون دل پی کر زندگی گزر رہی ہے۔ اس لئے کیموس (غذا کا معدے میں دوسرا ہضم) کے احسان مند ہونے سے نجات مل گئی۔ کیموس کا احسان تو اسے اٹھانا پڑتا ہے۔ جو روٹی وغیرہ کھائے، اس شعر میں فلسفیانہ نکتہ یہ ہے کہ عشق بذات خود موجب فراغت ہے۔ بیدل کہتے ہیں دائمی نشاط وسرور حاصل کرنا منظور ہو تو دل کو عشق ومحبت میں گرفتار کرو۔ کیونکہ مستی حصول مینا پر موقوف ہے، یعنی جس طرح شراب نوشہ سے مستی وسرخوشی پیدا ہوتی ہے اسی طرح دل کو بھی مستی وسرخوشی یا فراغت وخوشحالی اس

وقت حاصل ہوگی جب وہ دام عشق میں گرفتار ہوگا۔ عشق سے زندگی میں دائمی خوشی وفراغت، اور سکون وطمانینت حاصل ہوتی ہے۔ اس مضمون کو دونوں نے بیان کیا ہے۔ چنانچہ غالب نے دوسری جگہ اس طرح ادا کیا ہے:

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا
درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا

لیکن اس شعر میں غالب نے ایک نکتے کا اضافہ کیا ہے۔ اب اگر غور سے دیکھا جائے تو غالب کے مصرعہ ''کیا کہوں بیماریِ غم کی فراغت کا بیاں'' میں بیدل کے مصرعہ ''نشاطِ جاوداں خواہی دلی راصید الفت کند'' کا عکس نظر آئے گا۔ غالب کا ایک فارسی شعر اسی مفہوم میں درج ذیل ہے:

در عشق انبساط بہ پایاں نمی رسد
چوں گردباد خاک شو و در ہوا برقص

عرضِ نیاز عشق کے قابل نہیں رہا	کس با دلِ گرفتہ چہ صید آرزو کند
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا	ایں غنچہ وا شود کہ گل افتد بہ دام ما
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں بے وفائی کے صدمے اس قدر اٹھائے ہیں کہ دل ٹوٹ کر پاش پاش ہوگیا۔ اس لئے اب عاشقی کا دعویٰ کرنے کی جرات وجرات نہیں ہے۔ بیدل کہتے ہیں دل ایک کلی کی طرح ہے جب وہ کھلتا ہے تو پھول یعنی محبوب اس کے دام میں پھنستا ہے لیکن جب دل ہی بجھا ہوا، افسردہ اور غمگین ہو تو معشوق کو شکار کرنے کی تمنا کوئی کیا کرے گا۔ غالب اور بیدل دونوں نے دلِ شکستہ یا دل گرفتہ کی وجہ سے دعویٰ عاشقی کی ہمت نہ کرنے یا بیدل کے الفاظ میں معشوق کے دام عشق میں گرفتار نہ ہونے کی بات کہی ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کے پورے شعر میں بیدل کے پہلے مصرعہ ''کس با دلِ گرفتہ چہ صید آرزو کند'' کی صدائے بازگشت سنائی دے گی۔

مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں	نازم بدستگاہ ضعیفی کہ چوں خیال
شایانِ دستِ بازوئے قاتل نہیں رہا	در عالمی کہ اوست من زار می رسم
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں جدائی کے صدمے سہتے ہوئے اس قدر ناتواں ہو گیا ہوں کہ قاتل مجھ جیسے نیم جان کو قتل کرنے میں اپنی رسوائی محسوس کرے گا جبکہ اس کے عشق میں جان دینی بہر حال ضروری ہے۔ اس لئے اے دل اب مرنے کی کوئی اور تدبیر کر۔ بیدل کہتے ہیں مجھے اپنی ناتوانی اور کمزوری پر فخر ہے کیونکہ جس دنیا میں معشوق براجمان ہے میں زار و نزار عالم خیال کی طرح وہاں رسائی حاصل کر لیتا ہوں۔ غالب کے نزدیک عاشق غم جدائی سہتے سہتے اس قدر نحیف ہو گیا کہ قاتل اس کو قتل کرنے میں اپنی بے عزتی محسوس کرتا ہے۔ بیدل کے نزدیک غم جدائی سہتے سہتے اپنی ناتوانی پر فخر کے تصور سے عاشق خیال کی دنیا میں معشوق تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔ موازنہ سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب اور بیدل دونوں اس معاملے میں دو مخالف سمتوں میں گئے ہیں۔

محو عشق از کفر و ایماں فارغ است	بر روئے شش جہت درِ آئینہ باز ہے
خانۂ حیرت تماشہ می کند	یاں امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا
بیدلؔ	غالبؔ

غالب کہتے ہیں عشق نے میرے فکر و نظر میں اتنی وسعت پیدا کر دی ہے کہ میرے نزدیک ناقص اور کامل میں کوئی فرق نہیں رہ گیا یعنی میرے دل میں ہر شخص کے لئے جگہ ہے۔ خواہ وہ ناقص ہو یا کامل، مومن ہو یا کافر، مشرک ہو یا موحد گویا میرا دل ایک آئینہ ہے، جس کا دروازہ ہر شخص کے لئے کھلا ہوا ہے۔ بیدل کہتے ہیں جو آدمی دریائے عشق میں گم ہو جاتا ہے وہ کفر و ایمان کی قید سے آزاد ہو جاتا ہے۔ خانۂ حیرت تماشہ دکھاتا ہے۔ یعنی حیرت، جو کہ بالواسطہ عشق کا نتیجہ ہے اور خدا کے مظاہرِ قدرت میں غور و فکر سے انسان کو نصیب ہوتی ہے، وہ خدا کی کنہ تک پہنچنے سے اسے عاجز رکھتی ہے۔ چنانچہ ایک جگہ کہتا ہے:

عشق غیور از ما چیزی نخواست جز عجز

سازِ گدائی اینجا منظور بادشاہیست

اس لئے خانہ حیرت کا تقاضا ہے کہ تماشا دیکھنے والے مومن و کافر میں فرق نہ کریں۔ چنانچہ دوسری جگہ اس کی وضاحت یوں کرتا ہے:

تمیزِ خوب وزشت از فیض معنی باز می دارد
تماشا مشربی ، آئینہ کن بے انفعالی را

مطلب یہ ہے کہ خوب وزشت اور نیک وبد کی تمیز فیض معانی کے حصول سے باز رکھتی ہے۔تم تو تماشامشرب ہو یعنی تم کو تماشا دیکھنے سے مطلب ہے، بے انفعالی اور بے اثری کو آئینہ بناؤ۔ یہاں غالب کے شعر میں بیدل کے خیال کا عکس پوری طرح موجود ہے۔

گو میں رہا رہینِ ستمہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا
غالب

ہر چند ما اسیر کمند حوادثیم
عنقاست بے نشاں بسراغِ نشان ما
بیدل

غالب کہتے ہیں گو کہ میں انواع واقسام کی پریشانیوں میں گرفتار رہا ہوں، تیری یاد دل سے کبھی نہیں گئی۔ کہا جاتا ہے کہ بندش مضمون کے لحاظ سے یہ بہت بلند پایہ شعر ہے، اس لئے ضرب المثل ہو گیا۔ بیدل کہتے ہیں ہم اگر چہ گردش روزگار کی کمند میں اسیر رہے پر عنقا ہمارے نام ونشان کا پتہ لگانے میں بے نشاں ہو گیا۔ مطلب یہ ہے کہ ایک تو عنقا خود گمنام اور بے نشاں ہے جب وہ ہمارا نام ونشان معلوم کرنے میں بے نشاں ہو تو ہماری بے نشانی کا کیا عالم ہوگا۔ یعنی ہم انجام کار معدوم محض ہیں اس لئے اگر کمند حوادث کے شکار بھی ہوئے تو اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کا مصرعہ ''گو میں رہا رہین ستم ہائے روزگار'' بیدل کے پہلے مصرعہ ''ہر چند ما اسیر کمند حوادثیم'' کا بالکل لفظی ترجمہ ہے۔ البتہ دوسرے مصرعہ میں غالب نے بیدل سے بہتر ایک نکتہ بیان کر کے اپنی انفرادیت ثابت کردی۔

دل سے ہوائے کشتِ وفا مٹ گئی کہ واں
حاصل سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا
غالب

یک شرر رنگِ وفا از ہیچ دل روشن نہ شد
شمع خاموش است ایں غم خانہ ہائے تنگ را
بیدل

غالب کہتے ہیں وفاداری نبھانے کا چونکہ کوئی حاصل نہیں نکلا اس لئے دل سے وفا کاری کی آرزو ہی نکل گئی۔ بیدل کہتے ہیں وفاداری اتنی ہی نازک اور کمیاب چیز ہے کہ ایک

چنگاری کے نمود کے برابر بھی، جو ظاہر ہے لمحہ بھر سے زیادہ نہیں ہوتی ہے، کسی دل سے ظاہر نہیں ہوئی۔ کیونکہ اس تنگ غم خانہ یعنی دل کی، جو غم عشق کی ایک تنگ کوٹھری ہے، کی شمع خاموش ہے۔ ظاہر ہے جب دل کی شمع بجھی ہو تو وفاداری کا رنگ اس میں کہاں سے پایا جائے گا۔ غالب اور بیدل دونوں دل سے وفاداری کے مٹ جانے یا کمیابی کی بات کرتے ہیں۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کے مصرعہ ''دل سے ہوائے کشتِ وفا مٹ گئی کہ واں'' میں بیدل کے مصرعہ ''یک شرر رنگِ وفا از ہیچ دل روشن نہ شد'' کا عکس موجود ہے۔ البتہ دوسرے مصرعہ میں دونوں الگ ہو گئے۔

بیداد عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسد	مپندارید عاشق شکوہ پردازد بہ بیدادش
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا	کہ لب وا کردن امکانیست زخم تیغ الفت را
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں مجھے ان کلفتوں کا تو اندیشہ نہیں ہے جو عشق کے پرخطر راستے میں پیش آیا کرتی ہیں مگر افسوس اس بات کا ہے کہ میرے دل میں ان کے جھیلنے کی سکت نہیں رہ گئی۔ مطلب یہ ہے کہ دل افسردہ ہے۔ بیدل کہتے ہیں یہ نہ سمجھنا کہ عاشق معشوق کے جبر و بیداد کا شکوہ کرے گا۔ کیونکہ جو آدمی تیغ الفت کا زخم خوردہ ہو اس کے لئے لب کشائی ممکن ہی نہیں، شکوہ کرنا تو دور رہا۔ غالب کے نزدیک دل میں چونکہ مصائب عشق کے جھیلنے کی سکت نہیں رہی، اس لئے وہ معشوق کی ستم رانیوں سے ڈرتا ہے۔ بیدل کے نزدیک اگر عاشق، عاشقِ صادق ہے تو وہ بیداد عشق سے ڈرنا تو کجا اس کا شکوہ بھی زبان پر نہیں لاتا ہے۔ دل میں اس کے جھیلنے کی سکت ہو یا نہ ہو اس سے کوئی مطلب نہیں۔ چنانچہ دوسری جگہ کہتا ہے:

محبت پیشہ ای، بگداز و خوں شو
کہ دردِ عشق درمانی ندارد

محبت کو اگر تم نے پیشہ بنایا ہے تو اس کی آگ میں جلو، پگھلو اور خون کے آنسو روؤ، کیونکہ درد عشق کا کوئی علاج نہیں۔ حالانکہ غالب نے دوسری جگہ بیدل کے خیال سے اتفاق کیا ہے:

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنج فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

ذرہ ذرہ ساغرِ میخانۂ نیرنگ ہے	کیست از فیض جنوں مایہ ندارد اینجا
گردشِ مجنوں بہ چشمک ہائے لیلیٰ آشنا	خرد آں بہ کہ بتکلف نگذارد اینجا
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کائنات کا ذرہ ذرہ میخانۂ نیرنگ کا ساغر ہے یعنی معشوق حقیقی کی ایما پر گردش کر رہا ہے جس طرح مجنوں کی ہر حرکت لیلیٰ کے مرضی کے تابع تھی اسی طرح پوری کائنات کا ہر ذرہ محبوب حقیقی کی مشیت اور مرضی کے تابع ہے۔ بیدل کہتے ہیں کائنات میں ایسی کون سی چیز ہے جو فیض جنوں سے بہرہ مند نہ ہو، عقل کے لئے بہتر یہی ہے کہ وہ بہ تکلف یہاں قدم رنجہ نہ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ کائنات کے ذرہ ذرہ میں عشق حقیقی کی کارفرمائی ہے اور اس فیض جنوں سے سبھی مستفید اور اس کے آگے سجدہ ریز ہیں۔ قرآن کہتا ہے دیکھتے نہیں اللہ کو سجدہ کرتی ہے ہر وہ چیز جو آسمانوں اور زمین میں ہے۔ جیسے سورج ، چاند، ستارے، پہاڑ ، درخت ، جانور، بہت سے انسان۔ البتہ انسانوں میں بہت سے ایسے ہیں جو اس کو سجدہ نہیں کرتے۔ (سورہ حج ۱۸) غور سے دیکھا جائے تو غالب کے مصرعہ ''ذرہ ذرہ ساغرِ میخانۂ نیرنگ ہے'' میں بیدل کے مصرعہ ''کیست از فیض جنوں مایہ ندارد اینجا'' کا عکس موجود ہے۔

میں اور ایک آفت کا ٹکڑا وہ دلِ وحشی کہ ہے	دل را نشانِ ناوک آفات کردہ اند
عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا	ہر دم زدن بخانۂ آئینہ ماتم است
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں عشق کی راہ میں اس دل وحشی سے میرا سابقہ ہے جو عافیت کا دشمن اور آوارہ گردی کا دوست ہے۔ ایسی صورت میں مجھ پر جو مصیبت بھی آئے کم ہے۔ بیدل کہتے ہیں دل کو کارکنان قضا وقدر نے بلاؤں کے تیر کا نشانہ بنایا ہے اس لئے ہر سانس میں اور ہر لمحہ خانۂ آئینہ یعنی دل میں ماتم کا سلسلہ جاری ہے۔ غالب نے عشق میں گرفتار دل وحشی کو آفت کا ٹکڑا کہہ کر اسے عافیت کا دشمن قرار دیا۔ جبکہ بیدل کے مطابق دل کی فطری ساخت ہی خالق نے ایسی بنائی ہے کہ وہ چاہے غم عشق میں گرفتار ہو چاہے غمِ روزگار میں چاہے کسی اور غم میں، آفات کا نشانہ

بنا رہے گا، اور اس کی وجہ سے ہر لمحہ ماتم کا سلسلہ جاری رہے گا۔ غالب نے بھی دوسری جگہ اس خیال کا اظہار کیا ہے:

دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں رلائے کیوں

یا کہتا ہے:

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں، پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

ربط یک شیرازہ وحشت ہیں اجزائے بہار
سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ، گل نا آشنا
غالبؔ

زبس عام است در وحشت سرائے دہر بیتابی
دل ہر ذرہ دارد در قفس چندیں طپیدنہا
بیدلؔ

غالب کہتے ہیں موسم بہار کے مختلف اجزا میں باہم کوئی مناسبت نہیں ہے اگر ہے تو وہ وحشت اور آشفتگی کی مناسبت ہے جس میں سب شریک ہیں۔ سبزہ بیگانہ ہے، صبا آوارہ ہے، گل نا آشنا ہے۔ سبزہ کی بیگانگی، صبا کی آوارگی اور گل کی نا آشنائی یہ سب آشفتگی ہی کے کرشمے یا اس کی مختلف شکلیں ہیں۔ غرض کہ ساری دنیا آشفتہ و پریشان ہے۔ بیدل کہتے ہیں اس وحشت سرائے دہر میں بیتابی و بیقراری ایک عام بات ہے۔ ہر ذرے کا دل قفس میں انواع واقسام کی طپش کا حامل ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کے پورے شعر میں بیدل کے مصرعہ ''زبس عام است در وحشت سرائے دہر بیتابی'' کا پورا عکس موجود ہے۔ غالب کے دوسرے مصرعہ میں بیدل کے درج ذیل شعر کا عکس پوری طرح موجود ہے:

سحر آہ و گلستاں نکہت و بلبل فغاں دارد
جہانی سوے بیرنگی ز حسرت کارواں دارد

سحر کے پاس آہ، باغ کے پاس نکہت اور بلبل کے پاس فغاں ہے ایک دنیا حسرت کی بنا پر بے رنگی اور آشفتگی کی طرف رواں دواں قافلہ بنی ہوئی ہے۔

کوہکن نقاش یک تمثال شیریں تھا اسد	گر ہمہ برخاک پیچد عشق حسن آرد بروں
سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا	کوشش فرہاد آخر کرد شیریں سنگ را
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ فرہاد محض ایک نقاش تھا۔ اگر وہ عاشق صادق ہوتا تو اس کی سمجھ میں یہ حقیقت آتی کہ پتھروں سے سر ٹکرانے سے محبوب نہیں ملا کرتے ہیں، اس کے لئے جذب کامل درکار ہے۔ اگر وہ عاشق صادق ہوتا تو اپنے مقصد میں ضرور کامراں ہوتا۔ بیدل کہتے ہیں اگر عاشق سراسر خاک پر پیچ وتاب کھائے تو معشوق اسے اس سے باہر نکال لائے گا۔ فرہاد کی کوشش نے آخر کار پتھر کو شیریں بنادیا۔ یعنی پتھر توڑنا اور اسے توڑ کر نہر بنانا کوئی آسان کام نہ تھا لیکن شیریں کے عشق نے اس ناممکن کام کو ممکن بنادیا اور ایک تلخ کام کو شیریں کام میں بدل دیا۔ دوسرے مصرعہ میں لفظ شیریں نام نہیں ہے بلکہ انتہائی تلخ اور مشکل کام کو شیریں اور آسان کام بنانے کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ جیسے بیدل کا یہ شعر ہے:

بر امید وصل ، مشکل نیست قطع زندگی
شوق منزل می کند نزدیک راہ دور را

شیریں کے عشق میں پہاڑ توڑ کر نہر بنانے کے واقعہ کا تذکرہ غالب اور بیدل دونوں نے کیا ہے لیکن نتیجہ دونوں نے الگ الگ نکالا۔ غالب کے نزدیک فرہاد عاشق صادق نہیں تھا اس لئے اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ بیدل کے نزدیک شیریں کے عشق نے فرہاد کے لئے ایک محال کام کو ممکن اور تلخ کام کو شیریں بنادیا جو جذبہ کامل کے بغیر ممکن نہ تھا۔ یہاں بیدل کا بیان کہ شوق منزل دور دراز راستے کو نزدیک کردیتا ہے، حقیقت سے زیادہ قریب معلوم ہوتا ہے۔

منظر ایک بلندی پر اور ہم بنا سکتے	"ما ومن" بے نسبت است آنجا کہ اوست
عرش سے ادھر ہوتا کاش کہ مکاں اپنا	با کتاں ربطی ندارد ماہتاب
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کا مطلب یہ ہے کہ ابھی تک ہماری رسائی عرش تک ہے، یعنی خدا کے بارے میں ہماری قوت خیال کی پرواز اب تک یہ ہے کہ وہ عرش پر جلوہ افروز ہے۔ کاش ایسا ہوتا کہ ہمارا تصور ذات باری کے بارے میں عرش کے حدود سے بالاتر فضا میں پرواز کرسکتا تا کہ ہمارا نقطہ نظر اس کے متعلق زیادہ صحیح ہوتا۔ اس کو عرش پر متمکن سمجھ لینا تو ہمارے فہم کی کوتاہی ہے۔ بیدل کہتے ہیں جہاں وہ یعنی باری تعالیٰ تشریف فرما ہے وہاں ''ہم'' اور ''میں'' کی نسبت نہیں کی جاسکتی۔ ''ماومن'' کی پرواز کی خدائے تعالیٰ کے مستقر سے کوئی نسبت نہیں ہے۔ چاند کو کتان سے کوئی ربط نہیں ہوتا ہے۔ کتان اس ریشمی کپڑے کو کہتے ہیں جس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ چاندنی رات میں ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب نے بیدل کے برعکس خیال کا اظہار کیا ہے۔ بیدل کہتے ہیں خدا جہاں تشریف فرما ہے وہ ''ماومن'' کی پہنچ سے پرے ہے۔ یعنی ہم چاہے جتنی اونچی چوٹی پر بلندی کے پہنچ جائیں یا جس قدر اونچی اڑان بھریں اس تک رسائی حاصل نہیں کرسکتے۔ رہا عرش پر اس کے استقرار کا مسئلہ جس کا ذکر قرآن پاک میں ہے اس کی کیفیت کو ہم زمین پر اپنے استقرار کے ساتھ قیاس نہیں کرسکتے۔ کیونکہ اس کا ارشاد ہے جدھر رخ کرو ادھر اللہ ہے۔ حتیٰ کہ تمہارے شہ رگ سے بھی زیادہ قریب اللہ ہے۔ اس کے علاوہ خدا کے لئے استقرار یا ہاتھ، کان وغیرہ کے الفاظ کا استعمال اس کی شانِ رفیع کے مطابق ہے۔ اس لئے یہ تمنا کرنا کہ عرش سے پرے اگر اپنا مکان ہوتا تو ہمارا تصور عرش کے حدود سے بالاتر فضا میں پرواز کرتا ایک بالکل بے معنی سی بات ہے۔

از سجدہ حضوری بوئے اثر نبردیم	گھستے گھستے مٹ جاتا آپ نے عبث بدلا
امید دستہا سود از جبہ سائیِ ما	ننگ سجدہ سے میرے سنگ آستاں اپنا
بیدلؔ	غالبؔ

غالب کہتے ہیں میں نے محبوب کے سنگ آستاں پر سجدہ کیا، اس نے سمجھا کہ پتھر ناپاک ہوگیا اس لئے اسے بدل ڈالا۔ اس لئے اس سے کہتے ہیں آپ نے ناحق یہ زحمت گوارا فرمائی، اگر چند روز اور توقف فرمالیتے تو پتھر تبدیل کرنے کی نوبت ہی نہ آتی۔ میں خود سجدہ

کر کر کے اسے مٹا دیتا۔ بیدل کہتے ہیں کہ محبوب کے آستانے پر ذوق جبہ سائی کی وجہ سے بے انتہا سجدے کئے پر ان سجدوں میں حضور قلب حاصل نہ تھا۔ صرف سر اس کے آستانے پر ٹکا تھا دل کی توجہ کہیں اور تھی اس لئے اس کا اثر ظاہر نہیں ہوا۔ جبہ سائی سے جو مقصد تھا کہ محبوب کا دل ہماری طرف مائل ہو حاصل نہ ہوا اور امید کو کفِ افسوس ملنے کے سوا کچھ نہ ملا۔ یہاں ''ذوق جبہہ سائی عاشق'' کو غالب اور بیدل دونوں نے موضوع بنایا اس فرق کے ساتھ کہ غالب کے نزدیک تنگ سجدہ کی وجہ سے معشوق نے پتھر بدل دیا، جبکہ وہ گھستے گھستے مٹ سکتا تھا۔ بیدل کے نزدیک سجدۂ بے حضوری کی وجہ سے معشوق کے دل پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس لئے امید کو کف افسوس ملنا پڑا۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کے شعر میں بیدل کے اس خیال کا خفیف سا عکس موجود ہے۔ یہ شعر حقیقت اور مجاز دونوں کے طرف جا سکتا ہے۔

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے	عرض جوہر ندہی ، بے حسدی نیست فلک
بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا	ورنہ چوں آئینہ دستت بہ ہنر می بندد
غالبؔ	بیدلؔ

عام خیال یہ ہے کہ آسمان اہل علم و دانش کا دشمن ہوتا ہے اس پس منظر میں غالب نے یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ ہم نہ تو دانا تھے اور نہ کسی علم و فن میں یکتا تھے پھر کیا وجہ ہے کہ آسمان ہمارا دشمن ہو گیا۔ حالی کہتے ہیں آسمان کی دشمنی کے کیا خوب اسباب بتائے ہیں اور اپنی دانائی اور ہنر مندی کس خوبصورتی سے ثابت کی ہے (۱۰۷)۔ بیدل کہتے ہیں اپنے جوہر اور ہنر کی نمائش نہ کرنا آسمان حسد اور جلن سے خالی نہیں ہے ورنہ آئینہ کی طرح تیرے ہاتھ کو وہ ہنر سے باندھ دے گا۔ ''فنکاروں سے آسمان کی عداوت'' کو غالب اور بیدل دونوں نے موضوع بنایا ہے۔ بیدل نے نہایت سادگی سے بیان کر دیا کہ آسمان کو اہل علم و دانش سے چونکہ حسد ہے اس لئے اس کی نمائش سے پرہیز کرنا۔ جبکہ غالب نے نہایت خوبصورتی سے آسمان کی دشمنی کے سبب پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ضمنی طور پر اپنی دانائی کو ثابت کیا۔ بیدل اس موضوع کو دوسرے شعر میں یوں بیان کرتے ہیں کہ ابنائے زمانہ میں فضل و ہنر کا دعویٰ چونکہ ذلت و خواری کا سبب ہے اس لئے اگر اپنی عزت اور آبرو بچانی مقصود

ہو تو تھوڑی دیر کے لئے اپنے کو نادان ہی ظاہر کرو۔

دعویِ فضل و ہنر خواریست در ابنائے دہر
آبرو می خواہی اندکی ناداں برآ

سرمہ مفت نظر ہوں، مری قیمت یہ ہے
کہ رہے چشم خریدار پہ احساں میرا
غالبؔ

بہ کلام بیدل اگر رسی مگذر ز جادہ منصفی
کہ نمی طلبد ز تو صلہ دگر مگر آفریں
بیدلؔ

غالب کہتے ہیں جس طرح لذت نظر مفت ہے کسی کو اس کی قیمت ادا کرنی نہیں پڑتی اسی طرح میرے کلام سے لطف اندوزی بھی مفت ہے۔اس کی اگر کچھ قیمت ہے تو بس اتنی کہ قاری میرے کمال کا اعتراف کرے اور داد دے۔ بیدل کہتے ہیں میرے کلام کی تہہ تک اگر تمہاری رسائی ہو جائے تو انصاف کے ڈگر سے پیچھے نہ ہٹنا۔ کیونکہ وہ تمہاری داد و تحسین کے سوا کسی اور صلہ کا خواہاں نہیں ہے۔ شاعر کی حوصلہ افزائی اور اس کی قدردانی تو اصل میں اس کے کلام پر قارئین اور سامعین کی داد و تحسین سے ہی ہے۔اس موضوع کو غالب اور بیدل دونوں نے بیان کیا ہے۔ لیکن غالب نے نکتہ آفرینی سے کام لیتے ہوئے کہا کہ جس طرح سرمہ سے لذت نظر مفت حاصل ہوتی ہے اسی طرح میرے کلام سے لطف اندوزی بھی مفت ہے۔اس کی قیمت صرف اس کی داد و تحسین ہے۔ بیدل چونکہ دقیق، باریک اور نازک مضامین کے بیان پر اصرار کرتے تھے: ع

مارا ز فکرِ معنیِ باریک چارہ نیست

جس کی تہہ تک رسائی کے لئے ذہن کو خاصی ریاضت کرنی پڑتی ہے: ع

بے سعی تامل نتوان یافت صدایم

اس لئے کہا کہ اگر وہاں تک تمہاری رسائی ہو جائے تو اس کی داد دئے بغیر نہ رہنا۔

رخصت نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم
تیرے چہرے سے ہو ظاہر غم پنہاں میرا
غالبؔ

بیدل چو نے ز نالہ نداریم چارہ ای
تا راہ جنبشی ز نفس در گلوئے ماست
بیدلؔ

غالب کا مطلب یہ ہے کہ اے ظالم محبوب مجھے نالہ کی اجازت دے اس لئے کہ اجازت اگر نہ ہوگی تو ہم کو ضبط سے کام لینا پڑے گا جس کے نتیجہ میں میرا غم پنہاں تیرے چہرے سے نمایاں ہوگا، اور تیری پریشانی مجھے گوارا نہیں۔ بیدل کہتے ہیں جب تک میری سانس چل رہی ہے محبوب کے ظلم و بیدادگری کی وجہ سے اس کے سوا کوئی چارہ میرے پاس نہیں ہے کہ آہ و نالہ کروں جس طرح بانسری آہ و نالہ کرنے پر مجبور ہے۔ ''محبوب کے ظلم پر نالہ وشیون'' کو غالب اور بیدل دونوں نے موضوع بنایا ہے اس فرق کے ساتھ کہ غالب کے نزدیک عاشق، معشوق کے ظلم پر آہ و نالہ کرنے کی اجازت مانگتا ہے نہیں تو اس کے ضبط کا اثر محبوب کے چہرے پر نمایاں ہوگا جو اسے منظور نہیں، جبکہ بیدل کے نزدیک عاشق کے پاس آہ و نالہ کرنے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں ہے اجازت مانگنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اور یہ بات زیادہ قرین قیاس ہے۔

حسن حقیقت روبرو، سعی فضول آئینہ جو — غافل بہ وہم ناز خود آرا ہے، ورنہ یاں

بیدل چہ پردازد بگو اے یافتن ناجستنت — بے شانۂ صبا نہیں طرہ گیاہ کا

بیدلؔ — غالبؔ

غالب کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی ہر چیز فطری طور پر حسین وجمیل ہے۔ اپنی کوتاہ فہمی سے انسان کائنات کی ہر چیز کو اپنے خیال کے مطابق بناتا سنوارتا ہے، تاکہ اپنے کمال فن پر ناز کرے اور اپنے ہم پیشوں سے فخر کے طور پر کہے دیکھو فلاں چیز کو ہم نے کیسا حسین روپ دے دیا ہے۔ بیدل کہتے ہیں کہ یہ دنیا حسن تخلیق الٰہی کی جلوہ گاہ ہے۔ قرآن کہتا ہے، جو چیز اس نے بنائی کیا خوب بنائی۔ (سورۂ حم) اور خدا خود کو ''احسن الخالقین'' کا لقب دیتا ہے اب جب دنیا کی ہر چیز فطری طور پر خوبصورت ہے تو کوئی فنکار اپنے موئے قلم کی کوششوں سے اس کو اور حسین کیا بنائے گا۔ اس کو بیدل ''سعی فضول آئینہ جو'' سے تعبیر کرتا ہے پھر کہتا ہے اے بیدل خدا کی کنہ تک نہ پہنچنا ہی پہنچنا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا مقولہ ہے العجز عن الادراک ادراک۔ اس کی کنہ تک رسائی سے عاجز رہنا ہی رسائی ہے۔ تو اب کوئی کوشش کر کے کون سا تیر مارے گا۔ اسی طرح اس کی حسین وجمیل مخلوقات کو کوئی فنکار یا مجسمہ ساز اور کیا حسین بنا سکے گا۔ غالب اور بیدل دونوں

نے ''حسن فطرت یا حقیقت'' کو موضوع بنایا ہے۔ غور سے دیکھئے تو غالب کے پورے شعر میں بیدل کے مصرعہ ''حسن حقیقت روبرو، سعی فضول آئینہ جو'' کی صدائے بازگشت سنائی دے گی۔

بزم قدح سے عیش تمنا نہ رکھ کہ رنگ	سراغ عیش ازیں محفل مجو، کز جوش دل تنگی
صید زدام جستہ ہے اس دام گاہ کا	صدائے گریہ پیچیدہ است برخندیدن مینا
غالب	بیدل

غالب کا مطلب ہے کہ دنیا کی بزم عیش سے کسی خوشی کی امید نہ رکھو، کیونکہ یہاں کے عیش کا حال اس شکار کی طرح ہے جو شکاری کے جال سے نکل بھاگا ہو، مطلب یہ ہے کہ دنیا کا عیش وآرام سدا کسی کے پاس نہیں رہا ہے بلکہ بدلتا رہا ہے۔ بیدل کہتے ہیں اس محفل دنیا سے عیش وعشرت کی جستجو مت رہو، کیونکہ جام مے کے قہقہے پر اس کی دل تنگی کی وجہ سے صدائے گریہ بھی لپٹی ہوئی ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کا پہلا مصرعہ ''بزم قدح سے عیش تمنا نہ رکھ کہ رنگ'' میں بیدل کے مصرعہ ''سراغ عیش ازیں محفل مجو کز جوش دل تنگی'' کی چھاپ موجود ہے۔ لیکن مثال دونوں نے الگ الگ دی ہے۔ غالب کے نزدیک دنیا کا عیش وآرام شکاری کے جال سے بھاگے ہوئے شکار کی طرح ناپائیدار ہے۔ جبکہ بیدل کے نزدیک جام کی مسکراہٹ میں صدائے گریہ بھی پیچیدہ ہے یعنی خوشی کے ساتھ غم کا سلسلہ لگا ہوا ہے۔

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے	بہ کہ بہ پیش کریم ناز کنی وقت جرم
شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا	ورنہ ز کم ہمتی است عذر گنہ خواستن
غالب	بیدل

غالب کہتے ہیں میں جو گناہ پر عذر نہیں کرتا ہوں اس کی وجہ یہ نہ سمجھنا کہ میں اپنے گناہوں کا اقرار نہیں کرتا ہوں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ میں اپنے گناہوں پر اس قدر نادم وشرمندہ ہوں کہ معذرت کرتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ کوئی تعجب نہیں کہ میرا احساس پشیمانی بارگاہ الٰہی میں مجھے رحمت کا مستحق بنادے۔ لیکن غالب نے ایک اور شعر میں اس موضوع کا تذکرہ اس طرح کیا ہے:

کس پردے میں ہے آئینہ پرداز اے خدا
رحمت کہ عذر خواہ لب بے سوال ہے

مطلب یہ ہے کہ اے خدا تو کس پردے میں آئینہ پرداز ہے مجھ پر رحمت فرما کہ میرا بے سوال لب عذر خواہ ہے۔ بیدل کہتے ہیں بہتر ہے کہ مولائے کریم کے سامنے گناہ کرتے وقت تم اس کی رحمت پر ناز کرو ورنہ یہ بات کم ہمتی کی ہوگی کہ گناہ کر کے عذر گناہ کیا جائے۔ کہتے ہیں عذر گناہ بدتر از گناہ ہے مگر غالب مارے ندامت کے عذر نہیں کرنا چاہتے اور بیدل بلند ہمتی کی وجہ سے عذر نہیں کرنا چاہتے ہیں۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کے شعر پر بیدل کے اس پورے شعر کی چھاپ موجود ہے۔ بیدل نے اس مضمون کے کچھ اور اشعار بھی کہے ہیں۔ مثلاً:

بر امید ابر رحمت دامنی آلودہ ام
می کند آب از حیا بے برگی عصیاں مرا

ابر رحمت کے نزول کی آس لگا کر میں نے اپنے دامن کو گناہوں سے آلودہ کیا ہے۔ گناہوں کی بے سروسامانی مجھے شرم سے پانی پانی کئے دے رہی ہے۔ بیدل نے رحمت الٰہی کے بھروسے گناہ کیا پر چونکہ وہ گناہ بے سروساماں تھا اس لئے شرم نے اس کو پانی پانی کر دیا۔ شاید اس کا مقصد یہ تھا کہ کوئی بڑا گناہ کیا ہوتا جو سروساماں رکھتا پھر خدا کی رحمت بھی اسی قدر اس پر مرتب ہوتی ،درحقیقت بیدل رحمت الٰہی کا اس قدر امیدوار ہے کہ گناہ پر ندامت پر بھی اسے ندامت لاحق ہے۔ چنانچہ کہتا ہے:

خیر و شریکہ دارید بر فضل وا گذارید
ہر چند امید عفو است در کیش ما گناہ است

جو بھلا برا عمل تمہارے پاس ہے اس کو خدا کے فضل کے حوالے کرو، اگرچہ عفو کی امید ہے مگر میرے مذہب میں یہ بھی گناہ ہے۔ اسی کے قریب غالب کا ایک فارسی شعر ہے:

دستگاہِ گل فشانیہائے رحمت دیدہ ام
خندہ بر بے برگی توفیق طاعت می کنم

بیدل کا یہ خیال قرآن وحدیث سے متصادم ہے قرآن کہتا ہے، شیطان تم کو خدائے کریم کی کریمی سے دھوکے میں نہ رکھے مطلب یہ ہے کہ خدا کی کریمی کے بھروسے گناہ پر جرات نہ کرو۔ گناہ

ہو جائے تو اور بات ہے وہ اپنی کریمی سے معاف کرے گا۔ بشرطیکہ توبہ کرو۔ قرآن کہتا ہے، الا من تاب الخ۔ بیدل کے اسی خیال کے قریب قریب غالب کا خیال ہے کہ اپنے گناہوں پر اس قدر نادم ہوں کہ معذرت کرتے ہوئے بھی شرم آتی ہے اور یہی شرم رحمت کا مستحق بنا دے گی۔ یہ خیال صحیح نہیں ہے چونکہ قرآن میں الا من تاب کے قید سے معلوم ہوتا ہے کہ گناہ پر ندامت کافی نہیں ہے بلکہ آئندہ نہ کرنے کا دل میں عزم بھی ہونا چاہئے اور دنیا میں جو سزا اس کی مقرر ہے اس کو بھگتنا بھی ہوگا...... یہ ہے توبہ کی حقیقت۔ اسی توبہ پر رحمت الٰہی مرتب ہے۔ عہد نبوی میں ایک زانیہ عورت کا حضور کی خدمت میں آکر توبہ کرنے کا قصہ حدیثوں میں مشہور ہے وہ سمجھتی تھی کہ صرف ندامت اور زبان سے استغفار کرنے سے گناہ کا یہ داغ نہیں دھلے گا۔ اس کی سزا سنگساری ہے۔ اس لئے اس نے حضورؐ سے عرض کیا کہ مجھے سنگسار کیا جائے کہ دنیا کا عذاب آسان ہے آخرت کا عذاب نا قابل برداشت ہے چنانچہ اس کو سنگسار کیا گیا، اور حضورؐ نے اس کے جنازے کی نماز پڑھائی۔

مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے	منِ بیدل نہ بودم ایں قدر پروانۂ جرأت
پُر گل خیال زخم سے دامن نگاہ کا	دمِ تیغ تو دیدم ذوق کشتن کرد سیمابم
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں چونکہ زخموں کے خیال سے میرا دامن نگاہ پھولوں سے بھرا ہوا ہے اس لئے میں قتل گاہ کی طرف انتہائی شاداں و فرحاں چلا جا رہا ہوں۔ (زخم اور پھول دونوں بظاہر کشادہ، شگفتہ اور کھلے ہوتے ہیں اس لئے اس کو پھول سے تشبیہ دیتے ہیں) بیدل کہتے ہیں میرے اندر اتنی جرأت تو نہ تھی کہ معشوق سے کہتا کہ مجھے قتل کرو مگر اس کی تلوار آبدار کے دم خوشگوار کو دیکھا تو اس کے ہاتھوں قتل ہونے کی خواہش نے مجھے سیماب کی طرح بے قرار کر دیا۔ ''معشوق کے ہاتھوں قتل کی غیر معمولی خواہش'' غالب اور بیدل دونوں کا موضوع ہے مگر جو نزاکت بیدل کے کلام میں ہے وہ غالب کے کلام میں نہیں ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کے شعر ''مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے'' کو بیدل کے مصرعہ ''دمِ تیغ تو دیدم ذوق کشتن کرد سیمابم'' کے ساتھ ملا کر پڑھئے تو بیدل کے کلام کی چھاپ غالب کے کلام پر نہایت واضح نظر آئے گی۔

جاں در ہوائے یک نگہ گرم ہے اسد — پروانہ ہے وکیل ترے داد خواہ کا

غالب

کشتۂ تیغ نگاہ لالہ رویانیم ما — شمع داغے برسر لوح مزار ما زنید

بیدلؔ

غالب کہتے ہیں اے محبوب پروانے کی جس طرح یہ آرزو ہے کہ وہ شمع کی نگاہ گرم سے ہلاک ہو جائے اسی طرح میری تمنا ہے کہ تیری نگاہ برق آسا پر اپنی جان نچھاور کردوں۔ بیدل کہتے ہیں کہ چونکہ ہم لالہ رخ معشوقوں کی تیغ نگاہ سے گھائل ہو کر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں اس لئے ہماری قبر پر جو لوح لگائی جائے اس پر داغی شمع روشن کیا جائے۔ داغی شمع سے مراد وہ شمع ہے جس کو پروانے کے راکھ کردینے کا صدمہ ہو۔ غالب اور بیدل دونوں نے معشوق کی نگاہ سے ہلاک ہونے کو موضوع بنایا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ غالب کے نزدیک اس کی نگاہ گرم سے عاشق کو ہلاک ہونے کی تمنا ہے۔ جبکہ بیدل کے نزدیک اس کی تیغ نگاہ سے عاشق ہلاک ہو چکا ہے۔ اس لئے اس کی لوح مزار پر داغی شمع روشن کی جائے۔

رات دن گردش میں ہے سات آسماں — ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

غالب

عبث بہ فکر قماش ثبات جامہ مدر — بہ عالمی کہ توئی انقلاب می بافند

بیدلؔ

غالب کا خیال ہے کہ ساتوں آسمان کی شب و روز کی گردش یہ بتاتی ہے کہ کچھ نہ کچھ انقلاب زمانے میں برپا ہو کر رہے گا۔ اس لئے ان متوقع حوادث روزگار پر اضطراب اور بے چینی کا اظہار کیا کریں۔ بیدل کہتے ہیں غیر فانی اور لازوال زندگی کی فکر میں بلاوجہ اپنے کپڑے چاک مت کر، جس دنیا میں تو زندگی بسر کررہا ہے وہاں کے حالات میں سدا انقلاب آتا رہتا ہے۔ یہاں غالب اور بیدل دونوں نے آسمان کی گردش سے زمانے میں انقلاب برپا ہونے کا تذکرہ کیا ہے۔ نتیجہ گیری میں بھی قریب قریب برابر ہیں۔ غالب کے نزدیک گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے، بیدل کے نزدیک غیر فانی زندگی کے خیال میں جامہ دری کی ضرورت نہیں ہے۔ اسی مفہوم کا بیدل کا ایک دوسرا شعر ہے:

تا فلک در گردش است آفت بہر سو ہالہ است
از مزاج آسیا چندیں شرر جوالہ است

آسمان کی گردش کا سلسلہ جب تک جاری ہے ہر طرف آہ و نالہ اور گریہ وشیون کا سلسلہ بھی جاری رہے گا۔ چکی کے مزاج سے کچھ نہ کچھ چنگاریاں نکلتی ہی رہیں گی۔ غور سے دیکھا جائے غالب کے شعر میں بیدل کے ان دونوں شعروں کا عکس موجود ہے۔

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی	بستہ اند از شوخی اضداد نقشِ کائنات
چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا	کردہ اند اجزائے ایں پیکر بیکدیگر طرف
غالب	بیدل

غالب نے اس شعر میں ایک عام کلیہ بیان کیا ہے جو اس دنیا کی ہر چیز پر چسپاں ہوسکتا ہے مثلاً بوئے گل ایک لطیف شے ہے اس لئے اوراق گل کے واسطے سے وہ اپنا جلوہ دکھاتی ہے ۔روح جسم انسانی کے واسطہ سے کارفرما ہے۔ اسی طرح مطلق بھی مقید کے لباس میں ظاہر ہوتا ہے۔ غرض کہ اضداد کا تعارف اضداد سے ہوتا ہے۔ بیدل کہتے ہیں کائنات کے نقوش شوخی اضداد سے وابستہ ہیں، خالق کائنات نے اس پیکر کے اجزاء کو ایک دوسرے کا مدمقابل بنایا ہے۔ بیدل اور غالب دونوں نے اضداد نقوش کائنات کو موضوع بنایا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کے پورے شعر میں بیدل کے پورے شعر کی جھلک موجود ہے۔

حریف جوشش دریا نہیں خودداریِ ساحل	موجِ دریا را بساحل ہم نشینی مشکلست
جہاں ساقی ہو تو باطل ہے دعوٰی پارسائی کا	بیقراراں نذر منزل کردہ اند آرام را
غالب	بیدل

حالی مرحوم لکھتے ہیں ساحل لاکھ اپنے تئیں بچائے مگر جب دریا طغیانی پر آتا ہے تو ساحل محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح جہاں تو ساقی ہو وہاں ہوشیاری کا دعوٰی چل نہیں سکتا۔ یہ شعر حقیقت اور مجاز دونوں پر محمول ہوسکتا ہے (۱۰۸)۔ بیدل کہتے ہیں موج دریا کی ساحل کے

ساتھ ہم نشینی مشکل ہے۔اسی طرح ہم عاشق بیقرار ہیں اور ہم نے اپنے آرام اور سکون کو منزل کی نذر کر دیا ہے۔دریا کی موج میں اضطراب ہوتا ہے جبکہ ساحل اپنی جگہ سکون سے کھڑا ہے۔اس لئے دونوں اپنی جداگانہ خصوصیت کی وجہ سے ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔موج و ساحل کا ذکر غالب اور بیدل دونوں نے کیا ہے۔بیدل نے ساحل کی پر سکونی اور موج کی بے تابی کو موضوع بنایا ہے جبکہ غالب نے ساحل کی خودداری اور موج کی طغیانی کا ذکر کیا ہے۔ساحل کی پر سکونی کے مقابلے پر موج کی بیتابی کو رکھ کر بیدل نے ایک دوسرے کی ضد قرار دیا ہے۔مگر غالب نے ساحل کی خودداری کے مقابلے پر موج کی بیتابی کو قرار دیا ہے اور اس کا حریف بتایا ہے۔بیدل کے کلام کی روشنی میں ساحل کی خصوصیت انگڑائی، لب تشنگی، سکون اور آرام ہے۔جبکہ غالب کے کلام کی روشنی میں خودداری ہے۔چنانچہ بیدل دوسرے اشعار میں کہتا ہے:

چوں لب ساحل، نصیب ما ہماں خمیازہ است
گر ہمہ درکام ما ریزند یک دریا شراب

بیدل از گردوں نصیب من ہماں لب تشنگیست
گر ہمہ مانند ساحل ساغر از دریا کنم

اگر ساحل کی طرح سارے دریا کو ہم ساغر بنادیں تو بھی فلک کے ہاتھوں ہماری قسمت میں تشنگی ہی لکھی ہے۔

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا
غالب

زمحو عشق غیر از عشق نتواں یافت آثاری
بدریا قطرہ چو گردید گم مشکل شود پیدا
بیدل

حالی مرحوم لکھتے ہیں جب درد حد سے گذر جائے گا تو مر جائیں گے یعنی فنا ہو جائیں گے۔گویا قطرہ دریا میں کھپ جائے گا اور یہی اس کا مقصود ہے۔پس درد کا حد سے گذر جانا یہی اس کا دوا ہو جانا ہے(۱۰۹)۔بیدل کہتے ہیں عشق میں جو آدمی محو اور فنا ہو گیا اس کے اندر عشق کے سوا

کسی اور چیز کا اثر نہیں پایا جا سکتا۔ قطرہ جب دریا میں گم ہو گیا تو اس کی اپنی شخصیت مشکل سے نمایاں ہو گی۔ غالب اور بیدل دونوں نے ''درد عشق کے دوا میں بدلنے'' کا ذکر کیا ہے غالب کے نزدیک درد کا حد سے آگے بڑھ جانا دوا ہو جانا ہے۔ جبکہ بیدل کے نزدیک فنا فی المعشوق ہونا ہی درد عشق کی دوا ہے۔ چنانچہ دوسری جگہ اس کی وضاحت اس طرح کرتا ہے:

دل اگر محو مدعا گردد
درد در کام ما دوا گردد

دل اگر مقصد میں محو ہو جائے تو درد ہمارے حلق میں دوا بن جائے۔ غالب کے کلام میں بیدل کے ان دونوں اشعار کی پرچھائیں موجود ہے۔

دل ہوا کشمکشِ چارۂ زحمت میں تمام	کشاد عقدہ دل بی گداز خود بود مشکل
مٹ گیا گھسنے میں اس عقدہ کا وا ہونا	کہ نکشاید بجز سودن گرہ ازکار گوہر ہا
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کا مطلب یہ ہے کہ زحمت دل کا علاج کرنے میں مجھے اس قدر کشمکش سے سابقہ پڑا کہ خود دل کا کام تمام ہو گیا یعنی ختم ہو گیا۔ گویا دل کیا تھا ایک گرہ تھی جو کھولنے کی کوشش میں گھس کر ختم ہو گئی۔ بیدل کہتے ہیں دل کی گرہ کا کھلنا پگھلے بغیر مشکل ہے۔ کیونکہ موتیوں میں اگر گرہ پڑ گئی تو گھسے بغیر نہیں کھلتی ہے۔ بیدل کا مطلب یہ ہے کہ دل پر اگر ایسی گرہ پڑ گئی ہے کہ وہ متاثر نہیں ہوتا تو اسے عشق کی آگ میں تپانا اور پگھلانا پڑے گا۔ جس طرح موتی میں گرہ پڑ جائے تو اسے گھس کر کھولا جاتا ہے۔ غالب اور بیدل دونوں کے یہاں ''دل کی گرہ کا کھولنا'' موضوع ہے لیکن کھلنے کے مفہوم، اس کے طریقے اور اس سے حاصل ہونے والے نتیجے میں دونوں نے اختلاف کیا ہے۔

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ	دردلش میل جفا نقشی است بر لوحِ نگیں
اس قدر دشمن اربابِ وفا ہو جانا	درلبش حرف وفا بیرون طبع غنچہ بوست
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کا مطلب یہ ہے کہ محبوب ارباب وفا کا یعنی جو اس کے عشق میں وفاداری کا دم بھرتے ہیں ان کا اسی قدر دشمن ہے کہ کرم تو خیر کیا کرتا جفا سے بھی ان کو محروم کر رکھا ہے۔ کیونکہ یہ بھی تعلق کی ایک نوعیت کو واضح کرتا ہے۔ بیدل کہتے ہیں محبوب کے دل میں جفا کی طرف میلان تو ایسا ہی ہے جیسے لوح نگیں پر کوئی چیز نقش ہو جو مٹائے نہیں مٹتی یعنی پائیدار ہے اور اس کے ہونٹوں پر وفا کا لفظ ایسا ہی ہے جیسے کلی کی طبیعت میں خوشبو، جو اس کے مرجھانے کے بعد ختم ہو جاتی ہے یعنی ناپائیدار ہے۔ غالب کے نزدیک محبوب کی ارباب وفا سے دشمنی کی انتہا یہ ہے کہ اس نے ان کو اپنی جفا سے بھی محروم کر دیا۔ جبکہ بیدل کے نزدیک جفا تو نقش نگیں کی طرح اس کے دل میں پیوست ہے اس لئے ارباب وفا کو اس سے محروم نہیں کر سکتا۔ گویا بیدل کے خیال کے برعکس غالب کا خیال ہے۔

ضعف سے گریہ مبدل بہ دم سرد ہوا	آہم ز نارسائی شد اشک و با عرق ساخت
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا	پستیست گر خجالت شبنم کند ہوا را
غالبؔ	بیدلؔ

غالب نے اس شعر میں استحالہ عناصر کو شاعرانہ رنگ میں ثابت کیا ہے۔ کہتے ہیں جب تک ہمارے اندر توانائی تھی رات دن روتے رہتے تھے مگر جب ضعف لاحق ہوا تو آنسو بہانے کے بجائے ٹھنڈی سانس بھرنے لگے۔ اب ہمیں اس بات پر یقین ہو گیا کہ واقعی پانی (گریہ) ہوا (دم سرد) میں بدل جاتا ہے۔ یعنی ایک عنصر کا دوسرے عنصر میں منتقل ہونا جیسے پانی کا ہوا میں بدلنا ثابت ہوا۔ بیدل کہتے ہیں نارسائی کی وجہ سے میری آہ آنسو میں بدل گئی اور پسینے سے ہم آہنگ ہوگئی۔ بڑی گری ہوئی بات ہوگی اگر ندامت و شرمندگی ہوا کو شبنم کر دے یا پشیمانی ہوا کو شبنم میں بدل دے۔ ''عناصر کے ایک دوسرے میں بدلنے'' کے موضوع پر غالب اور بیدل دونوں متفق ہیں اس فرق کے ساتھ کہ غالب کے نزدیک ناتوانی کی وجہ سے آنسو آہ میں بدل گئے جبکہ بیدل کے نزدیک نارسائی کی وجہ سے آہ آنسو میں بدل گئی ہے۔ نتیجے کے لحاظ سے دونوں ایک ہیں۔ یہاں بیدل کا اثر واضح ہے۔

دل سے مٹنا تری انگشت حنائی کا خیال	صف رنگ لالہ بہم شکن مئے جام گل بزمین فگن
ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا	بہار دامن ناز زن ز حنائے دست نگار ما
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کا خیال ہے کہ جس طرح ناخن گوشت سے جدا نہیں ہوسکتا یا اس کا جدا ہونا انتہائی تکلیف دہ ہے، اسی طرح میرے دل سے تیری انگشت حنائی کی یاد نہیں جاسکتی۔ یا اس کا جانا نہایت اذیت ناک ہے۔ بیدل کہتے ہیں ہمارے معشوق کے حنائی ہاتھ کی کشش کے سامنے لالہ پھول کی صف کی صف درہم برہم کردو، جام گل کی شراب زمین پر انڈیل دو اور موسم بہار کو دامن ناز سے جھٹک دو۔ حنائی انگلیوں یا ہاتھ کی کشش کو غالب اور بیدل دونوں نے موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک محبوب کی انگشت حنائی کی کشش کا خیال عاشق کے دل میں اس طرح بس گیا ہے کہ اس کے جدا ہونے میں اس سے ایسی ہی تکلیف ہوتی ہے جس طرح گوشت سے ناخن کے جدا ہونے میں ہوتی ہے۔ بیدل کے نزدیک محبوب کے حنائی ہاتھ کے سامنے لالہ، گل اور موسم بہار کی ساری دلفریبیاں و دلآویزیاں ماند پڑ گئی ہیں۔

ہے مجھے ابر بہاری کا برس کر کھلنا	دل را غم وداع تو در خون نشاندہ بود
روتے روتے غم فرقت میں فنا ہو جانا	حالی خوشی نداشت کہ گویم چہ حال بود
غالبؔ	بیدلؔ

حالی مرحوم نے اس کا مطلب لکھا ہے غم فرقت میں روتے روتے فنا ہو جانا میرے نزدیک ایسی معمولی بات ہے جیسے ابر بہاری کا برس کر کھلنا۔ یہ بالکل نرالی تشبیہ ہے۔ (۱۱۰) مطلب یہ ہے کہ جس طرح ابر بہاری کا برس کر کھل جانا باعث مسرت ہوتا ہے اسی طرح تیری جدائی میں فنا ہو جانا میرے لئے باعث مسرت ہے۔ کیونکہ عاشق کے حق کے میں فنا ہو جانا سامان بقا بن جاتا ہے۔ بیدل کہتے ہیں تیری جدائی کے غم نے دل کو خون کے آنسو بہانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کی کوئی اچھی حالت نہیں ہے کہ میں بیان کروں کہ وہ کس حال میں ہے۔ غالب اور بیدل دونوں نے محبوب کی جدائی کے غم میں آہ وزاری کا تذکرہ کیا ہے۔ غالب کے نزدیک اس غم میں روتے روتے فنا ہو جانا باعث مسرت ہے جبکہ بیدل کے نزدیک وہ مسلسل ذہنی اذیت کا باعث ہے۔

ہر کجا نکہت گل پیرہنِ رنگ درید	گر نہیں نکہت گل کو ترے کوچے کی ہوس
نیست پوشیدہ کہ از خود سفری میخواہد	کیوں ہے گرد رہِ جولان صبا ہو جانا
بیدلؔ	غالبؔ

غالب کہتے ہیں کہ نکہت گل کو اگر تیرے کوچے کی خاک چھاننے کی آرزو نہیں ہے تو وہ گرد راہ جولان صبا کیوں ہے یعنی صبا کی گرد راہ کیوں بن گئی ہے۔ بیدل کے شعر کا منظوم ترجمہ راقم السطور نے اس طرح کیا ہے:

نکہت گل نے اگر چاک کیا دامن رنگ
ہے یہ واضح کہ مراد اس کی سفر کرنا ہے

غالب اور بیدل دونوں نے نکہت گل کی کوچا گردی یا مسافرت کا ذکر کیا ہے غالب کے نزدیک معشوق کے کوچے کی ہوس اسے وہاں لے گئی۔ جبکہ بیدل کے نزدیک اپنے محدود ذاتی دائرے سے نکل کر آزاد فضا میں سانس لینے کی خواہش نے اسے مجبور کیا۔ صاف ظاہر ہے کہ غالب کے کلام میں بیدل کے اس شعر کی چھاپ موجود ہے۔ یہاں بیدل دروں نگری سے بروں نگری کی طرف یا آپ بیتی سے جگ بیتی کی طرف قاری کی توجہ مبذول کرتے ہیں۔ یہ چیز غالب کے یہاں مفقود ہے۔ بیدل نے اس مفہوم کو دوسرے شعر میں اور زیادہ واضح طور پر بیان کیا ہے:

بہ ظرف غنچہ دشوارست بودن نکہت گل را
نمی گنجد نفس درسینہ من بس کہ دل تنگم

نکہت گل کا غنچہ کے ظرف میں مقید رہنا بہت مشکل ہے۔ میں بھی اس قدر دل تنگ واقع ہوا ہوں کہ سانس میرے سینے میں نہیں سما سکتی ہے۔ نیاز فتح پوری اس شعر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''پھول کو پیرہن گل اور نکہت کو گل کی جامہ دری حسن تعبیر کی وہ حد ہے جہاں نہ نظیری کی رسائی ہے نہ حافظ کی اور ''از خود سفری می خواہد'' تو وہ انداز بیان ہے جسے بہت سے ناواقف صرف مغربی لٹریچر کی خصوصیت سمجھے ہوئے ہیں۔ (مجلّہ نگار)

نگہ بہار و تصور بہشت و ہوش چمن	پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب
ز نشہ می رسد امروز گل بچنگ شراب	دے بطِ مے کو دلِ دوست شنا موجِ شراب
بیدلؔ	غالبؔ

غالب کا مطلب یہ ہے کہ موسم بہار کی آبیاری کے اثر سے شراب میں ابال آ گیا ہے اور موج شراب نے بط مے یعنی صراحی کو تیرنے کی طاقت عطا کر دی۔ یعنی میخانے میں دور شراب شروع ہو گیا۔ بیدل کہتے ہیں نگاہ سراپا بہار ہو گئی ہے، تصور بہشت زار ہو گیا ہے اور عقل و ہوش سراپا چمن بن گئی ہے۔ یعنی بہار کے پر کیف موسم کی آمد پر جب کہ نگاہ، تصور اور عقل سب پر مستی کی کیفیت طاری ہے۔ پھول پر تو نشے کا وہ عالم ہے کہ وہ شراب کے پنجے میں گرفتار معلوم ہوتا ہے۔ موسم بہار کے کیف آگیں اور نشہ پرور موسم کی آمد پر مے پرستوں پر جو کیفیت طاری ہوتی ہے اس کا اظہار غالب اور بیدل دونوں نے کیا ہے مگر بیدل کا انداز یہاں زیادہ حسین اور خوبصورت ہے۔ بیدل نے ایک اور شعر میں موسم بہار میں شراب نوشی کی طرف اشارہ کیا ہے:

قدح سر خوشی وہم می زنم بیدل
درین بہار چہ دارد بغیر بنگ شراب

بیدل وہم کی سرمستی میں قدح نوشی کر رہا ہوں اس موسم بہار میں شراب کے اندر بھنگ کے سوا اور کس چیز کی خصوصیت ہے۔ دیکھا جائے تو غالب اور بیدل دونوں نے موسم بہار کی خصوصیات کو بیان کیا ہے۔ اس موضوع پر اس کا ایک اور شعر ہے:

امروز نو بہار است ساغر کشاں بیائید
گل جوش بادہ دارد تا گلستاں بیائید

پوچھ مت وجہ سیہ مستی ارباب چمن	زبادہ ایست بہ بزم شہود مستی ما
سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا موج شراب	کہ کرد رفع خمارِ شراب ہستی ما
غالب	بیدل

غالب کہتے ہیں باغ میں پھل پھول اور پیڑ پودے عالم مستی میں اس لئے جھوم ہیں کہ ہوا جب انگور کی بیل کے پاس سے گذرتی ہے تو اس میں شراب کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور اس کے اثر سے سارے درخت جھومنے لگتے ہیں۔ بیدل کہتے ہیں شراب عشق کی وجہ سے ہی بزم شہود (کائنات) میں ساری مستی و سرخوشی کا عالم طاری ہے۔ جس نے ہماری ہستی کی شراب کے

خمار کو دور کر دیا ہے۔ غالب اور بیدل دونوں نے شراب سے ارباب چمن کی مستی یا بزم شہود کی مستی کا ذکر کیا ہے۔ البتہ بیدل کے کلام میں خاص طور سے شراب عشق الٰہی کا تذکرہ ہے۔

جو ہوا غرقۂ مے بخت رسا رکھتا ہے	چوں لب ساحل نصیب ما ہمہ خمیازہ است
سر سے گذرے پہ بھی ہے بال ہما موج شراب	گر ہمہ درکام ما ریزند یک دریا شراب
غالب	بیدل

غالب کہتے ہیں وہ شخص بڑا خوش نصیب ہے جو شراب کے دریا میں ڈوب جائے کیونکہ موج شراب سر سے گذر جانے یعنی اس میں ڈوب جانے کے باوجود بلحاظ تاثیر بال ہما سے کم نہیں ہے۔ ہما جس کے سر سے گذر جائے وہ بادشاہ ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر مے پرست پیتے پیتے فنا کے گھاٹ پہنچ جائے یا اس قدر پی لے کہ ہوش حواس کھو بیٹھے دونوں صورتوں میں اس کی خوش نصیبی میں کوئی شبہ نہیں۔ بیدل کہتے ہیں اگر پورے ایک دریا کے برابر بھی شراب ہمارے حلق میں انڈیل دی جائے تو ہماری قسمت میں لب ساحل کی طرح خمیازہ یعنی انگڑائی لینا ہی ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ مستی نہیں آئی۔ غور سے دیکھا جائے تو۔ غالب نے یہاں بیدل کے خیال سے اختلاف کیا ہے۔

موجہ گل سے چراغاں ہے گذرگاہِ خیال	بیدل چمن آرائے گریبان خیال است
ہے تصور میں ز بس جلوہ نما موج شراب	یارب نہ شود آنکہ سر از خویش برآرد
غالب	بیدل

غالب کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ میرے تصور میں موج شراب بہت زیادہ جلوہ نما ہے اور موج شراب گویا موج گل ہے اور موج گل چراغاں ہے اس لئے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میرے خیال کی گذرگاہ چراغاں بن جاتی ہے۔ یعنی خیال میں چراغاں کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ بیدل کہتے ہیں کہ وہ گریبان خیال کے چمن آرا ہیں، خدا نہ کرے وہ اپنا سر گریبان سے اٹھائے۔ بات یہ ہے کہ بیدل نے متعدد اشعار میں یہ واضح کیا ہے کہ خلوت کے اندر خاموشی سے بیٹھ کر شاعر جب تک غور و خوض اور تامل و تفکر سے کام نہیں لے گا قوت خیال نازک اور دقیق و دلآویز افکار و خیالات

کا اظہار نہیں کر سکتی:

ہر سخن سنجے کہ خواہد صید معنیہا کند
چوں گریباں باید اول خلوتی پیدا کند

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بیدل کی قوت فکریہ کو مہمیز کرنے والی چیز گریبان خیال ہے۔ جبکہ غالب کے نزدیک موجۂ گل یا موج شراب ہی مہمیز کرنے والی ہے۔ چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں: آگ میں گرمی ہے مگر وہ آتش سیال کہاں کہ جب دو جرعے پی لئے فوراً رگ وپے میں دوڑ گئی، دل توانا ہوگیا، دماغ روشن ہوگیا، نفس ناطقہ کو تواجد بہم پہنچا (۱۱۱)

نشہ کے پردے میں ہے محو تماشائے دماغ	ما بزورِ مے پرستی زندگانی می کنیم
بسکہ رکھتی ہے سرِ نشو ونما موج شراب	چوں حبابِ مے بنائے ماست سرتا پا شراب
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کا مطلب ہے کہ شراب ہمارے دماغ کو چونکہ نشو ونما دینے کی آرزومند ہے اس لئے وہ بشکل نشہ ہمارے دماغ میں پہنچ کر محو تماشا ہے یعنی دماغی قوتوں کو ترقی دے رہی ہے۔ چنانچہ اس کے خط کا اقتباس بالا اس کی توثیق کرتا ہے بیدل کہتے ہیں ہم تو مے پرستی کے سہارے ہی زندگی گذار رہے ہیں حباب مے کی طرح ہماری بنیاد ہی سراسر شراب پر قائم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہماری ہستی کی نشو ونما شراب ہی پر قائم ہے۔ غالب اور بیدل دونوں کے شعر کا موازنہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ غالب کے شعر میں بیدل کے شعر کا پورا عکس موجود ہے۔

شرح ہنگامۂ ہستی ہے زہے موسمِ گل	حسنِ تشریف بہار است آب را در برگ گل
رہبرِ قطرہ بدریا ہے خوشا موجِ شراب	میکند در ساغر اندازد اگر پیدا شراب
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کا مطلب ہے کہ ہستی کی ساری چہل پہل موسم گل یعنی بہار ہی کے دم سے قائم ہے۔ موسم بہار نہ آئے تو ساری دنیا ویران اور سنسان ہو کر رہ جائے۔ دوسرے مصرعہ میں یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ موج شراب قطرے کو دریا سے ملا دیتی ہے یعنی شراب انسان پر عالم بیخودی طاری کرتی ہے، اور بیخودی فنا کے مشابہ ہے اور فنا ہو کر دریا قطرہ میں مل جاتا ہے۔ اس لئے یہ شراب قطرہ یعنی

انسان کو دریا یعنی ذات حق سے ملا دیتی ہے۔ بیدل کہتے ہیں پھول کی پتی میں جو آب وتاب اور تروتازگی ہے وہ موسم بہار کی حسین آمد کی بنا پر ہے۔ شراب اگر پیالے میں ڈال دی جائے تو اور نمایاں ہو جاتی ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب اور بیدل دونوں نے موسم بہار اور شراب کی دلکشی کو موضوع بنایا ہے البتہ انداز بیان جداگانہ ہے۔ مجموعی طور پر غالب کے کلام پر بیدل کے اس کلام کی چھاپ نظر آتی ہے۔

غالب	بیدل
ہوش اڑتے ہیں مرے جلوۂ گل دیکھ اسد	جلوہ گل اگر چنیں طاقت گداز یہا کند
پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موج شراب	بعد ازیں خاکستری یابی بجائے عندلیب

غالب کہتے ہیں اس موسم بہار میں پھولوں کا حسن و جمال دیکھ کر مجھ پر بیہوشی اور بیخودی کا عالم طاری ہے۔ یعنی پھر وہ طاقت آگئی کہ شراب کا دور چلے۔ جلوہ گل مے کشی کا محرک ہے۔ بیدل کہتے ہیں جلوۂ گل اگر اسی طرح میری طاقت گدازی کا کام کرے یعنی مجھے ناتواں اور نحیف بنا دے تو اس کے بعد بلبل کی جگہ آپ کو راکھ ہی نظر آئے گی۔ گل وبلبل کے درمیان عاشق اور معشوق کا رشتہ ہے۔ گل کے عشق میں بلبل کی لگا تار آہ وزاری سے اس کی طاقت رفتہ رفتہ گھٹتی یا ختم ہو جاتی ہے اس طرح وہ فنا کے گھاٹ اتر جاتی ہے۔ یہاں غالب اور بیدل دونوں نے جلوۂ گل کو موضوع بنایا ہے اور غور سے دیکھا جائے تو غالب کا مصرعہ ''ہوش اڑتے ہیں مرے جلوۂ گل دیکھ اسد'' میں بیدل کے مصرعہ ''جلوہ گل اگر چنیں طاقت گداز یہا کند'' کا عکس موجود ہے۔

غالب	بیدل
لکھتا ہوں اسد سوزش دل سے سخن گرم	سخن شد داغ دل چوں شمع از آتش بیانیہا
تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پر انگشت	معانی مرد در دورانِ ما از سکتہ خوانیہا

غالب کا مطلب ہے کہ سوزش دل کی بدولت میرے کلام میں وہ تاثیر پیدا ہوگئی ہے کہ کوئی شخص میرے اشعار پر اعتراض نہیں کر سکتا۔ بیدل کہتے ہیں میری آتش نوائی کی وجہ سے خود شاعری شمع کی طرح داغ دل یا سوزش دل بن گئی ہے۔ سکتہ خوانی یعنی شعر کو بے وزن کہنے یا پڑھنے

کی وجہ سے ہمارے زمانے میں دوسروں کے معانی اور مضامین آستانہ مرگ پر پہنچ گئے ہیں۔غالب اور بیدل دونوں نے ''سخن گرم یا آتش بیانی'' کا تذکرہ کیا ہے۔غالب کے نزدیک اس کا سرچشمہ سوزش دل یا سوز عشق ہے۔جبکہ بیدل کہتے ہیں میری آتش بیانی نے میرے کلام میں شمع کی طرح ایک سوزش پیدا کردی ہے۔یا اس کی وجہ سے سوزش و درد میں گرفتار ہوگئی ہے۔

اے عافیت کنارہ کر اے انتظام چل	ز باغ عافیت رنگِ امیدی نیست عاشق را
سیلاب گریہ درپئے دیوار و در ہے آج	محبت غیر خوں گشتن نمی دانم چہ می باشد
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ سیلاب گریہ آنے والا ہے اور اس کی شدت سے میرا مکان ڈھ جائے گا اس لئے عافیت اور انتظام دونوں میرے گھر سے رخصت ہوجائیں گے۔مطلب یہ ہے کہ جب گھر ہی نہ رہا تو عافیت اور انتظام کہاں۔بیدل کہتے ہیں عاشق کو باغ عافیت کی سرے سے کوئی امید نہیں ہوتی ہے۔محبت خون کے آنسو بہانے کے سوا کسی اور چیز کا نام ہے مجھے نہیں معلوم۔عاشق کی عافیت سے محرومی اور گریہ وزاری کو غالب اور بیدل دونوں نے موضوع بنایا ہے۔بیدل نے اسے سادگی سے ادا کردیا۔جبکہ غالب نے ایک انوکھے انداز سے ادا کیا ہے۔یہاں غالب کے شعر پر بیدل کے شعر کا اثر واضح ہے۔بیدل نے اس مفہوم کو ایک اور شعر میں اس طرح ادا کیا ہے:

التفاتِ عشق آتش ریخت در بنیاد دل
سیل شد تردستیِ معمار ایں ویرانہ را

نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ	آرزو از سینہ بیروں کن ز کلفتہا برآ
اگر شراب نہیں انتظار ساغر کھینچ	عالمی زیں دانہ در دامِ بلا افتادہ است
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں آرزو کے بغیر زندگی میں کوئی کشش اور رونق نہیں ہوتی ہے۔اس لئے جب تک سانس چل رہی ہے آرزو کا سلسلہ جاری رہے،خواہ مقصد حاصل ہو یا نہ ہو۔اگر میخانے

میں ہو اور وہاں شراب نہیں ہے تو بھی اس کے انتظار میں بیٹھے رہو۔ بیدل کہتے ہیں دل سے آرزوؤں کا سلسلہ نکال دو، ہر قسم کی زحمت سے بچ جاؤ گے۔ اس دانے کی وجہ سے ایک دنیا دام بلا میں گرفتار ہے۔ گویا غالب نے بیدل کے بالکل برعکس خیال کا اظہار کیا ہے۔ اس موضوع پر بیدل کے بہت سے اشعار ہیں اور ڈاکٹر سر محمد اقبال اس سے متاثر ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

دوا ہر دکھ کی ہے مجروح تیغ آرزو رہنا
علاجِ زخم ہے آزاد احسانِ رفو رہنا

بیدل کے کچھ اور اشعار ملاحظہ ہوں:

بترکِ آرزوہا کوش اگر آسودگی خواہی
شکستِ رنگ ایں تب نیست بے ایجاد غیرتہا

در زمینِ آرزو بیدل املہا کاشتیم
لیک غیر از حسرت نشو و نمائے بر نخاست

کمالِ گرمیِ سعی تلاشِ دید نہ پوچھ
برنگ خار مرے آئینہ سے جوہر کھینچ
غالبؔ

باز از جہاں بحسرتِ دیدار می رسیم
آئینہ در بغل بدر یار می رسیم
بیدلؔ

غالب کا مطلب یہ ہے کہ دیدار محبوب کے لئے میں نے جو زبردست جتن کئے تھے اس کی تفصیل مجھ سے نہ دریافت کرو، بس یہ سمجھو کہ صحرا نوردی میں اس قدر کانٹے چبھے ہیں کہ تلوے درکنار، آئینہ حسرت دیدار میں بھی کانٹے چبھ گئے ہیں اگر تمھیں شک ہو تو اس آئینے کو دیکھ لو تمہیں جوہر کی جگہ کانٹے ہی نظر آئیں گے۔ جب جوہر کھینچنے کی کوشش کرو گے تو جوہر کے بجائے ایک نہ ایک کانٹا کھنچ کر تمہارے ہاتھ لگے گا۔ بیدل کہتے ہیں دنیا کے جھمیلوں سے نکل کر دیدار محبوب کی حسرت میں بغل میں آئینہ دبائے آستانہ محبوب پر پہنچ رہا ہوں کہ اگر یوں وہ سامنے نظر نہ آئے تو شاید کسی وقت آئینہ میں اس کا عکس ہی نظر آ جائے گا۔ یہاں ''حسرت دیدار'' کی جگہ ''سعی تلاش دید'' اور ''آئینہ در بغل'' کی جگہ ''آئینہ سے جوہر کھینچ'' کی ترکیب واضح کرتی

ہے کہ غالب کے ذہن کے کسی گوشے میں بیدل کا یہ شعر ضرور رہا ہے۔ البتہ محبوب تک دونوں کا اپیروچ الگ الگ ہے۔

تاکے ز خلق پردہ بہ رو افگنی چو خضر
مردن بہ از خجالت بسیار زیستن
بیدلؔ

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لیے
غالبؔ

حضرت خضرؑ کو مخاطب کر کے غالب کہتے ہیں کہ زندگی کا لطف تو ہمیں حاصل ہے۔ آپ اس سے محروم ہیں، کیونکہ دنیا میں ہم لوگوں سے ملتے جلتے ہیں اور آپ کو اگر چہ عمر جاوداں حاصل ہے پر سب کی نظروں سے اوجھل اور ان سے بے تعلق ہیں۔ بیدل کہتے ہیں خضرؑ کی طرح کب تک عوام سے منہ چھپائے پھرتے رہو گے۔ عمر دراز کی پشیمانی اٹھانے سے بہتر ہے کہ انسان موت کی آغوش میں پہنچ جائے۔ غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ خضرؑ کے لوگوں کی نظروں سے روپوش رہنے اور عوام سے قطع تعلق رکھنے کا مضمون غالب نے بیدل کے اس شعر سے لیا ہے۔ البتہ اپنی نکتہ آفرینی سے اس میں ایک بات پیدا کی کہ زندگی کا لطف تو عوام کے ساتھ تعلقات نبھانے میں ہے قطع تعلق میں نہیں ہے اور وہ لطف ہمیں حاصل ہے لیکن غالب نے براہ راست خضرؑ کو مخاطب کر کے اور ابدی زندگی کے لئے ان کو چور کہہ کر ایک نبی کی شان میں گستاخی کی مذموم حرکت کی ہے جبکہ بیدل نے احتیاط کا پہلو ملحوظ رکھتے ہوئے لفظ ''چو خضر'' استعمال کیا کہ خضر کی طرح عوام سے بے تعلق رہنا مناسب نہیں ہے۔ نیز یہ کہ عمر دراز کی پشیمانی سے موت بہتر ہے۔ غالب نے ان کے لئے عمر جاوداں کا لفظ استعمال کیا جو ظاہر ہے غلط ہے۔ کیونکہ قیامت سے پہلے آخر ان کو بھی ایک دن مرنا ہے۔ لیکن ایک اور شعر میں بیدل کہتا ہے اس صحرائے کائنات میں خضرؑ کی طرح ہی گمنامی میں زندگی گذارنی چاہیے۔ جو آدمی لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہوتا ہے وہ گم نہیں کہلاتا:

دریں صحرا بہ وضع خضر باید زندگی کردن
نگردد گم کسی کز مردماں پنہاں شود پیدا

تجھے بہانۂ راحت ہے انتظار اے دل
کیا ہے کس نے اشارہ کہ ناز بستر کھینچ
غالبؔ

در محبت آرزو را اعتبارِ دیگرست
ایں حریفاں وصل می خواہند و بیدل انتظار
بیدلؔ

غالب کہتے ہیں اے دل محبوب کے انتظار میں تو بستر پر لیٹا ہوا ہے جو حقیقت میں تیری تن آسانی کے لئے ایک بہانہ ہے۔ تجھ سے کس نے کہا کہ محبوب کے انتظار میں بستر پر لیٹا رہ۔ اگر واقعی تجھے وصل کے لئے طلب صادق ہے تو اس کے لئے تگ و دو کر۔ بیدل کہتے ہیں محبت میں آرزو کا کچھ اور ہی اعتبار ہے۔ احباب وصل کے خواہاں ہیں جبکہ بیدل انتظار کا طالب ہے۔ غالب اور بیدل دونوں نے محبوب کے انتظار اور وصل کو موضوع بنایا ہے غالب کے نزدیک محبوب کے انتظار میں بستر پر لیٹے رہنا راحت طلبی کی علامت ہے۔ جبکہ بیدل کے نزدیک انتظار میں آرزوئے وصل کی جو اہمیت اور اعتبار ہے وہ عین وصل میں حاصل نہیں ہے۔ چنانچہ دوسری جگہ کہتا ہے:

وصل ہم بیدل علاجِ تشنۂ دیدار نیست
دیدہ ہا چندانکہ محو اوست دیدن آرزوست

تشنہ دیدار محبوب کا علاج وصل سے بھی نہیں ہوتا ہے۔ آنکھیں جس قدر اس کے اندر محو ہوتی ہیں اسی قدر دیدار کی آرزو بڑھتی چلی جاتی ہے۔ غالب کا ایک فارسی شعر اسی مفہوم کا درج ذیل ہے:

بلبل بہ چمن نگرد و پروانہ بہ محفل
شوق است کہ در وصل ہم آرام ندارد

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد
غالبؔ

حسن مستغنیست از شہرت نوایہائے عشق
ہیچ کس گل را نمی خواہد برائے عندلیب
بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ جب تک میں بقید حیات تھا حسینان جہاں مجھ کو اپنے دام محبت میں گرفتار کرنے کے لئے ناز وادا اور عشوہ وغمزہ کی نمائش کرتی تھیں گویا میری وجہ سے حسینوں میں

ایک کشمکش جاری تھی۔ میری وفات کے بعد چونکہ کوئی اس لائق نہیں رہا کہ یہ اس کو اپنا گرویدہ بنائیں اس لئے وہ کشمکش جاتی رہی اور جفا کاروں کو سکون نصیب ہوگیا۔ بیدلؔ کہتے ہیں حسن و عشق کی شہرت نوائیوں تشہیر یا اشتہار بازی سے بے نیاز ہے۔ بلبل کی خاطر کوئی آدمی پھول کو طلب نہیں کرتا۔ چنانچہ دوسری جگہ کہتا ہے:

عشق را بیدستگاہ حسن شہرت مشکل است

از زبان برگ گل بشنو نوائے عندلیب

حسن کی توانائی کے بغیر عشق کی شہرت مشکل ہے۔ برگ گل کی زبان سے عندلیب کی آواز سنو۔ یہاں بیدل کا خیال حسینوں کی بے نیازی اور عاشقوں کی نیازمندی کے مسلمہ اصول کے موافق ہے جبکہ غالب کا خیال اس کے برعکس ہے۔ پھر اہل جفا کی جفا کاری تو ان کے خمیر میں داخل ہے۔ ع

رسم و آئین جفا خاصیت روئے نکوست

اس لئے ان دونوں باتوں میں غالب نے بیدل سے اختلاف کیا ہے۔

زدیم دست بدامانِ عشق از ہمہ پیش	منصب شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا
مراد ما شدہ حاصل ز پیش دستی ما	ہوئی معزولی انداز و ادا میرے بعد
بیدلؔ	غالبؔ

غالب کا مطلب یہ ہے کہ میرے مرنے کے بعد اب کوئی منصب عاشقی پر فائز ہونے کا اہل نہیں رہا۔ اس لئے معشوقوں کے ناز و ادا سب از کار رفتہ ہوگئے۔ بیدل کہتے ہیں عشق کا دامن تھامنے میں، میں نے پہل کی اور سب کو پیچھے چھوڑ دیا۔ اس پیش دستی کی وجہ سے مجھے میرا مقصد حاصل ہوگیا۔ بیدل اور غالب دونوں نے اپنے کو عاشق صادق یا کامل قرار دیا۔ اس فرق کے ساتھ کہ بیدل نے اپنے ہمعصروں میں اس سلسلے میں بازی جیت لی۔ اپنی وفات کے بعد کیا صورت حال رہے گی اس کا ذکر نہیں کیا۔ غالب نے اپنے ہمعصروں میں تو بازی جیتی ہی مگر وفات کے بعد بھی پیشین گوئی کی کہ کوئی اس منصب کا اہل نہیں رہا۔ اس لئے اب معشوق اپنے ناز و ادا کا اظہار کس کے لئے کریں گی۔

خون ہے دل خاک میں احوال بتاں پر غالب | محتاج نیست حسن بہ آرائش دگر
ان کے ناخن ہوئے محتاج حنا میرے بعد | گل را ز غنچہ تکمہٗ بند قبا بس است

غالبؔ   بیدلؔ

مطلب یہ ہے کہ جب میں بقید حیات تھا حسینان جہاں میرے خون سے اپنے ناخن رنگین کیا کرتی تھیں۔ میری وفات کے بعد انہیں مہندی لگانے کی ضرورت پڑ گئی۔ اس بات سے قبر کے اندر میرا دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ بیدل کہتے ہیں حسن کو کسی اور آرائش وزیبائش کی ضرورت نہیں۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ پھول جسین ہے اس کے بند قبا کے لئے کلی کا تکمہ یا بٹن کافی ہے۔ یہاں بیدل اور غالب دونوں متضاد سمتوں میں گئے ہیں۔ غالب کے مصرع ''ان کے ناخن ہوئے محتاج حنا میرے بعد'' کو بیدل کے مصرع 'محتاج نیست حسن بہ آرائش دگر'' کے مقابلے پر رکھ کر پڑھئے تو یہ فرق واضح ہوگا۔

در خور عرض نہیں جوہر بیداد کو جا | در دلش میل جفا نقشے است بر لوح نگیں
نگہ ناز ہے سرمے سے خفا میرے بعد | در لبش حرف وفا بیرون طبع غنچہ بوست

غالبؔ   بیدلؔ

غالب کہتے ہیں میری وفات کے بعد حسینوں کو ستم ڈھانے کے لئے کوئی مناسب جگہ نہیں ملی۔ اسی وجہ سے انہوں نے سرمہ لگانا ترک کر دیا، کیونکہ وہ پہلے تو سرمہ لگا کر مجھ پر ستم ڈھاتی تھیں میری وفات کے بعد اب کس پر ستم ڈھائیں گی۔ اس لئے مجبوراً سرمہ لگانا چھوڑ دیا۔ بیدل کہتے ہیں معشوق کے دل میں ظلم وستم کے طرف میلان لوح نگیں پر کندہ نقش کی طرح ہے جو مٹائے نہیں مٹتا اور اس کے ہونٹوں پر حرف وفا اس بو کی طرح ہے جو کلی کی طبیعت سے نکل چکی ہے۔ بیدل کا مقصد یہ ہے کہ کوئی کتنا ہی بڑا عاشق صادق کیوں نہ ہو اس کی وفات سے حسینوں کا مزاج نہیں بدلتا۔ جفا کاری اور ستم رانی ان کی خصوصیت ہے جو ان کی سرشت میں داخل ہے۔

کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق | دعویٰ عشق و ہوس عام افتادہ است اینجا
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد | عالم از کام و زباں عرصۂ کوس است و دوال

غالبؔ   بیدلؔ

مولانا حالی کہتے ہیں اس شعر کے ظاہری معنیٰ یہ ہیں کہ جب سے میں مر گیا ہوں مرد افگن عشق کا ساقی یعنی معشوق بار بار صلا دیتا ہے یعنی لوگوں کو شراب عشق کی طرف بلاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرے بعد شراب عشق کا کوئی خریدار نہیں رہا اس لئے اس کو بار بار صلا دینے کی ضرورت ہوئی۔ مگر زیادہ غور کرنے کے بعد جیسا کہ مرزا خود بیان کرتے تھے اس میں ایک نہایت لطیف معنیٰ پیدا ہوتے ہیں اور وہ یہ کہ پہلا مصرع ہی ساقی کے صلا کے الفاظ ہیں اور اس مصرعہ کو وہ مکرر پڑھ رہا ہے۔ ایک دفعہ بلانے کے لہجے میں پڑھتا ہے کہ کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق یعنی کوئی ہے جو مئے مرد افگن عشق کا حریف ہو پھر جب آواز پر کوئی نہیں آیا تو اسی مصرعہ کو مایوسی کے لہجے میں پڑھتا ہے کہ کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق، یعنی کوئی نہیں ہوتا اس میں لہجہ اور طرز ادا کو بہت دخل ہے۔ (۱۱۲) ماحصل یہ ہے کہ میرے بعد عاشقی کا سلسلہ درہم برہم ہے۔ بیدل کہتے ہیں دنیا میں عشق وہوس کا دعویٰ کرنا تو لوگوں میں ایک عام سی بات ہوگئی ہے۔ دنیا اپنی زبان وحلق کی وجہ سے عرصہ کوس ودوال یعنی نقارہ اور اس کی چوب یا چمڑے کا تسمہ بن کر رہ گئی ہے۔ جس طرح نقارچی اپنے چوب سے نقارہ بجا کر دنیا میں اپنے وجود کی تشہیر کرتا ہے اسی طرح لوگ عشق کا زبانی دعویٰ کر کے اپنے عاشق ہونے کی تشہیر کرتے ہیں۔ جبکہ حقیقت سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ غالب کہتے ہیں میرے بعد عاشق کامل کی تلاش بے سود ہے۔ بیدل کہتے ہیں ایک غالب کیا عام لوگ عشق ومحبت میں اسی قسم کے زبانی دعویٰ کیا کرتے ہیں اور اس کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں۔ لیکن بیدل کا ایک اور شعر ہے جس میں وہ غالب کی طرح اپنے عاشق صادق وکامل ہونے کا دعویٰ کرتا ہے:

قابل برق تجلی نیست جز خاشاک من

حسن ہر جا جلوہ پرداز است من آئینہ ام

محبوب کی تجلی کے نمایاں ہونے کے لائق میرے خاشاک کے سوا کوئی چیز نہیں ہے۔ محبوب جہاں بھی جلوہ آرا ہوتا ہے میں اس کا آئینہ ہوتا ہوں۔

ہے جنوں اہل جنوں کے لئے آغوش وداع
چاک ہوتا ہے گریباں سے جدا میرے بعد
غالبؔ

کیست از فیض جنوں مایہ ندارد اینجا
خرد آن بہ کہ تکلف نگذارد اینجا
بیدلؔ

غالب کہتے ہیں میری وفات کے بعد جنون، اہل جنوں سے اور چاک، گریباں سے سدا کے لئے رخصت ہو رہا ہے۔یعنی آئندہ نہ کوئی عشق کرے گا نہ گریباں چاک کرے گا ۔بیدل کہتے ہیں ذرہ سے لے کر آفتاب تک اور قطرے سے لے کر دریا تک کون سی چیز کائنات میں ایسی ہے جو دولت جنوں سے فیضیاب نہیں ہے۔خود غالب نے بھی اپنی فارسی شاعری میں اس کا دعویٰ کیا ہے: ع

ہر ذرہ محو جلوۂ حسن یگانہ ایست

اس لئے عقل کے لئے بہتر یہی ہے کہ وہ یہاں قدم نہ رکھے۔غالب نے بیدل کے خیال کے بالکل برعکس خیال کا اظہار کیا ہے کہ میرے بعد نہ کوئی عشق کرے گا نہ گریباں چاک کرے گا۔جبکہ بیدل کا خیال ہے کہ یہ سلسلہ رہتی دنیا تک برقرار رہے گا۔

بلا سے ہیں جو یہ پیشِ نظر در و دیوار
نگاہ شوق کو ہے بال و پر در و دیوار
غالبؔ

شوق دل وامانده پست و بلند دہر نیست
نالۂ فرہاد بیرونست زیں کوہسار ہا
بیدلؔ

محبوب کے دیدار میں اگر اس کے در و دیوار آڑے آتے ہیں تو کوئی پروا نہیں بلکہ میری نگاہ میں تو ان کا وجود شوق دیدار کے لئے بال و پر کا کام دیتا ہے۔یعنی رکاوٹیں کھڑی کرنے سے جذبۂ عشق اور ذوق دید میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔مشہور کہاوت ہے الانسان حریص لما منع بیدل کہتے ہیں زمانے کی پستی اور بلندی اور سرد و گرم کی وجہ سے شوق دل کو تکان لاحق نہیں ہوتی چنانچہ فرہاد کے آہ و نالہ کی آواز بیستون پہاڑ سے باہر بھی سنائی دیتی ہے۔عاشق کے جذبۂ شوق میں کوئی چیز حائل نہیں ہو سکتی اس موضوع پر غالب اور بیدل دونوں کا اتفاق ہے اس فرق کے ساتھ کہ غالب کے نزدیک رکاوٹوں سے اس میں مزید اضافہ ہوتا ہے جبکہ بیدل کے نزدیک اس سے واماندگی نہیں لاحق ہوتی ہے۔غور سے دیکھا جائے تو غالب کے مصرعہ ''نگاہ شوق کو ہے بال و پر در و دیوار'' میں بیدل کے مصرعہ ''شوق دل وامانده پست و بلند دہر نیست'' کا عکس موجود ہے البتہ غالب نے اس خیال کو زیادہ خوبصورتی سے ادا کیا ہے۔

وفور اشک نے کاشانہ کا کیا یہ رنگ
کہ ہو گئے مرے دیوار و در در و دیوار
غالبؔ

دادہ ام از کف عنان و سخت حیرانم کہ باز
تا کجا راند محبت اشک گلگون مرا
بیدلؔ

محبوب کی جدائی میں میں نے اتنی آہ و زاری کی اور اس قدر آنسو بہائے کہ یہ گھر سیلاب ہوگیا جس کی وجہ سے پورا مکان ڈھہ گیا جہاں دیوار تھی وہاں دروازہ ہوگیا اور جہاں دروازہ تھا وہاں مٹی کی ڈھیر کی وجہ سے دیوار نظر آنے لگی۔ بیدل کہتے ہیں فراق یار میں میں نے اس قدر آنسو بہائے کہ اس کی باگ ہاتھ سے دیدی اور اب حیران ہوں کہ محبت میرے گلابی آنسوؤں کا سلسلہ کہاں تک کھینچ لے جائے گی۔ فراق یار میں غیر معمولی اشکباری کا موضوع بیدل اور غالب دونوں کے یہاں ہے البتہ انداز بیان دونوں کا جداگانہ ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کے پورے شعر پر بیدل کے پورے شعر کی چھاپ ہے۔ بیدل نے اس موضوع کو اور دلکش انداز میں پیش کیا ہے:

از ہجوم اشک ما بیدل مپرس
یار می آید چراغاں کردہ ایم

ہمارے ہجوم اشک کا حال مت پوچھو۔ بات یہ ہے کہ محبوب قدم رنجہ ہورہا ہے اس کی خوشی میں ہم نے اپنے ہجوم اشک سے چراغاں کردیا ہے۔ غالب نے ہجوم اشک کی جگہ وفور اشک کا لفظ استعمال کیا اور اس کی وجہ سے گھر سیلاب میں بدل گیا جبکہ بیدل کے نزدیک گھر چراغاں میں بدل گیا۔

نہیں ہے سایہ کہ سن کر نوید مقدم یار
گئے ہیں چند قدم پیشتر در و دیوار
غالبؔ

ہمہ را ربودہ ز دست خود اثر نوید رسیدنت
ز وداع ما چہ خبر دہد بدل شکستہ سروش ما
بیدلؔ

غالب کہتے ہیں جسے تم درودیوار کا سایہ کہتے ہو وہ سایہ نہیں ہے بلکہ محبوب کی آمد کی خوشخبری سن کر میرے گھر کے درودیوار اس کے استقبال کے لئے چند قدم آگے بڑھ گئے ہیں۔ بیدل کہتے ہیں اے محبوب تیری آمد کی خوشخبری کے اثر نے سب کو مست و بیخود کردیا ہے اور

ہماری بیخودی کا عالم تو یہ ہے کہ ہمارا فرشتہ میرے دل شکستہ کو خبر دینے میں سوچ رہا ہے کہ دیں کہ نہ دیں۔ محبوب کی آمد کی خوشخبری دونوں کا موضوع ہے اس فرق کے ساتھ کہ غالب کے نزدیک سایہ دیوار درحقیقت دیوار ہے جو محبوب کے استقبال کے لئے آگے بڑھی ہوئی ہے جبکہ بیدل کے نزدیک اس نے سب عاشقوں کو بیخود کر دیا اور بیدل کو سب سے زیادہ بیخود کر دیا۔ یہاں بھی غالب کے شعر پر بیدل کے شعر کی یک گونہ چھاپ پائی جاتی ہے۔

ہوئی ہے کس قدر ارزانی مے جلوہ	ہمہ جا جمال تو جلوہ گر ہمہ سو مثال تو در نظر
کہ مست ہے ترے کوچے میں ہر در و دیوار	بتاملی مژہ باز کن کہ نسازد آئینہ غافلت
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں اے محبوب تیرے جلوے کی ارزانی کا یہ عالم ہے کہ انسان تو درکنار تیری گلی کوچے کے در و دیوار پر بھی مستی چھا رہی ہے۔ بیدل کہتے ہیں اے محبوب تیرا جمال سب جگہ جلوہ گر ہے اور تیری مثال ہر طرف پیش نظر ہے۔ پلکیں کھول کر دیکھو کہ آئینہ دل تجھے غافل نہ کرے۔ محبوب کی ہر جگہ ارزانی جلوہ کا تذکرہ غالب اور بیدل دونوں نے کیا ہے اس فرق کے ساتھ کہ غالب کے نزدیک در و دیوار سب اس سے مست ہیں جبکہ بیدل نے اسے سادگی سے ادا کر دیا ہے۔ البتہ دوسرے شعر میں کہتا ہے:

زہے نظارہ را از جلوۂ حسنِ تو زیور ہا
رگِ برگ گل از عکس تو در آئینہ جوہر ہا

اس نظارے کا کیا پوچھنا جو تیرے جلوہ حسن کے زیور سے آراستہ ہے اور تیرے عکس کی وجہ سے رگ برگ گل آئینہ میں جوہر (صیقل) بنا ہوا ہے۔

نظر میں کھٹکے ہے تیرے گھر کی آبادی	خوں بدل، خاک بسر، آہ بلب، اشک بچشم
ہمیشہ روتے ہیں ہم دیکھ کر در و دیوار	بے جمالِ تو چہا برمن مسکیں آید
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں اے محبوب تیری عدم موجودگی سے اپنا گھر اس قدر سونا اور ویران معلوم ہوتا ہے کہ اس کے در و دیوار کو دیکھ کر اس کی بے رونقی پر ہم سدا آنسو بہاتے رہتے ہیں۔ نظر میں کھٹکنے کے دو معنی ہیں ناگوار محسوس ہوتی ہے یا بری معلوم ہوتی ہیں اور جب آنکھوں میں کھٹک ہوتی ہے تو پانی نکلنے لگتا ہے گویا آنسو رواں ہو جاتے ہیں۔ بیدل کہتے ہیں تیرے حسن و جمال کی عدم موجودگی میں مجھ غریب پر کیا کیا بلائیں ہیں جو نہیں آئیں۔ دل میں خون جوش مار رہا ہے، سر پر خاک اڑا رہا ہوں، ہونٹوں سے آہیں بھر رہا ہوں اور آنکھوں سے آنسو بہا رہا ہوں۔ ''محبوب کی جدائی میں عاشق کی اشک باری'' غالب اور بیدل دونوں کا موضوع ہے، اس فرق کے ساتھ کہ غالب معشوق کی عدم موجودگی میں در و دیوار کی بے رونقی دیکھ کر آنسو بہاتے ہیں جبکہ بیدل آنسو بہانے کے ساتھ سر پر خاک اڑاتے، لب سے آہیں بھرتے ہیں اور دل میں ان کا خون جوش مارتا ہے جس کو مختصر لفظ میں دوسری جگہ بیدل یوں کہتے ہیں: ؏

بے یار زیستن ز تو بیدل قیامت است

محبوب کے بغیر زندگی تو بیدل قیامت ہے۔ فراق یار میں عاشق کی ان سب آپ بیتیوں کا احاطہ غالب نہیں کر سکے۔ اور یہاں غالب کی وہ بات صادق آتی ہے:

طرز بیدل میں ریختہ لکھنا
اسد اللہ خاں قیامت ہے

نہ کہہ کسی سے کہ غالب نہیں زمانے میں	گر ز اسرار بہار عشق بوے بردہ ای
حریف راز محبت، مگر در و دیوار	غیر داغ و زخم و اشک و آبلہ مشمار گل
غالبؔ	بیدلؔ

مطلب یہ ہے کہ اے غالب اپنا راز محبت کسی کے سامنے بیان مت کر کیونکہ کوئی آدمی راز کو سن کر پوشیدہ نہیں رکھ پاتا۔ اس لئے اگر کہنا ہی ہے تو در و دیوار سے کہہ دے۔ لیکن وہ سن نہیں سکتے اس لئے نتیجہ یہ نکلا کہ کسی سے بھی مت کہہ، در و دیوار سے کہنے میں ایک مفہوم یہ بھی مضمر ہے کہ وہ کسی سے کہہ نہیں سکتے۔ بیدل کہتے ہیں بہار عشق کے اسرار کی اگر تم کو کچھ بھی بو ملی ہے تو داغ،

زخم، اشک اور آبلہ کے سوا کسی چیز کو گل (پھول یعنی عیش) نہ سمجھنا۔ بیدل کا مطلب یہ ہے کہ عاشق کو سدا محبوب کی جدائی یا غفلت شعاری یا بیوفائی یا جفا کاری کی وجہ سے داغ، زخم، اشک اور آبلہ سے سابقہ پڑتا ہے۔ ان کو وہ عیش تصور کر کے انگیز کرے۔ چنانچہ ایک جگہ بیدل کہتا ہے: ع

عاشقاں در سایۂ برقِ بلا آسودہ اند

یہ ہیں وہ اسرار عشق و محبت جن کو کسی سے کہہ نہیں سکتے۔ غالب اور بیدل دونوں نے اسرار محبت کے پوشیدہ رکھنے کی تاکید کی ہے لیکن اسرار عشق یا رازہائے محبت کیا ہیں اور ان کو کیا سمجھنا چاہئے ان کی تفصیل بیدل کے شعر میں ملتی ہے۔

ز اسرار محبت صافی آئینہ اے دارم
کہ نتواند بجز حسرت نمودن چشم غمازم

کام اس سے آپڑا ہے کہ جس سے جہان میں	نشانِ مردمی بیدل چہ جوئی از سیہ چشماں
لیوے نہ کوئی نام ستمگر کہے بغیر	وفا کن پیشہ و زیں قوم آئینِ جفا بنگر
غالب	بیدل

غالب کا مطلب یہ ہے کہ ایسے ستم پیشہ محبوب سے سابقہ پڑا ہے کہ دنیا میں جو بھی اس کا نام لیتا ہے تو پہلے اس کو ستمگر پکارتا ہے پھر کچھ کہتا ہے گویا ستمگر اس کے نام کا ایک جز بن گیا ہے۔ بیدل کہتے ہیں سیاہ چشم حسینوں سے مروت و انسانیت کی توقع مت کرو۔ تم اپنا شعار وفاداری کا رکھو اور ان لوگوں کی طرف سے ظلم و جفا کے اصول و آئین کو دیکھو۔ ایک اور شعر اسی مفہوم کا ہے:

اے دل دیوانہ کارت با غم عشق اوفتاد
در چہ مزرع کشت ذوق سینہ چاکی دانہ ات

اے دل دیوانہ تیرا سابقہ غم عشق سے پڑا ہے ذرا دیکھ تیرے ذوق سینہ چاکی نے کس کھیت میں دانہ بویا ہے۔ غالب اور بیدل دونوں کو ایک ستمگر محبوب سے سابقہ پڑا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ غالب اسے پہلے ستمگر کہہ کر پکارتے ہیں جبکہ بیدل اسے ستمگر سمجھ کر نظر انداز کرتے ہیں۔

اگر عشق بتاں کفر است بیدل	چھوڑوں گا میں نہ اس بت کافر کا پوجنا
کسی چز کافر ایمانی ندارد	چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر
بیدلؔ	غالبؔ

غالب کہتے ہیں خواہ دنیا میں مجھ پر کفر کا فتویٰ کیوں نہ لگے میں اس بت کافر ادا کی پرستش یا عشق سے دستبردار نہ ہوں گا۔ بیدل کہتے ہیں کہ حسینوں سے عشق کرنا اگر کفر قرار پائے تو کافر کے سوا کسی کے پاس ایمان نہیں ہے۔ ''کافر ادا حسینوں کا عشق'' غالب اور بیدل دونوں کا موضوع ہے اس فرق کے ساتھ کہ غالب کے نزدیک اگر لوگ اس پر کفر کا فتویٰ دیں تو بھی اس کے عشق سے دستبردار نہ ہوگا۔ بیدل کے نزدیک ایمان تو درحقیقت ایسے ہی کافر کا ہے جو عشق بتاں سے دست کش نہ ہو۔ یہاں بھی غالب کے کلام پر بیدل کے کلام کی چھاپ واضح ہے۔

مجاز اندیشیت فہم حقیقت را نمی شاید	مقصد ہے ناز و غمزہ و لے گفتگو میں کام
محالست ایں کہ حق از عالم باطل شود پیدا	چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر
بیدلؔ	غالبؔ

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

غالب کے یہ دونوں اشعار ارباب معنیٰ کی نگاہ میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں، کیونکہ اس میں وہ نکتہ بیان کیا ہے جو ہر آدمی کے نزدیک مسلم ہے۔ نکتہ یہ ہے کہ عام لوگ غیر محسوس چیز کو آسانی سے نہیں سمجھ سکتے۔ ان کو سمجھانے کے لئے معقولات کو محسوسات کی لباس میں پیش کیا جاتا ہے۔ ناز و ادا یا غمزہ و عشوہ سے عاشق کے دل پر جو کیفیت گذرتی ہے اس کو بیان کرنے کے لئے تشبیہ اور استعارے کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ کیونکہ وہ کیفیت لفظوں میں ادا نہیں ہوسکتی۔ عاشق اس کیفیت کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ اس کی ادا کیا تھی بس یہ سمجھئے کہ ایک خنجر تھا جو میرے جگر میں پیوست ہو گیا اسی طرح جب آدمی خدا کی صفات بیان کرنا چاہتا ہے تو ان حقائق کے اظہار کے لئے مجاز کا سہارا لیتا ہے۔ جب آدمی پر عالم وجد طاری ہوتا ہے تو اس کیفیت کو یوں بیان کرتا ہے کہ

ساقی نے اپنی محبت کی شراب پلا کر تجھے مدہوش کر دیا۔ بیدل کہتے ہیں تیری مجاز اندیشی حقیقت کے سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتی ۔ یہ بات محال ہے کہ حق باطل سے پیدا ہو۔ غالب اور بیدل دونوں نے ''مجاز وحقیقت'' کی بحث چھیڑی ہے۔ کہتے ہیں المجاز قنطرۃ الحقیقۃ مجاز حقیقت کا پُل ہے۔ عشق مجازی سے آدمی عشق حقیقی تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ غالب کے نزدیک مشاہدہ حق کی گفتگو کے لئے ضروری ہے کہ مجازی تشبیہات و استعارات کا سہارا لیں۔ بیدل کہتے ہیں کہ تو مجاز اندیشی میں ایسا غرق ہو گیا کہ حقیقت کے سمجھنے کی تیرے اندر صلاحیت ہی نہیں رہی۔ وحدت الوجودی طبقہ کے نزدیک خدا کا وجود حق ہے اور جہان کا وجود باطل ہے لیکن اس باطل میں اس قدر محو ہو گئے اور اس میں ایسا کھو گئے کہ حق کو سمجھنے کی تمام صلاحیتیں مفقود ہو گئیں۔

کیوں جل گیا نہ تاب رخ یار دیکھ کر	برق جلوۂ حسنش را کراست تاب نگاہ
جلتا ہوں اپنی طاقت دیدار دیکھ کر	غنیمت است اگر سیر مہر و ماہ کنید
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کا مطلب یہ ہے کہ جلوہ یار دیکھ کر مجھے اپنی ہستی سے ہاتھ دھو لینا تھا۔ کیونکہ اس شکل میں زندگی کا مقصد مجھے حاصل ہو جاتا۔ مگر میں تو اتنا سخت جان نکلا کہ ابھی تک زندہ ہوں اس لئے اپنی طاقت دیدار پر غصہ آتا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ غصہ کی آگ میں جلا جا رہا ہوں۔ پھر جلنے میں بھی کوئی مزہ نہیں۔ مزہ تو جب تھا کہ جلوہ یار کی آگ میں جل کر بھسم ہو جاتا۔ بیدل کہتے ہیں اس کے جلوہ حسن کے برق کو نظر اٹھا کر دیکھنے کی کس کی نگاہ میں تاب ہے۔ اس لئے غنیمت ہے اگر سورج اور چاند کی سیر کرو۔ یعنی اسے دیکھو' جلوہ حسن محبوب کے دیکھنے'' کا تذکرہ غالب اور بیدل دونوں نے کیا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ غالب کو اپنی طاقت دیدار پر غصہ ہے۔ جبکہ بیدل کے نزدیک کوئی آدمی دیدار محبوب کی تاب لا ہی نہیں سکتا۔ غالب نے اس مضمون کو دوسری جگہ بیدل کے انداز میں بھی بیان کیا ہے۔

اے دلِ ناعاقبت اندیش ضبط شوق کر

کون لا سکتا ہے تابِ جلوۂ دیدار دوست

غور سے دیکھا جائے تو غالب کا مصرع ''کون لا سکتا ہے تابِ جلوۂ دیدار دوست'' بیدل کے مصرع ''برق جلوۂ حسنش را کراست تاب نگاہ'' کا لفظی ترجمہ ہے۔

آتش پرست کہتے ہیں اہل جہاں مجھے	بیدل چو نے ز نالہ نداریم چارہ ای
سرگرم نالہ ہائے شرر بار دیکھ کر	تا راہ جنبشِ نفس در گلوئے ماست
غالب	بیدل

غالب کہتے ہیں چونکہ میں سدا نالہ کرتا رہتا ہوں جس سے آگ برستی ہے اس لئے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میں آتش پرست ہوں۔ بیدل کہتے ہیں جب تک ہم عاشقوں کے گلے میں سانس کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری ہے بانسری کی طرح آہ و نالہ کئے بغیر کوئی چارہ کار نہیں۔ ''آہ و نالہ کی کثرت'' کا ذکر غالب اور بیدل دونوں نے کیا ہے اس فرق کے ساتھ کہ غالب اس کی بنا پر خود کو آتش پرست کہتے ہیں۔ جبکہ بیدل کے نزدیک سانس جب تک چل رہی ہے آہ و نالہ کئے بغیر چارہ نہیں۔ چنانچہ دوسرے شعر میں کہتا ہے:

چوں سپند آرام جسم درد ناکم نالہ است
برق جولانیکہ خواہد سوخت پاکم نالہ است

سپند یعنی کالے دانے کی طرح میرے دردناک جسم کی راحت و آرام نالہ سے ہے۔ وہ برق جولاں جو ہمیں بالکل راکھ کر کے رکھ دے یہی نالہ ہے۔

کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا	چوں شمع سر بلندیِ عشاق مفت نیست
رکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر	یعنی بقدر سوختن است آبروے ما
غالب	بیدل

چونکہ معشوق بلا وجہ درپے آزار ہے یعنی ہر کس و ناکس پر جفا کرتا ہے اور سچے اور جھوٹے عاشق کی تمیز نہیں کرتا اس لئے غالب کہتے ہیں مجھے اس سے اظہار محبت کرنے میں تامل ہے کیونکہ اگر میں ایسا کروں گا تو میرے عشق صادق کی توہین ہو جائے گی۔ بیدل کہتے ہیں شمع کی

طرح عاشقوں کو سر بلندی مفت حاصل نہیں ہوتی ہے۔یعنی ہم عاشقوں کی آبرو تو آتش عشق میں جلنے کے بقدر ہے جس قدر اس آتش میں جلیں گے یا جفائے معشوق سہیں گے اسی قدر ہم عاشقوں کی عزت و آبرو میں اضافہ ہوگا۔ جہاں تک معشوق کی جفا شعاری کا تعلق ہے بیدل کہتے ہیں یہ تو معشوقوں کی خصوصیت ہے۔ ع

رسم و آئینِ جفا خاصیت روئے نکوست

اور عاشق اس کا شکوہ نہیں کرسکتا۔

مپندارید عاشق شکوہ پردازد بہ بیدادش

''عشق یا عاشق کی آبرو'' بیدل اور غالب دونوں کا موضوع ہے لیکن دونوں متضاد سمتوں میں گئے ہیں۔

آتا ہے مرے قتل کو، پر جوش رشک سے	من بیدل نہ بودم ایں قدر پروانۂ جرأت
مرتا ہوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر	دمِ تیغ تو دیدم ذوق کشتن کرد سیمابم
غالب	بیدل

غالب کہتے ہیں گو محبوب مجھے قتل کرنے کے لئے آرہا ہے مگر تلوار کی اس خوش نصیبی پر کہ اسے محبوب کا قرب حاصل ہے اس قدر رشک آرہا ہے کہ موت سے پہلے مرا جاتا ہوں۔ بیدل کہتے ہیں مجھ میں اتنی جرأت تو نہ تھی کہ کہتا اے محبوب مجھے قتل کرو، ہاں تیرے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر تیرے ہاتھوں قتل ہونے کی خواہش نے مجھے سیماب کی طرح بیچین کردیا۔ محبوب کی تلوار دیکھ کر قتل ہونے کا تذکرہ غالب اور بیدل دونوں نے کیا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ غالب کو تلوار پر رشک ہے کہ اسے محبوب کا قرب حاصل ہے جبکہ بیدل کے نزدیک اس کے ہاتھوں قتل ہونے کی خواہش نے اسے بیچین کردیا۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کے مصرعہ ''مرتا ہوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر'' میں بیدل کے مصرعہ ''دمِ تیغ تو دیدم ذوق کشتن کرد سیمابم'' کا عکس موجود ہے۔

بک جاتے ہیں آپ متاعِ سخن کے ساتھ	خریداراں ہمہ سنگ اند معنیہائے نازک را
لیکن عیار طبع خریدار دیکھ کر	زیاں خواہی کشید اجناس بازار حلب مکشا
غالب	بیدل

غالب کہتے ہیں میرے کلام کا خریدار تو وہی شخص ہوسکتا ہے جو سخن فہم ہو اور چونکہ میں

سخن فہم کا قدرداں ہوں اس لئے مجھے ایسا لگتا ہے کہ اس نے میرا کلام کیا خرید ا گویا خود مجھے خریدلیا۔ بیدل کہتے ہیں نازک معانی ومضامین کے خریدار چونکہ سراسر سنگ یعنی پتھر دل یا پتھر ذہن ہوتے ہیں اس لئے حلب کے بازار میں اپنے سامان کی نمائش مت کرو ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔ یہاں غالب اور بیدل دونوں نے اپنے کلام کے خریدار کا تذکرہ کیا ہے اس فرق کے ساتھ کہ غالب کے نزدیک جو اعلیٰ سخن فہم ہیں وہ اس کے کلام کے خریدار ہیں اور چونکہ وہ ان کا قدرداں ہے اس لئے وہ سمجھتا ہے کہ خود غالب کو انھوں نے خریدلیا جبکہ بیدل کے نزدیک بیشتر خریدار اس کے کلام نازک کے سنگ دل یا سنگ ذہن ہیں بلکہ دوسرے شعر سے تو معلوم ہوتا ہے کہ خواص وعوام سب عام طور سے اس کے کلام کی تہہ تک نہیں پہنچ پاتے تھے:

نہ رسید فطرتِ ہیچ کس بہ خیال بیدل و معنیش
ہمہ راست بیخبری و بس ، چہ شعور خلق و چہ ہوش ما

اس لئے بازار میں اس کی نمائش کرنے سے گریز کرتا ہے۔

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پر خار دیکھ کر
غالبؔ

وادی عشق است اینجا منزل دیگر کجاست
جز نفس در آبلہ دزدیدن فرسنگہا
بیدلؔ

اس شعر میں غالب عام مسلمات سے ہٹ کر کہتے ہیں کہ عام طور سے لوگ راستے کو کانٹوں سے بھرا دیکھ کر گھبرا جاتے ہیں مگر میں اسے دیکھ کر خوش ہوتا ہوں کیونکہ جب آبلوں میں کانٹے چبھیں گے تو تکلیف بڑھے گی اور عاشق صادق کو جس قدر تکلیف زیادہ ہوگی اسی قدر اسے راحت محسوس ہوگی۔ بیدل کہتے ہیں یہ وادی عشق ہے یہ کوئی اور منزل نہیں ہے یہاں تو میلوں تک آبلہ پا چل کر سانس لینے یعنی تکلیف جھیلنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ چنانچہ دوسری جگہ اس خیال کو اس انداز سے پیش کرتا ہے:

درشتیہا گوارا می شود در عالمِ الفت
رگِ سنگ ملامت رشتۂ جاں بود مجنوں را

عشق کی راہ میں جو سختیاں اور کٹھنائیاں عاشق کو پیش آتی ہیں وہ اس کو گوارا ہوتی ہیں۔ چنانچہ سنگ

ملامت مجنوں کے لئے رشتہ جاں ثابت ہوا مطلب یہ ہے کہ مجنوں کو جب لوگوں نے لیلیٰ کے عشق میں لعنت ملامت کرنا شروع کیا تو اس سے اس کی محبت اور بڑھ گئی۔ ایک اور شعر میں کہتا ہے:

در آغوش شکنجِ دام الفت راحتی دارم

غور سے دیکھا جائے تو غالب کے شعر میں بیدل کے شعر کا عکس موجود ہے البتہ غالب نے نکتہ آفرینی اور مخصوص انداز بیان سے کام لے کر اس میں مزید دلکشی پیدا کر دی ہے۔

شبنم رم طینتم بیدل گر افسردم چہ باک	لرزتا ہے مرا دل زحمت مہرِ درخشاں پر
می زند بریک جہاں بے طاقتی نازم ہنوز	میں ہوں وہ قطرۂ شبنم جو ہو خار بیاباں پر
بیدلؔ	غالبؔ

غالب کہتے ہیں میری ہستی شبنم کے اس قطرے سے زیادہ نہیں ہے جو کانٹے کی نوک پر مائل بہ فنا ہو۔ آفتاب بلا وجہ مجھے فنا کرنے کی زحمت اٹھا رہا ہے۔ اس تصور سے میں لرزہ براندام ہوں۔ غالب نے ایک اور شعر میں لفظ شبنم کا استعمال اپنی فنا پذیری کے لئے کیا ہے:

پرتو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

بیدل کہتے ہیں میں ایک شبنم رم طینت ہوں۔ اگر افسردہ ہوا تو کوئی ڈر نہیں۔ میرا ناز ہنوز ایک دنیائے ناتوانی پر مسلط کرتا ہے۔ خود کو شبنم سے تشبیہ دے کر بیدل یہ کہنا چاہتا ہے کہ جس طرح شبنم ہر وقت اپنی ناتوانی کی وجہ سے مائل بہ رم یا فنا ہے میں بھی مائل بہ فنا ہوں اس لئے اس خیال سے اگر افسردہ اور پژمردہ ہوں تو کوئی اندیشے کی بات نہیں ہے۔ فنا پر میرے ناز نے ایک دنیا کو ناتواں اور کمزور بنا دیا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کے شعر میں بیدل کے شعر کی پوری چھاپ موجود ہے۔ خصوصاً غالب کے مصرعہ "میں ہوں وہ قطرۂ شبنم جو ہو خار بیاباں پر" میں بیدل کے مصرعہ "شبنم رم طینتم بیدل گر افسردم چہ باک" کا عکس موجود ہے۔ بیدل نے انسانی زندگی کی ناپائیداری کو حباب سے بھی تشبیہ دی ہے جو اپنے بودے پن، اور سست بنیاد ہونے میں مشہور ہے اور شبنم سے زیادہ موزوں اور مناسب ہے۔ کہتا ہے:

ہستی موہوم ما یک لب کشودن بیش نیست
چوں حباب از خجلت اظہار خاموشیم ما

ہماری موہوم ہستی جس کی ایک بار کی لب کشائی سے زیادہ نہیں ہے۔ چنانچہ حباب کی طرح اس کے اظہار کی ندامت سے ہم خاموش ہیں۔

من کیم تا در طلب چوں موج بر بندم کمر
یک نفس جانی کہ دارم چوں حبابم بر لبست

میں کون ہوں جو تلاش و جستجو میں موج دریا کی طرح کمر بستہ ہو جاؤں۔ میری جان جو ایک سانس بھر کے وقفہ سے زیادہ کی نہیں ہے حباب کی طرح میرے ہونٹ پر ہے۔

نہ چھوڑی حضرتِ یوسف نے واں بھی خانہ آرائی
سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر
غالبؔ

بوئے یوسف نیست پنہاں از غبار انتظار
پیرہن بیدل بیاض چشم یعقوبم بس است
بیدلؔ

غالب نے ایہام سے کام لیتے ہوئے سفیدی کے دو معنی لیے ہیں ایک تو آنکھ کی سفیدی دوسرے چونے کی سفیدی جو دیواروں کی آرائش کے لئے لگائی جاتی ہے۔ حضرت یعقوب کی آنکھیں چونکہ حضرت یوسف کو قید خانے کی چہار دیواریوں میں تلاش کر رہی تھیں اس بات سے غالب نے یہ مضمون پیدا کیا کہ حضرت یوسف نے قید خانے میں بھی خانہ آرائی کا انتظام کر دیا۔ چنانچہ دیدہ یعقوب کی سفیدی دیوار زنداں پر پھر رہی ہے۔ بیدل کہتے ہیں بوئے یوسف غبار انتظار سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ یا بوئے یوسف پر انتظار کی گرد نہیں جمی ہے۔ ان کا پیرہن چشم یعقوب کی سفیدی دور کرنے کے لئے کافی ہے۔ بیدل کا مطلب یہ ہے کہ یوسفؑ کی بو تو حضرت یعقوب کو پہلے سے مل رہی تھی۔ قرآن کہتا ہے انہوں نے بیٹوں سے کہا مجھے یوسف کی بو محسوس ہو رہی ہے اگر تم مجھے سڑی اور سر پھرا نہ سمجھو۔ (سورۂ یوسف) لیکن چشم یعقوب کی سفیدی کو دور کرنے کے لیے پیرہن یوسف ہی درکار تھا اور ایسا ہی ہوا۔ قرآن کہتا ہے جب ان کے چہرے پر پیرہن کو ڈالا گیا تو ان کی بینائی لوٹ آئی۔ (سورۂ یوسف) چشم یعقوب کی سفیدی کو غالب اور بیدل دونوں

نے موضوع بنایا ہے اس فرق کے ساتھ کہ غالب نے اس سے ایک نکتہ پیدا کیا جو مفروضات پر مبنی ہے۔ بیدل نے صرف قرآنی حقایق کو بیان کر دیا۔ غالب کا ایک اور شعر اس سلسلے کا ملاحظہ ہو:

نسیم مصر کو کیا پیر کنعاں کی ہوا خواہی
اسے یوسف کی بوئے پیرہن کی آزمائش ہے

نہیں اقلیم الفت میں کوئی طومار ناز ایسا	عالم تمام خوں شد و از چشم ما چکید
کہ پشت چشم سے جس کی نہ ہوئے مہر عنواں پر	خوباں ہنوز منکر دلہائے خستہ اند
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کا مطلب ہے کہ کشورِ عشق میں کوئی طومار ناز یعنی عاشق ایسا نہیں ہے جس کے دل پر معشوق کی بے اعتنائی کی مہر نہ لگی ہوئی ہو۔ یعنی جسے معشوق کی بے رخی کا صدمہ برداشت کرنا نہ پڑا ہو۔ بیدل کہتے ہیں سارا عالم خون ہو کر میری آنکھوں سے ٹپک رہا ہے اس کے باوجود حسینان جہاں ہنوز عاشقوں کے خستہ اور زخمی دلوں کی اہمیت کو ماننے کو تیار نہیں ہیں۔ بیدل کا مقصد یہ ہے کہ معشوقوں کی بے اعتنائی کی وجہ سے عاشقوں کو خون کے آنسو رونا پڑا۔ اس کے باوجود ان کا دل نہیں پگھلا اور ان پر ان کو ترس نہیں آیا۔ اس لئے سرے سے ان کی خستگی کا انکار کرتی ہیں۔ معشوق کی بے اعتنائی اور سرد مہری غالب اور بیدل دونوں کا موضوع ہے غور سے دیکھا جائے تو بیدل کے پورے شعر کا عکس غالب کے شعر میں موجود ہے لیکن بیدل کی نزاکت بیان کو وہ اپنے شعر میں منتقل نہ کر سکے۔ بیدل کا ایک اور شعر اسی مفہوم میں ہے۔ جس کے اندر وہ معشوق کی بے اعتنائی اور عتاب کو ان کا جوہر ذاتی قرار دیتا ہے:

عتاب لالہ رخاں عرض جوہر ذاتیست
ز شعلہ ہا نتواں برد گرمی خو را

فنا تعلیم درس بیخودی ہوں اس زمانے سے	جمعیت حواس در آغوش بیخودیست
کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوار دبستاں پر	از ہوش بہرہ نیست کسے را کہ مست نیست
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کا مطلب ہے کہ فنا فی المعشوق ہو کر بیخودی کا سبق میں اسی وقت سے پڑھ رہا

ہوں جب مجنوں عالم طفلی میں دیوار مکتب پر لام الف لکھ رہا تھا۔ یعنی وہ بے شعور تھا۔ اس لئے مجھ کو مجنوں پر بالاتری حاصل ہے۔ بیدل کہتے ہیں حواس کو سکون تو بیخودی کی آغوش ہی میں ملتا ہے جو آدمی فنا فی المعشوق ہو کر مست و بیخود نہیں ہے اس کو ہوش و حواس سے بھی کچھ حصہ نہیں ملتا۔ غالب اور بیدل دونوں نے فنا فی المعشوق ہو کر بے خودی کو اپنا موضوع بنایا ہے البتہ غالب نے ایک نکتہ پیدا کیا کہ میں اسی وقت سے فنا فی المعشوق ہوں جب مجنوں، جو فنا فی المعشوق ہونے کے لیے مشہور ہے، مکتب میں زیر تعلیم تھا۔ بے خودی بیدل کا بہت ہی پسندیدہ موضوع ہے اور اس کو نت نئے اسلوب سے بیان کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہزار جلوہ در آغوش بیخودی محو است
جہاں شعور طلب می کند تو خواب طلب

اے بیخودی بیا کہ زمانی ز خود رویم
جز ما دگر کہ نامہ رساند بیار ما

نہ لڑ ناصح سے غالب کیا ہوا گر اس نے شدت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر
غالبؔ

بہ کہ تیغی برکشیم و گردن ملا زنیم
شرم حیرانست با ایں مردک تقریر جنگ
بیدلؔ

غالب کہتے ہیں ناصح اگر تجھ سے سختی سے پیش آئے اور بلا وجہ تجھ پر الزام دھرے تو اس سے دست و گریباں ہونے کی ضرورت نہیں۔ دنیا میں ہمیشہ قوی کمزور کو دبایا کرتے ہیں۔ پھر یہ کہ ناصح نے اس خصوصیت کے باوجود سختی کی تو تو بھی تو گریباں چاک کر کے اس پر سختی کرتا ہے۔ بیدل کہتے ہیں بہتر یہی ہے کہ تلوار کھینچ کر ملا کی گردن اڑا دیں۔ اس مردک (بھڑوے) پر جس کی تقریر میں بجائے امن و آشتی کے ہر وقت جنگ و جدل کی بات رہتی ہے خود شرم حیران و پریشان ہے۔ لگتا ہے بیدل کو مولوی ملاؤں سے زبرست نوک جھونک رہی ہے۔ خصوصیت سے اس کی ریش تراشی اور زاہدوں پر نکتہ چینی نیز دیگر مسائل پر مولویوں کے اعتراض نے اسے آگ بگولہ کر دیا

تھااور اس قدر وہ آپے سے باہر ہو گیا تھا کہ ان کی گردن ناپ دینا چاہتا تھا۔ غالب کو بھی ایسی صورت حال پیش آئی ہے۔ ان کی میکشی اور نماز روزے سے بے اعتنائی کی بنا پر لوگوں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ مگر وہ آپے سے باہر نہیں ہوئے اور شوخی سے صرف یہ کہہ کر ٹال دیا کہ آخر تم بھی تو غریب گریباں کو چاک کر کے اس پر ستم ڈھا رہے ہو۔ ایک خط میں جو انجانے مظہر علی اور عبداللہ کے نام ہے ان کے خط کے حوالے سے غالب نے ان کا قول نقل کیا ہے: تو نماز کیوں نہیں پڑھا کرتا؟ خبردار نماز پڑھا کر اور نماز نہ پڑھے گا تو بعد مرنے کے بھوت بن جائے گا۔ غالب نے اس کے جواب میں لکھا: اب میں قہر درویش بر جانِ درویش پر عمل کر کے چپ ہو رہتا ہوں مگر حافظ کا شعر جواب میں لکھتا ہوں:

من اگر نیکم وگر بد تو برو خود را بیں
ہر کسی آں درود عاقبت کار کہ کشت (۱۱۳)

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات	نہ رسید فطرت ہیچ کس بخیال بیدل و معنیش
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور	ہمہ راست بیخبری و بس چہ شعور خلق و چہ ہوشہا
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں اے خدا چونکہ میری گفتگو سے میرا مقصد وہ نہیں سمجھے ہیں اور نہ سمجھ سکتے ہیں۔ اس لئے اگر تو مجھے ایسی زبان عطا نہیں کرنا چاہتا جو انھیں دلی مطلب سے آگاہ کر سکے تو ان کو ایسا دل عطا کر دے جو وہ میری بات سمجھ سکیں۔ حالی مرحوم لکھتے ہیں یہ شعر بظاہر معشوق کے حق میں معلوم ہوتا ہے مگر اس میں در پردہ ان لوگوں کی طرف بھی اشارہ ہے جو مرزا کے کلام کو بے معنی یا بعید الفہم کہتے تھے (۱۱۴)۔ بیدل کہتے ہیں کسی کی فطرت (ذہن) کو بیدل کے خیال اور اس کے معنی تک رسائی نہیں ہو سکی، چاہے عام لوگوں کا شعور ہو چاہے خواص کا ہوش ہو۔ مطلب یہ ہے کہ بیدل کے کلام کی گہرائی عوام و خواص کسی کے بس کی بات نہیں۔ خیال یا کلام کی تہہ تک عام لوگوں کی نارسائی غالب اور بیدل دونوں کا موضوع ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ غالب خدا سے دعا کرتے ہیں کہ اگر زبان و بیان ہم کو ایسی نہیں ملی تو کم از کم ان کو دل ہی ایسا دے جو ہماری بات سمجھ لیں

۔بیدل کا خیال ہے کہ لوگ چونکہ عام طور سے ہوش وگوش اور فہم وشعور سے بیگانہ ہوتے ہیں اس لیے وہ ہماری بات نہیں سمجھ پاتے۔غور سے دیکھا جائے تو غالب کے پہلے مصرعہ ''یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات'' میں بیدل کے مصرعہ ''نہ رسید فطرت ہیچ کس بخیال بیدل و معنیش'' کی جھلک موجود ہے۔ایک اور شعر میں بیدل کہتے ہیں کہ چونکہ ہم عجز فروش یا منکسر المزاج کی زبان عربی ہے اس لیے کوئی ہمارے مطلب موہوم یا ہماری بات کو نہیں سمجھ سکتا:

بہ فہم مطلب موہوم ما کہ پردازد

زبان عجز فروشاں مدعا عربیست

ابرو سے ہے کیا اس نگہ ناز کو پیوند	چشم مستش عین ناز و ابروے مشکیں ناز محض
ہے تیر مقرر مگر اس کی ہے کماں اور	ایں چہ طوفانست یارب ناز بر بالائے ناز
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ اس کی نگہ ناز تو بلاشبہ ایک تیر ہے مگر اس کو ابرو سے کوئی ربط اور مناسبت نہیں ہے۔یہ تیر کمان ابرو سے نہیں نکلا بلکہ اس کی کمان اس کے حسن کی دلکشی ہے۔بیدل کہتے ہیں اس کی مست نگاہ عین ناز ہے،اور ابروے مشکیں تو ناز محض ہے،خدایا یہ کون سا طوفان ہے کہ ناز بر بالائے ناز ہے۔محبوب کی نگہ ناز کو غالب اور بیدل دونوں نے موضوع بنایا ہے اس فرق کے ساتھ کہ غالب کے نزدیک نگہ ناز کو ابرو سے کوئی ربط نہیں،جبکہ بیدل کے نزدیک نگہ ناز اگر عین ناز ہے تو ابرو ناز محض ہے،اور اس ناز بر بالائے ناز کو بیدل ایک طوفان قرار دیتا ہے۔یہاں غالب نے بیدل سے اختلاف کیا ہے۔

ہر چند سبک دست ہوے بت شکنی میں	غرور ہستی و فکر حضور حق خیالست ایں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگ گراں اور	سری در جیب آگاہی بہ ایں گردن نمی گنجد
غالبؔ	بیدلؔ

حالی لکھتے ہیں اس شعر میں سارا زور ''ہم'' کے لفظ پر ہے یعنی جب تک ہماری ہستی باقی ہے اس وقت تک راہ معرفت الٰہی میں ایک اور سنگ گراں سد راہ ہے۔پس اگر ہم نے بت

توڑنے میں سبک دستی حاصل کی تو کیا فائدہ، یہ بڑا بھاری بت یعنی ہماری ہستی تو ابھی موجود ہے۔۱۱۵) بیدل کہتے ہیں ہستی کے غرور کے ساتھ حضور حق کی فکر ایک نرا خیال ہے۔ جیب آگاہی میں سر اس گردن کے ساتھ نہیں سما سکتا۔ بیدل کا مطلب یہ ہے کہ اپنی ہستی پر غرور کر کے کہ ہم بھی کچھ ہیں یا اس کا شعور رکھ کر ہم حضور حق کا تصور نہیں کر سکتے چونکہ فنا فی اللہ یا وحدۃ الوجود جس کو بیدل نے ''حضور حق'' سے تعبیر کیا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ اپنی ہستی کا شعور دل و دماغ سے نکال دیں۔ ہستی کا شعور اس کے راستے میں ایک رکاوٹ ہے۔ وحدۃ الوجود کی آگاہی اور شعور اس گردن یعنی غرور ہستی یا شعور ہستی کے ساتھ نہیں سما سکتی ۔ بیدل اور غالب دونوں نے ''وحدۃ الوجود'' کے راستے میں ''ہستی'' کو ایک رکاوٹ تصور کیا ہے۔ البتہ دونوں نے مثالیں الگ الگ دی ہیں۔ غالب کے مصرع ''ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگ گراں اور'' میں بیدل کے مصرع ''غرور ہستی و فکر حضور حق خیالست ایں'' کا عکس موجود ہے۔

ہے خون جگر جوش میں دل کھول کے روتا
ہوتے جو کئی دیدہ خونابہ فشاں اور
غالبؔ

بیدل از فہم تلاش درد غافل نہ گذری
دل بصد خون جگر یک آہ موزوں می کند
بیدلؔ

غالب نے اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ اگر میری دو آنکھوں کے علاوہ چند اور آنکھیں بھی ہوتیں تو میں دل کھول کے روتا، کیونکہ خون جگر جوش میں ہے اور طبیعت خود بخود رونے بلکہ خون برسانے پر آمادہ ہے جس کے لئے صرف یہ دو آنکھیں کافی نہیں ہیں۔ بیدل کہتے ہیں دردِ عشق کی اہمیت سمجھنے میں غفلت سے کام نہ لینا، سیکڑوں خون جگر بہانے کے بعد ہی دل ایک موزوں آہ نکال پاتا ہے۔ بیدل اور غالب دونوں نے ''خون جگر'' کا تذکرہ کیا ہے، اس فرق کے ساتھ کہ غالب کے نزدیک خون جگر جوش مار رہا ہے۔ اس لئے دل کھول کر رونے کی خواہش ہے۔ جس کے لئے دونوں آنکھیں کافی نہیں ہیں۔ بیدل کے نزدیک سیکڑوں خون جگر بہانے کے بعد ہی ایک موزوں آہ نکلتی ہے۔ اس لئے وہ دردِ عشق کی اہمیت کو سمجھنے پر زور دیتا ہے۔ چنانچہ اس کا دوسرا شعر اس خیال کی تائید کرتا ہے:

در تب شوق آرزوہا زیر لب خوں کردہ ام
نالہ جوشد گر بیفشارند تبخال مرا

لوگوں کو ہے خورشید جہاں تاب کا دھوکا
ہر روز دکھاتا ہوں میں ایک داغ نہاں اور
غالبؔ

چساں با دوست درد و داغ چندیں سالہ بنویسم
نیستاں صفحہ مسطر زند تا نالہ بنویسم
بیدلؔ

غالب کہتے ہیں ہر روز ایک تازہ داغ جگر دکھاتا ہوں، میرے داغ ہائے جگر پر لوگوں کو ایک خورشید جہاں تاب کا دھوکا ہوتا ہے۔ یعنی وہ سمجھتے ہیں کہ یہ وہ آفتاب ہے جو ہر روز طلوع ہوتا ہے۔ بیدل کہتے ہیں اپنے چند سالہ درد و داغ کا حال احباب کو کس طرح لکھوں۔ نیستاں (نرکل کا جنگل) میرے خط کے صفحہ پر مسطر سے نشان کھینچتا ہے کہ میں نالہ لکھوں۔ بیدل اور غالب دونوں نے داغ کا تذکرہ کیا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ غالب کو ہر روز ایک نئے داغ سے سابقہ ہے جسے وہ احباب کو دکھاتا ہے تو اس پر ان کو آفتاب کا دھوکا ہوتا ہے۔ جبکہ بیدل بہت اس قدر داغہائے جگر سہ چکے ہیں کہ ان کا تذکرہ احباب سے کرتے ہوئے تذبذب میں گرفتار ہیں۔

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے میری طبع تو ہوتی ہے رواں اور
غالبؔ

باہمہ افسردگی گر راہِ فکری واکنیم
جیب ما خمخانۂ جوش فلاطوں می شود
بیدلؔ

حالی لکھتے ہیں نالے یعنی ندی نالے نہ کہ آہ و نالے۔ یہ مثال (جب راہ نہیں پاتے ندی نالے چڑھ جاتے ہیں یعنی پانی کناروں سے باہر نکل آتا ہے) کس قدر ممثل لہ کے مطابق ہے اور مضمون کتنا مطابق واقع کے ہے۔ فی الحقیقت رنج و مصیبت کے سبب جوں جوں شاعر کی طبیعت رکتی ہے اسی قدر زیادہ راہ دیتی ہے۔ خصوصاً جو مضمون وہ اس وقت اپنے حسب حال لکھتا ہے وہ نہایت موثر اور درد انگیز ہوتا ہے۔ (۱۱۶) بیدل کہتے ہیں تمام تر افسردگی خاطر کے باوجود اگر ہم راہ فکر و اندیشہ کو وا کریں تو ہمارا گریباں جوش فلاطوں کا خمخانہ ہو جائے۔ افلاطون اپنے علم دانش کے

لئے مشہور ہے۔ اس لئے گریباں کے خمخانہ فلاطون ہونے کا مطلب یہ ہوا کہ میرے گریباں میں بے انتہا علم و دانش اور حکمت و فلسفہ کے نکتے اکٹھے ہو جائیں: ع

صد رنگ صریر قلمم ریشہ دواند

غالب اور بیدل دونوں نے نامساعد حالات میں بھی اپنی طبع رواں اور ذوق شاعری کی کارپردازی کے جاری رہنے کا ذکر کیا ہے۔ البتہ غالب نے اسے اچھوتے انداز سے بیان کیا۔

مباش غافل از انداز شعر بیدل ما	ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
شنیدنیست نوائے کہ کم نواختہ اند	کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور
بیدلؔ	غالبؔ

غالب کے انداز بیان کی کشش ایک ایسی حقیقت ہے جس پر تمام ناقدین بھی متفق ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ جو آدمی ان کے کلام کا بغور مطالعہ کرے گا اس کو غالب کے اس دعویٰ سے اتفاق کرنا پڑے گا۔ اس لئے بجا طور پر اسے اپنے انداز بیان پر فخر کرنے کا حق ہے۔ بیدل کہتے ہیں شاعری میں ہمارے انداز بیان سے غفلت نہ برتنا جس نغمے کو بہت کم شاعروں نے چھیڑا ہے وہ سننے سے تعلق رکھتا ہے۔ غالب کا ایک فارسی شعر اسی مفہوم میں ملاحظہ ہو:

از تازگی بدہر مکرر نمی شود
نقشی کہ کلک غالب خونیں رقم کشد

بیدل دوسری جگہ کہتا ہے:

غنچہ شو بوئے طرز کلامم نازکست
بے تامل نیست ممکن کس باین انشا رسد

غنچہ کی طرح سکڑ جاؤ میرے انداز بیان کی خوشبو بہت نازک ہے۔ کسی کے بس میں نہیں کہ غور و فکر کئے بغیر وہاں تک رسائی حاصل کر سکے۔ غالب اور بیدل دونوں نے اپنے ''انداز بیان اور اسلوب کلام کی دوسروں پر برتری'' کا ذکر کیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ دونوں اس کے مستحق ہیں البتہ غالب کے ہاں سادگی اور پرکاری کی خصوصیت نمایاں ہے جبکہ بیدل کے یہاں تامل اور تدبر اور نغمگی کی خصوصیت نمایاں ہے۔ چنانچہ کہتا ہے:

کسی جز منتہی مضمون عنوانم نمی فہمد

یا یہ کہتا ہے:

نغمۂ پردۂ دل از ہمہ آہنگ جداست
بے تامل نگذشت است کسی از سرِ ما

نہ کی سامان عیش و جاہ نے تدبیر وحشت کی	وحشت ما چہ خیالست بہ راحت سازد
ہوا جامِ زمرد بھی مجھے داغ پلنگ آخر	نالہ ای نیست کہ ساید بزمیں پہلو را
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کا مطلب ہے کہ اسباب عیش وعشرت نے عاشق کی وحشت کو دور نہیں کیا۔ چنانچہ میں نے جام زمرد میں شراب پی، جسے عام طور پر دولت مندلوگ استعمال کرتے ہیں۔ لیکن وحشت دور ہونے کے بجائے وہ داغ پلنگ ثابت ہوا یعنی وحشت میں مزید اضافے کا سبب بنا۔ کیونکہ پلنگ (چیتا) اپنی وحشت کے لئے مشہور ہے۔ مقصد یہ ہے کہ دولت سے سکون قلب حاصل نہیں ہوتا۔ بیدل کا مطلب یہ ہے کہ وحشت وراحت میں تال میل نہیں ہے۔ جہاں وحشت ہو ممکن نہیں وہاں راحت ہو، دونوں میں ایک طرح سے مغایرت ہے۔ خصوصاً عاشق کو تو وحشت سے رہائی ممکن ہی نہیں۔ چنانچہ ایک شعر میں کہتا ہے:

غیر وحشت کیست تا گردد مقیمِ خانہ ام
سیل ہم بیش از دمی مہمان ایں ویرانہ نیست

وحشت کے سوا کون سی چیز ہے جو ہمارے گھر میں قیام کرسکتی ہے۔ یا دوسری جگہ کہتا ہے:

بیقراران جنوں را منع وحشت مشکلست

وحشت بیدل کا بہت ہی محبوب موضوع ہے اس نے مختلف پیرائے میں اس کو بیان کیا ہے۔ یہاں اس کا موقع نہیں ہے۔ وحشت وراحت میں مغایرت کو غالب اور بیدل دونوں نے بیان کیا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کے مصرعہ ''نہ کی سامان عیش و جاہ نے تدبیر وحشت کی'' میں بیدل کے مصرعہ ''وحشت ماچہ خیالست بہ راحت سازد'' کا عکس موجود ہے۔

صفائے حیرت آئینہ ہے سامانِ زنگ آخر
تغیر، آبِ برجا ماندہ، پاتا ہے رنگ آخر
غالبؔ

رمز صفائے آئینہ ہا واشگافتیم
اسمِ کدورتی است کہ از اشک پاک شد
بیدلؔ

چوں باز عرض نوبت زنگار وارسید
آئینہ را بسنگ ہماں اشتراک شد

آئینہ فولادی پر جو زنگ لگ جاتا ہے غالب نے اس شعر میں اس کی شاعرانہ توجیہ پیش کی ہے۔ یعنی اس شعر میں حسنِ تعلیل کا رنگ ہے۔ کہتے ہیں کہ آئینہ میں زنگ اس لئے لگ جاتا ہے کہ وہ حیران ہے (شعرا عموماً آئینہ کو حیران باندھا کرتے ہیں) اور حیران کے لئے جمود لازم ہے اور جو چیز جامد ہو جائے اس میں کثافت پیدا ہو جاتی ہے۔ دوسرے مصرعہ میں مثال سے اپنے دعوے کو ثابت کیا ہے کہ جو پانی ٹھہرا ہوا رہتا ہے اس کا رنگ اور مزا بدل جاتا ہے۔ بیدل کہتے ہیں کہ آئینہ کی صفائی کے رموز سے ہم نے اس طرح پردہ ہٹایا کہ کدورت نام کی ایک چیز اس پر جمی تھی جسے ہم نے آنسوؤں سے پاک کیا۔ جب دوبارہ اس پر زنگ لگنے کی نوبت آئی تو آئینہ کا پتھر کے ساتھ اشتراک ہو گیا۔ بیدل نے ایک جگہ آئینہ کی خصوصیت یوں لکھی ہے:

"آئینہ تا کدورت دارد تسلیم خراشش ضروری است و چوں بہ صیقل رسید در انطباع خوب وزشت ناصبوری" (۱۱۷)

آئینہ پر اگر زنگ لگ جائے تو اس کی صیقل ضروری ہے اور صیقل اس پر ہو جائے تو اچھی بری چیز کا عکس قبول کرنے میں وہ بے صبر ہو جاتا ہے۔ اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ آئینہ کی خاصیت عکس پذیری ہے: ع

نیست اظہار خلاف ہیچ کس آئینہ را

مگر زنگ لگ جانے سے اس کی یہ خصوصیت جاتی رہتی ہے اس لئے صیقل گر کے حوالے کر کے اس کی قلعی اور صفائی کی جاتی ہے۔ اس لئے میرے خیال میں غالب کا مطلب یہی ہے کہ سامانِ زنگ آخر کار آئینہ کی صفائی کا تقاضا کرتا ہے اور جہاں تک حیرت کے لئے جمود کے لازم ہونے کا تعلق ہے بیدل کا خیال ہے کہ حیرت سے نگاہوں کو عروج حاصل ہوتا ہے۔ جمود نہیں۔ اس کا قول

ہے" امداد حیرت حوصلہ بخش عروج نظر باشد" (۱۱۸)

جنوں کی دستگیری کس سے ہو، گر ہو نہ عریانی	از چاک گریباں بدلی راہ نہ کردیم
گریباں چاک کا حق ہو گیا ہے میری گردن پر	کارے عجبے داشت جنوں ، آہ نہ کردیم
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کا مطلب یہ ہے کہ عاشق اگر عریاں نہ ہو تو اس کے جنوں کا اظہار نہیں ہو سکتا۔ چاک گریباں نے مجھے عریاں کر کے میرے جنوں کی دستگیری کی اس لئے میں اس کا ممنون ہوں۔ بیدل کہتے ہیں چاک گریباں سے (یا گریباں چاک کر کے) میں نے محبوب کے دل تک رسائی کا راستہ ہموار نہیں کیا۔ جنوں کا بھی عجیب و غریب عمل ہے افسوس کہ میں نے اسے انجام نہیں دیا۔ یہاں "چاک گریباں" غالب اور بیدل دونوں کا موضوع ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ غالب کے نزدیک چاک گریباں کی دستگیری سے اس کا جنون پایہ ثبوت کو پہنچا۔ اس لئے وہ اس کا ممنون ہے۔ جبکہ بیدل کے نزدیک چاک گریباں سے مقصود محبوب کے دل تک رسائی تھی اور یہی جنون کی کارفرمائی تھی وہ حاصل نہیں ہوئی، اس لئے اس پر اسے افسوس ہے۔ غالب نے یہاں بیدل سے اختلاف کیا ہے۔ جنون پر بیدل کے بہت سے اچھے اشعار ہیں۔ کچھ ملاحظہ ہوں:

در جنوں حسرت عیش دگر از بیخبریست
موئے ژولیدہ ہماں سایۂ بید است اینجا

فسردہ ایم بزندان عقل چارہ محال است
جنوں مگر کہ قیامت گری بر آورد از ما

برنگ کاغذ آتش زدہ نیرنگ بیتابی	لبے عام است در وحشت سرائے دہر بیتابی
ہزار آئینہ دل باندھے ہے بال یک تپیدن پر	دلِ ہر ذرہ دارد در قفس چندیں تپیدنہا
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں بیتابی و بیقراری کا عجیب حال ہے ایسا لگتا ہے کہ کسی نے تڑپنے والے بازوؤں پر ہزاروں بے قرار دل باندھ دیے ہیں اور یہ کیفیت جلے ہوئے کاغذ کے مانند ہے جس پر

نقطے ایک چمک کے ساتھ نمودار ہو جاتے ہیں۔ غالب نے بال یک تپیدن کو کاغذ آتش زدہ سے اور اس کے نقاط روشن کو دلوں سے تشبیہ دی ہے۔ مقصود انتہائی تپش اور اضطراب کا اظہار ہے۔ بیدل کہتے ہیں اس وحشت سرائے دہر میں بیتابی و بیقراری ایک عام بات ہے۔ حتیٰ کہ ہر ذرے کا دل قفس میں کئی کئی تپش اور بے قراری کا حامل ہے۔ ''غیر معمولی اضطراب اور بے قراری'' بیدل اور غالب دونوں کا موضوع ہے۔ بیدل نے اس کو نہایت سادگی سے ادا کر دیا ہے جبکہ غالب نے استعارات و تشبیہات کے لباس میں ملبوس کر کے پیش کیا ہے۔ غالب کے کلام میں لفظ بیتابی اور تپیدن کا استعمال جو بیدل کے شعر میں بھی ہے واضح کرتا ہے کہ اس کے نہاں خانہ دماغ میں بیدل کا یہ شعر موجود تھا۔

فلک سے ہم کو عیش رفتہ سے کیا کیا تقاضا ہے	از فلک بے نالہ کامِ دل نمی آید بدست
متاعِ بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر	شہد خواہی آتشی زن خانہ زنبور را
غالبؔ	بیدلؔ

حالی اس کی شرح میں لکھتے ہیں: یہ مضمون بھی بالکل واقعیات میں سے ہے جو لوگ آسودگی کے بعد مفلس ہو جاتے ہیں وہ ہمیشہ اپنے تئیں مظلوم، ستم رسیدہ اور فلک زدہ سمجھا کرتے ہیں اور آخر دم تک اس بات کے متوقع رہتے ہیں کہ ضرور کبھی نہ کبھی ہمارا انصاف ہو گا اور ہمارا اقبال عود کرے گا۔ (۱۱۹) مطلب یہ ہے کہ فلک سے عیش رفتہ سے امید رکھنی ایسی ہی ہے جیسے ڈاکو سے لوٹی ہوئی چیز کی واپسی کی امید۔ بیدل کہتے ہیں نالہ و شیون کئے بغیر آسمان سے دل کی مراد پوری نہیں ہوتی۔ شہد اگر مطلوب ہے تو شہد کی مکھی کے چھتے کو نذر آتش کر دو۔ یہاں غالب اور بیدل دونوں نے آسمان کا شکوہ کیا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ غالب اس سے عیش رفتہ کی واپسی کی امید نہیں رکھتے جس طرح لوٹے ہوئے مال کی واپسی کی امید رہزن سے نہیں ہوتی۔ جبکہ بیدل کا خیال ہے کہ جس طرح شہد کی مکھی کے چھتے میں آگ لگائے بغیر شہد نہیں مل سکتا اسی طرح آہ وزاری اور نالہ و شیون کئے بغیر آسمان سے دل کی مراد برآنے کی توقع نہیں ہے۔ ایک دوسرے شعر میں بیدل شکوہ گردوں کو تنگدستی کی علامت قرار دیتا ہے۔

شکوہ از گردوں دلیل تنگدستی ہائے ماست
نالہ در پرواز باشد طائر پر بستہ را

فنا کو سونپ اگر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا	بیدل ازیں چار سو عشوۂ دیگر مخر
فروغ طالع خاشاک ہے موقوف گلخن پر	غیر فنا ہیچ چیز نزد حق ارزندہ نیست
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں خس وخاشاک بظاہر نہایت بے وقعت چیز ہے لیکن جب یہی خاشاک اپنا وجود انگیٹھی کو سونپ دیتا ہے تو اس میں آگ کے خواص پیدا ہو جاتے ہیں جس کو قسمت کی چمک بھی کہہ سکتے ہیں۔ اسی طرح اگر تو اپنی حقیقت یا معرفت حاصل کرنا چاہتا ہے تو خود کو عشق الٰہی کی آگ میں جھونک دے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تیرے اندر ایزدی صفات کا رنگ پیدا ہو جائے گا۔ جب نفس کی آلائش ختم ہو جائے گی تو تیری خودی کندن کی طرح چمکنے لگے گی۔ اس وقت تجھے اپنی حقیقت سے آگاہی ہو جائے گی کہ میں مظہر ذات باری ہوں۔ بیدل کہتے ہیں ان چاروں سمتوں یعنی کسی طرف سے اور کہیں سے کوئی اور عشوہ وادا مت اختیار کر۔ فنا فی العشق یا فنا فی اللہ کے سوا کسی چیز کی خدا کے یہاں کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ یہاں فنا فی اللہ یا فنا فی العشق کو غالب اور بیدل دونوں نے موضوع بنایا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کے مصرعہ ''فنا کو سونپ اگر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا'' میں بیدل کے مصرعہ ''غیر فنا ہیچ چیز نزد حق ارزندہ نیست'' کا عکس پایا جاتا ہے۔ اصل میں یہ وحدت الوجود کا مسئلہ ہے کہ انسان اگر خدا سے تعلق قائم کرنا چاہتا ہے تو اسے اپنی ہستی کو خدا کی ہستی میں نابود کر دینا ہوگا۔ کیونکہ وہ باقی ہے ہم فانی ہیں۔ فانی باقی تک کیسے پہنچ سکتا ہے۔ اس خیال کو بیدل نے اور واضح الفاظ میں درج ذیل اشعار میں بیان کیا ہے:

بیدل چہ خیالست بہ آں جلوہ رسیدن
او ہستی و ما نیستی ، او جملہ و ما ہیچ

پیوستگی بحق ز دو عالم بریدن است
دیدار دوست ہستی خود را ندیدن است

در جناب کبریا جز نیستی مقبول نیست
خدمت اندیشیدن ما موجب تقصیر شد

غالب کا ایک فارسی شعر اسی مفہوم میں یوں ہے:

کو فنا تا ہمہ آلایش پندار برد
از صور جلوہ و از آئینہ زنگار برد

اسد بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے	گرد نیازم ، از سر کویت کجا روم
تو مشق ناز کر، خون دو عالم میری گردن پر	بسمل اگر پری بفشاند پرندہ نیست
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں اسد محبوب کی اداؤں پر اس درجہ مٹا ہوا ہے کہ اس سے کہتا ہے تو شوق سے مشق ناز کیے جا یعنی انسانوں کو اپنی تیغ ادا سے قتل کئے جا۔ قیامت میں باز پرس کا خیال ہرگز دل میں نہ لا۔ میں تیری طرف سے دونوں جہاں کا خون اپنی گردن پر لے لوں گا۔ تجھے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ معشوق کا ناز اور عاشق کی نیازمندی ایک مسلمہ اصول ہے: ع

نیاز و ناز باہم بسکہ یکرنگند در محفل

اس اصول کے تحت بیدل کہتے ہیں کہ اے معشوق تو ناز دکھا اور میں نیاز کا اظہار کرتا رہوں۔ بلکہ میں تو نیاز کی گرد ہوں، تیری گلی کو چھوڑ کر کہاں جاؤں گا۔ جس طرح بسمل اگر اپنے پر و بازو پھڑ پھڑائے تو اڑ نہیں سکتا۔ گویا میں بھی ایک طرح سے بسمل ہوں کہ کشتہ ناز ہو کر تیری گلی میں پر پھڑ پھڑا رہا ہوں۔ غالب اور بیدل دونوں نے ''کشتہ ناز معشوق'' ہونے کا تذکرہ کیا ہے۔ البتہ غالب نے نکتہ آفرینی سے کام لے کر اس میں مزید دلکشی پیدا کی ہے۔ دونوں کے کلام کا تقابلی مطالعہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ اس شعر کی تخلیق کے وقت غالب کے ذہن میں بیدل کا یہ شعر تھا۔

فارغ مجھے نہ جان کہ مانند صبح مہر	مرگم نہ کرد ایمن از آشوب زندگی
ہے داغ عشق زینت جیب کفن ہنوز	جمعست رشتہ ہائے امل در کفن ہنوز
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں یہ مت سمجھو کہ مر کر مجھے سودائے عشق سے نجات مل گئی ۔ داغ عشق آفتاب صبح کی طرح ہنوز میرے گریبان کفن کی زینت بنا ہوا ہے۔ یعنی مر کر بھی میں بدستور عشق میں مبتلا ہوں۔ بیدل کہتے ہیں میری موت نے آشوب زندگی سے مجھے نجات نہیں بخشی۔ آرزوں (عشق) کے دھاگے ہنوز میرے کفن میں جمع ہیں۔ ہنوز کی ردیف میں بیدل کے اس شعر سے غالب کے شعر کا موازنہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس غزل کو کہتے وقت غالب کے سامنے بیدل کی یہ غزل رہی ہے۔ کیونکہ دونوں کا مضمون اور انداز بہت حد تک یکساں ہے۔ خصوصیت سے غالب کا مصرعہ: ہے داغ عشق زینت جیب کفن ہنوز" میں بیدل کے مصرعہ "جمعست رشتہ ہائے امل در کفن ہنوز" کا عکس پوری طرح موجود ہے، بلکہ ایک طرح سے اس کا ترجمہ ہے۔ بیدل نے اس موضوع پر بہت سے اچھے اشعار کہے ہیں۔ چند ملاحظہ ہوں:

نگہ شد شمع فانوس خیال از چشم پوشیدن
فنا مشکل کہ از عاشق برد رنگِ تماشا را

میری آنکھ بند کر لینے سے نگاہ شمع فانوس کا خیال ہوگئی۔ فنا مشکل ہی سے عاشق کے رنگ تماشا کو دور کر سکتی ہے۔

تا کی شود جنون نفسی فارغ از تلاش
بستہ است زندگی کمر ما بکین ما

داغ عشقم نیست الفت باتن آسانی مرا
پیچ تاب شعلہ باشد نقش پیشانی مرا

ہے ناز مفلساں زر از دست رفتہ پر — چوں شمع خامشی کہ فروزی دوبارہ اش
ہوں گلفروش شوخی داغ کہن ہنوز — می سوزدم سپہر بداغ کہن ہنوز
غالبؔ — بیدلؔ

غالب کہتے ہیں جس طرح مفلس آدمی اپنی ضائع شدہ دولت پر ناز کرتا ہے اسی طرح میں بھی داغ کہن پر ناز کرتا ہوں کہ کبھی میں بھی کسی پر عاشق تھا اور وہ روز کس قدر دلکش تھا۔ بیدل

کہتے ہیں اس خاموش شمع کی طرح جسے تم دوبارہ روشن کرو آسمان ہنوز مجھے داغ کہن میں جلائے چلا جا رہا ہے۔ غالب اور بیدل دونوں نے داغ کہن کو موضوع بنایا ہے۔ ''داغ کہن ہنوز'' کا استعمال غالب کے شعر میں واضح کرتا ہے کہ اس کا سرچشمہ کیا ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ غالب کو داغ کہن پر ہنوز ناز ہے جبکہ بیدل کو داغ کہن میں آسمان ہنوز جلائے چلا جا رہا ہے۔

حریف مطلب مشکل نہیں فسون نیاز	نیاز من عروج نشہ ناز دگر دارد
دعا قبول ہو یارب کہ عمر خضر دراز	سپہر آوازہ ام بر آستانت از زمینہا
غالبؔ	بیدلؔ

حالی لکھتے ہیں چوں کہ خیال وسیع تھا اور مضمون مطلع میں بندھنے کا مقتضی تھا اس لئے پہلا مصرعہ اردو روزمرہ سے کسی قدر بعید ہو گیا۔ مگر بالکل ایک نئی شوخی ہے جو شاید کسی کو نہ سوجھی ہوگی۔ کہتا ہے کہ کسی مشکل مقصد کے حاصل ہونے میں عجز و نیاز کا منتر کچھ کام نہیں دیتا۔ ناچار اب یہی دعا مانگیں گے کہ الٰہی خضر کی عمر دراز ہو یعنی ایسی چیز طلب کریں جو پہلے ہی دی جا چکی ہے۔ (۱۲۰) بیدل کہتے ہیں میرا نیاز اور ہی قسم کے ناز کے نشے کا سا عروج رکھتا ہے۔ تیرے آستانے پر اپنی زمین گیری اور نیاز مندی کی بدولت مجھے آسمان جیسی شہرت حاصل ہوگئی ہے۔ ''فسون نیاز'' غالب اور بیدل دونوں کا موضوع ہے۔ لیکن نتیجے میں دونوں دو مخالف سمتوں میں گئے ہیں۔ غالب کے نزدیک نیاز مندی سے مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ بیدل کے نزدیک نیاز مندی سے آسمان جیسی شہرت اور رفعت حاصل ہوگئی ہے۔

نہ ہو بہ ہرزہ بیاباں نورد ''وہم وجود''	صورت وہمی بہ ہستی متہم داریم ما
ہنوز تیرے تصور میں ہے نشیب و فراز	چوں حباب آئینہ بر طاق عدم داریم ما
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کا مطلب ہے کہ ماسوی اللہ کے وجود کی تلاش میں بلا وجہ اپنی عمر ضایع مت کرو، ماسوی اللہ حقیقت میں موجود ہی نہیں ہے۔ اس کا وجود مرتبہ وہم سے آگے نہیں ہے۔ اگر تو

ماسوی اللہ کی جستجو میں سرگرم ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ابھی تک تیرے تصور میں وجود کے نشیب وفراز یعنی مراتب کارفرما ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وجود صرف ذات حق میں منحصر ہے۔ بیدل کہتے ہیں ہمارا وجود وہمی ہے، جس پر ہم نے ''ہستی'' کی تہمت لگا رکھی ہے۔ حباب کی طرح ہمارا آئینہ بھی طاق عدم پر ہے۔ یعنی جس طرح بلبلے کا وجود آمادہ بزوال ہے اور اس کا آئینہ عدم کی طاق پر ہے اسی طرح ہمارا وجود بھی آمادہ بہ زوال ہے، اس لئے اس کو ہستی کے بجائے صورت وہمیہ سے تعبیر کرنا بہتر ہے۔ غالب اور بیدل دونوں انسانی ہستی کے وہمی ہونے پر متفق ہیں، البتہ غالب نے نکتہ آفرینی سے کام لے کر اس میں کچھ مزید اضافہ کیا ہے۔

وصال جلوہ تماشا ہے، پر دماغ کہاں	زمردمک نگہم داغ شد چو شمع خموش
کہ دیجئے آئینۂ انتظار کو پرواز	در انتظار تو سامان انتظارم سوخت
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کا مطلب یہ ہے کہ یہ سچ ہے کہ اگر عرصہ دراز تک انتظار کیا جائے تو وصال یار حاصل ہو سکتا ہے، مگر انتظار کی زحمت کشی کی طاقت کہاں ہے۔ بیدل کہتے ہیں آنکھ کی پتلی کی بدولت میری نگاہ شمع خاموش کی طرح داغ ہوگئی، یعنی جل گئی یا گرفتار سوزش و درد ہوگئی۔ تیرے انتظار میں سامان انتظار جل کر راکھ ہو گیا۔ انتظار محبوب غالب اور بیدل دونوں کا موضوع ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ غالب دیر تک انتظار وصل محبوب سے وصل کی توقع رکھتے ہیں پر انتظار کرنے کا دماغ یعنی سکت کس میں ہے۔ بیدل کے نزدیک بھی وصل کی امید میں زندگی گذارنا کچھ مشکل نہیں ہے۔ چنانچہ کہتا ہے:

بر امید وصل مشکل نیست قطع زندگی
شوق منزل می کند نزدیک راہِ دور را

مگر سامان انتظار عاشق کی نگاہ تھی وہ محبوب کی راہ تکتے تکتے شمع خاموش کی طرح خاک ہوگئی، اب وہ کیا کام کرے گی۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کے پورے شعر میں بیدل کے مصرعہ ''در انتظار تو سامان انتظارم سوخت'' اور دوسرے مصرعہ ''بر امید وصل مشکل نیست قطع زندگی'' کی جھلک پوری

طرح نمایاں ہے۔

نگہ شد شمع فانوسِ خیال از چشم پوشیدن	ہر ایک ذرہ عاشق ہے آفتاب پرست
فنا مشکل کہ از عاشق برد رنگِ تماشارا	گئی نہ خاک ہوئے پر ہوائے جلوۂ ناز
بیدلؔ	غالبؔ

غالب کا مطلب یہ ہے کہ خاک کے ذرے جب آفتاب کے مقابل ہوتے ہیں تو چمکنے لگتے ہیں، غالب نے ان کی تابانی کو ان کی آفتاب پرستی سے تعبیر کیا ہے، اور اسی سے شعر کا مضمون پیدا کیا ہے کہ فنا ہوجانے کے بعد بھی عاشق کے دل سے اشتیاق دید زائل نہیں ہوا۔ اس کی خاک کا ہر ذرہ آفتاب پرستی کررہا ہے۔ بیدل کہتے ہیں مرکر آنکھ بند ہوگئی تو نگاہ شمع فانوس خیال (قوت خیالیہ کے فانوس کی شمع) بن گئی۔ فنا مشکل ہی سے عاشق کے رنگ تماشا کو اڑا سکتی ہے۔ بیدل کا مقصد یہ ہے کہ عاشق دنیا سے رخصت ہونے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے اور رنگ تماشائے محبوب کو ہاتھ سے نہیں دیتا ہے۔ حافظ نے اس کو سادگی سے ادا کیا ہے:

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق

ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

غور سے دیکھا جائے تو غالب کے مصرعہ ''گئی نہ خاک ہوئے پر ہوائے جلوۂ ناز'' میں بیدل کے مصرعہ ''فنا مشکل کہ از عاشق بردرنگِ تماشارا'' کا نہ صرف عکس نظر آئے گا بلکہ ایک طرح سے بیدل کے مصرعہ کا وہ آزاد منظوم ترجمہ معلوم ہوگا۔ بیدل کا پہلا مصرعہ غالب کے پہلے مصرعہ سے زیادہ خوبصورت اور دلکش ہے۔ بیدل کا ایک اور عمدہ شعر اسی مضمون کا ہے:

فنا مشکل کند منع طپش از طینت عاشق

بساحل نیز دارد موج ایں دریا تسلسل را

تا کی شود جنوں نفسی فارغ از تلاش	نہ پوچھ وسعتِ میخانہ جنوں غالب
بستہ است زندگی کمر ما بکین ما	جہاں یہ کاسۂ گردوں ہے ایک خاک انداز
بیدلؔ	غالبؔ

غالب کہتے ہیں میخانہ جنوں میں اس قدر وسعت ہے کہ اس کے سامنے آسمان بھی ایک خاک انداز (کوڑا دان) معلوم ہوتا ہے۔یعنی عشق کی جولانیوں کے سامنے کائنات کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ بیدل کہتے ہیں میری جنون نفسی تلاش وجستجو سے کب باز آتی ہے، زندگی نے میری کمر کو عداوت سے باندھ رکھا ہے۔مطلب یہ ہے کہ میرے جنوں کی تلاش وجستجو کا سلسلہ بہت دراز ہے ،اوراس کی وسعت بیکراں ہے۔ایک اور شعر میں بیدل نے اس مضمون کواس طرح ادا کیا ہے:

شکر اقبال جنوں را تاقیامت بندہ ایم
آفتاب اوج عزت کرد بے دستاریم

اقبال جنوں کے شکر کا میں تاقیامت غلام ہوں، میری بے دستاری نے مجھے اوج عزت کا آفتاب بنا دیا۔غالب اور بیدل دونوں نے جنون کی وسعت وکشادگی اور طوالت ودرازی کا تذکرہ کیا ہے لیکن یہاں غالب کا انداز بیدل سے کچھ زیادہ بہتر معلوم ہوتا ہے۔ بیدل نے اس موضوع پر کچھ اور بھی اچھے اشعار کہے ہیں:

عمرہا شد در بیابان جنوں دارم وطن
روشن است ازچشم آہو روزنِ کاشانہ ام

☆☆☆

ما جنوں شیفتگاں امت آشفتگیم
وضع ما را بسر زلف پریشاں قسم است

کیونکر اس بت سے رکھوں جان عزیز	اگر عشق بتاں کفرست بیدل
کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز	کسی جز کافر ایمانی ندارد
غالبؔ	بیدلؔ

حالی لکھتے ہیں اس کے ظاہری معنی تو یہ ہیں کہ اگر اس سے جان عزیز رکھوں گا تو وہ ایمان لے لے گا،اس لئے جان کو عزیز نہیں رکھتا۔دوسرے لطیف معنی یہ ہیں کہ اس بت پر جان قربان کرنا تو عین ایمان ہے، پھر اس سے جان کیونکر عزیز رکھی جاسکتی ہے۔(۱۲۱) بیدل کہتے ہیں

عشق بتاں اگر کفر ہے تو کافر کے سوا کسی کے پاس ایمان نہیں، مطلب یہ ہے کہ ایمان تو اصل میں عشق کا نام ہے۔

بغیر عشق ندانیم ہیچ آئینی
گزیدہ ایم چو پروانہ سوختن مذہب

اور المجاز قنطرۃ الحقیقۃ کے مطابق انسان عشق مجازی سے عشق حقیقی تک پہنچتا ہے پس عشق بتاں ہی اصل ایمان ہے۔ لہٰذا اگر کوئی عشق بتاں میں گرفتار کو کافر کہتا ہے تو کہنا چاہئے کہ ایمان تو کافر ہی کے پاس ہے۔ غالب اور بیدل دونوں نے بت کے عشق یا بت پر جان نثاری کو ایمان قرار دیا ہے۔ بیدل نے ایک اور شعر میں عشق بتاں میں دین و دانش کو قربان کرنے کا تذکرہ اس طرح کیا ہے:

دین و دانش ہمہ در عشق بتاں باید باخت
خویش را بیدل دیوانہ لقب باید کرد

عشق بتاں میں اپنے دین و مذہب اور علم و دانش سب کو قربان کر دینا چاہئے اور خود کو بیدل دیوانہ کا لقب دینا چاہئے۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کے اس شعر میں بیدل کے ان دونوں شعروں کا عکس موجود ہے۔

دل سے نکلا، پہ نہ نکلا دل سے　　جور حسن و صبر عاشق توأم یکدیگر اند
ہے ترے تیر کا پیکان عزیز　　باخدنگ او دل من ہمچو پیکاں آشناست
غالبؔ　　بیدلؔ

غالب کہتے ہیں مجھے تیرے تیر کا پیکان (پھل یا انی) اس قدر عزیز اور محبوب ہے کہ اگر چہ وہ دل سے نکل چکا ہے پر اس کی یاد ہنوز میرے دل میں باقی ہے۔ بیدل کہتے ہیں معشوق کا ظلم اور عاشق کا صبر دونوں جڑواں ہیں۔ اس کے تیر سے میرا دل پیکان کی طرح آشنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ معشوق کا عاشق پر ظلم و ستم اس کی ایک ذاتی خصوصیت ہے جو اس سے دور نہیں ہوتی: ع

رسم و آئین جفا خاصیت روئے نکوست

اسی طرح عاشق کا صبر و ضبط یعنی معشوق کے ظلم کو سہنا عاشق صادق کا شیوہ ہے: ع

مپندارید عاشق شکوہ پردازد بہ بیدادش

اس طرح دیکھا جائے تو جورِ حسن اور صبرِ عاشق جڑواں بچے کی طرح ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ اس کی مثال دے کر کہتا ہے کہ میرا دل تو پیکانِ تیر کی طرح محبوب کے تیر سے بہت پہلے سے آشنا ہے۔ غالب اور بیدل دونوں نے ''دلفریبی یا آشنائی پیکانِ تیر'' کو موضوع بنایا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کے مصرعہ'' ہے ترے تیر کا پیکان عزیز'' میں بیدل کے مصرعہ''باخدنگ او دلِ من ہمچو پیکاں آشناست'' کا عکس موجود ہے۔ غالب نے لفظ آشنا کی جگہ لفظ عزیز استعمال کرکے مزید لطف پیدا کر دیا ہے۔

عیانست از شکستِ رنگ ما وضعِ پریشانی	نہ گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
چہ لازم شانہ کردن طرۂ آشفتہ حالی را	میں ہوں اپنی شکست کی آواز
بیدلؔ	غالبؔ

غالب کہتے ہیں کہ مجھے گل نغمہ یعنی عیش اور پردہ ساز یعنی طرب اور موسیقی سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ میں تو سراپا رنج والم ہو کر اپنی ہی مصیبت میں گرفتا ہوں۔ بیدل کہتے ہیں ہماری شکستہ رنگی سے ہماری پریشانی آشکار ہے، کیا ضروری ہے کہ اپنی آشفتہ حالی کی زلف میں شانہ کنی کروں۔ مطلب یہ ہے کہ صورت ببیں حالت مپرس کے مطابق ہماری پریشانی و پراگندگی یا رنج والم خود ہماری شکستہ رنگی سے عیاں ہے۔ اپنی آشفتہ حالی کو بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کے مصرعہ''میں ہوں اپنی شکست کی آواز'' میں بیدل کے مصرعہ''عیانست از شکستِ رنگ ما وضعِ پریشانی'' کا نہ صرف عکس پایا جاتا ہے بلکہ ایک طرح سے وہ اس کا آزاد منظوم ترجمہ ہے۔ بیدل کو شکست رنگ یعنی ہستی کی ناپائیداری یا رنج والم کا موضوع بہت پسند تھا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

عمریست کہ در رنگ چمن شور شکستی است
کو غنچہ کہ گل گوش فشارد بسر انگشت

☆☆☆

جوش اشکم و شکست آئینہ دار است اینجا
رقص ہستی ہمہ دم شیشہ سوارست اینجا

☆☆☆

رنگہا یکسر شکست آمادہ اند
ایں گلستاں عالم مینا گریست

تو اور آرائش خم کاکل	بہ گلشن گر بر افشاند ز روئے ناز کاکل را
میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز	ہجوم نالہ ام آشفتہ سازد زلف سنبل را
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کا مطلب یہ ہے کہ تو اپنے حسن کے بنانے سنوارنے میں مصروف ہے جبکہ میرے دل میں مختلف قسم کے اندیشے پیدا ہورہے ہیں۔ مثلاً یہ کہ خدا معلوم تو کس کے لئے بناؤ سنگار کررہا ہے یا یہ کہ خدا معلوم اب کون لوگ تجھ پر فدا ہوں گے اور مجھے کیسے کیسے صدمے اٹھانے پڑیں گے۔ بیدل کہتے ہیں محبوب اگر باغ میں اپنے کاکل کو ازراہ ناز و ادا لہرائے تو میرا ہجوم نالہ زلف سنبل (بالچھڑ گھاس) کو آشفتہ کر کے رکھ دے۔ آرائش کاکل کا مضمون غالب اور بیدل دونوں نے بیان کیا ہے اس فرق کے ساتھ کہ غالب آرائش کاکل محبوب سے اندیشہائے دور دراز میں مبتلا ہیں، جبکہ بیدل کو اس کی وجہ سے اس قدر آہ و نالہ سے سابقہ ہے کہ زلف سنبل اس کی وجہ سے آشفتہ ہوجائے۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کے پہلے مصرعہ ''تو اور آرائش خم کاکل'' میں بیدل کے پہلے مصرعہ ''بہ گلشن گر بر افشاند زروئے ناز کاکل را'' کا عکس موجود ہے البتہ دوسرے مصرعہ میں دونوں اپنے ردعمل کے اظہار میں مختلف ہوگئے۔ یہاں غالب کا ردعمل ''اندیشہ ہائے دور ودراز'' بیدل کے ردعمل ''ہجوم نالہ'' سے زیادہ پرکشش معلوم ہوتا ہے۔ بیدل نے اس مضمون کو دوسرے انداز سے بھی بیان کیا ہے:

در خم آں زلف خوں شد دلہائے چاک
صبح ما آخر شفق گردید در زندان شب

عاشقوں کے دلہائے چاک محبوب کی زلف کی خموں میں خون ہو گئے۔ ہماری صبح زنداں شب میں آخر شفق کی صورت اختیار کر گئی۔ غالب کے شعر کا اگر اس شعر سے موازنہ کیجئے تو اندیشہ ہائے دور و دراز کا ایک پہلو سامنے آتا نظر آئے گا۔

لاف تمکین فریب سادہ دلی	پاس اسرار محبت داشتن آساں نہ بود
ہم ہیں اور رازہائے سینہ گداز	گنج ویراں کرد بیدل خانۂ آباد ما
غالب	بیدلؔ

غالب کا مطلب یہ ہے کہ راز عشق چونکہ سینہ گداز، یعنی برداشت سے باہر ہے اس لئے جلد یا دیر ضرور ظاہر ہو کر رہے گا۔ ایسی صورت میں ہمارا یہ دعویٰ کہ ہم اس راز کو پوشیدہ رکھ سکیں گے ہماری سادہ دلی کی دلیل ہے۔ بیدل کہتے ہیں اسرار عشق و محبت کی حفاظت کوئی آسان کام نہ تھا اس لئے وہ ہمارے خانۂ آباد کو گنج ویراں کر گیا۔ راز عشق کو پوشیدہ رکھنے کا مضمون غالب اور بیدل دونوں نے بیان کیا ہے اس فرق کے ساتھ کہ غالب کے نزدیک راز عشق سینہ گداز ہونے کی وجہ سے چونکہ صیغہ راز میں محفوظ نہیں رہ سکتا اس کے باوجود اس کے پوشیدہ رکھنے کا دعویٰ کرنا ہماری سادہ لوحی کی دلیل ہے۔ جبکہ بیدل کے نزدیک راز عشق کی نگہ داشت آسان کام نہ تھا۔ اس لئے ہمارے خانۂ آباد کو اس نے گنج ویران کر دیا۔ یہاں غالب کے مصرعہ ''ہم ہیں اور رازہائے سینہ گداز'' میں بیدل کے مصرعہ ''پاس اسرار محبت داشتن آساں نہ بود'' کا عکس موجود ہے۔ بیدل نے اس مضمون کو دوسرے انداز سے بھی بیان کیا ہے:

راز عشق از دل بروں افتاد و رسوائی کشید
شد پریشاں گنج تا غافل شد از ویرانہ ہا

راز عشق جب دل سے باہر آ گیا تو اسے رسوائی اٹھانی پڑی، جس طرح خزانہ جب ویرانے سے غافل ہو گیا تو پریشان ہوا۔

وہ بھی دن ہو کہ اس ستمگر سے	اے خوش آں دیدہ کہ در انجمن ناز و نیاز
ناز کھینچوں بجائے حسرت ناز	بال بلبل بہ نظر دارد و حیران گلست
غالب	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ خدا وہ دن بھی دکھائے جب محبوب میری طرف متوجہ ہو کر ناز کرے اور میں اس کے ناز اٹھاؤں اگر چہ صورت حال اس وقت یہ ہے کہ میں اس کے ناز اٹھانے کی حسرت کر رہا ہوں۔ بیدل کہتے ہیں وہ آنکھ کتنی خوش نصیب ہے جس کی نگاہ انجمن ناز و نیاز میں ایک طرف بلبل کے بازو پر ہے تو دوسری جانب وہ گل کو دیکھ کر حیران ہے۔ یعنی بلبل اپنی نیاز مندی کی وجہ سے گل کی بے رخی کے باوجود اس کی طرف مائل ہے اور اس سے عشق کئے جا رہی ہے۔ جبکہ گل اپنے ناز و ادا کی وجہ سے بے نیازی کا اظہار کر رہا ہے، جسے دیکھ کر بلبل حیران ہے۔ ''ناز محبوب'' غالب اور بیدل دونوں کا موضوع ہے اس فرق کے ساتھ کہ غالب اس دن کے متمنی ہیں جب محبوب ناز کرے اور عاشق ناز اٹھائے۔ جبکہ بیدل کے نزدیک ناز و نیاز کا سلسلہ گل و بلبل ہی میں نہیں کائنات کے ہر چیز کے جوڑوں میں ہے۔ جسے اس حقیقت کا پتا لگ گیا اس کی آنکھ خوش نصیب ہے۔ چنانچہ بیدل نے اس موضوع کو کئی اشعار میں پیش کیا ہے:

نیاز و ناز باہم بسکہ یکرنگند در گلشن
ز بوئے غنچہ نتواں فرق کرد آواز بلبل را

باغ میں ناز و نیاز دنوں ہم رنگ ہیں۔ بوئے غنچہ اور آواز بلبل میں فرق نہیں کیا جا سکتا۔

نیاز و ناز و کمال و نقصاں ز یکدیگر ظاہر و نمایاں
ذکور شد از اناث پیدا، اناث شد از ذکور پیدا

نیاز و ناز ہماں درد و صاف یکقدح اند
چو پائے او سر ما ہم از آں رکاب طلب

جگر کا ایک شعر اس موضوع پر درج ذیل ہے:

نیاز و ناز کے جھگڑے مٹائے جاتے ہیں
وہ ہم میں اور ہم ان میں سمائے جاتے ہیں

مژدہ اے ذوق اسیری کہ نظر آتا ہے	بیدل از کیفیت شوق گرفتاری مپرس
دام خالی قفس مرغ گرفتار کے پاس	نالہ زنجیر ہرجا گل کند دیوانہ ام
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ اے ذوق اسیری تجھے خوش خبری سناتا ہوں کہ قفس مرغ گرفتار کے پاس جال بچھا ہوا ہے چل اپنی آرزوئے اسیری پوری کر لے یعنی گرفتار ہو جا۔ بیدل کہتے ہیں شوق گرفتاری کی کیفیت اور اس کا عالم کیا ہے مجھ سے مت پوچھو، بس یہ سمجھو کہ زنجیر کا نالہ جہاں بلند ہوتا ہے میں دیوانہ ہو جاتا ہوں۔ غالب اور بیدل دونوں نے ذوق اسیری یا شوق گرفتاری کو موضوع بنایا ہے اس فرق کے ساتھ کہ غالب کہتے ہیں مرغ گرفتار کے پنجرے کے پاس خالی جال بچھا ہوا ہے وہاں چل کر اپنی آروزئے گرفتاری پوری کر لو۔ جبکہ بیدل کے شوق گرفتاری کا یہ عالم ہے کہ زنجیر کے بجنے کی آواز سن کر اس میں خود کو جکڑنے کے لئے وہ دیوانہ ہوا جا رہا ہے۔ (دیوانہ و زنجیر میں باہم مناسبت ہے) غور سے دیکھا جائے تو غالب کے مصرعہ ''مژدہ اے ذوق اسیری کہ نظر آتا ہے'' میں بیدل کے مصرعہ ''بیدل از کیفیت شوق گرفتاری مپرس کا عکس موجود ہے۔ البتہ دوسرے مصرعہ میں غالب نے ''دام خالی'' اور بیدل نے ''نالۂ زنجیر'' کا ذکر کر کے گرفتار ہونے کے محل میں اختلاف کیا ہے۔ بیدل نے ایک اور شعر میں اس مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے:

دل صید عشق و دیدہ اسیر خیال تست
ویرانہ کشوریکہ بایں بندوبست نیست

دہن شیر میں جا بیٹھئے لیکن اے دل	مروت از دل خوباں مدارید
نہ کھڑے ہوجیے خوبان دل آزار کے پاس	فرنگستاں مسلمانی ندارد
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں ظالم معشوق سے دل لگانے سے بہتر یہ بہتر کہ آدمی شیر کے منہ میں چلا جائے، وہ ایک لمحہ میں ختم کر دے گا، لیکن ظالم معشوق برسوں تڑپا کر ہلاک کرتا ہے۔ بیدل کہتے ہیں حسینوں کے دل سے مروت وانسانیت کی امید نہ رکھو۔ فرنگستان یعنی یورپ میں مسلمان نہیں ہوتے۔ غالب اور بیدل دونوں نے ''حسینوں کی روش دل آزاری و بے مروتی'' کو موضوع بنایا ہے اس فرق کے ساتھ کہ غالب کے نزدیک ان کے پاس کھڑے ہو کر ان کی دل آزاری سہنے سے بہتر ہے کہ دہن شیر میں پہنچ کر آدمی ایک دم سے اپنے کو ہلاک کر ڈالے۔ جبکہ بیدل کے

نزدیک ان سے مروت اور انسانیت کی توقع رکھنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص فرنگستان میں مسلمان تلاش کرے۔ظاہر ہے وہاں کوئی مسلمان نہیں ہوتا۔اس لئے حسینوں سے بھی مروت کی امید نہیں ہے۔ بیدل کے زمانے یعنی ۱۷۲۰ء سے پہلے تک ہوسکتا ہے فرنگستان میں کوئی مسلمان نہ ہو یا ہو لیکن بیدل کو اس کا پتہ نہ ہوگا لیکن اب ان علاقوں میں مسلمانوں کی تعداد بھی خاصی ہے۔اس لئے اس وقت کے لحاظ سے یہ مثال درست ہوسکتی ہے۔ بہر حال غالب کے مصرعہ ''نہ کھڑے ہو جیے خوبان دل آزار کے پاس'' میں بیدل کے مصرعہ ''مروت از دل خوباں مدارید'' کا عکس پوری طرح نمایاں ہے۔

امروز در قلمرو نظارہ نور نیست	نہ لیوے گر خس جوہر طراوت سبزۂ خط سے
از بس خطت بسایہ نشاند آفتاب را	لگا دے خانۂ آئینہ میں روئے نگار آتش
بیدلؔ	غالبؔ

غالب کہتے ہیں کہ اگر محبوب کے سبزہ خط سے جوہر آئینہ نمی حاصل نہ کرے تو اس کے رخسار کی گرمی سے آئینہ میں آگ لگ جائے ۔ بیدل کہتے ہیں آج قلمرو نظارہ میں روشنی اس لئے نہیں ہے کہ تیرے خط نے آفتاب کو انتہائی سایہ میں بٹھا دیا۔غالب اور بیدل دونوں نے محبوب کے سبزۂ خط کو موضوع بنایا ہے۔اس فرق کے ساتھ کہ غالب کے نزدیک محبوب کے سبزہ خط سے جوہر آئینہ کو نمی نہ ملے تو اس کی گرمی آئینہ کو نذر آتش کر دے۔ جبکہ بیدل کے نزدیک محبوب کا سبزہ خط اس قدر نورانی اور چمکدار ہے کہ اس نے قلمرو نظارہ یعنی کائنات میں آفتاب کو بھی سایہ نشین کر دیا یا آفتاب کی روشنی اس کے مقابلے پر ماند پڑگئی۔غالب نے خط محبوب کی آتشیں صفت کو اور بیدل نے اس کی نورانی صفت کو بیان کرنے میں مبالغہ سے کام لیا ہے۔ بیدل نے اس موضوع کو دوسرے انداز سے بھی بیان کیا ہے: ع

یاد رخسارت جبین فکر را آئینہ ساخت

یا

از شبیخون خط یار نگردی غافل

زبان اہل زباں میں ہے مرگ ،خاموشی | شمع خاموش وا رہید از اشک و آہ و سوختن
یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانیٔ شمع | بے زبان بودن چہ مشکلہا کہ آسانم نہ کرد
غالبؔ | بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ شمع کے طرز عمل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ خاموشی موت کے درجے میں ہے۔ یعنی جب شمع خاموش ہو جاتی ہے تو اسے شمع مردہ کہتے ہیں، گویا اہل زبان کا خاموش رہنا ان کی موت ہے۔ بیدل کہتے ہیں شمع نے خاموش ہوکر اشک باری ،آہ وزاری اور سوزش سے نجات پالی، اسی طرح بے زبانی یعنی خاموشی نے جانے کتنی مشکلات کو آسان کر دیا۔ بیدل کا مطلب یہ ہے کہ انسان خاموش رہ کر بہت سی بلاؤں کو ٹالتا اور آفتوں سے نجات پالیتا ہے۔ چنانچہ عربی کا ایک شاعر کہتا ہے:

الا احفظ لسانك ان اللسان

سريع الى المرء فى قتله

زبان کی نگہداشت کرو کیونکہ زبان انسان کے قتل کرنے میں بہت جلد باز واقع ہوئی ہے۔ یہاں غالب نے بیدل کے بالکل برعکس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اہل زبان کا خاموش رہنا گویا ان کی موت ہے۔ اور دلیل اس کی یہ دی کہ شمع جب خاموش ہو جاتی ہے تو اسے شمع مردہ کہا جاتا ہے، عجیب بات یہ ہے کہ شمع کا مشاہدہ دونوں نے کیا لیکن دونوں مختلف نتیجے پر پہنچے۔ بیدل کا نتیجہ مشاہدہ غالب کے نتیجہ مشاہدہ سے زیادہ دل کو اپیل کرتا ہے۔ مگر سچی بات وہ ہے جو سعدی نے کہی کہ گفتگو اور خاموشی کا اپنا اپنا موقع ہوتا ہے۔ خاموشی کے موقع پر گفتگو اور گفتگو کے موقع پر خاموشی غلط ہے۔ مشہور کہاوت ہے: "مشتی کہ بعد از جنگ یاد آید بر کلہ خود باید زد" بیدل نے موقع شناسی کی اہمیت پر ایک شعر میں اس طرح اشارہ کیا ہے:

دشمن امن است موقع ناشناس دم زدن
زندگی بر خود مکن چوں مرغ بے ہنگام تلخ

کرے ہے صرف بایمائے شعلہ قصہ تمام | بسکہ از ذوق فنا در بزم جولاں کرد شمع
بطرز اہل فنا ہے فسانہ خوانیٔ شمع | ترکِ تمہید تعلقہائے امکاں کرد شمع
غالبؔ | بیدلؔ

غالب کہتے ہیں اہل فنا یعنی عاشقان خدا عشق حقیقی کی آگ میں فنا ہو جاتے ہیں اسی طرح شمع بھی شعلہ سے لو لگا کر اس کے ایک اشارے پر اپنی ہستی کو فنا کر دیتی ہے۔ بیدل کہتے ہیں شمع نے اپنے ذوق فنا کی بنا پر بزم میں بے انتہا جولانی دکھائی اور تعلقہائے امکاں کو خیر باد کہا۔ غالب اور بیدل دونوں نے ''شمع کی فسانہ خوانی یا ذوق فنا'' میں غیر معمولی جولانی کا تذکرہ کیا ہے، اس فرق کے ساتھ کہ غالب نے اس کی اس روش کو اہل فنا یعنی عاشقوں کے طرز فنا سے تشبیہ دی ہے۔ جبکہ بیدل نے اس کو سادگی سے ادا کر دیا ہے۔ بیدل نے مضمون فنا کو شمع کے ساتھ تشبیہ دے کر نہایت خوبصورتی سے ایک شعر میں اس طرح ادا کیا ہے:

آہم ، شررم ، سرشکم ، داغم چہ تواں کرد
چوں شمع دریں بزم بصد رنگ ہلاکم

شمع کی طرح میں آہ، شرر، اشک، داغ غرض سیکڑوں رنگ اور انداز سے ہلاک ہونے کے سوا کر ہی کیا سکتا ہوں۔

غم اس کو حسرتِ پروانہ کا ہے اے شعلہ
ترے لرزنے سے ظاہر ہے ناتوانیِ شمع
غالبؔ

اضطراب و طپش و سوختن و داغ شدن
آنچہ دارد پر پروانہ ہماں دارد شمع
بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ شمع کی لو عموماً تھرتھراتی ہے اس لرزش کی وجہ یہ ہے کہ شمع پروانہ کے غم میں اس قدر ناتواں ہوگئی ہے کہ اس کا اثر شعلۂ شمع پر بھی مرتب ہو گیا۔ یعنی شعلہ کی لرزش کا سبب شمع کی ناتوانی ہے۔ بیدل کہتے ہیں اضطراب (لرزنا) طپش (تڑپنا) سوزش (جلنا)، داغ (درد یا صدمہ اٹھانا) کا جو سرمایہ پروانہ کے پاس تھا وہی شمع کے پاس ہے۔ ''شعلہ شمع کی لرزش واضطراب'' کو غالب اور بیدل دونوں نے موضوع بنایا ہے اس فرق کے ساتھ کہ غالب نے نکتہ آفرینی سے کام لیتے ہوئے کہا کہ شعلہ کے اندر جو اضطراب ہے وہ پروانہ کے غم میں شعلہ کی ناتوانی کے سبب ہے۔ جبکہ بیدل کے خیال میں پروانہ کی خصوصیات چہارگانہ جن کا اوپر ذکر ہوا شمع کے اندر بھی ہے۔ گویا عاشق و معشوق دونوں ان خصوصیات کے حامل ہیں اور دونوں طرف سے آگ برابر لگی ہوئی ہے۔ اس لئے شعلہ شمع کا اضطراب پروانہ کے جل کر راکھ ہو جانے کے غم میں

نہیں ہے۔ بلکہ یہ اس کی ذاتی خصوصیت ہے۔

ترے خیال سے روح اہتزاز کرتی ہے
بہ جلوہ ریزی باد و بہ پرفشانی شمع
غالب

فردوس دل اسیر خیال تو بودنست
عید نگاہ چشم برویت کشودنست
بیدلؔ

غالب کہتے ہیں قسم ہے ہوا کے چلنے کی اور شمع کے جھلملانے کی کہ تیرے تصور سے عاشق کی روح پر عالم وجد طاری ہو جاتا ہے اور اس کی روح جھومنے لگتی ہے۔ بیدل کہتے ہیں تیرے خیال کا قیدی ہونا دل کے لئے فردوس ہے اور تیرے چہرے کو دیکھتے رہنا نگاہ کے لئے عید ہے۔ ''محبوب کا خیال اور اس کا تصور نشاط آور ہے'' غالب اور بیدل دونوں کا موضوع ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ غالب کے نزدیک محبوب کے تصور سے روح جھوم اٹھتی ہے اور اس پر کیف وسرور کا عالم طاری ہوتا ہے جبکہ بیدل کے نزدیک اس کے تصور سے دل کو فردوس کی سی خوشی ومسرت اور سکون وراحت حاصل ہوتی ہے جو کسی آرام وراحت کی منتہا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کے مصرعہ ''ترے خیال سے روح اہتزاز کرتی ہے'' میں بیدل کے مصرعہ ''فردوس دل اسیر خیال تو بودنست'' کی جھلک پوری طرح نمایاں ہے۔

نشاط داغ غم عشق کی بہار نہ پوچھ
شگفتگی ہے شہید گلِ خزانیِ شمع
غالب

گر ز اسرار بہار عشق بوئے بردہ ای
غیر داغ و زخم و اشک و آبلہ مشمار گل
بیدلؔ

غالب کہتے ہیں غم عشق کے داغ میں ایسی بہار ہے کہ شگفتگی بھی اس پر نثار ہے، یعنی غم عشق کے سینے میں جو داغ پڑ جاتا ہے وہ اس قدر دلکش ہوتا ہے کہ اس کے سامنے شگفتگی کی بھی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ بیدل کہتے ہیں بہار عشق کے اسرار کی اگر تم کو کچھ خوشبو ملی ہے تو داغ، زخم، اشک اور آبلہ کے سوا کسی اور چیز کو گل یعنی بہار مت تصور کرو۔ غالب اور بیدل دونوں نے ''غم عشق کی بہار'' کو موضوع بنایا ہے اس فرق کے ساتھ کہ غالب کے نزدیک بہار داغ غم عشق کے سامنے پھول کی شگفتگی کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ جبکہ بیدل کے نزدیک اسرار بہار عشق تو اصل میں

داغ، زخم، اشک اور آبلے کا نام ہے۔ اس کے سوا کسی اور چیز کو گل تصور نہیں کرنا چاہئے۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کے اس شعر میں بیدل کے شعر کا عکس پوری طرح موجود ہے۔ لیکن بیدل نے بہار غم عشق کے اسرار کی جو تفصیل فراہم کی ہے وہ غالب کے شعر میں نہیں ہے۔ بیدل نے اس مفہوم کو دوسرے انداز سے بھی پیش کیا ہے:

نشاط جاوداں خواہی دلی را صید الفت کن
کہ مستیہاست موقوفِ بدست آوردن مینا

دائمی نشاط و سرور کے حصول کے لئے دام عشق میں گرفتار ہونا لازمی ہے. جس طرح حصول مستی کے لئے مینا کی دست آوری یعنی شراب نوشی لازم ہے۔ بیدل نے داغ عشق سے متعلق کئی اچھے اشعار کہے ہیں:

داغ عشقم ،نیست الفت باتن آسانی مرا
پیچ و تاب شعلہ باشد نقش پیشانی مرا
دل فرد باطلست خوشا جوش داغ عشق
تا بیدلی بہ ثبت رساند قبالہ را
جز داغ نیست مایدہ دستگاہ عشق
آتش خورد کسی کہ شود میہمان ما

جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے	ابتدا و انتہا در سوختن گم کردہ ام
اے ناتمامیِ نفسِ شعلہ بار ، حیف	ہرچہ دارد شمع از ہستی بسر آوردہ ام
غالب	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں میں اس بات سے بہت ملول خاطر ہوں کہ اگرچہ میری ہر سانس شعلہ برسا رہی ہے پر کوئی شعلہ ایسا نہیں نکلا جو مجھے ایک دم سے جلا کر خاک کر دیتا۔ اے نفس شعلہ بار تیری کوتاہی پر کمال افسوس ہے۔ بیدل کہتے ہیں ہم نے اپنی ہستی کی ابتدا و انتہا جلنے میں گذار دی۔ ہستی کا جو سرمایہ شمع کے پاس ہے وہی میرے سر میں بھی ہے۔ بیدل کا مطلب یہ ہے کہ شمع کی ہستی کا کل سرمایہ سوزش ہے جو شروع سے آخر تک اسے حاصل ہے۔ میری ہستی بھی شمع کی طرح ابتدا

سے انتہا تک سراپا سوزش بنی ہوئی ہے۔ غالب اور بیدل دونوں نے سوزش ہستی کو موضوع بنایا
ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ غالب کے نزدیک سانس جو شعلہ باری کر رہی ہے میری ہستی کو
دھیرے دھیرے تڑپا کر جلا رہی ہے، ایسا کوئی شعلہ کیوں نہیں نکلا جو ایک دم سے جلا کر راکھ
کر دیتا جبکہ بیدل کے نزدیک زندگی شمع کی طرح از آغاز تا انتہا سراپا سوزش ہے۔ جس طرح شمع
بقول غالب سحر تک ہر رنگ میں جلتی ہے انسانی زندگی بھی ہر رنگ میں جلتی ہے جس کی تفصیل
بیدل نے اس طرح دی ہے:

اضطراب و طپش و سوختن و داغ شدن
آنچہ دارد پر پروانہ ہماں دارد شمع

یعنی لرزنا، پیچ کھانا، جلنا اور داغ ہونا یہی ہے ہر رنگ میں جلنا۔ بیدل نے ایک جگہ نثر میں غالب
کے خیال کو اس طرح ادا کیا ہے:

''پروانہ وار بیک بارہ بر آتش زدن محفوظ تر از آنست کہ ہر ساعت رنج سوختنی تازہ باید کشید'' (۱۲۲)
پروانہ کی طرح ایک دم سے خود کو نذر آتش کر دینا اس سے بہتر اور مامون تر ہے کہ ہر لحہ جلنے کی تازہ
تکلیف سہنی پڑے۔

گرد راہِ یار ہے سامان ناز زخم دل	در طلوع مہر بے عرض تبسم نیست صبح
ورنہ ہوتا ہے جہاں میں کس قدر پیدا نمک	ہر کہ گردد خاک راہت می کند پیدا نمک
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں یار کے کوچے کی گرد ہمارے زخم دل کے لئے باعث ناز ہے۔ یعنی اس
میں زیادہ لذت محسوس ہوتی ہے ورنہ دنیا میں نمک کی کوئی کمی نہیں ہے۔ شاعر نے نمک پر گرد کو اس
لئے ترجیح دی ہے کہ ایک تو وہ گرد کوئے یار کی ہے۔ دوسرے یہ کہ نمک سے زخم بھر جاتا ہے یعنی اچھا
ہو جاتا ہے مگر مٹی سے زخم اور بڑھ جاتا ہے۔ بیدل کہتے ہیں جب آفتاب طلوع ہوتا ہے تو صبح تبسم
کا اظہار کئے بغیر نہیں رہتی ہے۔ اسی طرح اے محبوب جو آدمی تیرے راستے کی خاک ہو جائے وہ
نمک کا لطف اور مزہ حاصل کر لیتا ہے۔ گرد راہ محبوب غالب اور بیدل دونوں کا موضوع ہے اس
فرق کے ساتھ کہ غالب کوچہ یار کی گرد کو زخم دل کے لئے باعث ناز سمجھتے ہیں یعنی نمک سے زیادہ

اس میں لذت ہے۔ جبکہ بیدل کے نزدیک گرد راہ محبوب نمک کی خصوصیت کی حامل ہے۔ کھانے میں نمک مناسب مقدار میں نہ ہو تو چاہے جتنا اچھا پکا ہو بے مزہ ہوتا ہے۔ اسی طرح گرد راہ محبوب بن کر عاشق کو نمک کی سی لذت ملتی ہے اور لطف محسوس ہوتا ہے۔ نمک کے سلسلے میں غالب نے بیدل سے اختلاف کیا ہے۔ بیدل نے اس خیال کو دوسرے انداز سے بھی ادا کیا ہے۔

اے خرد خمخانہ نازی بجوش آوردہ ای

باش تا شور جنونِ ما کند پیدا نمک

اے عقل تو نے خمخانہ ناز میں جوش اور ابال پیدا کر دی ہے، رکی رہ تا آنکہ ہمارا شور جنوں اس میں نمک کی چاشنی ڈال دے۔

آہ کو چاہئے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

غالبؔ

چساں بدوش اجابت رسانمش بیدل
کہ از ضعیفیِ من دست نالہ کوتہ است

بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ عاشق کی آہ معشوق کے دل میں اثر تو کرتی ہے پر اس کے لئے ایک مدت دراز درکار ہوتی ہے۔ لیکن ہمیں یہ توقع نہیں ہے کہ جب تک تیری زلفوں تک ہماری رسائی ہو اس وقت تک ہم زندہ بھی رہیں گے۔ بیدل کہتے ہیں میرے ضعف و نقاہت کی وجہ سے دست نالہ کوتاہ واقع ہوا ہے۔ اس لئے اس کو معشوق کے دوش اجابت تک کیسے پہنچاؤں۔ یہاں غالب اور بیدل دونوں نے آہ و نالہ کی تاثیر کو موضوع بنایا ہے اس فرق کے ساتھ کہ غالب کے نزدیک معشوق کے دل میں عاشق کی آہ کے اثر کرنے کے لئے ایک مدت دراز درکار ہے جس کی اسے توقع نہیں ہے۔ بیدل کے نزدیک اس کے لئے قوت و توانائی درکار ہے جو مفقود ہے۔ اس لئے کہتا ہے کہ ناتوانی کی وجہ سے عاشق کے نالے میں اتنی سکت نہیں رہ گئی ہے کہ معشوق کے دوش اجابت تک وہ پہنچ سکے۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کے پورے شعر میں بیدل کے اس شعر کا عکس پایا جاتا ہے۔ البتہ غالب نے اس خیال کو زیادہ خوبصورتی سے ادا کیا ہے۔ لیکن بیدل آہ بے تاثیر کو بھی کم نہیں سمجھتا۔

آہ بے تاثیر ما کم مگیر
ہر کجا دودیست آتش درقفاست

میری آہ بے تاثیر کو بے وقعت نہ سمجھو، جہاں کہیں دھواں اٹھتا ہے اس کے پیچھے آگ بھی سر اٹھاتی ہے۔

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ	صد قطرہ و موج محو طوفاں گردد
دیکھیں کیا گذرے ہے قطرہ پہ گہر ہونے تک	کز دریا گوہری نمایاں گردد
غالبؔ	بیدلؔ

فطرت عمری کند تگ و دو
تا نقش ادب بندد و انساں گردد

قطرہ نفس کی تربیت سے گہر بنتا ہے اور اس راہ میں اسے بے شمار مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس نکتہ کو غالب نے اس طرح ادا کیا ہے کہ سمندر کی ہر موج میں جال کا ہر حلقہ گویا مگر مچھ کا حلق ہے۔ دیکھیں قطرہ پر گوہر بننے تک کیا کیا آفتیں گزرتی ہیں۔ بقول حالی جو مطلب اس شعر میں ادا کیا گیا ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ انسان کو درجہ کمال تک پہنچنے میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ (۱۲۳)

بیدل کہتے ہیں سیکڑوں قطرے اور لہریں طوفان کی نذر ہوتی ہیں تب جا کر کہیں دریا سے گوہر (موتی) نمایاں ہوتا ہے اسی طرح انسانی فطرت مدتوں تگ و دو کرتی ہے تب کہیں جا کر اس کے اندر ادب کے نقوش نمایاں ہوتے ہیں اور وہ انسان کا روپ دھارتا ہے۔ یعنی کہ کمال تک رسائی کے لئے بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ اس موضوع پر غالب اور بیدل دونوں متفق ہیں۔ بلکہ اقبال بھی بیدل کے اس کلام سے متاثر ہو کر کہتے ہیں:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

غالب کے اس شعر میں بیدل کے اس رباعی کا نہ صرف عکس پوری طرح نظر آتا ہے بلکہ وہ اس کا منظوم ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔

عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب
دل کا کیا رنگ کروں خون جگر ہونے تک
غالبؔ

دامنت نایاب و من بیتاب عرض اضطراب
خواہد از خاکم غبار انگیخت ایں ابرام ما
بیدلؔ

غالب کہتے ہیں عشق میں کامیاب ہونے کے لئے صبر وتحمل لازمی ہے۔ لیکن تمنائے وصال مجھے بیتاب کر رہی ہے۔ ایسی صورت میں جب تک جگر خون ہو کر دل کا کام تمام ہو دل کو کیونکر سمجھاؤں۔ بیدل کہتے ہیں تیرا دامن نایاب ہے اور میں عرض اضطراب کے لئے بیقرار ہوں۔ میرا یہ اصرار میری خاک سے دھول اڑا کر رہے گا۔ عاشق کی شکیبائی اور اس کی تمنا کی بیتابی غالب اور بیدل دونوں کا موضوع ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کے مصرعہ ''عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب'' میں بیدل کے مصرعہ ''دامنت نایاب و من بیتاب عرض اضطراب'' کا عکس ایک حد تک پایا جاتا ہے۔ البتہ دوسرا مصرعہ بدلا ہوا ہے۔ بیدل نے اس موضوع کو ایک اور شعر میں اس طرح ادا کیا ہے:

شوق بیتاب و قدم لبریز جوش آبلہ
تا کجاہا بایدم مینا بزیر پا شکست

اے محبوب تیرا شوق مجھے بیقرار کئے ہوئے ہے اور قدم جوش آبلہ سے لبریز ہے۔ مینا (آبلوں جو مینا کی شکل کے ہوتے ہیں) کو پاؤں تلے کہاں تک توڑتا رہوں۔

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک
غالبؔ

بساط ماجرائے سایہ و خورشید طے کردم
دراں خلوت کہ او باشد خیال من نمی گنجد
بیدلؔ

یہ شعر اصل میں تصوف کے رنگ میں رنگا ہوا ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ پہلے مصرعہ میں تعلیم فنا کا ذکر ہے اور دوسرے مصرعہ میں وہ یہ کہتے ہیں کہ جب تک تمہاری نظر عنایت مجھ پر نہیں ہوتی ہے اس وقت تک میں بھی ہوں یعنی میرا وجود بھی ہے۔ ادھر تمہاری عنایت ہوئی ادھر میں فنا ہوا۔ غالب کا مطلب یہ ہے کہ ''میں بھی ہوں'' کا ادعای باطل اسی وقت تک ہے جب تک خداشناسی کی منزل نہیں ملتی۔ جب حق تعالیٰ بندے پر عنایت کی نظر کرتا ہے یعنی اسے خداشناسی کی توفیق ہوتی ہے تو اس پر یہ حقیقت الم نشرح ہوتی ہے کہ اللہ کے سوا کوئی حقیقی معنیٰ میں موجود ہے ہی

نہیں۔ بیدل کہتے ہیں سایہ اور آفتاب کے ماجرا کی بساط میں نے لپیٹ دی، جس خلوت میں وہ موجود ہوتا ہے اس میں میرے خیال کی گنجائش نہیں ہوتی۔ غالب اور بیدل دونوں نے فنافی اللہ کو موضوع بنایا ہے البتہ مثال دونوں نے الگ الگ دی ہے۔ غالب کے نزدیک سورج کی روشنی میں شبنم راہی عدم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح میں بھی یعنی میری ہستی کا احساس تب تک باقی ہے جب تک خداشناسی کی منزل تک نہیں پہنچتے۔ جسے وہ نظر عنایت سے تعبیر کرتا ہے۔ بیدل کے نزدیک آفتاب کی روشنی میں سایہ کا وجود نہیں رہتا اس لئے جس خلوت میں وہ یعنی خدا ہے وہاں میرے تمہارے وجود تو دور رہا خیال کی بھی کوئی گنجائش نہیں۔ چنانچہ اس خیال کو بیدل نے دوسرے اشعار میں اس طرح وضاحت کی ہے:

حق است آئینہ اینجا خیال ما و تو چیست
کہ دید سایہ در آفتاب تافتہ را

حق یہاں آئینہ کی طرح چاروں طرف روشن ہے، یہاں ہمارے تمہارے خیال کی کیا حقیقت ہے ،چمکتے آفتاب کے اندر سایہ کو کس نے دیکھا ہے۔

سراغ سایہ از خورشید نہ تواں یافتن بیدل
من و آئینہ نازی کہ می سوزد مقابل را

آفتاب سے سایہ کا سراغ نہیں لگایا جا سکتا۔

تا بہ سیلاب فنا وانگذاری بیدل
باخبر باش کہ رختِ تو نمازی نہ شود

جب تک خود کو فنافی اللہ کے سیلاب کے حوالے نہیں کرو گے دھیان رہے کہ تمھارا لباس بھی نمازی نہ ہوگا۔ خود تمھارا نمازی ہونا تو دور رہا۔ بیدل نے خورشید اور سایہ غالب نے خورشید اور شبنم کی علامت اس مقصد کے لئے استعمال کی ہے۔

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل گرمیِ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک غالبؔ	عمرِ شرار و برق بہ فرصت نمی کشد بیدل گذشتہ گیرد رنگ از شتاب ما بیدلؔ

غالب کا مطلب ہے کہ فرصت ہستی یا جسے مدت زندگی کہئے بہت مختصر ہے۔ بس یوں سمجھ لیجئے جیسے محفل میں شرر کا رقص ہو۔ مدت زندگی کو غالب نے رقص شرر سے تشبیہ دی ہے، جو بہت ہی موثر اور معنیٰ خیز ہے۔ بیدل کہتے ہیں چنگاری اور برق جیسی نمود رکھنے والی زندگی کو ٹھہراؤ کہاں ہے، ہماری زور گذری کی وجہ سے حال، ماضی کا روپ اختیار کرتا جا رہا ہے۔ غالب اور بیدل دونوں نے زندگی کی کم فرصتی کو موضوع بنایا ہے اس فرق کے ساتھ کہ غالب نے زندگی کی قلیل مدت کو رقص شرر سے تشبیہ دی ہے جبکہ بیدل نے اس کو براہ راست شرر اور برق کی نمود سے تشبیہ دی ہے۔ جو لمحے بھر سے زیادہ کی نہیں ہوتی۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کے پورے شعر میں بیدل کے مصرعہ "عمرِ شرار و برق بہ فرصت نمی کشد" کی صدائے بازگشت پائی جاتی ہے۔ بیدل نے اس موضوع کو اس سے بہتر انداز میں بھی ادا کیا ہے:

قدم بوادی فرصت زن و مژہ بردار
بہار می رود اے بے خبر شتاب طلب

وادی فرصت میں قدم رکھو اور پلکیں اٹھا کر دیکھو اے غافل آدمی بہار رخصت ہو رہی ہے جلد اس سے لطف حاصل کر لو۔

گر تجھ کو ہے یقین اجابت، دعا نہ مانگ
یعنی بغیر یک دل بے مدعا نہ مانگ
غالبؔ

ز مراد عالم آب و گل بہ درِ جنوں زن و واگسل
اثر اجابت منفعل ز شکست دست دعا طلب
بیدلؔ

غالب کہتے ہیں اگر تجھے اپنی دعا کے قبول ہونے کا یقین ہے تو صرف ایک دعا مانگ کہ اے خدا مجھے ایسا دل عطا کر دے جس میں کوئی مدعا اور آرزو نہ ہو۔ جب تجھے ایسا دل مل جائے تو تجھے دعا مانگنے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ بیدل کہتے ہیں کہ عالم آب و گل کی مراد یعنی دنیوی مقاصد سے نکل کر جنون کے دروازے پر دستک دو، دنیاوی علائق کو خیر باد کہو اور اجابت منفعل کا اثر دست دعا کی شکست سے طلب کرو، مطلب یہ ہے کہ انسان زندگی کی ضرورتوں اور عافیتوں کے لئے خدا سے دعا مانگتا ہے، لیکن اگر وہ دنیوی اسباب راحت سے کنارہ کشی کر کے عشق و محبت کو اختیار کر لے تو دعا مانگنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی، اس کو وہ شکست دست دعا سے اجابت منفعل

کا اثر طلب کرنے سے تعبیر کرتا ہے۔ اس خیال کو بیدل نے ایک اور شعر میں زیادہ واضح طور پر ادا کرتا ہے:

چہ خوش آنکہ ترک سبب کنی بیقین رسی وطرب کنی
ز حقیقت آنچہ طلب کنی بہ طریق بیدل ما طلب

کیا ہی اچھی بات ہوگی اگر تو اسباب سے قطع تعلق کر کے یقین کی منزل پر پہنچے اور خوشی منائے اور عالم حقیقت سے جو چیز بھی تم کو مطلوب ہو بیدل کے طریقہ...... قناعت و سیر چشمی و خدا شناسی و عشق الٰہی...... سے طلب کرو۔ غالب اور بیدل دونوں نے خدا سے دعا کو موضوع بنایا ہے اس فرق کے ساتھ کہ غالب کے نزدیک دعا کی قبولیت کا اگر یقین ہے تو صرف دل بے مدعا کی دعا مانگو، پھر کوئی دعا مانگنے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی، جبکہ بیدل کے نزدیک ترک اسباب کر کے عشق اختیار کرنے پر انسان کو دعا مانگنے کی ضرورت ہی نہیں رہ جائیگی۔ اس طرح شکست دست دعا سے اجابت شرمندہ ہوگی۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کے اس شعر میں بیدل کے ان دونوں اشعار کی جھلک نظر آئے گی۔

بجہان عجز و قدرت چہ حساب دارد لنہا	آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد
تو و صد ہزار رحمت من و یک گناہ کردن	مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ
بیدلؔ	غالبؔ

حالی لکھتے ہیں اس میں ایک نئی طرح کی شوخی ہے جو بالکل اچھوتی ہے۔ بظاہر درخواست کرتا ہے کہ اے خدا مجھ سے میرے گناہوں کا حساب نہ مانگ، اور در پردہ الزام دیتا ہے گویا یہ کہتا ہے کہ گناہوں کا حساب کیوں کر دوں، وہ شمار میں اس قدر زیادہ ہیں کہ جب ان کو شمار کرتا ہوں تو وہ داغ جو تو نے دنیا میں دئے ہیں اور جو شمار میں اسی کثرت سے ہیں جس کثرت سے میرے گناہ ہیں ان کی گنتی یاد آتی ہے۔ گناہوں اور داغوں کے شمار میں برابر ہونے سے یہ مراد رکھی ہے کہ جب کسی گناہ کا ارتکاب کیا تو بسبب عدم استطاعت اس کو خاطر خواہ نہ کر سکا۔ کوئی نہ کوئی حسرت ضرور باقی رہ گئی۔ مثلاً اگر شراب پینے کو ملی تو وصل نصیب نہ ہوا، اور وصل میسر آ گیا تو شراب

نہ ملی۔ پس جتنے گناہ کیے ہیں اتنے ہی داغ دل پر کھائے ہیں۔ (۱۲۴) بیدل کہتے ہیں کہ اے خدا ایسی دنیا میں جہاں ہم عاجز و بے بس اور تو قادر مطلق ہے میں نے اگر ایک گناہ کیا تو تیری لاکھوں رحمتیں بھی بندے پر ہوتی ہیں وہاں ان گناہوں کے حساب وکتاب کا کیا سوال ہے۔ غالب اور بیدل دونوں نے گناہ کے حساب وکتاب سے مستثنیٰ رکھنے کی خدا سے درخواست کی ہے اس فرق کے ساتھ کہ غالب کے مطابق گناہ کا ارتکاب چونکہ خاطر خواہ نہیں کیا کوئی نہ کوئی حسرت باقی رہ گئی اس لئے گناہ کا حساب لینے سے اے خدا مستثنیٰ رکھ۔ جبکہ بیدل کے مطابق میرے ایک گناہ کے مقابلے میں تیری ہزاروں رحمتیں ہیں اس لئے اے خدا اس کے حساب سے تو ہمیں مستثنیٰ رکھ۔

جو تھا سو موج رنگ کے دھوکے میں مر گیا
اے وائے نالۂ لبِ خونیں نوائے گل
غالبؔ

تمثال گل و رنگ بہارم چہ فریبد
من آئینۂ حسن خداداد تو دارم
بیدلؔ

غالب کا مطلب یہ ہے کہ پھول کا رنگ اصل میں اس کی فریاد ہے کہ اے خدا تو نے مجھے ثبات ودوام کیوں نہیں عطا کیا۔ یہ فریاد پھول کے لبِ خونیں سے نکل رہی ہے (لب خونیں کنایہ ہے اس کی سرخ پتیوں سے) لیکن ظاہر بیں لوگ اسے رنگ سمجھ کر دھوکا کھا گئے، اور اس پر فریفتہ ہو گئے۔ بیدل کہتے ہیں پھول کا تمثال اور رنگ بہار مجھے کیا فریب دے سکتا ہے میرے پاس تیرے حسن خداداد کا آئینہ ہے۔ رنگ گل کا فریب غالب اور بیدل دونوں کا موضوع ہے اس فرق کے ساتھ کہ غالب کے نزدیک ظاہر بیں لوگ گل کے رنگ کو اس کا دائمی رنگ سمجھ کر دھوکا کھائے اور اس پر فریفتہ ہو گئے۔ جبکہ بیدل کے نزدیک چونکہ وہ محبوب کے حسن خداداد کا آئینہ ہے اس لئے گل کا تمثال اور بہار کا رنگ اسے دھوکا نہیں دے سکتا۔

آزادیِ نسیم مبارک کہ ہر طرف
ٹوٹے پڑے ہیں حلقۂ دام ہوائے گل
غالبؔ

ہر کجا نکہت گل پیرہن رنگ درید
نیست پوشیدہ کہ از خود سفری میخواہد
بیدلؔ

غالب کہتے ہیں غنچہ شگفتہ ہو گئے، پھول کھل گئے، غنچوں میں قید خوشبو آزاد ہو گئی، اس لئے نسیم باغ کو جو بوئے گل سے معمور ہے آزادی بوئے گل مبارک ہو۔ بیدل کہتے ہیں نکہت گل نے جہاں بھی پیرہن رنگ کو چاک کیا تو یہ بات واضح ہو گئی کہ اس کا مقصد اپنی ذات سے نکل کر خارجی دنیا کا سفر کرنا تھا۔ راقم السطور نے اس کو منظوم ترجمہ کا روپ اس طرح دیا ہے:

نکہت گل نے اگر چاک کیا دامن رنگ
ہوا ظاہر کہ مراد اس کی سفر کرنا ہے

اس شعر کی وضاحت نیاز فتحپوری نے بڑی خوبی سے کی ہے ملاحظہ ہو:

''پھول کو ''پیرہن گل'' کہنا اور نکہت کو گل کی ''جامہ دری'' حسن تعبیر کی وہ حد ہے جہاں نظیری کی رسائی ہے نہ حافظ کی، اور ''از خود سفری میخواہد'' تو وہ انداز بیان ہے جسے بہت سے ناواقف صرف مغربی لٹریچر کی خصوصیت سمجھے ہوئے ہیں۔'' (۱۲۵)

یہاں غالب اور بیدل دونوں نے ''نکہت گل کی آزادی یا مسافرت'' کو موضوع بنایا ہے اس فرق کے ساتھ کہ غالب کے نزدیک غنچہ میں قید نکہت گل جب آزاد ہوئی تو نسیم باغ کو اس کی آزادی کی مبارک باد دی گئی۔ جبکہ بیدل کے نزدیک اس کی آزادی درحقیقت اپنی محدود ہستی کے دائرے سے نکل کر اس وسیع و عریض آفاق کی سیر کرنا ہے۔

ایجاد کرتی ہے اسے تیرے لئے بہار	خلق معشوقاں کمندِ صید مشتاقاں بس است
میرا رقیب ہے نفسِ عطر سائے گل	نیست غیر از بوئے گل زنجیر پائے عندلیب
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں اے محبوب! بہار نے گلاب کی خوشبو محض تیرے لئے ایجاد کی ہے اس لئے یہ خوشبو لامحالہ میری رقیب بن گئی کیونکہ اگر پھولوں میں خوشبو نہ ہوتی تو وہ تیرے گلے کا ہار ہرگز نہ بنتے۔ بیدل کہتے ہیں عاشقوں کو دام عشق می گرفتار کرنے کے لئے معشوق کی ادائیں کمند کا کام کرتی ہیں چنانچہ بلبل کے پاؤں کی زنجیر بوئے گل کے سوائے کوئی نہیں ہے۔ ''بوئے گل'' غالب اور بیدل دونوں کا موضوع ہے اس فرق کے ساتھ کہ غالب کے نزدیک بوئے گل عاشق کے لئے

رقیب بن گئی کیونکہ اگر گل میں خوشبو نہ ہوتی تو معشوق کے گلے کا ہار نہ بنتا، جبکہ بیدل کے نزدیک عاشق کو اپنے دام عشق میں گرفتار کرنے کے لئے معشوق کی کوئی نہ کوئی ادا ہونی چاہئے۔ یہاں وہ ادا بوئے گل ہے جو بلبل کے پاؤں کی زنجیر بن گئی۔ یہاں غالب نے نکتہ آفرینی سے کام لیا جبکہ بیدل نے اسے ایک عام اصول کی طرح سادگی سے بیان کر دیا۔

تیرے ہی جلوہ کا ہے یہ دھوکا کہ آج تک	زہے نظارہ را از جلوہ حسن تو زیورہا
بے اختیار دوڑے ہے گل در قفائے گل	رگِ برگِ گل از عکس تو در آئینہ جوہرہا
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں یہ جو باغ میں ایک پھول کے پیچھے دوسرا اور دوسرے کے پیچھے تیسرا پھول تیزی کے ساتھ شاخوں پر نکلتا چلا آتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ انھیں یہ غلط فہمی ہوگئی کہ تو صحن چمن میں مصروف گل گشت ہے۔ اس لئے تیرے دیدار کے اشتیاق میں پھول یکے بعد دیگرے پیہم کھلتے چلے جاتے ہیں۔ بیدل کہتے ہیں اس نظارے کا جس کی آرائش تیرے جلوہ حسن سے ہے۔ جس کی جھلک سے برگ گل کی رگ ایسی لگ رہی ہے جیسے آئینہ میں جوہر ہو، غالب اور بیدل دونوں نے ''جلوۂ حسن محبوب کی دلکشی'' کو موضوع بنایا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ غالب کے نزدیک اس غلط فہمی میں کہ محبوب نے باغ میں اپنے جلوہ حسن کا مظاہرہ کیا ہے پھول اس کو دیکھنے کے لئے ایک کے پیچھے دوسرے نکلتے چلے آرہے ہیں۔ جبکہ بیدل کے نزدیک جلوۂ حسن محبوب سے باغ کا پورا منظر اس قدر حسین اور دلکش ہوگیا ہے کہ اس کی جھلک رگِ برگ گل میں بھی نظر آنے لگی۔ جس طرح آئینہ کے اندر اس کا جوہر یعنی صیقل چمکتا ہے۔

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس	آزادگاں از کلفتِ اسباب فارغند
برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم	نتواں نگاہ داشت بزنجیر نالہ را
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ دنیوی علائق سے آزاد ہوتے ہیں انہیں کسی چیز کے جاتے رہنے کا غم ایک لمحہ سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اس نکتہ کو واضح کرنے کے لئے غالب نے یہ مثال دی ہے کہ وہ لوگ اپنے ماتم خانہ کی شمع برق سے روشن کرتے ہیں یعنی جس طرح برق کی روشنی ایک لمحہ سے زیادہ

نہیں ہوتی اسی طرح غم بھی ایک لمحہ سے زیادہ نہیں ہوتا۔ بیدل کہتے ہیں آزاد منش لوگ اسباب کی کلفت یعنی سروساماں کے غم سے فارغ ہوتے ہیں۔ نالہ کو زنجیر میں جکڑ کر نہیں رکھا جا سکتا۔ آزاد مزاج لوگوں کو کسی چیز کے جانے کا غم نہیں ہوتا، اس امر میں غالب اور بیدل دونوں متفق ہیں مگر غالب کے نزدیک ان کو اگر غم ہوتا بھی ہے تو لمحہ بھر کے لئے جبکہ بیدل کے نزدیک سرے سے انہیں غم نہیں ہوتا۔ جس طرح نالے کو زنجیر میں جکڑا نہیں جا سکتا، اسی طرح آزاد مزاج انسان کو حالات کی ناسازگاری پابہ زنجیر نہیں کرسکتی۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کے مصرعہ ''غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس'' میں بیدل کے مصرعہ ''آزادگاں از کلفتِ اسباب فارغند'' کا عکس موجود ہے۔ مثال البتہ دونوں نے الگ الگ دی ہے۔ اس خیال کو بیدل نے دوسرے شعر میں اس طرح ادا کیا ہے:

بر طینت آزار شکستی نتواں بست
بے رنگی ایں شیشہ ز آفات سلیم است

آزاد منش آدمی کو شکست سے دوچار نہیں ہونا پڑتا ہے اس شیشہ کی بے رنگی آفات سے محفوظ ہے۔ بیدل کے نزدیک آزاد مزاجی کا مفہوم صرف یہی نہیں ہے کہ اس کو کسی چیز کے جانے کا غم نہیں ہوتا بلکہ غم و خوشی، کمی بیشی، مشکل و آسان کسی چیز سے وہ متاثر نہیں ہوتا، اور اس کی طبیعت میں ایک ہمواری ہوتی ہے، وہ بادِ نسیم کی طرح چمن میں داخل ہوتا ہے اور دامن جھاڑتا ہوا نکل جاتا ہے۔ اس خیال کو بیدل نے درج ذیل رباعی میں ادا کیا ہے:

بیدل ز غم و نشاط دوراں بگذر — وز بیش و کم و مشکل و آساں بگذر
در گلشن دہر ہمچو نسیم دم صبح — آزادہ درآ و دامن افشاں بگذر

باوجود یک جہاں ہنگامہ پیدائی نہیں — ہیں چراغانِ شبستانِ دلِ پروانہ ہم
غالبؔ

باہمہ کثرت شماری غیر وحدت باطلست — یک یک آمد برزباں از صد ہزار اعدادہا
بیدلؔ

غالب کا مطلب یہ ہے کہ پروانہ کے دل میں جس چراغاں نے اس قدر ہنگامہ برپا کردیا ہے اس کا خارج میں کہیں وجود نہیں ہے۔ یہی حال ہماری ہستی کا ہے کہ دیکھنے میں ہر طرف ہنگامہ برپا ہے، مگر دراصل ہماری ہستی خارج میں موجود نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کائنات میں صرف ایک ہستی واجب الوجود کی موجود ہے اور یہ کائنات اس ہستی مطلق کا پرتو ہے۔ بیدل کہتے ہیں کثرت شماری یعنی یہ تسلیم کرنے کے باوجود کہ یہ دنیا دنیائے کثرت ہے وحدت وجود کے سوا سب کا وجود باطل ہے۔ اگر آپ ایک لاکھ تک عدد شمار کرتے چلے جائیں تو زبان پر ایک ہی کا عدد باقی رہ جائے گا۔ یعنی اگر سفر ہٹادیں تو ایک کے سوا کیا رہ جائے گا۔ دنیا میں اپنی کثرت شماری یا یک جہاں ہنگامہ ہستی کے باوجود ہمارا وجود باطل ہے صرف خدائے وحدہ لاشریک لہٗ کا وجود ہے اس کو غالب اور بیدل دونوں نے موضوع بنایا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کے مصرعہ "باوجود یک جہاں ہنگامہ پیدائی نہیں" میں بیدل کے مصرعہ "باہمہ کثرت شماری غیر وحدت باطلست" کا عکس موجود ہے۔ البتہ مثالیں دونوں نے الگ الگ دی ہیں۔

دائم الحبس اس میں ہیں لاکھوں تمنائیں اسد	در زمین آرزو بیدل املہا کاشتیم
جانتے ہیں سینہ پرخوں کو زنداں خانہ ہم	لیک غیر از حسرت نشو و نمائے برنخاست
غالب	بیدل

غالب کہتے ہیں ہمارے سینہ میں لاکھوں تمنائیں ایسی ہیں جن کے پورے ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اس لئے ہم اپنے سینہ کو ایک قید خانہ تصور کرتے ہیں جس میں وہ تمنائیں ہمیشہ کے لئے قید کردی گئی ہیں۔ بیدل کہتے ہیں آرزو کی سرزمین میں میں نے بہت سی تمناؤں کے بیج بوئے لیکن نشو ونما کی حسرت کے سوا کوئی حاصل نہیں نکلا۔ غالب اور بیدل دونوں نے بہت سی آرزوؤں کے ناشرمندۂ تکمیل ہونے پر اتفاق کیا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کے پورے شعر میں بیدل کے اس خیال کا عکس موجود ہے، البتہ غالب نے ان آرزوؤں کے پوری نہ ہونے کی وجہ سے اپنے سینہ پرخوں کو قید خانہ قرار دیا، جس میں وہ تمنائیں محبوس ہیں، جبکہ بیدل کو ان کی حسرت نشو ونما ستائے ہوئے ہے۔ ایک شعر میں بیدل دل کے زندان خانہ گرفتاری میں قید رہنے پر خوشی کا اظہار کرتا ہے:

بیدل از بس بگرفتاری دل خو کردیم
بے غم دام و قفس خاطر ما خرم نیست

دو روزی عذر خواہ نالہ دل بایدم بردن	مجھ کو دیار غیر میں مارا وطن سے دور
غریبی در دیار بیکسی یاد وطن دارد	رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم
بیدلؔ	غالبؔ

حالی لکھتے ہیں پردیس میں مرنا جو ہر شخص کو ناگوار ہوتا ہے اس پر خدا کا شکر اس لئے کرتا ہے کہ اگر وہاں بے گور وکفن پڑے رہے تو کچھ مضائقہ نہیں، کیونکہ کوئی شخص نہیں جانتا کہ یہ کون تھا اور کس رتبے کا آدمی تھا، لیکن وطن میں مرنا جہاں ایک زمانہ واقف حال ہو مگر خریدار وغم خوار ایک بھی نہ ہو وہاں مردے کی طرح مٹی خراب ہونی سخت رسوائی وذلت کی بات تھی، پس خدا کا شکر ہے کہ اس نے پردیس میں موت دے کر میری بے کسی کی شرم رکھ لی۔ اس میں گو بظاہر خدا کا شکر ہے لیکن درحقیقت اہل وطن کی شکایت ہے، جس کو ایک عجیب پیرائے میں ظاہر کیا ہے۔ (۱۲۶)

بیدل نے اپنے شعر میں اپنی پوری رام کہانی بیان کردی ہے۔ اپنی بے بسی ولاچاری کی وجہ سے اپنے وطن بہار خصوصاً عظیم آباد کو خیر باد کہہ کر بنگال، اڑیسہ، اترپردیش، دہلی، پنجاب، کشمیر، گجرات میں پردیسی کی زندگی گذاری۔ جہاں اس کو اکثر اپنے وطن کی یاد، جو فطری امر ہے، ستاتی رہتی ہے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں ایک مسافر کو دیار غربت وبیکسی میں وطن کی یاد آتی ہے لیکن اس یاد سے اس کی بیکسی کا تدارک نہیں ہوسکتا اس لئے کہتا ہے دودن کی زندگی میں اگر نالہ دل سے سابقہ ہے تو اس کو اس میں خود کو معذور سمجھ کر زندگی گذار دینی چاہئے۔ بیدل اور غالب دونوں نے دیار بیکسی اور غربت میں موت کو موضوع بنایا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ غالب نے اس بات پر خدا کا شکر ادا کیا، کہ اس نے پردیس میں موت دے کر میری بیکسی کی لاج رکھ لی۔ حالانکہ ان کی موت اپنے دیس ہی میں ہوئی کیونکہ آگرہ اور دہلی میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔ کلکتہ، لکھنؤ یا بنارس میں نہیں ہوئی جو ان کے لئے دیار غربت کی حیثیت رکھتے تھے جبکہ بیدل کی موت ایک طرح سے پردیس میں ہوئی کیونکہ ان کی جائے پیدائش بہار تھا۔ اس

لئے یہ مصرعہ بلکہ پورا شعر بیدل پر پورا صادق آتا ہے۔ بیدل کے نزدیک حالات کی ستم ظریفی نے اسے پردیس پہنچایا جہاں اسے تکلیف بھی ملی اور آرام بھی ملا، پر وہ تکلیف کو بخوشی اس لئے جھیلنا چاہتا ہے کہ زندگی صرف دو دن کی ہے۔ غالب کا ایک فارسی شعر اسی مفہوم میں ہے:

غربتم ناسازگار آمد وطن فہمیدمش
کرد تنگی حلقۂ دام آشیاں نامیدمش

وہ حلقہ ہائے زلف کمیں میں ہے اے خدا	دل زدام حلقہ زلفت چساں آید بروں
رکھ لیجو مرے دعویِ وارستگی کی شرم	مہرہ را نتواں گرفتن از دہان مارہا
غالب	بیدل

غالب کا مطلب یہ ہے کہ اے خدا محبوب کی زلفیں اپنے دام میں گرفتار کرنے کے لئے گھات لگائے بیٹھی ہوئی ہیں۔ ادھر میرا دعویٰ ہے کہ میں اس کی زلفوں میں اسیر نہیں ہوں گا اس لئے میرے اس دعوے کی لاج رکھ لے۔ بیدل کہتے ہیں میرا دل تیرے حلقہ زلف کے دام سے بھلا کیونکر نجات پا سکتا ہے۔ مہرہ یعنی سانپ کا منکا سانپ کے منہ سے نکالا نہیں جا سکتا۔ غالب اور بیدل دونوں نے حلقہ زلف محبوب کے دام میں گرفتاری کو موضوع بنایا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ غالب کے نزدیک زلف محبوب دل عاشق کو گرفتار کرنے کے لئے گھات لگائے بیٹھی ہے۔ اس لئے خدا سے درخواست کرتا ہے کہ میرے دعویٔ عدم اسیری کی لاج رکھ لے، جبکہ بیدل کے نزدیک حلقہ زلف محبوب کے دام سے نکلنا اسی طرح ناممکن ہے جس طرح سانپ کے منہ سے اس کا منکا نکالنا، غور سے دیکھا جائے تو غالب کے مصرعہ ''وہ حلقہ ہائے زلف کمیں میں ہے اے خدا'' کو بیدل کے مصرعہ ''دل زدام حلقہ زلفت چساں آید بروں'' کو ملا کر پڑھئے تو اندازہ ہوگا کہ غالب کے تحت الشعور میں بیدل کا یہ خیال موجود تھا۔ لیکن غالب نے اس شعر میں وارستگی کو بھی موضوع بنایا ہے۔ اس موضوع پر بیدل کا خیال ملاحظہ ہو:

قید اسباب بہ وارستگی ما چہ کند
بوئے گل در جگر رنگ ہم از رنگ جداست

اسباب و سامان کی قید و بند ہماری وارستگی کو کب متاثر کر سکتی ہے۔ پھول کی خوشبو رنگ کے جگر

میں ہوتے ہوئے بھی اس سے آزاد ہے۔

تھی وہ اک شخص کہ تصور سے　　آں رنگہا کہ داشت خیال ایں زماں کجاست
اب وہ رعنائی خیال کہاں　　افگندہ بود آئینہ در آب روغنم
غالبؔ　　بیدلؔ

غالب کہتے ہیں میرے خیالات میں رعنائی محبوب کے تصور سے تھی اب نہ وہ محبوب ہے نہ میرے خیالات میں وہ رعنائی ہے۔ بیدل کہتے ہیں میری قوت خیال جوانی میں جس رنگ و روغن کی حامل تھی وہ اب پیری میں کہاں ہے، آئینہ دل نے میرے رنگ و روغن کو پانی میں ڈال دیا۔ بیدل نے ایک خط میں اپنے کو ''ترجمان رنگینہائے تعبیر'' یعنی نت نئے رنگین انداز اور طرز تعبیر کا ترجمان لکھا ہے، اور بعض اشعار میں اپنے خیال کو ''چمن پرور'' اور خود کو ''چمن پرداز'' کہا ہے: ع

جیب دامانِ خیال ما چمن می پرورد

☆☆☆

بہر رنگی کہ می آیم ''چمن پرداز'' می آیم

ظاہر بات ہے بڑھاپے میں قوت خیال کے اندر وہ کس بل کہاں، اس لئے اس پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ پانی میں تیل ڈالنے سے تیل کی خصوصیت جاتی رہتی ہے یہی حال بڑھاپے میں میری قوت خیال کی ہوگئی ہے۔ غالب اور بیدل دونوں نے اپنے خیال کی رعنائی کے رخصت ہو جانے کا ماتم کیا ہے۔

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب　　یارب چہ بودم و کجا رفتہ ام کہ من
اب عناصر میں اعتدال کہاں　　ہر گہ بیاد خویش رسم گریہ می کنم
غالبؔ　　بیدلؔ

غالب کہتے ہیں پیری میں قوائے جسمانی مضمحل ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے پھر عناصر میں اعتدال بھی باقی نہیں رہتا، اس اختلال کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دل میں کوئی آرزو یا امنگ پیدا نہیں ہوتی۔ بیدل کہتے ہیں بار الہا: میں کبھی کیا تھا اب کیا ہو گیا ہوں؟ جب کبھی اپنی ماضی کو یاد

کرتا ہوں تو مجھے اپنے اوپر رونا آتا ہے۔ غالب اور بیدل دونوں نے عالم جوانی کی تروتازگی، قوت وتوانائی، شاعرانہ بلند پروازی اور ادبی سرگرمی کو یاد کر کے بڑھاپے کی ناتوانی اور اعضاء کی پژمردگی کی وجہ سے ادبی سرگرمی کو جاری نہ رکھنے پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔ غالب کی اس پوری غزل کو جب ہم بیدل کی اس پوری غزل سے جو بڑھاپے میں کہی گئی ہے موازنہ کر کے دیکھتے ہیں تو دونوں میں بڑی مماثلتیں ملتی ہیں۔

کی وفا ہم سے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں	در دلش میل جفا نقشی است بر لوح جبیں
ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں	بر لبش حرف وفا بیرون طبع غنچہ بو
غالب	بیدل

غالب کہتے ہیں محبوب نے ہم سے وفا کی تو رقیبوں نے جل کر اس کی وفا کو جفا سے تعبیر کیا ہے۔ غالب پر مہربانی قدر تاً رقیبوں کی ناخوشی کا باعث ہوئی ہے۔ اسی لئے انہوں نے محبوب کو بدنام کرنا شروع کر دیا۔ غالب محبوب کی کدورت کو دور کرنے کے لئے اس سے کہتے ہیں آپ اس کا مطلق خیال نہ کریں، لوگ اچھوں کو ہمیشہ برا کہتے آئے ہیں۔ بیدل کہتے ہیں محبوب کے دل میں جفا کی طرف میلان تو ایک ایسا نقش ہے جو اس کی لوح پیشانی پر ثبت ہے، اور اس کے ہونٹوں پر حرف وفا ایسا ہی ہے جیسے غنچہ کی طبیعت سے خوشبو اڑ کر فضا میں ناپید ہو جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جفا اس کی سرشت میں داخل ہے، اور وفا بوئے غنچہ کی طرح اس کی قید میں نہیں رہتی۔ ع

بہ ظرف غنچہ دشوار است بودن نکہت گل را

وفا اور جفائے محبوب غالب اور بیدل دونوں کا موضوع ہے اس فرق کے ساتھ کہ غالب کے نزدیک محبوب نے اس کے ساتھ وفاداری کا سلوک کیا تو رقیبوں نے اسے جفا سے تعبیر کیا، جبکہ بیدل کے نزدیک محبوب کی وفاداری ایسی ہی پھسپھسی ہے جیسے غنچہ میں بو جو قید میں نہیں رہ سکتی، اور جفا تو اس کی پیشانی پر نقش کالحجر ہے۔ چنانچہ دوسری جگہ کہتا ہے:

نشان مردی بیدل چہ جوئی از سیہ چشماں
وفا کن پیشہ و زیں قوم آئینہ جفا بنگر

☆☆☆

اثر ہائے مروت از سیہ چشماں مجو بیدل
وفا کن پیشہ و زیں قوم آئینہ جفا بنگر

غالب نے ایک اور شعر میں وفائے دلبراں کو ایک اتفاقی امر قرار دیا ہے اور بیدل سے اختلاف کیا ہے:

وفائے دلبراں ہے اتفاقی ورنہ اے ہمدم
اثر فریاد دلہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے

رستن ز دور گردوں بے میکشی محال است	اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو
دز دیدہ ام ز مینا سر در پناہ مینا	جو مئے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں
بیدلؔ	غالبؔ

غالب کہتے ہیں اگلے وقتوں کے لوگ سادہ لوح ہوتے تھے اس لئے وہ مئے ونغمہ کو غم غلط کرنے والا سمجھتے تھے۔ حالانکہ غم ایسی چیز نہیں ہے جو مئے یا نغمہ سے دور ہو سکے۔ غم تو حقیقت زندگی ہے اس لئے جب تک دم ہے تب تک غم ہے۔ بیدل کہتے ہیں گردش دوراں سے رہائی میکشی کے بغیر ممکن ہی نہیں، چنانچہ میں نے مینا سے سر اٹھایا تو پھر مینا ہی میں پناہ لیا۔ ایک اور شعر میں بھی وہ اسی خیال کا اظہار کرتا ہے:

ما بزور مے پرستی زندگانی می کنیم
چوں حباب مئے بنائے ماست سر تاپا شراب

ہم تو مئے پرستی کے سہارے ہی زندگی گزار رہے ہیں۔ حباب مئے کی طرح ہماری بنیاد بھی سراسر شراب پر قائم ہے۔ یہاں شراب کی اندوہ ربائی یا غم غلط کرنے کو غالب اور بیدل دونوں نے موضوع بنایا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ غالب کے نزدیک شراب کی اندوہ ربائی اگلے وقت کے سادہ لوح لوگوں کا خیال تھا، اب صورت حال ایسی نہیں ہے۔ جبکہ بیدل کا خیال ہے کہ یہ ہمیشہ سے اندوہ ربا رہی ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔ غالب یہاں یہ کہہ گئے لیکن وہ بھی شراب کی اندوہ ربائی کے قائل تھے:

مئے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو
یک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہئے

ایک خط میں لکھتے ہیں:

''آگ میں گرمی سہی مگر وہ آتش سیال کہاں کہ جب دو جرعے پی لئے فوراً رگ و پے میں دوڑ گئی، دل توانا ہو گیا، دماغ روشن ہو گیا، نفس ناطقہ کو تواجد بہم پہنچا، ساقی کوثر کا بندہ اور تشنہ کب تک رہے''۔ (۱۲۷)

ضعف سے اے گریہ کچھ باقی مرے تن میں نہیں
رنگ ہو کر اڑ گیا جو خوں کے دامن میں نہیں
غالبؔ

چساں بدوش اجابت رسانمش بیدل
کہ از ضعیفیِ تن دست نالہ کوتاہست
بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ گریہ سے خطاب کرتے ہیں کہ اب میرے جسم میں خون بالکل باقی نہیں ہے۔ زیادہ تر خون تو آنکھوں کی راہ سے نکل گیا اس کا ثبوت میرے خون آلود دامن سے مل سکتا ہے اور جو باقی رہ گیا تھا وہ رنگ بن کر اڑ گیا۔ ظاہر ہے کہ ضعف میں رنگ اڑ جانے سے تعبیر کیا کرتے ہیں۔ بیدل کہتے ہیں میری ناتوانی کی وجہ سے میرا دست نالہ کوتاہ واقع ہوا ہے اس لئے اسے دوش اجابت تک کیسے پہنچا سکتا ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ میں فراق یار میں آہ و نالہ کرتا ہوں لیکن نقاہت کی وجہ سے اس میں اتنی توانائی نہیں ہے کہ محبوب کے دوش اجابت تک پہنچا سکوں۔ یعنی وہ اس سے متاثر ہو کر اس کا جواب دے۔ یہاں غالب اور بیدل دونوں نے نارسائی نالہ کو موضوع بنایا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ غالب کے نزدیک ہوش میں آنے کے بعد نالہ کا خیال عاشق کے دل میں آتا ہے، یہ تصور نالہ کی رسائی کا ثبوت ہے، نہیں تو پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں۔ جبکہ بیدل کے نزدیک جسمانی ناتوانی کی وجہ سے عاشق کے نالے میں اتنی سکت نہیں ہے کہ محبوب اس سے متاثر ہو کر اس کا جواب دے۔ غالب کا دوسرا شعر بھی اس وزن میں ہے جس میں بیدل کے خیال کا عکس پایا جاتا ہے۔

غالب کے اس شعر کے ساتھ بیدل کا شعر ملا کر پڑھا جائے تو غالب کے پہلے مصرعہ ''ضعف سے اے گریہ کچھ باقی میرے تن میں نہیں'' میں بیدل کے مصرعہ ''کہ از ضعیفیِ تن دست نالہ کوتاہست'' کا عکس موجود ہے۔

ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود	باوج کبریا کز پہلوئے عجزست راہ آنجا
قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں	سرِ موئے گر اینجا خم شوی بشکن کلاہ آنجا
غالبؔ	بیدلؔ

غالب نے اس شعر میں غیر مسلموں کے اس اعتراض کا جواب دیا ہے کہ مسلمان کعبہ کو سجدہ کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہمارا مسجود یعنی معبود حقیقی عقل کی دسترس سے بالاتر ہے۔ کیونکہ عقل صرف محسوسات کا ادراک کرسکتی ہے اور خدا تو غیر محسوس ہے۔ چونکہ سجدہ کرنے کے لئے جہت کا تعین ضروری ہے اس لئے ہم نے خانہ کعبہ کو جہت سجدہ قرار دیا ہے۔ یعنی وہ دراصل قبلہ نما ہے نہ کہ مسجود ہے، مسلمان موحد ہوتے ہیں، یعنی شرک سے دور رہتے اور اور بت پرستی سے نفرت کرتے ہیں، اس لئے وہ کعبہ کو مسجود قرار نہیں دے سکتے۔ بیدل کہتے ہیں اوج کبریا تک پہنچنے کا راستہ عجز و درماندگی کا حامل ہے، بال برابر بھی اگر تم جھکے تو تمہاری ٹوپی گر ہو جائے گی۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کی کبریائی تک پہنچنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔ وہ یہاں عاجز و درماندہ ہے۔ اس لئے اگر وہ اس کے حضور عجز و درماندگی کا اظہار کرے تو اسے سربلندی حاصل ہوگی، چنانچہ ایک شعر میں کہتا ہے:

کبریا گم بود در تمہید عجز
تا گدا گفتیم شہ آوردیم ما

☆☆☆

ما سجدہ سرشتاں را جز عجز پناہی نیست
امید رسا داریم چوں سر بہ تہِ موہا

خدا کی کنہ انسانی ادراک سے وراء الورا ہے اس کو غالب اور بیدل دونوں نے موضوع بنایا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کا مصرعہ ''ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود'' میں بیدل کے مصرعہ ''باوج کبریا کز پہلوئے عجزست راہ آنجا'' کا عکس موجود ہے۔ بلکہ اس کا ایک آزاد ترجمہ ہے۔ البتہ غالب نے دوسرے مصرعہ میں مسلمانوں پر کئے جانے والے ایک اعتراض کا جواب دیا ہے، جو درست ہے۔

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذت زخم سوزن میں نہیں
غالبؔ

علاج زخم دل از گریہ کے ممکن بود بیدل
ز شبنم بخیہ نتواں کرد چاک دامن گل را
بیدلؔ

غالب کہتے ہیں رقیب کو یہ راز معلوم نہیں کہ میں زخم اس لئے سلوا رہا ہوں کہ مجھے سوئی کے چبھنے سے لذت محسوس ہوتی ہے اس لئے وہ نادانی کی وجہ سے طعنہ دیتا ہے کہ میں زخم کی چارہ جوئی یعنی اس کا علاج کر رہا ہوں۔ بیدل کہتے ہیں زخم دل کا علاج گریہ وزاری سے کب ممکن ہے شبنم سے کہیں چاک دامن گل کو سیا جاسکتا ہے؟ یہاں زخم دل کا علاج غالب اور بیدل دونوں کا موضوع ہے۔ غالب کے نزدیک زخم سلوانے کی کوشش پر رقیب اسے چارہ جوئی کا الزام دھرتا ہے جبکہ سوئی چبھونے سے بھی لذت حاصل ہو رہی ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کے تحت الشعور میں بیدل کا یہ شعر ضرور موجود تھا اگرچہ اس نے مضمون کا انداز بدل دیا ہے۔

بسکہ ہیں ہم اک بہار ناز کے مارے ہوئے
جلوۂ گل کے سوا گرد اپنے مدفن میں نہیں
غالبؔ

آمدم تا صد چمن بر جلوہ نازاں بینمت
نشہ در سر، مے بساغر، گل بداماں بینمت
بیدلؔ

غالب کہتے ہیں چونکہ ہم کشتہ بہار ناز ہیں، اس لئے ہمارے مدفن میں خاک کے بجائے ہر طرف پھول ہی پھول کھلے ہوئے ہیں۔ یہاں بہار ناز سے مراد معشوق ہے۔ مقصد یہ ہے کہ ہم محبوب کے ناز و ادا کے مارے ہوئے ہیں۔ بیدل کہتے ہیں اے محبوب تجھے سیکڑوں چمن میں اس حالت میں اپنے جلوہ حسن پر ناز کرتے دیکھنے آیا ہوں کہ تیرے سر میں نشہ، پیالے میں شراب اور دامن میں پھول بھرے ہوں۔ غالب اور بیدل دونوں نے محبوب کے ناز و ادا کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک عاشق معشوق کی بہار ناز و ادا کا مارا ہوا ہے اس لئے اس کے مزار پر خاک کے بجائے پھول کھلے ہوئے ہیں۔ جبکہ بیدل کے نزدیک عاشق محبوب کو چمن میں اپنے جلوۂ حسن پر اس طرح ناز کرتے دیکھنا چاہتا ہے کہ اس کے سر میں نشہ، ہاتھ میں ساغر، اور دامن میں پھول بھرے ہوں۔ یہاں بیدل نے معشوق کے ناز و ادا کی جس قاتلانہ کیفیت کا منظر کھینچا

ہے وہ ایک عاشق کے لئے یقیناً قاتل ہے۔ غالب نے کشتہ بہار ناز کہہ کر اس پر مرتب ہونے والے نتیجہ کو تو بیان کر دیا مگر اس کی قاتلانہ کیفیت ناز کو نہیں بیان کیا۔ اس طرح دیکھا جائے تو بیدل کا شعر زیادہ دلکش ہے۔

قطرہ قطرہ اک ہیولیٰ ہے مرے نئے ناسور کا	بیدل ز فہم تلاش درد غافل نہ گذری
خون بھی ذوق درد سے فارغ مرے تن میں نہیں	دل بصد خون جگر یک آہ موزوں می کند
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں میرے خون کے ہر قطرے میں ناسور بن جانے کی صلاحیت پوشیدہ ہے اس لئے میں کہہ سکتا ہوں کہ میرے خون کے ہر قطرے میں لذت درد پنہاں ہے۔ بیدل کہتے ہیں تلاش درد کو سمجھنے میں لاپرواہی نہ برتنا، دل سیکڑوں خون جگر بہاتا ہے تب جا کر وہ ایک آہ موزوں کر پاتا ہے۔ یہاں غالب اور بیدل دونوں نے درد عشق کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک خون کے ہر قطرے میں چونکہ ناسور بننے کی اہلیت ہے اس لئے اس کے اندر لذت درد پنہاں ہے۔ جبکہ بیدل کے نزدیک سیکڑوں خون جگر بہانے کے بعد دل ایک آہ موزوں کر کے نکالتا ہے۔ اس لئے درد کی اہمیت اور حلاوت کو سمجھنے اور اس سے لاپرواہی نہ برتنے کی تلقین کرتا ہے۔ چنانچہ ایک اور شعر میں اس کی طرف اشارہ کرتا ہے:

بانشہ حلاوتِ درد آشنا نہ ای
چوں نے بنالہ پیچ و سراپا شکر برآ

درد عشق میں کیا حلاوت ہے تم اس سے واقف نہیں ہو، اس لئے بانسری کی طرح اپنے نالے میں پیچ تاب کھاؤ اور سراپا شکر بن کر نکلو۔ ان دونوں اشعار میں بیدل نے درد کی اہمیت اور اس کی حلاوت پر متوجہ کر کے قاری کو اس کی قدر کرنے کی تلقین کی ہے۔

لے گئی ساقی کی نخوت قلزم آشامی مری	تہی دستیم چوں ساغر خدارا ساقیا رحمی
موج مے کی آج رگ مینا کی گردن میں نہیں	بروئے بخت ما بکشا درِ گنجینۂ مینا
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں میری قلزم آشامی ساقی کی نخوت کو اپنے ساتھ بہا کر لے گئی۔ مطلب یہ ہے کہ ساقی کو اپنے شراب پلانے پر بہت غرور تھا، مگر میں نے کثرت مئے نوشی سے بوتل خالی کر کے اس کا غرور توڑ دیا۔ بیدل کہتے ہیں اے ساقی ہم لوگ ساغر کی طرح تہی دست ہیں، خدا کے لئے ہمارے حال پر ترس کھا کر درگنجینہ مینا کو ہماری قسمت پر کھول دے۔ غالب اور بیدل دونوں نے مئے نوشی کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک ساقی کو اپنے شراب پلانے پر بڑا غرور تھا۔ کثرت مئے نوشی کی وجہ سے غالب نے بوتل توڑ کر اس کا غرور خاک میں ملا دیا جبکہ بیدل نے غالب کے بالکل برعکس اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ ساغر کی طرح ہم بالکل تہی دست ہیں اس لئے اے ساقی خدا کے لئے ہم پر ترس کھا کر خزانہ مینا کے دروازے کھول دے، یعنی خوب پلا۔ یہاں غالب اور بیدل دونوں دو متضاد سمتوں میں گئے ہیں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ غالب کے ذہن میں بیدل کا یہ شعر موجود تھا۔ غور کرنے سے پتا چلتا ہے بیدل کا یہ شعر مجاز کی بہ نسبت حقیقت سے زیادہ تعلق رکھتا ہے۔ گویا وہ پیر مرشد سے جو ساقی کے درجے میں ہے یہ درخواست کرتا ہے کہ میرا ساغر مئے عرفان خالی ہے اس لئے میری قسمت پر مینائے عرفان خدا شناسی و عشق الہی کے خزانے کا دروازہ کھول دے۔

ہو فشارِ ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود	بسکہ دارد ناتوانی نبض احوال مرا
قد کے جھکنے کی بھی گنجائش مرے تن میں نہیں	باز گشتن نیست از آئینہ تمثال مرا
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں چونکہ ضعف نے ہر طرف سے مجھے دبا رکھا ہے اس لئے کسی طرف کو جھک نہیں سکتا، یا میں اس قدر ضعیف ہوں کہ اپنی ناتوانی کا اظہار بھی نہیں کر سکتا۔ بیدل کہتے ہیں میری نبض احوال میں اس قدر ضعف و ناتوانی ہے کہ آئینہ سے میرے تمثال کی واپسی بھی ممکن نہیں۔ غالب اور بیدل دونوں نے ناتوانی کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک وہ اس قدر ناتواں ہو گیا ہے کہ قد جھکانے کی گنجائش بھی اس میں نہیں رہی۔ جبکہ بیدل کے نزدیک نبض احوال میں اتنی نقاہت آ گئی ہے کہ آئینے سے اس کے تمثال کی واپسی بھی ممکن نہیں۔ آئینہ میں ہر چیز کا عکس یا تمثال نظر آتا ہے۔ ع

چیزے کہ در آئینہ تواں دید مثال است

اب انسان اگر انتہائی لاغر اور کمزور ہے تو آئینہ میں بھی ویسا ہی لاغر اور کمزور نظر آئے گا۔ اگر چہ خارجی مصنوعی عمل سے اس کے اس تمثال کو بدلا جا سکتا ہے لیکن بیدل کہتے ہیں کسی بھی شکل میں اس کی اس ناتوانی کو دور نہیں کیا جا سکتا۔ اس مفہوم کو بیدل دوسرے شعر میں اس طرح ادا کرتا ہے:

پیکرم خوں گشتہ از ضعف و دل خوں می خورد
بارِ ایں کشتی بدوشِ ناخدا افتادہ است

ناتوانی کی بدولت میرا جسم خون ہو گیا ہے، اور دل خون کے گھونٹ پی رہا ہے، ۔اس کشتی کا بوجھ اب ناخدا کے کاندھوں پر پڑ گیا ہے۔

تھی وطن میں شان کیا غالب کہ ہو غربت میں قدر	خاک غربت کیمیائے مردم نیک اختر است
بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں	قطرہ در گردِ یتیمی خشک چوں شد گوہر است
غالبؔ	بیدلؔ

حالی اس شعر کی وضاحت میں لکھتے ہیں اپنے تئیں خس یعنی پھوس وغیرہ سے اور وطن کو گلخن سے تشبیہ دی ہے۔ یعنی جس طرح پھوس گلخن میں ہوتا ہے تو جلتا ہے اور گلخن (انگیٹھی) میں نہیں ہوتا ہے تو اس کی کچھ قدر نہیں ہوتی۔ یہی حال میرا ہے کہ وطن میں تھا تو جلتا تھا اور اب پردیس میں ہوں تو بے قدر رہوں۔ (۱۲۸) بیدل کہتے ہیں پردیس کی سرزمین نیک اختر لوگوں کے لئے کیمیا ہے۔ قطرہ گرد یتیمی میں جب خشک ہو گیا تو گوہر بن گیا۔ غربت میں قدر کو غالب اور بیدل دونوں نے موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک وطن میں کیا قدر قیمت تھی جو پردیس میں ہو۔ یعنی دونوں جگہ اس کی وہ قدر جو ہونی تھی یا جس کی توقع انہیں تھی نہیں ہوئی۔ ایک شعر میں اور اچھے انداز سے اس کا ذکر کیا ہے:

کرتے کس منھ سے ہو غربت کی شکایت غالب
تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں

چنانچہ دہلی میں رہے تو ایک خط میں لکھتے ہیں: ''پندرہ برس کی عمر سے شعر کہتا ہوں۔ ساٹھ برس بکا، نہ مدح کا صلہ ملا نہ غزل کی داد۔'' (۱۲۹) دوسرے خط میں لکھتے ہیں: ''ہر شخص نے بقدر حال ایک

ایک قدرداں پایا۔ غالب سوختہ اختر کو ہنر کی داد بھی نہ ملی۔'' (۱۳۰) دہلی سے جب کلکتہ گئے تو وہاں بھی غیر معمولی ادبی معرکہ ہوا جس کی گواہ ان کی مثنوی بادِ مخالف ہے۔ چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں ''اللہ اللہ کلکتے میں جو شور نشور اٹھا تھا''۔ (۱۳۱) بیدل کے نزدیک اگر آدمی خوش قسمت ہے تو پردیس کی سرزمین اس کے لئے کیمیا کی حیثیت رکھتی ہے۔ اب قسمت کی بات ہے کہ بیدل کو پردیس میں بہت سے قدرداں مل گئے۔ دہلی میں رہے تو نواب عاقل خاں رازی اور نواب شکر اللہ خاں اور ان کا پورا خاندان قدرداں رہا۔ ان کے علاوہ نواب آصف جاہ، نواب حسین علی خاں اور بہت سے دوسرے امراء اس کے قدرداں تھے۔ لاہور میں رہا تو نواب عبدالصمد خاں اس کے قدردانوں میں تھے۔

حلقے ہیں چشمہائے کشادہ بسوئے دل	حلقۂ آنزلف رونق از غبار دل گرفت
ہر تارِ زلف کو نگہِ سرمہ سا کہوں	دودِ آہ صید باشد سرمہ چشمِ دام را
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کا مطلب یہ ہے کہ اس کی زلف کے حلقے کھلی ہوئی آنکھوں کی مانند میرے دل کی میری طرف دیکھ رہے ہیں اس لئے اگر میں تار زلف کو نگہ سرمہ سا کہہ دوں تو بیجا نہیں ہے۔ بیدل کا مطلب یہ ہے کہ محبوب کے حلقہائے زلف کی ساری رونق تو غبار دل کی بدولت ہے شکار کی آہ کا دھواں چشم دام کا سرمہ ہوتا ہے۔ دام کے حلقے چونکہ آنکھ کی طرح لگتے ہیں اس لئے اسے چشم دام سے تعبیر کر کے کہتا ہے کہ شکار یعنی دل کی آہ کا دھواں چشم دام کے لئے سرمہ کے درجہ میں ہے۔ سرمہ لگانے سے بینائی تیز ہو جاتی ہے، گویا چشم دام کی رونق شکار کی آہ کے دھواں کی بدولت ہے۔ یہاں ''حلقۂ زلفِ محبوب کی دلکشی'' غالب اور بیدل دونوں کا موضوع ہے۔ غالب کے نزدیک حلقہائے زلف چشم کشادہ کی طرح دل کی طرف دیکھ رہے ہیں، اس لئے ہر تار زلف کو نگہ سرمہ سا کہا جا سکتا ہے۔ جبکہ بیدل کے نزدیک حلقہائے زلف کی رونق غبار دل کی بدولت ہے جس طرح دود آہ صید، چشم دام کے لئے سرمہ بن کر رونق کا سبب ہے۔ دونوں کے کلام کا موازنہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کے تحت الشعور میں بیدل کا یہ شعر تھا۔

غرہ اوج بنائے عالم امکاں نہ ہو   غرہ منشیں بکمالی کہ کند ممتازت
اس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی ایک دن   بیشتر قطرۂ گوہر شدہ ننگِ دریاست
غالب   بیدلؔ

غالب کہتے ہیں اس دنیا کی دلکشی اور ترقی پر مت پھولو یا دھوکا مت کھاؤ۔ یہ سارا کارخانہ آخر کار فنا ہو جائے گا۔ بیدل کہتے ہیں اس عروج و کمال پر مت پھول جو تجھے سماج میں ممتاز کرتا ہے۔ بہت سے ایسے قطرے جو موتی ہو گئے دریا کے لئے باعث ننگ و عار ہیں۔ دنیاوی ترقی اور کمال پر نہ پھولنا یا دھوکا نہ کھانا غالب اور بیدل دونوں کا موضوع ہے۔ غالب کے نزدیک چونکہ اس کارخانہ کو ایک دن فنا ہو جانا ہے اور بلندی کو آخر پستی میں پہنچنا ہے اس لئے اس کی ترقی پر مغرور نہ ہونا چاہئے، جبکہ بیدل کے نزدیک قطرہ ترقی کر کے موتی بنتا ہے لیکن ایسے بہت سے قطرے جو موتی بن گئے ہیں دریا کے لئے باعث ننگ و عار ہیں اسی طرح انسان کو بھی اپنے کمال پر نہیں پھولنا چاہئے۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کا مصرعہ ''غرہ اوج بنائے عالم امکاں نہ ہو'' بیدل کے مصرعہ ''غرہ منشیں بکمالی کہ کند ممتازت'' کا آزاد ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔ اسی مفہوم کو بیدل نے درج ذیل شعر میں بھی ادا کیا ہے:

اے غرہ اقبال سر انجام تو شوم است
مرگت بہ تہِ بال ہما سایۂ بوم است

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانئے   بیدل ایں انجمن وہم دگر نتواں یافت
بے صدا ہو جائے گا یہ ساز ہستی ایک دن   دردِ دہم مفت تماشاست طرب باید کرد
غالب   بیدلؔ

غالب کہتے ہیں اے دل نغمۂ غم یعنی نالہ و فریاد کو بھی غنیمت سمجھ، نغمہ شادی نہ سہی نغمۂ غم ہی سہی۔ کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا تو بہتر ہے۔ ایک دن ایسا آنے والا ہے جب یہ جسم فانی بالکل خاموش ہو جائے گا، نہ اس سے آہ نکلے گی نہ واہ۔ بیدل کہتے ہیں اس انجمن وہم یعنی دنیا سے پھر میرا واسطہ نہیں پڑے گا۔ درد و غم کا تماشہ بھی مفت میں حاصل ہے اس لئے ہمیں خوشی منانی چاہئے

۔غور سے دیکھا جائے تو غالب کے پورے شعر میں بیدل کے اس شعر کا عکس موجود ہے۔

ہم پر جفا سے ترک وفا کا گماں نہیں　　عمریست وفا ممتحن ناز و نیاز است
اک چھیڑ ہے وگرنہ مراد امتحاں نہیں　　نے تیغ ز دستِ تو جدا شد نہ سر ازما
غالبؔ　　بیدلؔ

غالب کہتے ہیں محبوب کی جفائیں محض ہمیں چھیڑنے کی خاطر ہیں، ہماری آزمائش مقصود نہیں ہے۔ کیونکہ اسے یقین ہے میں خواہ کتنی ہی جفائیں کیوں نہ کروں غالب ترک وفا نہیں کرے گا۔ بیدل کہتے ہیں ایک مدت سے وفا ہم عاشق کے نیاز اور محبوب کے ناز کا امتحان لے رہی ہے، نہ تو تلوار تمہارے ہاتھ سے الگ ہوئی اور نہ سر میرے ہاتھ سے، غالب اور بیدل دونوں نے جفا و وفا کو موضوع بنایا ہے، اس فرق کے ساتھ کہ غالب کے نزدیک محبوب کی جفا کاری عاشق کو محض چھیڑنے کے لئے ہے۔ اس کی وفا داری کا امتحان مقصود نہیں۔ جبکہ بیدل کے نزدیک وفاداری محبوب کے ناز یعنی ستمگاری اور عاشق کے نیاز یعنی ظلم کے تحمل کا امتحان لے رہی ہے۔ یہاں غالب نے بیدل سے اختلاف کیا۔ بیدل نے وفاداری کا مفہوم عاشق کے حق میں ظلم سہتے رہنے اور معشوق کے حق میں ظلم کرتے رہنے سے لیا ہے، اور اس کے امتحان کا سلسلہ مدت سے جاری ہے۔ دوسرے شعر میں بیدل نے معشوق کی جفا کاری کو اس کی زندگی کا اصول اور عاشق کی ظلم سہنے میں وفاداری کو اس کا پیشہ قرار دیا ہے۔

نشان مردی بیدل چہ جوئی از سیہ چشماں
وفا کن پیشہ و زیں قوم آئین جفا بنگر

کس منہ سے شکر کیجئے اس لطف خاص کا　　ہمہ لطفی و از حال من بیدل نہ ای غافل
پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں　　نظر پوشیدہ سوئے خاکساراں دیدنت نازم
غالبؔ　　بیدلؔ

غالب کہتے ہیں میں محبوب کی اس مہربانی کا کس منہ سے شکریہ ادا کروں کہ وہ زبان

سے مزاج پرسی کرنے کے بجائے محبت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھ لیتا ہے، میری نگاہ میں اس کی یہ توجہ ہی گویا پرسش احوال ہے۔ بیدل کہتے ہیں اے محبوب تم سراپا لطف وعنایت ہو اور مجھ بیدل کی حالت سے بیخبر بھی نہیں، اپنے عاشق کو نظر چھپا کر یا بچا کر تمہارا دیکھنا ایسی ادا ہے جس پر مجھے ناز ہے۔ یہاں غالب اور بیدل دونوں نے محبوب کے لطف کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک اس کے لطف خاص کا یہ عالم ہے کہ اگر چہ زبان سے مزاج پرسی نہیں کرتا نیز محبت بھری نگاہوں سے دیکھ لیتا ہے اس لئے اس کا شکریہ ادا کرتا ہے۔ بیدل کے نزدیک محبوب چونکہ سراپا لطف ہے اس لئے وہ نظر بچا کر عاشق کو دیکھ لیتا ہے جس پر اسے ناز ہے، دونوں کے کلام کے موازنہ سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کے اس شعر میں بیدل کے شعر کا پورا عکس موجود ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ غالب اس کا شکریہ بجالاتا ہے جبکہ بیدل کو اس پر ناز ہے۔

ہم کو ستم عزیز، ستمگر کو ہم عزیز	بیدل بہر تاب و تب ممنون التفاتیست
نامہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں	نامہرباں بیائید یا مہرباں بیائید
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں ہم اس کے ستم کو عزیز رکھتے ہیں اور چونکہ وہ ہمیں عزیز رکھتا ہے اس لئے وہ ہم پر ستم کرتا ہے پس اگر وہ ہم پر ستم کرتا ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ ہم پر ظلم کرتا ہے بلکہ یہ ثابت ہوا کہ وہ ہم پر مہربانی کرتا ہے کیونکہ وہ ہمیں وہی چیز عطا کرتا ہے جو ہمیں پسند ہے۔ اس شعر کی خوبی یہ ہے کہ شاعر نے محبوب کی نامہربانی (ستم) کو مہربانی ثابت کیا ہے، اور اس کا اثبات اس انداز سے کیا ہے کہ اس میں صنعت تضاد پیدا ہوگئی۔ مہربان نامہربان کی ضد ہے۔ بیدل کہتے ہیں اے محبوب ہر تب و تاب (بے کلی و بیقراری) پر تمہاری توجہ کا ممنون ہوں ، چاہے تم مہربان بن کر آؤ چاہے نامہربان بن کر۔ غالب اور بیدل دونوں نے محبوب کی مہربانی اور نامہربانی کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک محبوب کی نامہربانی بھی مہربانی ہے، کیونکہ عاشق اس کے ستم کو عزیز رکھتا ہے، اور چونکہ محبوب اسے عزیز رکھتا ہے اس لئے اگر عاشق پر وہ ستم ڈھاتا ہے تو بھی اسے عزیز ہے۔ بیدل کے نزدیک اصل چیز عاشق کے حال پر محبوب کی توجہ ہے، چاہے مہربان بن کر ہو چاہے نامہربان بن کر۔ محبت بھری نظروں سے دیکھ کر ہو چاہے

عتاب آلود نگاہوں سے دیکھ کر، ہر صورت میں اس کی توجہ قابل قدر ہے، اس لئے وہ اس کی توجہ کا احسانمند ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کے شعر میں بیدل کے اس شعر کا عکس موجود ہے البتہ غالب کا انداز بیان یہاں زیادہ دلکش ہے۔ غالب کا ایک اور شعر بیدل کے اس خیال سے پوری طرح ہم آہنگ ہے:

وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو
کیجیے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو

بوسہ نہیں ، نہ دیجئے ، دشنام ہی سہی	دشنامی ازاں لعل شنیدم کہ مپرسید
آخر زباں تو رکھتے ہو تم ، گر دہاں نہیں	می خواست بہ سنگم زند آخر بگہر زد
غالب	بیدل

غالب کہتے ہیں اے محبوب تم بوسہ نہیں دے سکتے تو کم از کم گالی ہی دو کیونکہ اگر تم دہن نہیں رکھتے تو زبان تو رکھتے ہو، (شعرا نے دہن محبوب کو معدوم فرض کرلیا ہے) بیدل کہتے ہیں اس لب لعل سے ایسی گالی سنی کہ پوچھومت، وہ مجھے پتھر سے مارنا چاہتا تھا مگر اس نے موتی مجھ پر نچھاور کردیے، بیدل اور غالب دونوں نے محبوب کی دشنام کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک بوسہ کے بجائے محبوب اگر دشنام دے تو یہ بھی غنیمت ہے، اس لئے کہتے ہیں اے محبوب تمھارے پاس منھ نہیں ہے تو زبان تو ہے لہٰذا گالی دو، جبکہ بیدل کے نزدیک محبوب کی دشنام طرازی گہرافشانی ہے سنگ زنی نہیں ہے۔ اس لئے اس کی لذت کا حال مت پوچھو۔ یہاں بیدل کا بیان زیادہ دلکش ہے۔

ہر چند جانگدازی قہر و عتاب ہے	ہر چند پست گرمیِ تاب و تواں نہیں
جاں مطربِ ترانۂ ھل من مزید ہے	لب پردہ سنجِ زمزمہ الاماں نہیں

غالب

نسبتی خاص است اہل عشق را باجور حسن
زخم ما و تیغ نازت ابروئے پیوستہ است

بیدل

غالب کہتے ہیں اگر چہ اس کے قہر وعتاب سے جان پگھلی جاتی ہے اور مجھ میں اس کے برداشت کی سکت بھی نہیں ہے اس کے باوجود میں اس سے یہی کہتا ہوں کہ تیرے پاس مزید ظلم ہے یعنی جتنا جی چاہے مجھ پر ظلم کر میں برداشت کروں گا۔ بیدل کہتے ہیں عاشق کو معشوق کے ظلم وستم سے خاص نسبت ہوتی ہے، ہمارا زخم اور تیرا تیغ ناز دونوں ابروئے پیوستہ کی طرح جڑے ہوئے ہیں۔ دونوں بھویں اگر آپس میں ایک جگہ مل جائیں تو اسے ابروئے پیوستہ کہتے ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ صبر عاشق اور ظلم معشوق دونوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے، چنانچہ ایک شعر میں صاف لفظوں میں کہتا ہے:

جور حسن و صبر عاشق توأم یکدیگر اند
باخدنگ او دلِ ما ہمچو پیکاں آشناست

یہاں غالب اور بیدل دونوں نے جور حسن اور صبر عاشق کو موضوع بنایا ہے غالب کے نزدیک معشوق کا قہر وغضب اگر چہ جانگداز ہے عاشق کی ایذا طلبی مزید ظلم کا تقاضا کرتی ہے کہ وہ اور ستم ڈھائے اور میں اور سہوں۔ جبکہ بیدل کے نزدیک جور حسن اور صبر عاشق دونوں لازم ملزوم ہیں ظلم کی کمی بیشی سے کوئی فرق نہیں پڑتا، صاف ظاہر ہے کہ غالب کے شعر میں بیدل کے خیال کا عکس موجود ہے، البتہ غالب کا بیان بیدل سے زیادہ دلکش معلوم ہوتا ہے۔

کہتے ہو کیا لکھا ہے تیری سرنوشت میں	بت پرتی باعث ایجاد ماست
گویا جبیں پر سجدۂ بت کا نشاں نہیں	برہمن زادۂ ایں بتخانہ ایم
غالبؔ	بیدلؔ

غالب معشوق سے پوچھتے ہیں کہ تم جو پوچھ رہے ہو کہ تیری تقدیر میں کیا لکھا ہے؟ کیا میری پیشانی پر سجدہ بت کا نشان تمھیں نظر نہیں آتا؟ گویا اپنی تقدیر کا حال بتایا ہے کہ ساری عمر بت پرتی میں گزرے گی۔ بیدل کہتے ہیں بت پرتی تو ہماری ایجاد کا سبب ہے ہم تو اس بت خانہ کے برہمن زادہ ہیں۔ بیدل کا مطلب شاید یہ ہے کہ آدمی اپنی شریک حیات سے اس قدر محبت کرتا اور اسے چاہتا ہے کہ گویا وہ اس کی پوجا کرتا ہے جس کی وجہ سے جنسی اختلاط عمل میں آتا ہے اور اس کے نتیجے میں انسان پیدا ہوتا ہے۔ یہ سلسلہ آدم سے چلا آرہا ہے اور رہتی دنیا

تک جاری رہے گا۔اس طرح دیکھا جائے تو ہم سب در حقیقت بت پرستی کی ہی پیداوار ہیں،اور اس بت خانے کے برہمن کی اولاد ہیں۔غالب اور بیدل دونوں نے بت پرستی کو موضوع بنایا ہے۔غالب کے نزدیک پیشانی پر سجدہ بت کا نشان اس امر کی دلیل ہے کہ ہماری قسمت میں بت پرستی لکھی ہے۔جبکہ بیدل کے نزدیک بت پرستی دنیا میں انسانوں کے وجود کا باعث ہے۔غالب کے اس شعر پر بیدل کے شعر کی کتنی گہری چھاپ ہے،موازنہ سے بالکل واضح ہے۔

مانع دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں
غالبؔ

چوں شمعم مانع وحشت نہ شد بیدست و پاییہا
بلغزشہائے اشک آخر بروں زیں انجمن رفتم
بیدلؔ

حالی لکھتے: ہیں چکر پھرنے کی دھت کہتے ہیں اس کے پاؤں میں چکر ہے یعنی اس کو پھرنے کی دھت ہے۔کہتا ہے کہ کوئی تدبیر مجھے دشت نوردی سے نہیں روک سکتی۔پس زنجیر جو اس غرض سے میرے پاؤں میں ڈالی گئی ہے اسے زنجیر نہ سمجھو بلکہ چکر سمجھو۔(۱۳۲) بیدل کہتے ہیں میری بے دست و پائی اور درماندگی شمع کی طرح وحشت کے لئے رکاوٹ نہیں ہوئی۔چنانچہ آنسوؤں کی لغزش کی طرح آخر میں اس انجمن سے باہر نکل آیا۔غالب اور بیدل دونوں نے وحشت یا دشت نوردی کو موضوع بنایا ہے۔غالب کے نزدیک کوئی تدبیر دشت نوردی سے اسے باز نہیں رکھ سکتی۔حتیٰ کہ زنجیر جو اسے روکنے کے لئے پاؤں میں ڈالی گئی ہے ایک چکر کی حیثیت رکھتی ہے۔بیدل کے نزدیک اس کی درماندگی شمع کی طرح وحشت و دشت نوردی سے اسے باز نہیں رکھ سکی۔چنانچہ آنسوؤں کی لغزش سے انجمن سے باہر نکل آیا۔ایک اور شعر میں مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے:

بیقرارانِ جنوں را منع وحشت مشکل است
نالہ را زنجیر ہم سامان رفتن می شود

جنون کی وجہ سے بیقرار لوگوں کو وحشت و دشت نوردی سے روکنا مشکل ہے۔نالہ کے لئے زنجیر بھی چلنے کا ایک ذریعہ بن جاتی ہے۔غور سے دیکھا جائے تو غالب کے شعر میں بیدل کے ان دونوں اشعار کا عکس پایا جاتا ہے۔زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ غالب کے نزدیک ''کوئی تدبیر'' سے

عمومیت ثابت ہوتی ہے جبکہ بیدل کے نزدیک ''بے دست وپائی'' سے خصوصیت ثابت ہوتی ہے۔

شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھکو کہ جہاں	شوق می گویدم پر افشاں باش
جادہ غیر از نگہِ دیدۂ تصویر نہیں	طالب آنچہ یافت نتواں باش
غالب	بیدل

غالب کہتے ہیں عشق مجھے اس جنگل میں دوڑاتا ہے جس میں کوئی راستہ نہیں ہے۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس جنگل میں عاشق مثل دیدہ تصویر حیران رہ جاتا ہے کہ کدھر کو جاؤں۔ بیدل کہتے ہیں شوق مجھ سے کہتا ہے اپنی پرفشانی یعنی تلاش وجستجو کا سلسلہ جاری رکھو۔ جو چیز آسانی سے حاصل نہیں ہوسکتی اس کو حاصل کرو۔ غالب اور بیدل دونوں نے شوق کی جولانی کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک شوق نے اسے ایسے بیاباں میں دوڑایا جہاں کوئی راستہ نظر نہیں آتا، جبکہ بیدل کے نزدیک شوق اسے اس منزل تک دوڑاتا ہے جہاں تک رسائی آسان نہیں ہے۔ غور سے دیکھئے تو غالب کے پورے شعر میں بیدل کے پورے شعر کی چھاپ نظر آئے گی۔ بیدل کا دوسرا مصرعہ غالب کے دوسرے مصرعہ سے زیادہ بامعنی ہے۔ شوق پر بیدل کے دوشعر اور ملاحظہ ہوں جو نہایت دلکش ہیں:

شوق دل وامانده پست و بلند دہر نیست
نالۂ فرہاد بیرونست زیں کہسارہا

تمام شوقیم لیک غافل کہ دل براہ کہ می خرامد
جگر بداغ کہ می نشیند، نفس بآہِ کہ می خرامد

مت مردمک دیدہ میں سمجھو یہ نگاہیں	ہر نگہ از دیدہ من نالہ است اما چہ سود
ہیں جمع سویدائے دل چشم میں آہیں	حلقہ زنجیر نومید است از شیون در آب
غالب	بیدل

غالب کا مطلب ہے کہ میری آنکھ کی پتلی میں نگاہیں نہیں ہیں بلکہ سویدائے دل چشم یعنی پتلی میں آہیں جمع ہوگئی ہیں، یا میری نگاہیں دراصل وہ آہیں ہیں جو پتلی میں ایک مرکز پر اکٹھی ہوکر سیاہ نقطے کی شکل اختیار کرگئی ہیں۔ بیدل کہتے ہیں میری آنکھ کی ہر نگاہ اپنی جگہ ایک نالہ ہے مگر اس سے کیا فائدہ جب حلقۂ زنجیر پانی میں آہ وشیون نہیں کرسکتا۔ غالب اور بیدل دونوں نے نگاہ کو آہ قرار دیا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ غالب کے نزدیک آنکھ کی پتلی میں جو نگاہیں نظر آتی ہیں وہ نگاہیں نہیں بلکہ آہیں ہیں جو ایک جگہ جمع ہوگئی ہیں۔ جبکہ بیدل کے نزیک ہر نگاہ ایک آہ و نالہ ہے۔ چونکہ نگاہیں بہت ہوتی ہیں اس لئے آہ و نالے بھی بہت ہیں۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کا پورا شعر بیدل کے ایک مصرعہ ''ہر نگہ از دیدہ من نالہ است اما چہ سود'' کا ترجمہ ہے۔ لیکن دوسرے مصرعہ میں بیدل نے جونکتہ بیان کیا ہے وہ غالب نہ کہہ سکے۔ کہتے ہیں کہ ہر نگاہ اگرچہ ایک آہ و نالہ ہے پر آنسوؤں کی باڑھ کی وجہ سے اس کی آواز اس طرح دب کر رہ جاتی ہے جس طرح حلقۂ زنجیر پانی میں ہو تو اس کے بجنے کی آواز نہیں آسکتی۔

برشگال گریہ عاشق ہے دیکھا چاہئے	برنگِ ابر در یاد تو ہر جا گریہ سر کردم
کھل گئی مانند گل سو جا سے دیوار چمن	گہر افشاند پیش از پردہ ہائے دیدہ دامانم
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کا مطلب یہ ہے کہ عاشق کی گریہ وزاری سے برسات کا سا سماں پیدا ہوگیا ہے۔ دیکھئے اس شدت گریہ کا انجام کیا ہو، آغاز تو یہ ہے کہ چمن کی دیوار پھول کی طرح سو جگہ سے شق ہوگئی ہے۔ بیدل کہتے ہیں تیری یاد میں بادل کی طرح جب بھی میں نے گریہ وزاری کی تو میرا دامن پردہ ہائے دیدہ سے پہلے ہی گہر افشانی کرنے لگا۔ غالب اور بیدل دونوں نے شدت گریہ عاشق کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک شدت گریہ عاشق سے برسات کا سماں بندھ گیا ہے۔ جبکہ بیدل کے نزدیک شدت گریہ عاشق ابر باراں کی طرح ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کے مصرعہ ''برشگال گریہ عاشق ہے دیکھا چاہئے'' میں بیدل کے مصرعہ ''برنگِ ابر در یاد تو ہر جا گریہ سر کردم'' کے خیال کا عکس موجود ہے البتہ دوسرے مصرعہ میں دونوں الگ ہوگئے۔ غالب

کہتے ہیں چمن کی دیوار سوجگہ سے پھٹ گئی ہے۔ جبکہ بیدل کہتے ہیں میرا دامن پردہ چشم سے زیادہ گہرافشانی کررہا ہے۔

الفت گل سے غلط ہے دعویٰ وارستگی	قید اسباب بوارستگیِ ما چہ کند
سرو ہے باوصف آزادی گرفتار چمن	بوئے گل در جگر رنگ ہم از رنگ جدا است
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کا مطلب یہ ہے کہ چمن میں جو بھی ہے وہ الفت گل میں گرفتار ہے، سرو دعویٰ آزادی کے باوجود باغ سے باہر نہیں جاسکتا۔ اسی طرح دنیا میں جو بھی ہے وہ دنیا کی محبت میں گرفتار ہے، جولوگ دنیا سے بے تعلق ہونے کے مدعی ہیں وہ بھی اس سے باہر نہیں جاسکتے۔ بیدل کہتے ہیں اسباب کی قید و بند ہماری وارستگی کو متاثر نہیں کرسکتی۔ بوئے گل رنگ کے جگر میں قید ہوتے ہوئے بھی رنگ سے جدا ہے۔ غالب اور بیدل دونوں نے وارستگی کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک دنیا میں رہ کر دنیا سے بے تعلقی کا دعویٰ جسے وارستگی کہتے ہیں غلط ہے ۔جس طرح سرو آزاد ہوتے ہوئے بھی باغ سے باہر قدم نہیں رکھ سکتا اسی طرح انسان بھی دنیا کے تعلق سے آزاد نہیں ہوسکتا۔ جبکہ بیدل کے نزدیک اسباب دنیا اس کی وارستگی کی راہ میں آڑے نہیں آتے، ٹھیک جس طرح بوئے گل جگر رنگ میں قید رہتے ہوئے رنگ سے آزاد ہے۔ گویا غالب نے بیدل کے برعکس خیال کا اظہار کیا ہے۔ اگرچہ غالب کا خیال حقیقت پر مبنی ہے مگر بیدل کا مقصد وارستگی سے یہ ہے کہ انسان دنیا کے سرد گرم، غم وخوشی، کمی بیشی، مشکل وآسان سے متاثر نہ ہو، اوراس کی زندگی میں ایک ہمواری ہو۔ چنانچہ کہتا ہے

بیدل ز غم و نشاط دوراں بگذر	وز بیش و کم و مشکل و آسان بگذر
در گلشنِ دہر ہمچو نسیم دمِ صبح	آزادہ درآ و دامن افشاں بگذر

راز معشوق نہ رسوا ہو جائے	راز عشق از دل بروں افتاد و رسوائی کشید
ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں	شد پریشاں گنج تا غافل شد از ویرانہ ہا
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کا مطلب یہ ہے کہ میں جو زندہ ہوں تو اس لئے نہیں کہ میرے مرجانے میں کوئی قباحت پوشیدہ ہے بلکہ اس لئے کہ مجھے یہ اندیشہ لاحق ہے کہ میرے مرنے سے محبوب کی رسوائی نہ ہو جائے۔ بیدل کہتے ہیں راز عشق اگر دل سے نکل کر فاش ہو جائے تو اسے رسوائی اٹھانی پڑتی ہے۔ خزانے کو جب کھنڈر کی پرواہ نہیں رہتی تو پریشان ہو جاتا ہے۔ رسوائِ راز معشوق غالب کا اور رسوائی راز عاشق بیدل کا موضوع ہے۔ غالب معشوق کو رسوائی سے بچانے کے لئے زندہ ہیں ورنہ اس کی محبت میں جان دینا کوئی مشکل کام نہ تھا، جبکہ بیدل کے نزدیک راز عشق یا عاشق فاش ہوتے ہی رسوا ہو جاتا ہے بلکہ ایک شعر میں کہتا ہے عاشق کے لئے رسوائی اور معشوق کے لئے مستوری اسی طرح لازم ملزوم ہے جس طرح مجنوں کے لئے صحرا اور لیلیٰ کے محمل:

رسوائِ و عشق ، مستوری و حسن
مجنوں و صحرا ، لیلیٰ و محمل

اس رسوائی عاشق کی وضاحت ایک اور شعر میں اس طرح کرتا ہے:

رسوائِ عاشق بہ رہِ یار بہشتی است
اے کاش دریں کوچہ بچنگِ عسس افتم

معشوق کی گلی میں عاشق کی رسوائی بہشت کی حیثیت رکھتی ہے کاش میں اس گلی میں کوتوال کے ہتھے چڑھ جاتا۔ ان تفصیلات کی روشنی میں معلوم ہوتا ہے کہ رسوائی تو اصل میں عاشق کی ہوتی ہے، نہ کہ معشوق کی۔ یہاں غالب نے بیدل کے برعکس خیال کا اظہار کیا ہے۔

بیدل اسباب طرب تنبیہ آگاہیست لیک	گردش رنگ طرب سے ڈر ہے
انجمن پُر غافلست از گوشمال چنگہا	غم محرومیِ جاوید نہیں
بیدلؔ	غالبؔ

غالب کا مطلب یہ ہے کہ مجھے محرومی جاوید اور دائمی ناکامی کا غم نہیں ہے، یعنی اس حالت کو گوارا کر سکتا ہوں کیونکہ اس میں بھی تسکین قلب کا ایک پہلو پوشیدہ ہے اور وہ یہ کہ حالت محرومی ہمیشہ رہے گی اور یہ قدرتی بات ہے کہ جب انسان رنج کا خوگر ہو جاتا ہے تو رنج کا احساس

مٹ جاتا ہے۔ جس بات سے ڈرتا ہوں وہ گردش رنگ طرب ہے۔ یعنی عیش کے بعد مصیبت کا دور آجائے تو وہ حالت ناقابل برداشت ہوتی ہے اور سب جانتے ہیں کہ دنیا میں دور عشرت کو ثبات نہیں۔ اس لئے کہتا ہے کہ میں غم محرومی جاوید کے بجائے گردش رنگ طرب سے ڈرتا ہوں۔ بیدل کہتے ہیں کہ طرب کے جتنے اسباب ہیں جیسے چنگ باجا وغیرہ یہ سب ایک طرح سے ہمیں خبردار کرتے ہیں کہ چنگ باجا کی گوشمالی یعنی اس کے کان مروڑے جاتے ہیں تب اس سے موسیقی کی آوازیں نکلتی ہیں۔ دنیا کے لوگ اس نکتے سے غافل ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ آرام کے ساتھ تکلیف اور تکلیف کے ساتھ آرام جڑا ہوا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ کہتا ہے:

بادستگاہ عشرت پرتو ام است کلفت
چشمِ تری نشستہ است برقاہ قاہ مینا

آرام اور تکلیف دونوں جڑوان واقع ہوئے ہیں۔ چنانچہ مینا کے قہقہے پر چشم تر بھی براجمان ہیں۔ غالب اور بیدل دونوں نے رنگ طرب کی گردش کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک رنگ طرب کی گردش یعنی آرام کے بعد تکلیف کی حالت ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ اس لئے وہ اس سے خوف زدہ ہیں جبکہ بیدل کے نزدیک آرام اور تکلیف دونوں جڑوان واقع ہوئے ہیں اور ایک دوسرے کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ اس لئے وہ غم سے ڈرتے نہیں اور خوشی پر اتراتے نہیں ۔ چنانچہ ایک شعر میں کہتے ہیں:

دریں وادی کہ می باید گذشت از ہر چہ پیش آید
خوش آں رہرو کہ در دامانِ دی پیچید فردا را

اس دنیا میں آرام اور تکلیف کی جو بھی صورت پیش آئے اس سے متاثر ہوئے بغیر گذر جانا چاہئے، وہ راہگیر کتنا خوش نصیب ہے جس نے مستقبل کو ماضی کے دامن میں لپیٹ کر رکھ دیا۔

کہتے ہیں : جیتے ہیں امید پہ لوگ	آنقدر بر یاس پیچیدم کہ امیدی نماند
ہم کو جینے کی بھی امید نہیں	پائے تا سر یک گرہ شد رشتہ ام از تابہا
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ دنیا میں بہت سے لوگ امید کے سہارے جیتے رہتے ہیں لیکن ہم ایسے بدنصیب ہیں کہ جینے کی امید ہی سے محروم ہیں۔ پھر ہمارے جینے کی کیا شکل ہو سکتی ہے یا امید پر وہ جیتا ہے جسے جینے کی امید ہوتی ہے مگر میری نومیدی کا یہ عالم ہے کہ مجھے جینے کی بھی امید نہیں۔ بقول حالی یہ شعر سہل ممتنع ہے۔ اس زمین میں اس سے بہتر شعر نکالنا مشکل ہے (۱۳۳)۔ بیدل کہتے ہیں مایوسی پر میں نے اس قدر پیچ و تاب کھائی کہ پاؤں سے لے کر سر تک میرا رشتہ جسم ایک گرہ کا روپ اختیار کر گیا اور امید سرے سے جاتی رہی۔ غالب اور بیدل دونوں نے نومیدی کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک لوگ امید کے سہارے جیتے ہیں مشہور شعر ہے:

امید وقت کا سب سے بڑا سہارا ہے
جو امید ہے تو ہر موج میں کنارہ ہے

لیکن جب جیتے رہنے کی امید ہی ختم ہوگئی تو پھر جینے کی کیا صورت باقی رہ جائے گی۔ بیدل کے نزدیک مایوسی پر اس قدر پیچ و تاب کھایا کہ سر سے پاؤں تک سارا وجود دھاگے کی طرح بٹ کر گرہ بن گیا۔ پھر جینے کی امید ہی سرے سے ختم ہوگئی۔ غالب کے اس شعر میں بیدل کے اس شعر کی چھاپ پوری طرح واضح ہے۔ بیدل کا ایک اور شعر اس مفہوم کا درج ذیل ہے۔

از شکستِ من بنائے ناامیدی محکم است
فکر تعمیری ندارم تا کند ویراں مرا

میری شکست سے مایوسی کی اساس مستحکم ہوگئی ہے مجھے تعمیر کی فکر نہیں ہے کہ ویران ہونے کا سوال پیدا ہو۔

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں	ز نقش پائے تو بوئے بہار می آید
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں	بیا کہ جبہہ نہم برزمیں و گل چینم
غالب	بیدلؔ

غالب کا مطلب ہے کہ اے محبوب جہاں جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں وہاں بہشت کے جلوے بکثرت نظر آتے ہیں یعنی تیرا نقش قدم جہاں پڑتا ہے وہ جگہ بہشت کی طرح سر سبز وشاداب ہو جاتی ہے۔ بیدل کہتے ہیں اے محبوب تیرے نقش قدم سے موسم بہار کی بو آ رہی

ہے۔اب آ بھی جا کہ اپنی پیشانی زمین پر ٹیک کر گلچینی کروں۔غالب اور بیدل دونوں نے محبوب کے نقش قدم کی تاثیر کو موضوع بنایا ہے،اس فرق کے ساتھ کہ غالب کے نزدیک محبوب کے نقش قدم کا اثر یہ ہے کہ جس سرزمین پر وہ پڑتا ہے بہشت کی طرح وہ سرسبز و شاداب ہو جاتی ہے۔ جبکہ بیدل کے نزدیک اس کے نقش قدم سے موسم بہار کی خوشبو آ رہی ہے۔غالب کے پورے شعر میں بیدل کے پہلے مصرع ''ز نقش پائے تو بوئے بہاری آید'' کا پورا عکس موجود ہے۔

ترے سرو قامت سے اک قدِ آدم	ایکہ بر نقش قدش دل بستہ ای ہشیار باش
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں	سایۂ این سرو آشوب قیامت پرور است
غالبؔ	بیدلؔ

حالی لکھتے ہیں غالب کے اس شعر کے ایک معنی تو یہی ہیں کہ تیرے سرو قامت سے فتنہ قیامت کمتر ہے۔دوسرے یہ معنی بھی ہیں کہ چونکہ تیرا قد اس فتنۂ قیامت سے بنایا گیا ہے اس لئے وہ ایک قد آدم کم ہو گیا ہے (۱۴۴)۔بیدل کہتے ہیں تو نے محبوب کے نقش قد و قامت سے دل لگایا ہے تو ہوشیار رہ،اس سرو کا سایہ ایک قیامت پرور آشوب ہے۔غالب اور بیدل دونوں نے محبوب کی قامت کو موضوع بنایا ہے اس فرق کے ساتھ کہ غالب کے نزدیک محبوب کے سرو قامت سے فتنہ قیامت کم درجے کا ہے۔یا یہ کہ وہ فتنہ قیامت سے ایک قد آدم کم ہے، جبکہ بیدل کے نزدیک سرو قامت کا سایہ ایک قیامت پرور آشوب کی حیثیت رکھتا ہے تو خود قامت کس قیامت کی ہو گی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔یہاں بھی غالب کے کلام پر بیدل کے کلام کا اثر واضح ہے۔

تماشا کر اے محوِ آئینہ داری	عمریست تماشا کدہ شوخیِ نازیم
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں	آئینہ ما با کہ دچار است بہ بینید
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں اے محبوب تو اپنا آئینہ کیا دیکھتا ہے ہمیں دیکھ کہ ہم کس شوق و ذوق سے تجھے دیکھ رہے ہیں۔یعنی تجھے اپنے حسن میں وہ دلکشی نظر نہیں آئے گی جو ہمارے دیکھنے میں پائی جاتی ہے۔بیدل کہتے ہیں کہ ایک مدت سے ہم محبوب کی شوخی ناز کا تماشا کدہ بنے ہوئے

ہیں۔ بھلا دیکھو ہمارا آئینہ دل کس سے دو چار ہے۔ غالب اور بیدل دونوں نے تماشا کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک محبوب آئینہ دکھا کر اپنے حسن کی نمائش کرتا ہے اس لئے اس سے کہتے ہیں تو ہماری اس تمنا کا تماشا دیکھ کہ کس شوق سے ہم تجھے دیکھ رہے ہیں۔ بیدل کے نزدیک عاشق کا آئینہ دل ایک مدت سے محبوب کی شوخی ناز کا تماشا کدہ بنا ہوا ہے اس لئے کہتا ہے دیکھو میرا آئینہ دل کس سے دو چار ہے۔ یعنی کتنی بڑی چیز ہمارے آئینہ دل میں ہے۔

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب — شد حاجت ما پردہ بر اندازِ عنایت

تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں — سائل ہمہ جا آئینہ راز کریم است

غالبؔ — بیدلؔ

غالب کہتے ہیں ہم نے فقیروں کا بھیس گداگری کے لئے نہیں اپنایا بلکہ ہمارا مقصد یہ دیکھنے کے لئے کہ اس دنیا میں اہل کرم کتنے ہیں اور کہاں ہیں۔ بیدل کہتے ہیں کہ ہمارا احتیاج یا فقیرانہ صورت خود کریم کی عنایت سے پردہ سرکانے والی ہے۔ کیونکہ جہاں بھی سائل ہوتا ہے وہ راز کریم کا آئینہ ہوتا ہے۔ غالب اور بیدل دونوں نے اہل کرم کے تماشائے جود و کرم کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک فقیروں کا بھیس اپنانے کا مقصد اہل کرم کا تماشائے کرم دیکھنا ہے جبکہ بیدل کے نزدیک فقیر کی احتیاجی شکل و صورت اہل کرم کی عنایت سے پردہ اٹھانے والی ہے۔ کیونکہ سائل کی شخصیت راز کریم کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اس خیال کو بیدل نے دوسری جگہ اس سے بہتر انداز میں بیان کیا ہے:

اے خوش آں جود کہ از خجلتِ وضع سائل

لب بہ اظہار نیارند و بایما بخشند

اہل کرم کے اس جود و کرم کا کیا پوچھنا جو صورت بیں حالت میرس کے مطابق سائل کی حالت دیکھ کر شرما جاتے اور ہونٹوں سے اظہار کیے بغیر ہی اشارے سے دے دے۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کے اس شعر میں بیدل کے خیال کا عکس موجود ہے۔

میں اور حظ وصل ، حظ ساز بات ہے | با کمال اتحاد از وصل مہجوریم ما
جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں | ہم چوں ساغر مئے بلب داریم و مخموریم ما

غالب | بیدلؔ

غالب کہتے ہیں مجھے وصل کی کوئی امید نہ تھی لیکن یہ خدا کا کام ہے کہ مجھے اس کے وصل کی لذت نصیب ہوگئی۔ اس نعمت کے حصول کی خوشی میں مجھے اپنی جان نذر کرنی لازم تھی مگر اس غیر متوقع خوشی سے ایسا مبہوت ہوں کہ یہ فرض ادا کرنا بھول گیا۔ بیدل کہتے ہیں عاشق و معشوق میں کمال اتحاد کی وجہ سے ہم وصل سے مہجور ہیں۔ ساغر کی طرح شراب ہونٹ سے لگی ہے اور نشے میں ہے ۔ غالب اور بیدل دونوں نے وصل محبوب کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک غیر متوقع طور پر وصل کی لذت پر جان نذر کردینی تھی مگر عالم اضطراب میں وہ اسے نذر کرنا بھول گیا۔ جبکہ بیدل کے نزدیک عاشق و معشوق میں اس درجہ اتحاد و یگانگت ہے کہ وصل کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ کیونکہ وصل تو فراق کی ضد ہے۔ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے جدائی تھی اب ملاقات ہوئی جبکہ بیدل کے خیال میں سرے سے جدائی ہی نہیں ہوئی۔ پھر وصل اور ہجر کوئی معنیٰ نہیں رکھتا۔

غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی | شادم کہ فطرتم نیست تریا کی تعین
پیتا ہوں روز ابر و شب ماہتاب میں | وہمیکہ می فروشم بنگ است و گاہ گاہ است

غالب | بیدلؔ

غالب کے شعر کا مطلب واضح ہے کہ اگر چہ میں نے شراب پینی چھوڑ دی ہے پر برسات کے دنوں میں اور چاندنی راتوں میں طبیعت پر قابو نہیں رہتا۔ بیدل کہتے ہیں اس بات سے مجھے خوشی ہے کہ میری فطرت تریا کی تعین نہیں ہے۔ یعنی افیون خوری اور شراب نوشی کا میں فطری طور پر عادی نہیں ہوں۔ اگر کوئی وہم فروشی کرتا ہوں تو وہ بھنگ کا استعمال ہے اور وہ بھی کبھی کبھی ۔ غالب اور بیدل دونوں نے بڑھاپے میں منشیات کے وقتاً فوقتاً استعمال کا تذکرہ کیا ہے ۔ البتہ غالب موسم برسات یا چاندنی رات میں کبھی کبھی شراب پیتے تھے اور بیدل بھی کبھی کبھی بھنگ کا استعمال کرتے تھے۔ شراب نوشی کے بارے میں بیدل کے مختلف بیانات ہیں۔ بعض اشعار

سے معلوم ہوتا ہے کہ جوانی میں وہ بھی شراب پیتے تھے:

نہ عبادت نہ ریاضت کردم
بادہ ہا خوردم و عشرت کردم

میں نے نہ تو طاعت وعبادت کی اور نہ کوئی ریاضت ومجاہدہ کیا۔ ہاں شراب پیتا رہا اور عیش کرتا رہا۔

ما بزور مئے پرستی زندگانی می کنیم
چوں حباب مئے بنائے ماست سرتا پا شراب

مئے پرستی کے سہارے ہم زندگی گذار رہے ہیں۔ حباب مئے کی طرح ہماری بنیاد سراسر شراب پر ہے۔ مگر دوسری طرف کچھ ایسے اشعار بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شراب سے پرہیز کرتے تھے:

از مئے حذر کنید کہ ایں دشمن حیا
کاریکہ از ادب نتواں کرد می کند

شراب نوشی سے پرہیز کرو، کیونکہ شرم وحیا کی یہ دشمن ایسا کام انجام دیتی ہے جو ادب کے سراسر خلاف ہوتا ہے۔

رو میں ہے رخش عمر، کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں
غالب

خواجہ ممکن نیست ضبط عمر و حفظ مالہا
جادۂ بسیار دارد آب در غربالہا
بیدلؔ

غالب کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی زندگی اس کے اختیار میں نہیں ہے۔ اس کی مثال اس سوار کی طرح ہے جو قابو سے باہر گھوڑے پر بیٹھا ہو، یعنی انسان کو سرے سے معلوم نہیں کہ اس کی زندگی کب ختم ہو جائے گی۔ بیدل کہتے ہیں انسان کا اپنی عمر اور مال پر کنٹرول کرنا ممکن نہیں ہے۔ ان کی مثال اس چھلنی کی سی ہے جس میں پانی نکلنے کے بہت سے راستے ہوتے ہیں۔ غالب اور بیدل دونوں نے عمر کی ناپائیداری اور رواروی کو موضوع بنایا ہے۔ غالب نے اسے اس گھوڑے سے تشبیہ دی ہے جو قابو سے باہر ہو، جس کی باگ نہ تو اپنے ہاتھ میں ہو اور نہ پاؤں اس کے رکاب میں ہوں۔ بیدل نے اسے چھلنی سے تشبیہ دی ہے جس میں پانی کبھی نہیں نکلتا۔ اس طرح سے غالب کے اس شعر میں بیدل کے شعر کا عکس موجود ہے۔ مثالیں البتہ الگ الگ ہیں۔

اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بعد ہے	مجاز اندیشیت فہم حقیقت را نمی شاید
جتنا کہ وہم غیر سے ہوں پیچ و تاب میں	محالست ایں کہ حق از عالم باطل شود پیدا
غالبؔ	بیدلؔ

حالی مرحوم لکھتے ہیں غیر سے یہاں ماسوی اللہ مراد ہے جو صوفیاء کے نزدیک معدوم ہے اس لئے کہ وہ وجود واحد کے سواسب کو معدوم سمجھتے ہیں۔ کہتا ہے کہ جس قدر وجود ماسوا کے وہم سے رات دن پیچ وتاب میں رہتا ہوں اتنا ہی مجھے اپنی حقیقت یعنی وجود واجب سے بعد ہے (۱۳۵)۔ یہاں لفظ بعد سے بیگانگی اور عدم واقفیت مراد ہے۔ جب تک انسان غیر اللہ کو بھی حقیقی معنوں میں موجود سمجھتا رہے گا، اس وقت تک موجود حقیقی سے آگاہی حاصل نہ ہو سکے گی۔ بیدل کہتے ہیں تیری مجاز اندیشی فہم حقیقت کی اہل نہیں ہے، حق عالم باطل سے پیدا ہو ایک امر محال ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ساری دنیا خدائے وحدہ لاشریک لہ کی جلوہ گاہ ہے اور ہر جگہ حق ہی حق نمایاں ہے۔ چنانچہ ایک شعر میں کہتا ہے:

چہ امکانست گردِ غیر ازیں محفل شود پیدا

ہماں لیلیٰ شود بے پردہ گر محمل شود پیدا

کیا ممکن ہے کہ اس محفل دنیا سے غیر اللہ نمایاں ہو۔ اگر محمل یعنی کجاوا نمایاں ہوگا تو لیلیٰ ہی نظر آئے گی۔ لیکن انسان مجاز اندیشی کا اس قدر عادی ہو گیا ہے کہ وہ اس حقیقت کو سمجھنے سے قاصر ہے ۔اصل حقیقت تو خدا کے وجود کی ہے انسان کا وجود ظلی ہے۔ غالب اور بیدل دونوں نے انسان کی مجاز اندیشی یا حقیقت سے بیگانگی کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک انسان اپنی حقیقت یعنی یہ کہ وہ مظہر ذات باری یا ظل الٰہی ہے سے دور جا پڑا ہے اور بیدل کے نزدیک حقیقت خود خدا کے سوا کسی کا وجود ذاتی نہیں ہے۔ اس امر کو انسان کی مجاز اندیشی سمجھنے نہیں دیتی۔ جیسا کہ دوسری جگہ کہتا ہے:

غیر رادر عالم وحدت نگاہاں بار نیست

کاروانِ وادی مجنوں غبار محمل است

ہے مشتمل نمود صور پر وجود بحر	تب و تابِ موج و کف خارجِ دریا شمار
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں	قصہ کثرت مخواں ، بیدل ما وحدتیست
غالبؔ	بیدلؔ

حالی مرحوم لکھتے ہیں یہ وحدت وجود اور کثرت موہوم کی تمثیل ہے۔ قطرہ و موج و حباب کے ہیچ اور ناچیز ہونے کو ایک عام محاورے میں اسی طرح ادا کرنا کہ ''یاں کیا دھرا ہے'' منتہائے بلاغت ہے۔ (۱۳۶) اس اجمال کی شرح یہ ہے کہ قطرہ اور موج حباب کا کوئی مستقل وجود نہیں ہوتا ہے۔ جسے تم قطرہ یا موج یا حباب کہتے ہو وہ بحر ہی کی مختلف صورتیں ہیں۔ وجود بحر ان ہی صورتوں کے نمونوں پر مشتمل ہے۔ بیدل کہتے ہیں دریا کی لہر اور جھاگ میں جو چمک دمک اور تب وتاب نظر آتی ہے اسے دریا سے باہر کی چیز سمجھو۔ ورنہ موج اور کف بذات خود دریا کے سوا کیا ہے۔ یہ دنیا جو دنیائے کثرت معلوم ہوتی ہے درحقیقت اس کثرت میں وحدت پوشیدہ ہے۔ قطرہ، موج، کف، حباب یہ سب بظاہر جدا جدا چیزیں اور کثرت کی نمائندہ نظر آتی ہیں، جبکہ دریا کے سوا وہاں کوئی چیز موجود نہیں ہے۔ اسی طرح اس دنیا میں باوجود کثرت اشیاء کے خدا کے سوا کسی چیز کا وجود نہیں ہے۔ اس لیے کثرت کی کہانی مت پڑھ ہمارا بیدل وحدت الوجودی ہے چنانچہ چند اشعار میں کہتا ہے:

باہمہ کثرت شماری غیر وحدت باطلست
یک یک آمد برزباں از صد ہزار اعداد ہا

بایں کثرت نمائی غافل از وحدت مشو بیدل
خیال آئینہا درپیش دارد شخص تنہا را

غالب اور بیدل دونوں نے وحدت الوجود کو موضوع بنایا ہے، غالب کے شعر میں بیدل کے ان تمام اشعار کا عکس نظر آتا ہے۔

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز	بہر نظارہ حسنش شوخی رنگِ دگر دارد
پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں	تصور چوں تواں کردن جمال بیمثالش را
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ اس کائنات کو پیدا کر کے فارغ ہو کر نہیں بیٹھ رہا گیا بلکہ ہر لحظہ فعل تخلیق یا اپنی ذات کی جلوہ گری اور اپنے حسن کی نمائش میں مصروف رہتا ہے۔ یہ شعر اس آیت کی تشریح ہے جس میں اللہ نے فرمایا ہے کہ ہر دن وہ ایک نئی شان میں ہے۔ یعنی اللہ ہر لحظہ اپنی ذات کی جلوہ گری میں مصروف ہے۔ بیدل کہتے ہیں ہر نظارہ پر اس کے حسن کی شوخی کا انداز نرالا ہوتا ہے۔ اس کے جمال بے مثال کا تصور بھلا کیوں کر کیا جا سکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ کے لاثانی اور بے نظیر حسن و جمال کا انسان تصور نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اس کے مظاہر کو ہر دفعہ دیکھنے میں اس کے حسن کی نرالی اور انوکھی شوخی نظر آتی ہے۔ غالب اور بیدل دونوں نے خدا کی ہر آن اپنے حسن کی جلوہ گری کو موضوع بنایا ہے البتہ انداز بیان الگ الگ ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کے اس شعر پر بیدل کے شعر کا اثر نہایت نمایاں ہے۔

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں
غالبؔ

ہمچو آتش ہر کرا دود طلب در سر بود
ہر خس و خارش بہ اوج مدعا رہبر بود
بیدلؔ

حالی مرحوم لکھتے ہیں طالب راہ خدا کو جو حالت ابتدا میں پیش آتی ہے اس کو تمثیل میں بیان کیا ہے۔ طالب اول اول جس شخص میں کوئی کرشمہ یا وجد و سماع و جوش و خروش دیکھتا ہے اسی کے ہاتھ پر بیعت کرنے کا ارادہ کرتا ہے، اور اس کے پیچھے پیچھے پھرتا ہے۔ پھر جب کوئی اس سے بڑھ کر نظر آتا ہے تو اس کا تعاقب کرتا ہے و ھلم جرا اور وجہ اس تذبذب اور تزلزل کی یہی تو ہے کہ وہ کاملین کو پہچان نہیں سکتا (۱۳۶)۔ بیدل کہتے ہیں جس کے سر میں آگ کی طرح طلب اور جستجو کا دھواں ہوتا ہے ہر خس و خار اس کے اوج مدعا تک اس کا رہبر ہو جاتا ہے۔ غالب اور بیدل دونوں نے سالک کی خدا طلبی کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک سالک چونکہ ابھی نو آموز ہے اس لئے کامل کو نہ پہچان کر ہر رہبر کے ساتھ چل پڑتا ہے۔ جبکہ بیدل کے نزدیک اگر انسان کے سر میں منزل تک پہنچنے کا خبط سوار ہو تو ہر خس و خاشاک اس کا رہبر و رہنما بن جاتی ہے۔ جیسا کہ سعدی کا بھی خیال ہے:

برگ درخت سبز در نظر ہوشیار
ہر ورقی دفتریست معرفتِ کردگار

یہاں بیدل اور غالب دونوں دو متضاد سمتوں میں گئے ہیں۔

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار	بت پرستی باعث ایجاد ماست
کیا پوجتا ہوں اس بتِ بیدادگر کو میں	برہمن زادہ ایں بت خانہ ایم
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں اس بت بیداد گر کا طالب ہوں اس کی پوجا نہیں کرتا، لیکن عام لوگ چونکہ نفس کے بندے ہیں اس لئے حصول مقصد کی خاطر محبوب کی پرستش کرنے لگتے ہیں۔ ان کو یہ بات معلوم نہیں کہ خواہش اور پرستش میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس لئے غالب نے ان کو احمق قرار دیا۔ بیدل کہتے ہیں بت پرستی تو ہماری ایجاد کا سبب ہے، ہم اس بت خانہ کے برہمن زادہ ہیں۔ غالب اور بیدل دونوں نے بت پرستی یا محبوب پرستی کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کا خیال ہے کہ خواہش پرستی اور بت پرستی میں فرق ہے۔ بتِ بیداد گر سے خواہش کی تکمیل کرتا ہوں پر اس کو پوجتا نہیں۔ بیدل کے مطابق انسان اگرچہ اپنی شریک حیات سے خواہش کی تکمیل کرتا ہے جس کے نتیجے میں انسانی نسل کا سلسلہ باقی ہے لیکن عموماً لوگ اس کو خدا کی طرح پوجتے ہیں کیونکہ اس کی خاطر احکام خداوندی کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ اس عام صورت حال کو دیکھتے ہوئے کہہ سکتے ہیں کہ اس دنیا میں ہمارے وجود کا سبب تو بت پرستی ہی ہے۔ گویا بیدل کا خیال عام رجحان پر موقوف ہے۔ جبکہ غالب اسے احمقوں کا خیال قرار دیتے ہیں۔

پھر بیخودی میں بھول گیا راہ کوئے یار	خبر زخویش ندارم جز اینکہ روزی چند
جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں	نگاہ شوق تو بودم کنوں خیال تو ام
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ میں ایک دن کوئے یار میں گیا تھا وہاں کی دلکشی سے ایسا بیخود ہوا کہ اپنے آپ کو وہیں چھوڑ آیا۔ اب چونکہ مجھ پر عالم بیخودی طاری ہے اس لئے کوئے یار کا راستہ یاد

نہیں۔ اگر راستہ یاد آ جاتا تو میں اپنی خبر لینے وہاں ضرور جاتا۔ بیدل کہتے ہیں مجھے خود اپنی خبر نہیں سوائے اس کے کہ چند دنوں میں تیرا نگاہ شوق تھا اب تیرا خیال ہوں۔ عالم بیخودی کو غالب اور بیدل دونوں نے موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک کوئے یار کی دلکشی سے اس درجہ بیخود ہوئے کہ خود کو وہاں چھوڑ کر اس کا راستہ بھول گئے۔ بیدل کے نزدیک کوئے یار کی دلکشی میں عالم بیخودی ایسی طاری ہوئی کہ اس کو صرف اتنا یاد رہ گیا کہ کبھی وہ معشوق کی نگاہ شوق تھا یعنی عالم اشتیاق میں محبوب کو دیکھتے رہنا اس کا معمول تھا۔ لیکن اب وہ چیز تو حاصل نہیں ہے اس کا خیال دل و دماغ پر سمایا رہتا ہے۔

قدر دانی چہ خیالست در ابنائے زماں	اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہل دہر کا
بیدل اینہا ہمہ از عالم نشناختہ اند	سمجھا ہوں دل پذیر متاعِ ہنر کو میں
بیدلؔ	غالبؔ

غالب کا مطلب یہ ہے کہ میں متاع ہنر کو بہت دل پذیر سرمایہ سمجھتا ہوں اس لئے قدرتی طور پر یہ قیاس کرتا ہوں کہ اہل زمانہ بھی میری طرح اس کے قدرداں ہوں گے۔ لیکن افسوس کہ میرا یہ قیاس غلط ثابت ہوا۔ دنیا والوں کی نظر میں شاعری متاع دلپذیر نہیں ہے۔ بیدل کہتے ہیں کہ ابنائے زمانہ میں اہل علم وفن کی قدردانی پہلے کبھی رہی تھی لیکن اب خواب وخیال کی بات ہوگئی۔ چنانچہ دوسری جگہ کہتا ہے:

عرض اہل ہنر نگہ دارید
پیش طاؤس نام پا مبرید

فنکار اپنی ہنر نمائی کے عمل میں احتیاط سے کام لیں مور کے سامنے اس کے پاؤں کا نام مت لو۔ ایک اور شعر میں کہتا ہے:

قدر دانی در بساطِ امتیاز دہر نیست
ورنہ من در مکتب بیدانشی علامہ ام

زمانے میں اہل علم وفضل کی قدردانی کی روایت ختم ہوگئی۔ ورنہ میں تو مکتب بیدانشی کا علامہ

ہوں۔غالب اور بیدل دونوں نے اپنے ہنر کی ناقدری کا شکوہ کیا ہے اور شاعروں کو عموماً یہ شکایت ، رہا کرتی ہے۔

شاہد ہستیِ مطلق کی کمر ہے عالم	جز ہستی مطلق ز مقید نتواں یافت
لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں	اشیا ہمہ یک سایۂ خورشید نقاب اند
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں یہ عالم درحقیقت شاید ہستی مطلق کی کمر یعنی معدوم ہے لوگ کہتے ہیں کہ موجود ہے مگر ہمیں تو نظر نہیں آتا۔یا یہ مطلب ہے کہ عالم درحقیقت معدوم ہے،لوگ کہتے ہیں کہ موجود ہے مگر ہم اس بات کو تسلیم نہیں کرتے۔بیدل کہتے ہیں مقید (کائنات) سے ہستی مطلق (خدائے وحدہ لاشریک لہٗ) کے سوا کسی اور چیز کا سراغ نہیں لگایا جا سکتا۔دنیا میں جتنی چیزیں ہیں ان کی حیثیت سایۂ خورشید کی طرح ہے۔یعنی ہم سب معدوم محض ہیں،اور ہمارا وجود خدائے وحدہ لاشریک لہ کا پرتو اور سایہ ہے جسے ظلی وجود کہتے ہیں۔یہاں غالب اور بیدل دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ عالم کی حقیقت معدوم ہے اور خدا کے سوا کسی چیز کا وجود نہیں۔مگر بیدل وحدت الشہود کے قائل ہیں جبکہ غالب وحدت الوجود کے قائل ہیں۔کیونکہ بیدل نے دنیا کو خدا کا وجود ظلی قرار دیا ہے۔اس خیال کو بیدل ایک اور انداز سے بھی ادا کرتا ہے۔

اے غفلت آبروئے طلب بیش ازیں مریز

عالم تمام اوست کرا جستجو کنند

اے سراپا غفلت انسان تلاش وجستجو کی آبرو اس سے زیادہ خاک میں مت ملا۔عالم سراسر وہ ہے پھر کسی اور کی تلاش کیا کر رہے ہو۔

نالہ جز حسن طلب اے ستم ایجاد نہیں	نالہ کفرست در طریق وفا
ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں	بر قضا شکوۂ قضا مبرید
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کا مطلب یہ ہے کہ اے ستم ایجاد اور ظالم محبوب میں جو نالہ وفریاد کر رہا ہوں اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں تیرے ستم کا شکوہ کر رہا ہوں بلکہ یہ نالہ کشی اس لئے ہے کہ تو اس بات

سے خفا ہو کر مجھ پر ظلم کرے گا۔ لہٰذا میری نالہ کشی طلب ستم ہی کی ایک صورت ہے۔ بیدل کا مطلب یہ ہے کہ عشق میں وفاداری کا تقاضا یہ ہے کہ معشوق کے ظلم وستم کو خندہ پیشانی سے برداشت کریں، آہ وزاری نہ کریں اور قضا وقدر کے فیصلے پر راضی ہو کر شکوہ نہ کریں۔ وفاداری کی شریعت میں نالہ وزاری کرنا کفر ہے۔ یہاں غالب نے بیدل سے اختلاف کیا ہے وہ کہتے ہیں نالہ بھی ایک حسن طلب ہے یعنی نالہ اس لئے کر رہے ہیں کہ معشوق اور ستم ڈھائے اور میں اور سہوں۔ اس کے ظلم کا شکوہ مقصود نہیں ہے۔ یہ غالب کی نکتہ آرینی ہے۔

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالب	مارا کہ نہ علم است نہ معلوم شدن
میرے دعویٰ پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں	نے جوشِ منثور و نہ منظوم شدن
غالبؔ	بیدلؔ

مضمون ظہوری بخیال آمدہ است

باید بزبان خلق موسوم شدن

غالب کہتے ہیں میں ظہوری کے مقابلے میں خفائی ہوں اور میرے اس دعوے پر دلیل یہ ہے کہ ظہوری مشہور ہے لیکن مجھے اس جیسی شہرت نصیب نہیں ہوئی۔ مگر اس بات کو کچھ اس انداز سے کہا کہ ظہوری کا مرتبہ اپنے مرتبہ سے بالاتر دکھایا ہے۔ غالب نے فارسی میں بھی ایک شعر ظہوری کی بابت کہا ہے:

بہ نظم و نثر مولانا ظہوری زندہ ام غالب

رگِ جاں کردہ ام شیرازہ اوراقِ کتابش را

بیدل کہتے ہیں ہم کو نہ تو کسی چیز کا علم ہے اور نہ کوئی چیز معلوم ہے، نہ نظم ونثر کہنے یا لکھنے کا طبیعت میں کوئی جوش ہے۔ ہاں ظہوری کا ایک مضمون اس وقت ذہن میں آتا ہے کہ زبان خلق کو نقارہ خدا سمجھو، یعنی لوگ تم کو کس نام سے یاد کرتے ہیں اسی نام سے اپنے کو موسوم سمجھو۔ یہاں غالب کو یہ فکر ستا رہی ہے کہ ظہوری کی طرح اسے شہرت حاصل نہیں ہوئی۔ لیکن بیدل کو ظہوری کی یہ بات اچھی لگی کہ زبان خلق آپ کو جس نام سے یاد کرے وہی نام آپ کے لئے مناسب ہے۔

اہل بینش کو ہے طوفان حوادث مکتب   در حوادث فیض معنی می برند اہل صفا
لطمۂ موج کم از سیلیِ استاد نہیں   می فروزد شمع صبح از جنبش دامان شب
غالبؔ   بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ عقل مند لوگ حوادث روزگار سے عبرت حاصل کرتے ہیں یعنی ان کی نگاہ میں موج حوادث کے تھپیڑے استاد کے طمانچے کے درجے میں ہیں۔ استاد کا تھپڑ شاگرد کے حق میں مفید ہوتا ہے۔ اسی طرح عقلمند لوگ حادثات کے تھپیڑے کھا کر سدھرتے ہیں۔ بیدل کہتے ہیں اہل صفا یعنی صوفیا یا دانش مند حضرات حوادث روزگار سے بھی فیض معنی حاصل کرتے ہیں۔ دامن شب کی جنبش سے ہی صبح کی شمع نمودار ہوتی ہے۔ حوادث سے عبرت اور سبق اہل صفا یا اہل بینش حاصل کرتے ہیں اس بات پر بیدل اور غالب کا اتفاق ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کے مصرعہ "اہل بینش کو ہے طوفان حوادث مکتب" میں بیدل کے مصرعہ "در حوادث فیض معنی می برند اہل صفا" کا عکس پوری طرح موجود ہے بلکہ اس کا آزاد ترجمہ ہے دوسرے مصرعہ میں دونوں نے الگ الگ مثالیں دی ہیں۔ ایک اور شعر میں بیدل اس خیال کا اظہار اس طرح کرتا ہے:

واصلاں را سرمہ می باشد غبارِ حادثات
چشم ماہی از سواد موج دریا روشن است

واصلوں یعنی خدا رسیدوں کے لئے غبار حادثات سرمہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ مچھلی کی آنکھ یعنی موج دریا کی سیاہی سے ہی روشن ہے۔

رنگِ تمکین گل و لالہ پریشاں کیوں ہے   ز گل حقیقت حسن بہار پرسیدم
گر چراغان سر رہگذر باد نہیں   بخندہ گفت کہ ایں رنگہا بروں جوشید
غالبؔ   بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ ہر رنگ تمکین گل و لالہ چراغان رہگذر باد کے درجے میں نہیں ہے۔ یعنی اگر گل و لالہ کا رنگ تمکین عارضی نہیں ہے تو وہ اس قدر جلد پریشاں یعنی زائل کیوں ہو جاتا ہے۔ یہاں استفہام اقراری ہے۔ مطلب یہ ہے کہ گل و لالہ کے رنگ میں ثبات و دوام نہیں

ہے۔بیدل کہتے ہیں کہ پھول سے میں نے موسم بہار کے حسن کی حقیقت دریافت کی تو اس نے ہنس کر کہا اس کی حقیقت اتنی ہی ہے کہ یہ رنگ نمایاں ہو گئے ہیں۔اس رنگ کی حقیقت کو بیدل دوسرے شعر میں اس طرح بیان کرتا ہے:

ہر رنگ کہ گل کرد شکستن بہ کمیں بود
ہر شیشہ مچپید کہ سنگیست دریں باغ

جو رنگ بھی نمایاں ہوتا ہے شکست اس کی گھات میں لگی رہتی ہے یہاں غالب اور بیدل دونوں نے رنگِ تمکین گل ولالہ کی بے ثباتی کو موضوع بنایا ہے۔غالب کے شعر میں بیدل کے دونوں شعر کا اثر بالکل نمایاں ہے۔اس موضوع پر بیدل کے اور بھی اچھے اشعار ہیں:

انجام بہار ایں ہمہ پامال خزانیست ۔۔۔ آئینہ مپرداز کہ رنگیست دریں باغ
در خندہ گل بوئے سلامت نتواں یافت ۔۔۔ گر قلقل میناست ترنگیست دریں باغ

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں
غالبؔ

شکوہ کبریائے او ز عجز ما چہ می پرسی
نگہ جز زیر پا نبود سرِ افتادۂ مارا
بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ اے خدا چونکہ تو کہیں نظر نہیں آتا اس لئے جو شخص بھی تیری تلاش میں نکلتا ہے وہ انجام کار تھک ہار کے بیٹھ جاتا ہے۔لفظ مقام تصوف کی اصطلاح ہے اس سے مقامات سلوک مراد ہیں۔بیدل کہتے ہیں خدا کی کبریائی کے شکوہ کا حال ہماری عجز و درماندگی سے کیا پوچھتے ہو ہم سرافتادہ لوگوں کی نگاہ پاؤں کے نیچے کے سوا کہیں نہیں جا سکتی۔مطلب یہ ہے کہ خدا کی کبریائی تک رسائی کے چاہے جتنے جتن کر ڈالیں ہم نہیں پہنچ سکتے۔غالب اور بیدل دونوں نے اس مسئلے پر انسانی عجز و درماندگی کو موضوع بنایا ہے اس فرق کے ساتھ کہ غالب کے نزدیک سالکین یا صوفیا ہر مقام سلوک پر کوشش کر کے تھک ہار گئے۔پر اس کا پتہ نہ چل سکا۔لیکن بیدل کے نزدیک شروع ہی سے لوگ اس معاملے میں درماندہ اور عاجز ہیں چنانچہ درج ذیل شعر میں جو اس کے دیوان کا پہلا شعر ہے اس کی وضاحت کرتا ہے:

باوج کبریا کز پہلوی عجزست راہ آنجا
سرِ موئے گر اینجا خم شوی بشکن کلاہ آنجا

کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہل بزم	ز شمع باعث سوز و گداز پرسیدم
ہو غم ہی جانگداز تو غمخوار کیا کریں	بگریہ گفت مپرس از ندامت ایجاد
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں بلاشبہ اہل بزم شمع کے ہمدرد اور غمخوار ہیں۔ جب اسے جلتے دیکھتے ہیں تو ان کا جی کڑھتا ہے، مگر شمع کی تقدیر ہی میں جلنا لکھا ہے۔ اس لئے وہ لوگ مجبور ہیں کچھ امداد نہیں کرسکتے۔ بیدل کہتے ہیں شمع سے اس کے سوز و گداز کا سبب دریافت کیا تو اس نے رو کر کہا ندامت ایجاد کے بابت مجھ سے نہ پوچھو، یعنی جو چیز دنیا میں قدم رکھتی ہے وہ چاہے عاشق ہو یا غیر، سب کو بالآخر جلنا اور پگھلنا ہے۔ اسی کو ندامت ایجاد سے تعبیر کیا ہے۔ شمع کے سوز و گداز کو غالب اور بیدل دونوں نے موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک شمع کی جانگدازی اس کی تقدیر میں لکھی ہے، اس لئے کوئی غمگسار اس کی مدد کیا کرسکتا ہے۔ بیدل کے نزدیک ایک شمع کیا ہر وہ چیز جو دنیا میں صفت وجود سے موصوف ہے۔ اس کی قسمت میں سوز و گداز لکھا ہے۔ چنانچہ ایک اور شعر میں بیدل اس کی وضاحت اس طرح کرتا ہے:

عبرتی بستہ است محمل بر شکستِ رنگ شمع
کای بخود وا ماندہ در ہر رنگ از محفل برآ

رنگ شمع کی شکست پر عبرت نے ایک کجاوا باندھا ہے کہ اے وہ لوگو جو تھک ہار کر بیٹھ گئے اس محفل سے نکل لو۔

دلِ نازک پہ اس کے رحم آتا ہے مجھے غالب	یارب مکن بہ بار دگر امتحان ما
نہ کر سرگرم اس کافر کو الفت آزمانے کا	برداشتیم پیش تو دست دعا بس است
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کا مطلب یہ ہے کہ محبوب کو اس بات پر آمادہ مت کرو کہ وہ تمہاری محبت کو آزمائے کیونکہ آزمائش کے لئے وہ تم کو قتل کرے گا لیکن اس کا دل بہت نازک ہے اس لئے قتل

کے بعد اسے بہت صدمہ لاحق ہوگا۔ بیدل کہتے ہیں خدایا محبوب کے ذریعہ میرے عشق کی دوبارہ آزمائش نہ کر، تیرے سامنے ہم دست بہ دعا ہیں یہی کافی ہے۔ غالب اور بیدل دونوں نے آزمائش عاشق کو موضوع بنایا ہے، غالب کے نزدیک محبوب کو عاشق کے عشق کی آزمائش پر آمادہ نہ کرنا چاہئے۔ کیونکہ اس کا دل نازک ہے۔ جبکہ بیدل کے نزدیک خدا سے استدعا ہے کہ محبوب کے عشق کی آزمائش میں اسے دوبارہ نہ ڈالے کہ اس کے سہنے کی صلاحیت اور سکت اس کے اندر نہیں ہے۔

ہے زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام	فضائے وادی امکاں پر از غبار فناست
مہر گردوں ہے چراغ رہگذارِ باد یاں	چہ آسماں چہ زمیں مغز ایں دو پوست ہواست
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کا مطلب یہ ہے کہ کائنات میں ہر شئے زوال پذیر ہے۔ یہاں تک کہ آفتاب بھی جو بظاہر بہت پایدار معلوم ہوتا ہے درحقیقت رو بہ زوال ہے۔ یعنی اس کی روشنی اگر چہ ہمیں محسوس نہیں ہوتی پر ہر لحظہ کم ہو رہی ہے، اور ایک زمانہ ایسا آئے گا جب وہ بالکل بے نور ہو جائے گا۔ بیدل کہتے ہیں وادی امکاں کی پوری فضا غبار فنا سے معمور ہے۔ آسمان ہو چاہے زمین دونوں کے پوست کے مغز میں ہوا بھری ہے۔ یہاں غالب اور بیدل دونوں نے کائنات کی فنا پذیری کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک کائنات کی ہر شئے زوال پذیر ہے۔ بیدل کے نزدیک بھی کائنات کی پوری فضا غبار فنا سے اٹی ہوئی ہے۔ فنا بیدل کا بہت محبوب موضوع ہے ۔جس پر اس کے بہت سے اشعار ہیں۔ ایک شعر اور ملاحظہ ہو:

بہر چہ می نگری پرفشانِ نیرنگیست
کہ گفتہ اند جہاں آشیانِ عنقائیست

جس چیز کو دیکھو بے رنگی اس کے اندر پرفشاں ہے مشہور کہاوت ہے کہ دنیا آشیانہ عنقا ہے۔ عنقا کا صرف نام ہی ہے اس کے وجود کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ اسی طرح دنیا کا بھی صرف نام ہی نام ہے اور ہر چیز اس کی فنا پذیر ہے۔ غالب کے پہلے مصرع ''ہے زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام'' میں بیدل کے پہلے مصرع ''فضائے وادی امکاں پر از غبار فناست'' کا عکس پوری طرح موجود ہے۔

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے	بوصل حیرت و در ہجر شوق حائلست
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں	بہوش باش کہ رفع حجاب دشوارست
غالبؔ	بیدلؔ

حالی مرحوم لکھتے ہیں کہ اپنے گھر میں معشوق کے آنے سے جو حیرت ہوتی ہے دوسرے مصرعہ میں اس کی کیا عمدہ تصویر کھینچی ہے کہ یعنی کبھی معشوق کو دیکھتا ہے اور کبھی اپنے گھر کو دیکھتا ہے کہ اس گھر میں اور ایسا شخص وارد ہوا ہے (۱۳۷)۔ بیدل کہتے ہیں وصل محبوب حاصل ہو تو حیرت حائل ہوتی ہے اور ہجر محبوب ہو تو شوق حائل ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ حجاب کا دور کرنا بہت مشکل ہے۔ بیدل کا مطلب یہ ہے کہ حیرت اس بات پر ہے کہ محبوب جو اپنی بے نیازی کے لئے مشہور ہے وہ کس طرح ملنے اور میرے گھر آنے پر تیار ہو گیا اور شوق جدائی میں اس لئے حائل ہے کہ عاشق معشوق کے بغیر حیران و پریشان اور پراگندہ حال رہتا ہے۔ غرض وصل ہو یا ہجر کسی بھی شکل میں حجاب دور نہیں ہوتا۔ غالب کو محبوب کی آمد پر حیرت اور خوشی کا ملا جلا ردعمل ہے۔ جبکہ بیدل کو اس کے وصل پر حیرت اور اس کے ہجر میں شوق اس درجہ حائل ہے کہ کسی طرح ختم ہونے کو نہیں آتا۔

جہاں میں ہو غم و شادی بہم، ہمیں کیا کام	در زمین آرزو بیدل املہا کاشتیم
دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں	لیک غیر از حسرتِ نشو و نمایش برنخواست
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں دنیا میں لوگوں کو غم کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی خوشی بھی نصیب ہو جاتی ہے مگر ہم ایسے بدنصیب ہیں کہ ہمیں کبھی خوشی نہیں حاصل ہوتی۔ بیدل کہتے ہیں آرزو کی زمین میں میں نے بہت سی تمناؤں کے تخم کی کاشت کی مگر ان کے نشو و نما یعنی پروان چڑھنے کی حسرت کے سوا کچھ ہاتھ نہ لگا۔ غالب اور بیدل دونوں نے اپنی محرومی اور بدنصیبی کا شکوہ کیا ہے۔ موازنہ سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کے شعر پر بیدل کے شعر کی پرچھائیں ہے۔

آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے	آہِ بے تاثیر مارا کم مگیر
ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں	ہر کجا دود یست آتش در قفاست
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ ہمیں معلوم ہے کہ ہماری آہ میں اثر نہیں ہے، لیکن محض اس لئے ایسا کرتے ہیں کہ ہمارے عشق کی شہرت ہوجائے، یا تو مرعوب ہوجائے۔ ہوا باندھنا ایک محاورہ ہے یعنی کوئی ایسا کام کرنا جس سے انسان کی شہرت ہوجائے، یا دوسروں پر رعب طاری ہوجائے۔ بیدل کہتے ہیں اگر ہماری آہ میں اثر نہیں ہے تو بھی اسے کم مت سمجھو، جہاں کہیں دھواں اٹھتا ہے اس کے پیچھے آگ بھی سر اٹھاتی ہے۔ آہ کو عموماً دھواں سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ اس لئے بیدل یہ کہنا چاہتا ہے کہ جہاں کہیں دھواں اٹھتا ہے اس کے پیچھے آگ بھی سر اٹھاتی ہے۔ اس لئے یہ آہ کا دھواں اگر اٹھا ہے تو اس کے بعد اس کی آگ نکل کر جلا دے گی۔ اس لئے میری آہ کو کم نہ سمجھو۔ یہاں غالب نے بیدل سے اختلاف کیا ہے۔ بیدل نے آہ کی تاثیر پر ایک اور شعر کہا ہے جس کو اورنگ زیب نے نقل کیا ہے:

بترس از آہ مظلوماں کہ ہنگامِ دعا کردن
اجابت از درِ حق بہر استقبال می آید

تیری فرصت کے مقابل اے عمر
برق کو پا بہ حنا باندھتے ہیں
غالب

عمرِ شرار و برق بفرصت نمی کشد
بیدل گذشتہ گیرد رنگ از شتاب ما
بیدل

غالب کہتے ہیں کہ اے عمر تو اس قدر تیزی سے رواں دواں ہے کہ تیری صورت رفتار کے سامنے برق بھی پا بہ حنا یعنی سست رفتار ہے۔ (جس کے پاؤں میں مہندی لگی ہوتی ہے وہ چلنے پھرنے سے معذور ہوتا ہے، اس لئے یہاں پا بہ حنا کنایہ ہے سست رفتاری سے)۔ بیدل کہتے ہیں ہماری زندگی کو جو چنگاری اور برق کی طرح زود گذر ہے ٹھہرنے کی کہیں فرصت ہی نہیں، اس زود گذری کی وجہ سے ہماری عمر تیزی سے ماضی کا روپ دھارتی چلی جارہی ہے۔ غالب اور بیدل دونوں نے عمر کی زود گذری کو موضوع بنایا ہے۔ غالب نے اس کے مقابل پر برق کو بھی سست رفتار قرار دیا ہے۔ جبکہ بیدل نے برق اور شرار سے تشبیہ دے کر اس کی زود گذری کو واضح کیا ہے، اور یہ ایک حقیقت ہے کہ بجلی اور چنگاری سے زیادہ زود گذر دنیا میں کوئی اور چیز نہیں ہوتی۔ مگر عہد حاضر میں آواز کو سب سے زیادہ دتیز رفتار کہا جاتا ہے۔ بہر حال دونوں کے کلام کے موازنہ سے معلوم

ہوتا ہے کہ غالب کے تحت الشعور میں بیدل کا یہ شعر تھا۔ میر نے تو شاید بیدل کے اس شعر کا ترجمہ ہی کر دیا ہے:

شرار و برق کی سی بھی نہیں یاں فرصت ہستی
فلک نے ہم کو سونپا کام جو کچھ تھا شتابی کا

قید ہستی سے رہائی معلوم
اشک کو بے سر و پا باندھتے ہیں
غالبؔ

تا فنا ہستی ما را ز تپش نیست گریز
چہ تواں کرد نفس حلقہ بریں در زدہ است
بیدلؔ

غالب کہتے ہیں اشک کی صفت یہ ہے کہ وہ بے سرو پا ہوتا ہے یعنی ایک ہستی بے بود ہے۔ اس لئے اس لائق نہیں کہ اسے باندھا جائے لیکن پھر بھی مضمون کی بندش میں آجاتا ہے۔ اس بات سے معلوم ہوا کہ قید ہستی سے کسی کو رہائی نہیں مل سکتی۔ بیدل کہتے ہیں جب تک ہم فنا کے گھاٹ نہیں اترتے ہیں ہماری ہستی کو تڑپنے اور تپنے سے آزادی ممکن نہیں۔ سانس نے اس دروازے پر حلقہ بندی کر رکھی ہے اس لئے ہمارے بس میں کچھ نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب تک موت ہمیں گلے نہیں لگاتی ہماری ہستی کو تپنے اور تڑپنے سے رہائی ممکن نہیں۔ چنانچہ دوسری جگہ کہتا ہے:

تا نفس باقیست عمر از پیچ و تاب آسودہ نیست

جب تک سانس چل رہی ہے زندگی کو پیچ و تاب سے آزادی حاصل نہیں۔ بیدل اور غالب دونوں نے قید ہستی یا پیچ تاب ہستی سے عدم رہائی کو موضوع بنایا ہے۔ البتہ غالب نے اشک سے تشبیہ دے کر ایک نکتہ پیدا کیا۔ جبکہ بیدل نے اسے سادگی سے ادا کر دیا ہے۔

نشہ رنگ سے ہے واشد گل
مست کب بند قبا باندھتے ہیں
غالبؔ

غنچہ وا شدہ آغوش وداع رنگ است
بفسون دل خرم نتواں شد خرم
بیدلؔ

مستی کی حالت میں انسان اپنے بند قبا کھول دیا کرتا ہے۔ غالب نے اس سے یہ نکتہ پیدا کیا کہ پھول نے اپنے بند قبا اس لئے کھول دئے ہیں کہ وہ نشہ رنگ سے مست ہو گیا ہے۔ اس

شعر میں حسن تعلیل کی خوبی پائی جاتی ہے۔ پھول کی پتیاں اس لئے کھل گئیں کہ وہ نشہ رنگ سے مست ہیں۔ بیدل کہتے ہیں کلی جب کھل کر پھول کا رنگ اختیار کرلیتی ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ اس کا رنگ اب رخصت ہونے والا ہے۔ اسی طرح دل اگر کسی وجہ سے خوش وخرم ہے تو اس کے جادو سے خوش نہیں ہوا جا سکتا۔ یہاں غالب اور بیدل کے مشاہدے میں کافی فرق پیدا ہوگیا۔ پھول کے کھلنے کو بیدل رنگ کی رخصتی کی تمہید قرار دیتے ہیں جبکہ غالب کے نزدیک پھول کا کھلنا رنگ کے نشے کی وجہ سے ہے۔ مشاہدے کے اس فرق کا نتیجہ دوسرے مصرعہ میں ظاہر ہوا کہ غالب کے نزدیک مست لوگ بند قبا نہیں باندھتے ہیں بیدل کے نزدیک دل اگر کسی بات سے دل خوش ہو تو اس کے جادو سے خوش نہ ہونا چاہئے۔

اہل تدبیر کی واماندگیاں
آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں
غالب

چنیں کہ نیک و بد ما بعجز وابستہ است
قضا بدست حنا بستہ نقش ما بستہ است
بیدلؔ

غالب کا مطلب یہ ہے کہ میرے تیمار دار بھی کس قدر سادہ لوح ہیں ان کی یہ بیوقوفی کی انتہا یہ ہے کہ میرے آبلوں پر حنا باندھتے ہیں، تاکہ وہ اچھے ہو جائیں اور اتنا نہیں سمجھتے کہ جب وہ اچھے ہو جائیں گے تو میں پھر صحرا نوردی شروع کردوں گا۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آبلہ ہو ہی گیا تو اب تدبیر سے کیا حاصل۔ پھر وہ تدبیر بھی ایسی کہ سامان زیب وزینت یعنی مہندی جو صحت وتوانائی کی تقاضا کرتی ہے، جراحت کے لئے استعمال کیا جائے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اہل تدبیر ہماری چارہ دری میں وامانده ہیں اور اب ایسی پست حرکات پر اتر آئے ہیں۔ بیدل کہتے ہیں کہ ہمارا بھلا یا برا حال بعجز ودرماندگی سے وابستہ ہے۔ یعنی ہمارے حالات اچھے ہوں یا برے قضا وقدر نے دست حنا بستہ سے ہمارے نقوش باندھ دئے ہیں۔ ظاہر ہے مہندی لگے ہاتھ سے اگر نقاشی کی گئی تو نقوش کے اثر دیرپا ہوتے ہیں۔ بیدل کا مطلب یہ ہے کہ کارکنان قضا وقدر نے ہماری قسمت میں جو بھلا برا لکھ دیا ہے ہم اس میں بالکل عاجز ودرمانده ہیں ہماری کوئی تدبیر اس میں کارگر نہیں ہوسکتی۔ غالب اور بیدل دونوں نے اہل تدبیر کی واماندگی کو موضوع بنایا ہے اور موازنہ سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کے شعر پر بیدل کے شعر کا اثر ہے۔ بیدل نے واماندگی پر کئی

اچھے شعر کہے ہیں:

واماندگی ز سلسلہ ما نمی رود
چوں جادہ ایم یک رگِ زنجیر خواب پا

خواہی بر آسماں تاز خواہی بخاک پرداز
اے گرد ہرزہ پرداز واماندگی پناہ است

بیدل	غالب
بیدل بہ کشاد مژہ زحمت نہ پسندی	سادہ پرکار ہیں خوباں غالب
منظور وفا نیست گل اندامِ تماشا	ہم سے پیمان وفا باندھتے ہیں
بیدؔل	غالبؔ

غالب کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ یہ حسین اپنی دانست میں بہت عیار بنتے ہیں کہ ہمیں فریب دینے کی نیت سے ہم سے پیمان وفا باندھتے ہیں مگر دراصل یہ لوگ بہت بیوقوف ہیں کیونکہ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ ہم ہرگز ان کے فریب میں نہیں آسکتے۔ بیدل کہتے ہیں محبوب کا تماشا دکھانے سے مقصد وفاداری کو نبھانا نہیں ہے یعنی حسینوں کے اپنے حسن کی نمائش سے آپ یہ توقع نہ رکھئے کہ وہ وفادار بھی ہوں گی۔ اس لئے کہتا ہے تم پلکیں کھول کر اس کے دیکھنے کی زحمت نہ کرو۔ حسینوں کی وفاداری کو غالب اور بیدل دونوں نے موضوع بنایا ہے۔ انداز دونوں کا الگ الگ ہے، لیکن مجموعی طور پر بیدل کے کلام کا اثر اس پر نمایاں ہے۔ بیدل کا ایک اور شعر اسی مضمون کے قریب ہے

مروت از دل خوباں مدارید
فرنگستاں مسلمانی ندارد

بیدل	غالب
دریں وادی کہ می باید گذشت از ہرچہ پیش آید	کیوں گردش مدام سے گھبرا نہ جائے دل
خوش آں رہرو کہ در دامان دی پیچید فردا را	انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں
بیدؔل	غالبؔ

غالب کہتے ہیں زمانے کی لگا تار گردش سے بھلا دل کیوں نہ گھبرائے، آخر انسان ہوں جو حساس ہوتا ہے پیالہ وساغر تو ہوں نہیں کہ متاثر نہ ہوں۔ بیدل کہتے ہیں اس دنیا میں چاہے جیسے حالات پیش آئیں بے نیازی سے ان سے گذر جانا چاہئے، وہ راہرو کتنا اچھا ہے جو مستقبل کو ماضی کے دامن میں لپیٹ کر رکھ دے۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا میں انسان کو اکثر ناگفتہ بہ حالات سے سابقہ رہتا ہے۔ اس لئے ہر آنے والی مصیبت یا پریشانی کو ماضی میں بدل کر بھول جاؤ۔ بیدل اور غالب دونوں نے گردش زمانہ کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک انسان چونکہ حساس ہے اس لئے گردش سے گھبرانا ایک فطری امر ہے۔ بیدل کہتے ہیں بیشک فطری تقاضے کے تحت انسان اچھے برے حالات سے متاثر ہوتا ہے۔ مگر آزادمنشی اختیار کرو تو پھر کسی تکلیف سے گھبرانے کی نوبت نہیں آئے گی۔

یا رب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے
لوح جہاں پہ حرف مکرر نہیں ہوں میں
غالبؔ

عبث بفکر قماش ثبات جامہ مدر
بعالمی کہ توئی انقلاب می بافند
بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ اے خدا زمانہ مجھے مٹانے پر کیوں تلا ہوا ہے۔ جبکہ لوح جہاں پر میں حرف مکرر نہیں ہوں یعنی تو نے مجھے اس دنیا میں بیکار اور بے مقصد پیدا نہیں کیا ہے۔ بیدل کہتے ہیں کہ اس دنیا میں کسی کو دوام وثبات حاصل نہیں ہے، حالات سدا بدلتے رہتے ہیں اور ان میں انقلاب آتا رہتا ہے پھر دوام کی فکر میں جامہ دری کرنا بیہودہ عمل ہے۔ غالب اور بیدل دونوں نے انسانی زندگی کی ناپائیداری کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک زمانہ ہمیں ختم کرنے پر تلا ہوا ہے۔ بیدل کے نزدیک اس دنیا میں انقلاب آتا رہتا ہے۔ یہاں لوگ آتے جاتے رہتے اور حالات بھی ان کے بدلتے رہتے ہیں۔ یہی ریت زمانے کی ہے پھر شکوے کا کیا تک ہے۔

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محو ماہ کنعاں ہو گئیں
غالبؔ

عصمت حسن یوسفی زد چاک
پردۂ طاقتِ زلیخا را
بیدلؔ

غالب کا مطلب یہ ہے کہ عام طور سے عاشق اپنے رقیبوں سے نفرت کرتا ہے، مگر زلیخا اپنے رقیبوں یعنی مصری عورتوں سے ناخوش نہیں ہوئیں ۔کیونکہ ماہ کنعاں یعنی یوسف کو دیکھ کر سب ان پر عاشق ہوگئیں ۔اس شعر میں اس واقعہ کی طرف شارہ ہے کہ مصری عورتوں نے زلیخا کو جب اس بات پر لعن طعن کرنا شروع کیا کہ وہ اپنے غلام پر فریفتہ ہوگئی ہے تو اس نے ان عورتوں کو دعوت دی اور یوسف کو پردہ کے پیچھے بٹھا دیا، جب وہ عورتیں پھل تراشنے لگیں تو زلیخا نے یوسف سے باہر آنے کو کہا۔ یوسف کو دیکھ کر وہ ایسی بیخود ہوگئیں کہ پھلوں کی جگہ اپنی انگلیاں کاٹ ڈالیں ۔اس پر زلیخا نے ان سے کہا یہی ہے وہ شخص جس کے بارے میں تم مجھے لعن طعن کرتی تھیں ۔ بیدل کہتے ہیں حسن یوسف کی عصمت نے زلیخا کی طاقت صبر کا پردہ چاک کر کے رکھ دیا، مطلب یہ ہے کہ یوسفؑ انتہائی حسین وجمیل تھے پر خدا کے معصوم بندے اور نبی تھے ۔اس لئے ان کی عصمت کی حفاظت بھی خدا نے اپنے ذمہ لے رکھی تھی ۔قرآن میں زلیخا کا یہ قول اللہ نے نقل کیا ہے کہ میں نے یوسف کے جی کو پھسلانا چاہا لیکن وہ صاف بچ نکلے ۔(ولقد راودته عن نفسه فاستعصم) (ایک فارسی شعر میں غالب نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے:

بندہ ای را کہ بہ فرمان خدا راہ رود

نگذارند کہ در بند زلیخا ماند)

اس آیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بیدل کہتے ہیں عصمت حسن یوسفی نے زلیخا کی قوت صبر وبرداشت کے پردے کو چاک کر دیا اور اس کو کھلے الفاظ میں یہ کہنے پر مجبور کیا (هيت لك) ''آجاؤ''۔غالب نے اس کے بعد پیش آنے والے واقعہ کی طرف اشارہ کیا جب مصری عورتوں نے اس مسئلے پر اس کو آڑے ہاتھوں لیا۔

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں	جہاں از شور دلہا خانۂ زنجیر خواہد شد
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں	بیفشاں بے تکلف دامن زلف پریشاں را
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ محبوب کی زلف گرہ گیر عاشق کے بازو پر پریشان ہو جائے تو حالت وصل پیدا ہوتی ہے۔جس کی وجہ سے اسے زندگی کا لطف حاصل ہوتا ہے کہ نیند بھی خوب آتی ہے

دماغ کو سکون بھی ملتا ہے اور رات بھی خوشگوار گذرتی ہے۔ بیدل کہتے ہیں اے محبوب تو اپنی زلف پریشاں کو اگر بے تکلفی سے جھٹک دے۔ دنیا دلوں کے شور نالے کی وجہ سے زنجیر خانہ میں بدل جائے گی۔ مطلب یہ ہے کہ محبوب کی زلف پریشاں کے بکھرنے سے عاشقوں پر ایسی کیفیت طاری ہوتی ہے کہ وہ آہ و نالہ کرنے لگتے ہیں اور ان کی گریہ و بکا کے شور سے دنیا خانۂ زنجیر میں بدل جاتی ہے۔ زلف پریشاں کی تاثیر کا تذکرہ غالب اور بیدل دونوں نے کیا ہے لیکن دونوں دو متضاد سمتوں میں گئے ہیں۔ غالب کے نزدیک محبوب کی زلف پریشاں عاشق کے لئے آرام جاں کا باعث ہے۔ جبکہ بیدل کے نزدیک وہ عاشق کے آہ و نالے کا سبب ہے۔ ایک اور شعر میں بیدل زلف کا تذکرہ اس طرح کرتا ہے:

بگلشن گر برافشاند ز روئے ناز کاکل را
ہجومِ نالہ ام آشفتہ سازد زلف سنبل را

محبوب باغ میں اپنی زلف کو از راہ ناز بکھیر دے تو میرا ہجوم نالہ زلف سنبل کو آشفتہ کر دے۔

خزاں کیا، فصل گل کہتے ہیں کس کو، کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں، قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے
غالبؔ

کرد آگاہم ز سوز و ماتم ایں انجمن
در بہار آواز بلبل در خزاں بانگ کلاغ
بیدلؔ

بیدل کہتے ہیں موسم بہار میں بلبل کی آواز اور موسم خزاں میں کوے کی آواز نے اس انجمن کے سوز و ماتم سے متعارف کرا دیا۔ غالب کے مطابق موسم بہار ہو یا خزاں ہماری حالت بے بال و پری یا مجبوری میں کوئی فرق نہیں پڑتا ہے جبکہ بیدل کے نزدیک بہار میں بلبل کے آہ و نالے اور خزاں میں کوؤں کی آواز نے اسے آہ و نالہ اور ماتم و سوگواری سے واقف کرا دیا۔ بیدل نے گل و بلبل سے متعلق ایک اور شعر میں اس مضمون کو دوسرے انداز سے بیان کیا ہے۔

بلبل بہ نالہ حرف چمن را مفسر است
یارب زبان نکہتِ گل ترجمان کیست

بلبل آہ و نالہ کر کے چمن کے ایک نکتے کی وضاحت کرتی ہے۔ لیکن نکہت گل کس بات کی ترجمان ہے۔ اس سوال کا جواب خود بیدل نے دوسرے شعر میں دیا ہے:

خلق معشوقاں کمند صید مشتاقاں بس است
نیست غیراز بوئے گل زنجیر پائے عندلیب

معشوق کی ادا عاشق کو اپنے دام محبت میں گرفتار کرنے کے لئے کافی ہے۔بلبل کے پاؤں کی زنجیر بوئے گل کے سوا کوئی نہیں ہے۔

جانفزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگ جاں ہوگئیں
غالبؔ

مسیح وقت اگر کس بادہ را خواند عجب نبود
کہ ہر دم بادہ جانِ تازہ بخشد در تنِ مینا
بیدلؔ

غالب کا مطلب ہے کہ شراب بہت جاں فزا شے ہے جو شخص بھی جام شراب ہاتھ میں لے لیتا ہے شراب کی تاثیر سے اس کی ہاتھ کی لکیریں گویا رگ جاں بن جاتی ہیں۔یعنی ان میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔بیدل کہتے ہیں بادہ کو اگر مسیح وقت کہے تو کچھ تعجب نہیں، کیونکہ بادہ ہر آن تن مینا کے اندر نئی جان ڈالتی ہے۔غالب اور بیدل دونوں نے بادہ کی جاں فزائی کا تذکرہ کیا ہے۔غالب کے نزدیک جس کے ہاتھ وہ لگ جاتی ہے اس کی ہاتھ کی لکیریں تک رگِ جاں ہوجاتی ہیں۔جبکہ بیدل کے نزدیک وہ تن مینا کی جاں فزائی کا سبب ہے۔صاف واضح ہے کہ غالب کے اس شعر پر بیدل کے شعر کا اثر ہے۔

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں
غالبؔ

پیوستگی بحق ز دو عالم بریدن است
دیدار دوست ہستی خودرا ندیدن است
بیدلؔ

حالی لکھتے ہیں تمام ملتوں اور مذہبوں کو منجملہ دیگر رسوم کے قرار دیتا ہے جن کا ترک کرنا اور مٹانا موحد کا اصل مذہب ہے اور کہتا ہے کہ یہی ملتیں جب مٹ جاتی ہیں تو اجزائے ایمان بن جاتی ہیں (۱۳۸)۔بیدل کہتے ہیں خدا سے تعلق جوڑنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان دونوں جہاں سے قطع تعلق کرلے۔دوست کا دیدار اپنی ہستی سے ہاتھ دھوئے بغیر یا اس سے صرف نظر کئے بغیر ممکن نہیں۔اس امر میں کہ توحید کا مطلب سب سے قطع تعلق کر کے ایک خدا سے لو

لگاتا ہے۔غالب اور بیدل دونوں متفق ہیں۔البتہ غالب کے نزدیک تمام مذاہب کے جملہ رسوم وقیود کو ترک کر کے یہ چیز حاصل ہو سکتی ہے۔جبکہ بیدل کے نزدیک دونوں جہاں حتیٰ کہ خود اپنی ذات سے قطع تعلق کر کے یہ بات حاصل ہو سکتی ہے۔چنانچہ ایک دوسرے شعر میں اس کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

جمعی کہ دم ز عالم توحید می زنند
پیوستہ اند باحق و از خود نرستہ اند

ایک طبقہ توحید کا دم بھرتا ہے اور اس کا دعویٰ کرتا ہے جب کہ اس نے خدا سے وابستگی کے باوجود خود اپنی ذات سے تعلق ختم نہیں کیا۔گویا توحید کے دعویٰ کے لئے ضروری ہے کہ سب سے کٹ کر حتیٰ کہ خود اپنی ذات سے کٹ کر ایک خدا سے لو لگائے۔

یوں ہی اگر روتا رہا غالب تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں
غالبؔ

چوں سپند آرامِ جسمِ دردناکم نالہ است
برق جولانی کہ خواہد سوخت پاکم نالہ است
بیدلؔ

غالب کا مطلب ہے کہ اگر وہ اسی طرح روتا رہا تو کچھ عرصے کے بعد دلی ہی نہیں بلکہ اس کے گردونواح کی سب بستیاں اشکوں کے سیلاب سے تباہ ہو جائیں گی۔غالب نے یہ غزل ۱۸۵۲ء میں اپنے قلم سے لکھ کر منشی نبی بخش حقیر کو بھیجی تھی جو ان کے کلام کے بڑے قدرداں تھے اور خط میں لکھا تھا ''بھائی خدا کے واسطے اس غزل کی داد دینا، اگر ریختہ یہ ہے تو میر و مرزا کیا کہتے تھے اور اگر وہ ریختہ تھا تو پھر یہ کیا ہے؟ صورت اس کی یہ ہے کہ ایک صاحب شاہزادگان تیموریہ میں سے لکھنؤ سے یہ زمین لائے تھے۔حضور (شاہ ظفر) نے خود بھی غزل کہی اور مجھے بھی حکم دیا سو میں حکم بجا لایا اور غزل کہی'' (۱۳۹)۔بیدل کہتے ہیں سپند یعنی کالے دانے کی طرح میرے دردناک جسم کا سارا آرام وسکون نالے کی بدولت ہے۔وہ برق جولاں جو مکمل طور پر مجھے جلا کر راکھ کر دے وہ نالہ ہی ہے۔غالب اور بیدل دونوں نے وفور گریہ کے نتیجے کو موضوع بنایا ہے۔اس فرق کے ساتھ کہ غالب کے نزدیک اگر وہ اسی طرح شدت گریہ سے روتے رہے تو دلی کے علاوہ گردونواح کی بستیاں بھی اشکوں کے سیلاب سے بہہ جائیں گی۔غالب کی زندگی حالات

کی ستم ظریفی کی وجہ سے روتے ہی کٹی اس لئے ان کی یہ پیشین گوئی غلط ثابت ہوئی۔ دلی تو خیر دلی ہے گردونواح کی بستیوں خصوصاً گڑگاؤں جسے غالب اپنے خط میں گاؤں لکھتے تھے اپنی صنعتی ترقیوں کی وجہ سے رشک دلی ہو رہا ہے۔ بیدل کے نزدیک اس کے جسم دردناک کو سکون تو نالہ ہی سے حاصل ہے، جو بجلی کی طرح اس کے سارے وجود کو جلا کر راکھ کر دے اسی لئے ایک اور شعر میں نالہ کو خطاب کر کے کہتا ہے:

اے فغاں بگذر ز چرخ و لامکاں تسخیر باش
چند در زیر سپہر کردن نہاں شمشیر را

اے آہ وفغاں آسمان پار کر کے لامکاں پر بھی اپنی کمند ڈال دے۔ تلوار کو آسمان کے نیچے کہاں تک چھپا کر رکھے گا۔

زبس کہ شورِ جنوں گشت برق کلبۂ ہوشم	دیوانگی سے دوش پہ زنار بھی نہیں
برنگ حلقۂ زنجیر سوخت پردۂ گوشم	یعنی ہماری جیب میں اک تار بھی نہیں
بیدلؔ	غالبؔ

غالب کا مطلب یہ ہے کہ ہماری دیوانگی کا یہ عالم ہے کہ ہم نے زنار بھی توڑ کر پھینک دیا حالانکہ اس کا باقی رکھنا بت پرستی کے لئے ضروری تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ ہم نے اپنے گریباں کی دھجیاں اڑا دیں، ورنہ اگر کوئی تار باقی رہ جاتا تو ہم اس کو زنار کا قائم مقام سمجھ لیتے۔ بیدل کہتے ہیں شورِ جنوں میرے کلبۂ ہوش کے لئے ایسی زبردست بجلی ثابت ہوئی کہ حلقہ زنجیر کی طرح اس نے میرے پردۂ گوش کو بھی جلا کر رکھ دیا۔ غالب اور بیدل دونوں نے شدت جوش جنوں کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک شدت جوش جنوں کا عالم یہ ہے کہ اس نے زنار بھی توڑ کر پھینک دیا اور گریباں کی دھجیاں بھی اڑا دیں۔ بیدل کے نزدیک شدت جوش جنوں نے اس کے ہوش کی جھونپڑی پر ایسی بجلی گرائی کہ حلقۂ زنجیر کی طرح اس کے پردۂ گوش کو بھی جلا کر رکھ دیا۔ بیدل نے عشق وعقل اور دیوانگی وہوش کے درمیان تضاد کے موضوع کو دوسرے انداز سے بھی بیان کیا ہے:

دل مست جنونست بگوئید خرد را
امروز سراغ منِ بیتاب نگیرد

دل کو نیاز حسرتِ دیدار کر چکے	در وصل ہم ز حسرتِ دیدار چارہ نیست
دیکھا تو ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں	با عشق طالعیست کہ ما آزمودہ ایم
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کا مطلب یہ ہے کہ پہلے تو دیدار کی آرزو میں ہم نے اپنے دل کو نذر جاناں کر دیا یعنی مٹا دیا لیکن بعد میں پتہ چلا کہ اب ہمارے اندر دیدار کی طاقت بھی باقی نہیں رہی۔ یعنی ہم نے مفت میں اپنے دل کو گنوا دیا۔ بیدل کہتے ہیں وصل میں بھی حسرتِ دیدار سے چارہ نہیں ہے۔ عشق میں ہمارا سابقہ ایسی قسمت سے ہے جسے ہم نے بارہا آزمایا ہے۔ غالب اور بیدل دونوں نے حسرتِ دیدار کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک عاشق نے آرزوے دیدار میں دل کو اس حد تک نذر محبوب کر دیا کہ اب اس میں دیدار کی سکت بھی باقی نہ رہی۔ بیدل کے نزدیک وصل حاصل ہونے پر بھی حسرتِ دیدار باقی رہ جاتی ہے۔ عاشق کی قسمت کچھ ایسی ہی واقع ہوئی ہے جس کو اس نے بارہا آزمایا۔

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں	بے عشق محالست بود رونق ہستی
طاقت بقدر لذت آزار بھی نہیں	بے جلوۂ خورشید جہاں نامہ سیہ است
غالبؔ	بیدلؔ

غالب اس شعر میں اپنی باطنی کشمکش کا اظہار کرتے ہیں کہ ایک طرف میری فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ اپنی ساری عمر عشق میں بسر کروں دوسری طرف مجھے فراق یار کی سختیوں کے جھیلنے کی طاقت بھی نہیں ہے اس لئے پریشان ہوں کہ زندگی کیسے بسر ہوگی۔ بیدل کہتے ہیں کہ عشق کے بغیر زندگی میں رونق آ ہی نہیں سکتی جس طرح جلوۂ خورشید کے بغیر دنیا ایک نامہ سیاہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ غالب اور بیدل دونوں نے بغیر عشق کی زندگی کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک عشق کے بغیر زندگی نہیں کٹ سکتی، لیکن ساتھ ہی فراق یار کی سختی برداشت کرنے کی سکت بھی اس کے اندر نہیں ہے جبکہ بیدل کے نزدیک زندگی کی ساری رونق تو عشق کی بدولت ہی ہے۔ جیسے اگر سورج نہ نکلے تو ساری دنیا تاریک ہو جاتی ہے۔ اسی طرح عشق زندگی میں نہ ہو تو زندگی بے رونق ہو جاتی ہے۔ اس موضوع کو بیدل نے دوسرے انداز سے بھی بیان کیا ہے:

بے محبت زندگانی نیست جز ننگِ عدم
خاک کن بر فرق آں ساز یکہ ایں آہنگ اوست

بے عشق اگر آفتاب خواہی گشتن
ہشدار کہ عاقبت زوالست تو را

دیکھا اسد کو خلوت و جلوت میں بارہا — دیوانگی و ہوش بیک جامہ نگنجد
دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں — از دست ادب چاکِ گریباں گلہ دارد

غالبؔ — بیدلؔ

غالب نے عاشق کی نفسیاتی کیفیت واضح کی ہے کہ اسے دیوانہ تو اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ وہ ایک مقصد معین اپنے سامنے رکھتا ہے اور اس کے حصول کے لئے دن رات کوششیں کرتا ہے اور ہوشیار اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ وہ دنیا والوں کے زاویہ نگاہ سے کوئی کام عقل کا نہیں کرتا بلکہ ان کی رائے میں اس کی پوری زندگی حماقتوں سے لبریز ہوتی ہے۔ بیدل کا مطلب ہے کہ دیوانگی اور ہوش دونوں ایک جگہ اکٹھے نہیں ہو سکتے انسان یا تو دیوانہ ہوگا یا ہوش مند۔ بیچ کی کوئی راہ نہیں ہے۔ دیوانگی اور ہوش کو غالب اور بیدل دونوں نے موضوع بنایا ہے۔ لیکن غالب بیدل سے اختلاف کرتے ہیں کہ میں عاشق نہ تو دیوانہ ہوں نہ ہوشیار۔ بیدل نے بہت سے اشعار میں عقل وجنوں اور ہوشیاری اور دیوانگی کو موضوع بنا کر نت نئے مضامین بیان کئے ہیں چند ملاحظہ ہوں:

پرفشانست نفس لیک ز خود رستن کو
با ہمہ شور جنوں در قفس ہوش خودم

اپنی ذات سے رہائی کی تمام تر کوششوں کے باوجود میرا جنون اس درجے کو نہیں پہنچا کہ ہوش وخرد کی قید سے خود کو آزاد کروں۔

نشوی منکرِ سامان جنونم بیدل
کہ اگر ہیچ ندارم دلِ دیوانے ہست

میرے سامان جنوں کا انکار نہ کرنا کہ میرے پاس اگر کچھ نہیں ہے تو ایک دل دیوانہ تو ہے ہی۔

نہیں ہے زخم کوئی بخیہ کے درخور مرے تن میں
ہوا ہے تارِ اشکِ یاس رشتہ چشمِ سوزن میں
غالبؔ

آنقدر بریاس پیچیدم کہ امیدی نماند
پائے تا سر یک گرہ شد رشتہ ام از تابہا
بیدلؔ

غالب کا مطلب یہ ہے میرے جسم میں کوئی زخم اس قابل نہیں کہ جراح اسے سی سکے اس لئے زندگی سے مایوسی ہوگئی ہے۔ اس بات کو انہوں نے یوں کہا کہ اس لئے مایوسی کے اشکوں کا تار سوئی کی آنکھ کا رشتہ (سوئی کے ناکے کا تاگا) بن گیا ہے یعنی سوئی بھی میری صحت سے ناامید ہوگئی ہے۔ بیدل کہتے ہیں میں نے یاس پر اس قدر پیچ وتاب کھائی کہ سرے سے کوئی امید ہی باقی نہ رہی۔ میرا دھاگا پیچ کھانے کی وجہ سے سر سے پاؤں تک ایک گرہ کی شکل اختیار کر گیا۔ مطلب یہ ہے کہ مایوسی نے میرے سارے وجود کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ غالب اور بیدل دونوں نے مایوسی کو موضوع بنایا ہے۔ البتہ انداز بیان الگ ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کے کلام میں بیدل کے خیال کا عکس موجود ہے۔

ہوئے اس مہروش کے جلوۂ تمثال کے آگے
پرافشاں جوہر آئینہ میں مثل ذرہ روزن میں
غالبؔ

بیدل اندر جلوہ گاہ حسن طاقت سوز او
جوہرِ حیرت زبان عذر خواہ آئینہ را
بیدلؔ

غالب کہتے ہیں جس طرح شعاع آفتاب سے روزن میں ذرات پرافشاں اور متحرک نظر آتے ہیں اسی طرح اس مہروش کے عکس رخ کے آگے یعنی اس کے حسن و جمال کو دیکھ کر آئینہ فولادی کے جوہر پرافشاں یعنی مضطرب ہوگئے۔ بالفاظ دیگر اس کی تابش جمال کے سامنے آئینہ بھی ماند پڑ گیا۔ غالب کا ایک اور شعر اسی مفہوم میں درج ذیل ہے۔

جلوے کا ترے وہ عالم ہے کہ گر کیجیے خیال
دیدۂ دل کو زیارت گاہِ حیرانی کرے

بیدل کہتے ہیں کہ محبوب کے حسن طاقت سوز کے جلوے میں جوہر حیرت آئینہ کے لئے ایک عذر

خواہ زبان ہوگئی۔ غالب اور بیدل دونوں نے محبوب کے جلوہ حسن یا جلوہ تمثال کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک اس کے جلوہ تمثال کے سامنے جوہر آئینہ ذرہ روزن کی طرح مضطرب ہو گیا۔ یعنی اس کی تاب نہ لا سکا۔ جبکہ بیدل کے نزدیک اس کے جلوہ حسن تواں فرسا کے سامنے جوہر حیرت آئینہ کی وہ زبان بن گئی جو معذرت کرتی ہے۔ اصل میں آئینہ اور حیرت کا تلازمہ ہے۔ بیدل نے کئی اشعار میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ ع:

آئینہ را بقسمتِ حیرت قناعت است

عکس چوں حیرت مقیمِ خانہ آئینہ است

حیرت از شش جہتم در دل آئینہ گرفت

اب آئینہ کو محبوب کے حسن کو دیکھ کر حیرت لاحق ہوتی ہے کہ خدا نے ایسی چیز بنائی ہے کہ اس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا یا اس کی تاب کوئی نہیں لا سکتا۔ یہی حیرت اس کی وہ زبان بن جاتی ہے جو معذرت کرتی ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو نتیجے کے لحاظ سے دونوں ایک ہی نکتے پر پہنچے ہیں۔

مزے جہاں کے اپنی نظر میں خاک نہیں	زباغ عافیت رنگِ امیدی نیست عاشق را
سوائے خونِ جگر، سو جگر میں خاک نہیں	محبت غیر خوں گشتن نمی دانم چہ می باشد
غالب	بیدل

غالب کا مطلب یہ ہے کہ عاشقی اختیار کرنے کے بعد میرے لئے دنیا کی کسی چیز میں کوئی لطف نہیں رہا، لے دے کے خونِ جگر پینے میں کچھ لذت محسوس ہوتی تھی لیکن اب جگر میں بھی خون کا کوئی قطرہ باقی نہیں رہا۔ بیدل کہتے ہیں عاشق کو خیر و عافیت کے باغ کی کوئی امید نہیں ہوتی۔ محبت خون کے آنسو رونے کے علاوہ کسی اور چیز کا نام ہے میں نہیں جانتا۔ غالب اور بیدل دونوں نے عشق میں خونِ جگر پینے یا خون کے آنسو بہانے کو موضوع بنایا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ غالب کے نزدیک خون جگر پینے میں لذت محسوس ہوتی تھی لیکن اب جگر میں بھی خون کا قطرہ باقی نہیں رہا۔ جبکہ بیدل کے نزدیک عشق میں خون کے آنسو بہانے کے سوا خیر و عافیت کی سرے سے کوئی امید ہی نہیں ہوتی ہے۔ یہاں غالب نے ایک نکتہ پیدا کیا ہے۔

خیالِ جلوۂ گل سے خراب ہیں میکش	جلوہ گل گر چنیں طاقت گداز یہا کند
شراب خانے کے دیوار و در میں خاک نہیں	بعد ازیں خاکستری یابی بجائے عندلیب
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کا بظاہر یہ مطلب ہے کہ میکشی یعنی عاشقوں کی مستی کا باعث شراب نہیں بلکہ خیال جلوۂ گل یعنی تصور جاناں ہے۔ بیدل کہتے ہیں جلوۂ گل اگر اسی انداز سے طاقت گدازی کا کام کرے تو اس کے بعد بلبل کی جگہ راکھ کا ڈھیر نظر آئے گا۔ غالب اور بیدل دونوں نے جلوۂ گل یعنی معشوق کی کرشمہ سازی کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک تصور جاناں سے عاشقوں کے اندر مستی پیدا ہوتی ہے۔ جبکہ بیدل کے نزدیک جلوۂ معشوق سے عاشقوں کی طاقت گھلتی اور پگھلتی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ عاشق کا وجود راکھ کے ڈھیر میں بدل جاتا ہے۔

ہواں ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ	در زمین آرزو بیدل املہا کاشتیم
سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں	لیک غیر از حسرتِ نشو ونمایش برنخاست
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کا مقصد یہ ہے کہ عشق نے اسے اس درجہ برباد کر دیا کہ ساری عمر کہیں اپنا گھر نہ بنا سکا، لیکن اس بات کو اس انداز سے ادا کرتے ہیں کہ میرے گھر میں حسرت کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے اور چونکہ وہ غیر مادی شے ہے اس لئے عشق کے سامنے شرمندہ ہوں کہ جب کچھ بھی نہیں تو غارت کیسے کرے گا۔ غالب کا ایک اور شعر اسی مفہوم کا ہے:

گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر، سو ہے

بیدل کہتے ہیں کہ میں نے آرزو یعنی عشق و محبت کی زمین میں بڑی بڑی امیدوں کے بیج بوئے تھے لیکن حسرتِ نشو ونما کے سوا کچھ ہاتھ نہ لگا۔ مطلب یہ ہے کہ انسان جب کوئی پودا زمین میں لگاتا ہے تو اس کے پروان چڑھنے اور پھل دینے کی اسے امید ہوتی ہے۔ لیکن عشق کا پودا ایسا تھا کہ اس کے لگانے کے بعد پروان چڑھنے کی حسرت ہی رہ گئی۔ یعنی ناکام رہا۔ غالب نے حسرتِ نشو ونما

کو حسرتِ تعمیر سے بدلا۔ غور سے دیکھیے تو غالب کے شعر میں بیدل کے شعر کا عکس نظر آئے گا۔

ہمارے شعر میں اب صرف دل لگی ہے اسد	عبرتِ آئینہ گیر اے غافل از لافِ کمال
کھلا کہ فائدہ عرض ہنر میں خاک نہیں	عرض جوہر جز خراش چہرۂ اظہار نیست
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اپنے اشعار میں کمال فن کا اظہار کیا، مگر افسوس کہ پڑھنے والوں نے اس کی کوئی قدر نہیں کی۔ بلکہ اس کو مذاق کا نشانہ بنایا، اس سے ثابت ہوا کہ عرض ہنر یعنی اظہار فن میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔ بیدل کہتے ہیں اپنے کمال کی لاف زنی کر کے اے غافل آدمی آئینے سے عبرت حاصل کر۔ اپنے جوہر یا فن کی نمائش چہرۂ اظہار پر خراش لگانے کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ بیدل اور غالب دونوں نے اپنے کمال فن کے اظہار سے پہلو تہی اس لئے کرنی چاہی ہے کہ لوگوں نے اس کی قدر نہ پہچانی۔ ناقدری کا شکوہ عموماً شاعروں کو ہوا کرتا ہے۔ اسی اصول کے تحت ان دونوں نے اس کا اظہار کیا ورنہ حقیقت یہ ہے کہ غالب اور بیدل دونوں کی قدر ہوئی، اور آج تک قدر ہوتی چلی آرہی ہے۔

جب وہ جمال دل فروز صورت مہر نیم روز	گر جمالت عام سازد رخصت نظارہ را
آپ ہی ہو نظارہ سوز، پردے میں منھ چھپائے کیوں	مردمک از دیدہ ہا پیش از نگہ گیرد ہوا
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کا مطلب یہ ہے کہ محبوب کے جمال دل فروز کا یہ عالم ہے کہ آفتاب نیم روز کی طرح اس کے دیدار کی کوئی شخص تاب نہیں لاسکتا۔ ایسی صورت میں کہ جب کوئی اسے دیکھ نہیں سکتا سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر وہ اپنے چہرے پر نقاب کیوں ڈالے ہوئے ہے۔ یعنی پردے میں کیوں پوشیدہ ہے۔ بیدل کہتے ہیں کہ اے محبوب تو جب اپنے حسن جمال کے دیدار عام کی اجازت دیتا ہے تو نگاہ سے پہلے آنکھ کی پتلی پیش قدمی کرتی ہے۔ بیدل اور غالب دونوں نے حسن محبوب کے نظارہ کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک محبوب کا حسن نظارہ سوز ہے یعنی کوئی اس کے دیکھنے کی

تاب نہیں لا سکتا۔ جبکہ بیدل کے نزدیک اس کے حسن کا نظارہ اتنا ہی پر کشش ہے کہ نگاہ سے پہلے آنکھ کی پتلی پیش قدمی کر رہی ہے۔ بیدل نے ایک اور شعر میں اس طرف اشارہ کیا ہے کہ حسن اور نقاب میں صرف نام کا فرق ہے:

تفاوت در نقاب و حسن جز نامی نمی باشد
خوشا آئینۂ صافی کہ لیلیٰ دید محمل را

حسن و نقاب میں نام کے سوا کسی چیز کا فرق نہیں ہے۔ اس صاف ستھرے آئینہ دل کا کیا پوچھنا جس نے محمل کو دیکھ کر لیلیٰ کو دیکھ لیا۔ اس طرح غالب یہاں بیدل سے اختلاف کرتے ہیں، کہ محبوب کا حسن نظارہ سوز ہونے کے باوجود اس نے اپنے رخ پر نقاب کیوں ڈال رکھا ہے۔ نظارے پر بیدل نے کئی اچھے اشعار کہے ہیں:

حسنی است بر رخش رقمِ مشکناب را
نظارہ کن غبار خطِ آفتاب را

غالب کا ایک اور شعر نظارہ پر اسی قسم کا ملاحظہ ہو:

نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں	جز مرگ نیست چارۂ آفات زندگی
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں	چوں زخم شیشہ ایکہ گداز التیام داشت
غالب	بیدل

غالب کہتے ہیں کہ انسان جب تک زندہ ہے اس کا غم میں مبتلا رہنا لازمی ہے۔ یعنی غم وہ بری بلا ہے کہ موت سے پہلے اس کے پنجے سے رہائی ممکن نہیں۔ بیدل کہتے ہیں کہ زندگی کی آفتوں اور غموں سے بچنے کی تدبیر موت کے سوا کوئی نہیں ہے۔ جیسے شیشے کا زخم پگھلنے سے بھر جاتا ہے۔ یعنی شیشہ اگر ٹوٹ گیا ہے تو اسے بھٹی میں رکھ کر پگھلا دیتے ہیں تو وہ جڑ جاتا ہے۔ غالب اور

بیدل دونوں نے زندگی اور غم کی ہمدمی اور موت کو اس سے رہائی کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کا مصرعہ "موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں" بیدل کے مصرعہ "جز مرگ نیست چارۂ آفات زندگی" کا آزاد ترجمہ معلوم ہوگا۔ اس موضوع کو بیدل نے دوسرے انداز سے بھی بیان کیا ہے۔

فکر تدبیر سلامت خون راحت خوردن است
ماہمہ بیچارہ ایم و چارۂ ما مردن است

زندگی کی آفتوں اور غموں سے سلامتی کی تدبیر سوچنا اپنے آرام و راحت کا خون کرنا ہے۔ ہم سب ایک طرح سے لاچار اور مجبور ہیں، اور ان سے نجات کی ایک ہی راہ موت ہے۔

ہاں وہ خدا پرست نہیں، جاؤ وہ بیوفا سہی	دین و دانش ہمہ در عشق بتاں باید باخت
جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں	خویش را بیدل دیوانہ لقب باید کرد
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کا مطلب یہ ہے کہ بیشک محبوب نہ خدا پرست ہے اور نہ وفادار ہے، لہذا جسے اپنا دین و دل عزیز ہو وہ اس کی گلی میں ہرگز نہ جائے۔ گلی جانا کنایہ ہے دل لگانے سے۔ بیدل کہتے ہیں دین و دانش کا جو سرمایہ ہمارے پاس ہے وہ اس لائق ہے کہ عشق بتاں میں صرف کر کے ان سے ہاتھ دھو بیٹھیں اور خود کو عاشق و دیوانہ کے نام سے مشہور کر دیں۔ غالب اور بیدل دونوں نے راہ عشق میں دل و دین کی قربانی کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک جس کو دل و دین عزیز ہو اسے چاہئے کہ معشوق سے دل نہ لگائے۔ جبکہ بیدل کے نزدیک دین و دانش کے سارے سرمائے کو معشوق کے عشق پر نچھاور کر کے دیوانہ ہو جانا ہی اصل کامیابی ہے۔ چنانچہ ایک اور شعر میں اس کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں:

نہ ذوق ہنر دارم و نے محو کمالم
مجنون توام دانش و فرہنگ من اینست

نہ تو کسی ہنر اور فن کا مجھے ذوق ہے اور نہ کسی کمال میں محو ہوں میں تو تمہارا عاشق ہوں میری دانش و فرہنگ کا کل سرمایہ بس یہی ہے۔

پرسشِ طرز دلبری کیجیے کیا کہ بن کہے
اس کے ہر اک اشارے سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں
غالبؔ

طریق دلربائی یکجہاں نیرنگ می خواہد
بحسن محض نتواں پیش بردن نازنینیہا
بیدلؔ

غالب کہتے ہیں ہم اس سے کیا پوچھیں کہ دل کس طرح لیتے ہو اس کے جسم کی ہر حرکت بغیر بتائے دلستاں ہے۔ یعنی اس کی ہر ادا زبانِ حال سے طرز دلبری کا اظہار کر رہی ہے۔ بیدل کہتے ہیں دلربائی کا انداز بھی اپنے اندر ایک دنیا نیرنگ یعنی مکر وفریب کی حامل ہے۔ نازنینی یعنی دلربائی اور دلبری کے انداز محض حسن سے فروغ نہیں پاتے۔ بیدل اور غالب دونوں نے محبوب کی طرز دلبری کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک اس کی ہر ادا زبان حال سے طرز دلبری کا اظہار کرتی ہے۔ جبکہ بیدل کے نزدیک طرز دلبری کے لئے مکر وفریب اور حیلہ و بہانہ کی ایک پوری دنیا درکار ہے۔ محض حسن سے یہ چیز فروغ نہیں پاتی۔ اس مضمون کو بیدل نے دوسرے شعر میں اس انداز سے پیش کیا ہے۔

شیوۂ خوباں عجب نازک ادا افتادہ است
شوخی آنجا تا عرق آلود می گردد حیاست

حسینوں کا شیوہ عجیب نازک ادا واقع ہوا ہے، شوخی اگر پسینے سے شرابور ہو تو وہ حیا کا روپ دھار لیتی ہے۔

کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی
آئینہ دار بن گئی حیرت نقش پا کہ یوں
غالبؔ

ز نقش پائے تو بوئے بہار می آید
بیا کہ جبہہ نہم برزمیں و گل چینم
بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کوئے یار میں رہنے کا ڈھب معلوم نہ تھا مگر حیرت پا نے زبان حال سے بتا دیا کہ اگر یہاں رہنا مطلوب ہے تو میری طرح بے حس وحرکت یعنی محو حیرت ہو جاؤ۔ بیدل کہتے ہیں اے محبوب تیرے نقش پا سے موسم بہار کی بو آ رہی ہے۔ اب آ بھی جا کہ میں تیرے حضور زمین پر اپنی پیشانی ٹیکوں اور گلچینی کروں۔ غالب اور بیدل دونوں نے نقش پائے محبوب کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک نقش پائے محبوب عاشق کو کوئے یار میں رہنے کی روش بتاتا

ہے۔جبکہ بیدل کے نزدیک نقش پائے محبوب سے موسم بہار کی خوشبو عاشق کو مل رہی ہے جس پر وہ سجدہ کرنے اور گلچینی کے لئے تیار ہے۔ بیدل نے نقش پائے محبوب پر کئی اور اچھے اشعار کہے ہیں:

شبی سیرِ خیال نقش پائے دلبری کردم
گریباں را پر از کیفیتِ برگِ حنا کردم

☆

نہ نقش پایم و نے سایہ اینقدر دانم
بہ خاک راہِ تو ام خواہ آں و خواہ اینم

گر ترے دل میں ہو خیال وصل میں شوق کا زوال
موج محیط آب میں مارے ہے دست پا کہ یوں
غالب

وصل نتواند خمارِ حسرتِ دلہا شکست
کم نہ سازد مے کشی خمیازہ جامِ بادہ را
بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ اگر تم یہ سمجھو کہ وصل کی حالت میں جذبہ شوق سرد پڑ جاتا ہے تو یہ غلط ہے۔شوق کا زوال تو بڑی بات ہے اس میں کمی تک نہیں ہوتی۔تم نے دیکھا ہوگا کہ موجیں دریا سے ہم آغوشی کے باوجود برابر ہاتھ پاؤں مارتی رہتی ہیں جوان کے اضطراب وشوق وصال کی کھلی ہوئی علامت ہیں۔ بیدل کہتے ہیں وصل حسرتِ دل کے خمار کو دور نہیں کرسکتا جس طرح مے کشی جامِ بادہ کے خمیازہ کو کم نہیں کرتی۔ وصل میں شوق کا عدم زوال بیدل اور غالب دونوں کا موضوع ہے۔غالب کے نزدیک وصل میں شوق کا سلسلہ اسی طرح ختم نہیں ہوتا جس طرح موجیں دریا سے ٹکرا کر بھی ہاتھ پیر مارتی رہتی ہیں۔ بیدل کے نزدیک جس طرح مے کشی جامِ بادہ کی انگڑائی میں کمی نہیں کرتی اسی طرح وصل حسرتِ دل کے نشے کو اتار نہیں کرسکتا۔بیدل نے اس موضوع کو دوسرے انداز سے بھی پیش کیا ہے:

بزم وصل از شوق فضول ایمن نیم بیدل
مباد ابرام تمہیدِ تغافل گردد ایما را

غور سے دیکھا جائے تو غالب کے پورے شعر میں بیدل کے مصرع ''وصل نتواند خمارِ حسرتِ دلہا شکست'' کا عکس موجود ہے۔

بقدرِ حسرتِ دل چاہئے ذوق معاصی بھی
بھروں یک گوشہ دامن گر آب ہفت دریا ہو
غالبؔ

بر امید ابر رحمت دامنی آلودہ ام
میکند آب از حیا بے برگیِ عصیاں مرا
بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ دنیا میں گناہ کم کیے ہیں اور میرا ذوق گناہ بہت زیادہ ہے۔ لیکن اس بات کو اس طرح سے کہتے ہیں کہ اگر گناہوں کے سات سمندر بھی ہوں تو میرا صرف گوشہ دامن تر ہوگا۔ شاعرانہ لطف اس گوشہ دامن کے بھرنے میں یہ ہے کہ فارسی میں گنہگار کو تر دامن کہتے ہیں۔ بیدل کہتے ہیں ابر رحمت کی آس لگا کر میں نے اپنے دامن گناہوں سے آلودہ کئے ہیں۔ عصیان کی بے برگی مجھے شرم سے پانی پانی کئے دیتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ رحمت کی امید پر مجھے اور گناہ کرنا تھا۔ عصیان کی بے برگی و بے سروسامانی مجھے شرم سے پانی پانی کئے دیتی ہے۔ چنانچہ دوسرے شعر میں اس کی وضاحت کرتا ہے:

بیدل از حد گذشت معاصی و من ہماں
رد نیستم اگر بدرش التجا برم

بیدل ہمارے گناہ حد سے بڑھ گئے اس کے باوجود اگر میں اس کی رحمت کی امید میں دربار الٰہی میں مغفرت کی التجا کروں تو میری دعا رد نہیں ہوگی۔ غالب اور بیدل دونوں نے ذوق معاصی کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک حسرتِ دل کے مطابق ذوق معاصی بھی ہونا تھا۔ بیدل کے نزدیک اس کی بے برگیِ عصیاں اسے شرمندہ کر رہی ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کے مصرعہ ''بقدرِ حسرتِ دل چاہئے ذوق معاصی بھی'' میں بیدل کے مصرعہ ''میکند آب از حیا بے برگیِ عصیاں مرا'' کے خیال کا عکس موجود ہے۔

اگر وہ سرو قد گرمِ خرام ناز آجائے
کفِ ہر خاک گلشن شکل قمری نالہ فرسا ہو
غالبؔ

بااین قد و عارض بچمن گر بخرامی
گل تاج بخاک افگند و سرو علم را
بیدلؔ

غالب کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ سرو قد معشوق باغ میں آ کر گرم خرام ناز ہو جائے تو اس کی تاثیر سے گلشن میں ہر کف خاک قمری کی طرح اس پر عاشق ہو کر نالہ وفریاد کرنے لگے۔ بیدل

کہتے ہیں اے محبوب اس حسین قد و رخسار کے ساتھ اگر تو چمن میں گرم خرام ہو تو پھول اپنا تاج اور سرو اپنا علم زمین پر رکھ دے۔ سرو قد معشوق کا باغ میں گرم خرام ہونا غالب اور بیدل دونوں کا موضوع ہے۔ غالب کے نزدیک اس کی تاثیر سے ہر کف خاک قمری کی طرح اس پر عاشق ہو کر نالہ کرنے لگے۔ جبکہ بیدل کے نزدیک پھول اپنا تاج اور سرو اپنا علم زمین پر رکھ دیتا ہے۔ یہاں غالب کے کلام میں بیدل کے کلام کا اثر پوری طرح نمایاں ہے بلکہ غور سے دیکھا جائے تو غالب کا مصرعہ ''اگر وہ سروِ قد گرمِ خرام ناز آ جائے'' بیدل کے مصرعہ ''بااین قد و عارض بچمن گر بخرامی'' کا منظوم ترجمہ معلوم ہو گا دوسرے مصرعہ میں البتہ دونوں الگ ہو گئے۔ لیکن بیدل کا یہ خیال کہ اسے دیکھ کر پھول اپنا تاج اور سرو اپنا علم زمین پر رکھ دے۔ غالب کے اس خیال سے کہ ہر کفِ خاک اس پر عاشق ہو کر نالہ کرے۔ زیادہ دلکش اور دلآویز ہے۔

طاعت میں تا رہے نہ مئے وانگبیں کی لاگ	کو طاعتی کہ مارا تا کوئے او رساند
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو	تسبیح تا زبان است زنار تا بگردن
غالبؔ	بیدلؔ

حالی لکھتے ہیں جب تک بہشت قائم ہے لوگ عبادت اس امید پر کرتے ہیں کہ وہاں شہد اور شراب طہور وغیرہ ملے گی۔ بس بہشت کو دوزخ میں جھونک دینا چاہئے تاکہ یہ لالچ باقی نہ رہے اور لوگ خالصتاً لوجہ اللہ عبادت کیا کریں۔ (۱۴۰) بیدل کہتے ہیں کہ ہم عبادت ضرور کرتے ہیں پر وہ ایسی کہاں ہے کہ محبوب کے کوچے تک پہنچا دے۔ کیونکہ تسبیح صرف زبان تک ہے، اور جنیو صرف گردن تک۔ بیدل کا مطلب بھی یہی ہے کہ عبادت تو اصل میں وہ ہے جو حضور قلب اور خلوص کے ساتھ ہو چنانچہ چند اشعار میں اس کی طرف اشارہ کرتا ہے:

از سجدۂ حضوری بوئے اثر نہ بردیم
امید دستہا سود از جبہہ سائیِ ما

حضور قلب کے ساتھ سجدہ کرنے کی بو تک ہمیں نہیں لگی۔ ہماری جبہہ سائی سے امید نے ہاتھ گھس لئے:

زاہد کجا و طاعت یزدانش از کجا
از وضع سجدہ شیوۂ خاصش ارادہ است

بھلا زاہد کو خدا کی عبادت سے کیا تعلق اس کے سجدے کے انداز سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی کچھ اور ہی نیت ہے۔ غالب اور بیدل دونوں نے پرخلوص عبادت کو موضوع بنایا ہے۔ عبادت اگر بہشت اوراس کے آرام کے لالچ میں کوئی کرتا ہے تو غالب اور بیدل دونوں کے نزدیک وہ عبادت نہیں ہے۔ غالب کے نزدیک ایسی صورت میں بہشت کو دوزخ میں جھونک دیا جائے تا کہ عبادت میں غرض کی آمیزش ہی نہ رہے۔ بیدل کے نزدیک بہشت پھر ایک ایسی جگہ ہو جاتی ہے جہاں انسان کا دل عشق الٰہی میں نہیں تپتا اور جہاں دل میں تپش عشق نہ ہو وہ کوئی رہنے کی جگہ ہے۔

گویند بہشت است ہمہ راحت جاوید
جائیکہ بداغی نطپد دل چہ مقام است

☆

وصف جنت شنیدہ عبرت گیر
ہر جا زر و گوہریست جز دنیا نیست

جنت کی تعریف تم نے سنی عبرت حاصل کرو۔ جہاں زر و جواہرات ہوں وہ دنیا کے سوا کوئی جگہ نہیں ہے۔ ان دونوں کی ایک بات تو صحیح ہے کہ عبادت میں خلوص اور حضور دل ہونا چاہئے۔ کیونکہ قرآن و حدیث دونوں اس نکتے پر زور دیتے ہیں لیکن دوسری بات کہ اگر خلوص نہیں ہے تو جنت کو دوزخ میں جھونک دیا جائے یا جنت نا قابل رہائش مقام ہے یا وہ بھی دنیا ہی کا ایک روپ ہے، غلط ہے۔ سعدی نے کیا معقول بات کہی ہے:

گر نبیند بروز شپرہ چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

دن کی روشنی میں اگر چمگادڑ کو نظر نہیں آتا تو اس میں آفتاب کی ٹکیہ کا کیا قصور ہے۔ اسی طرح اگر آدمی نے پرخلوص عبادت نہیں کی تو اس میں جنت کا کیا قصور ہے کہ اس کو دوزخ میں جھونک دیا جائے۔

مجو بیدل علاج سرنوشت از گریۂ حسرت
بموجِ بادہ دشوار است شستن خط ساغر ہا
بیدلؔ

ہوں منحرف نہ کیوں رسم و رہِ ثواب سے
ٹیڑھا لگا ہے قط، قلم سرنوشت کا
غالبؔ

غالب کہتے ہیں کہ انسان فطری طور پر مجبور ہے۔ نیکی اور پارسائی کی راہ سے میں اس لئے ہٹا ہوا ہوں کہ میری تقدیر میں اس سے انحراف کرنا لکھا ہوا ہے اور نوشتہ تقدیر کو کوئی بدل نہیں سکتا۔ بیدل کہتے ہیں سرنوشت یعنی تقدیر کے لکھے کا علاج گریہ حسرت سے مت تلاش کرو، ساغر کی لکیر کو موج بادہ سے دھونا بہت مشکل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تقدیر کے لکھے کو مٹایا نہیں جا سکتا۔ بیدل اور غالب دونوں نے اس کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک ثواب کی راہ و رسم سے ہم اس لئے منحرف ہیں کہ ہماری سرنوشت کے قلم کا قط ٹیڑھا لگا تھا۔ یعنی ہماری قسمت میں انحراف لکھا تھا۔ بیدل کے نزدیک جس طرح خط ساغر کو موج بادہ سے دھونا ممکن نہیں اسی طرح تقدیر کے لکھے کو کوشش کر کے مٹانا ممکن نہیں۔ چنانچہ دوسری جگہ کہتا ہے کہ:

ہمہ مجبور حکم تقدیریم
کرد و ناکرد اختیاری نیست

سب لوگ حکم تقدیر کے آگے مجبور و بے بس ہیں۔ ہمارا کوئی فعل اختیاری نہیں ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب اور بیدل دونوں جبریہ فرقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یعنی یہ کہ انسان مجبور محض ہے۔ جو اچھا یا برا کام اس سے سرزد ہوتا ہے اس میں اس کے اختیار کا قطعاً دخل نہیں ہے۔ ایسی صورت میں پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نیک کام پر خدا ثواب کیوں دے اور برے کام پر عذاب کیوں؟ اس لئے اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ خدا نے انسان کو اینٹ پتھر کی طرح مجبور نہیں پیدا کیا ہے۔ بلکہ یک گونہ اختیار اور یک گونہ اجبار دیا ہے۔ ہدایت و گمراہی دونوں کے راستے بتا دیے ہیں (وھدینہ النجدین) اب اگر حسن اختیار سے وہ اچھی راہ اختیار کرتا ہے تو اس راستے پر چلنا اس کا آسان کر دیتا ہے اور سوء اختیار سے اگر بری راہ اختیار کرتا ہے تو اس پر چلنا اسے آسان کر دیتا ہے۔ قرآن کی بہت سی آیتیں اس بات کی تصدیق کرتی ہیں۔ فاما من اعطیٰ واتقیٰ وصدق بالحسنیٰ فسنیسرہ للیسریٰ واما من بخل واستغنیٰ و کذب بالحسنیٰ

فسنیسرہ للعسریٰ (واللیل ۔۵)۔انا ھدیناہ السبیل اما شاکرو واما کفورا۔(سورہ انسان ۔ ۳)

اس لئے واضح ہے کہ دونوں بڑے شاعر اس مسلک سے ہٹے ہوئے ہیں۔

محبت پیشہ ای بگداز و خوں شو	پیدا ہوئی ہے کہتے ہیں ہر درد کی دوا
کہ درد عشق درمانی ندارد	یوں ہو تو چارۂ غم الفت ہی کیوں نہ ہو
بیدلؔ	غالبؔ

غالب کہتے ہیں جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ دنیا میں ہر درد کی دوا پیدا ہوئی ہے یہ غلط ہے، اگر ایسا ہوتا تو غم الفت کا بھی کوئی علاج ہوتا۔ بیدل کہتے ہیں تم نے عشق و محبت کو اپنا پیشہ بنایا ہے تو اس کی آگ میں جلو، پگھلو اور خون کے آنسو روؤ، کیونکہ درد عشق کا کوئی علاج نہیں ہے۔ غالب اور بیدل دونوں نے چارۂ غم الفت کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کا خیال ہے کہ یہ جو مشہور ہے کہ ہر درد کی دوا ہوتی ہے تو غم الفت کی دوا بھی ہوتی تو ہم سمجھتے کہ یہ کہاوت صحیح ہے۔ بیدل کہتے ہیں درد عشق کی کوئی دوا ہے ہی نہیں، یہاں تو بس اس کی آگ میں جلنا اور پگھلنا ہی ہے لیکن ایک دوسرے شعر میں بیدل اس مضمون کو دوسرے انداز سے ادا کرتا ہے:

دل اگر محو مدعا گردد
درد درکامِ ما دوا گردد

آدمی کا دل اگر اپنے مقصد میں محو اور منہمک ہو جائے تو درد دوا کا روپ دھار لیتا ہے۔ یعنی عشق میں اگر اسے کمال حاصل ہو تو وہی اس کے درد کی دوا ہو جاتی ہے۔

کثرت نہ شد محو از ساز وحدت	ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال
ہمچوں خیالات از شخصِ تنہا	ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو
بیدلؔ	غالبؔ

غالب نے نفسیات کا ایک اہم نکتہ بیان کیا ہے کہ انسان اگر خلوت یعنی تنہائی میں بیٹھا ہو تو بھی تنہا نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس کے دماغ میں افکار و خیالات کی ایک دنیا آباد ہے اور اس دنیا میں

ہر وقت قیامت کا سا ایک ہنگامہ برپا رہتا ہے۔ غالب نے افکار کے ہنگاموں کو محشر خیال سے تعبیر کر کے شعر میں بڑی دلکشی پیدا کر دی ہے۔ بیدل کہتے ہیں ساز وحدت کی وجہ سے کثرت ناپید نہیں ہو جاتی ہے۔ جیسے آدمی گو یکہ و تنہا ہوتا ہے پر اس کے افکار و خیالات بہت وسیع ہوتے ہیں۔ غالب اور بیدل دونوں نے انسان کے محشر خیال ہونے کو موضوع بنایا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کا پورا شعر بیدل کے پورے شعر کا منظوم ترجمہ ہے۔ اس نے کثرت اور وحدت کی جگہ انجمن اور خلوت کے الفاظ استعمال کیے اور ''ہمچو خیالات یک شخص تنہا'' کی جگہ ''ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال'' کی ترکیب استعمال کی۔ بیدل نے ایک شعر میں خود اپنی اسی کیفیت کا اظہار کیا ہے:

بیدل نفسم کار گہِ حشر معانیست
چوں غلغلہ صور قیامت کلماتم

میری سانس حشر معانی کا ایک پورا کارخانہ ہے۔ میرے الفاظ صور قیامت کے شور کی طرح ہیں۔ یہاں بیدل نے خود اپنی سانس کو محشر خیال قرار دیا ہے۔

وارستگی بہانۂ بیگانگی نہیں	آزادگی کز دست مباہات عافیت
اپنے سے کر نہ غیر سے وحشت ہی کیوں نہ ہو	دل را ز حکم حرص و ہوس وا خریدن است
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کا مطلب یہ ہے کہ وارستگی و آزادہ روی اس بات کا نام نہیں ہے کہ انسان دوسرے سے بے تعلقی اختیار کر لے۔ آزاد آدمی وہ ہے جو خود آپ یعنی نفس امارہ سے وحشت اور رمیدگی کا اظہار کرے۔ بیدل کہتے ہیں جس آزادگی یا آزادہ روی کی وجہ سے عافیت کو خود پر فخر ہے وہ حقیقت میں حرص و ہوس سے دل کو آزاد کرنے کا نام ہے۔ غالب اور بیدل دونوں نے وارستگی اور آزادی کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک وارستگی یہ نہیں ہے کہ انسان دوسروں سے بے تعلق ہو جائے۔ بلکہ اپنے نفس امارہ سے بے تعلقی حاصل کرے۔ بیدل کے نزدیک بھی آزادمنشی اور وارستگی کا یہی مفہوم ہے۔ بلکہ اس نے اور واضح کر کے بتا دیا کہ حرص و ہوس سے دل کو آزاد رکھنا

اصل وارستگی ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کے اس شعر میں بیدل کے شعر کا پورا عکس موجود ہے۔ بیدل نے وارستگی کا مفہوم دوسری جگہ اگرچہ غیروں سے بے تعلقی کو بتایا ہے جیسے:

عبرت آبادست اینجا عافیت وا رستگی است
ہر کہ دل باایں و آں بندد الم خواہد کشید

بسکہ ما آزاد گاں را از تعلق وحشت است
عکس ما چوں آب داند قعرِ چاہ آئینہ را

دل وارستہ با کون و مکاں الفت نمیگیر د
کہ ہست ایں مصرع از برجستگی بیرونِ دیوانہا

مگر اس موضوع پر اس کے سارے اشعار کو ملا کر پڑھے تو اس کا مقصد وہی نکلے گا جو پہلے لکھا گیا ہے۔

مٹتا ہے فوت فرصت ہستی کا غم کہیں	فرصت از دست رفت و دل کاری نکرد افسوس عمر
عمر عزیز صرف عبادت ہی کیوں نہ ہو	کارواں بگذشت و من در خواب غفلت، وائے من
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں خواہ ہم اپنی عمر عزیز عبادت ہی میں کیوں نہ گزار دیں پھر بھی ہم کو مرتے وقت یہ رنج یا افسوس ضرور ہوتا ہے کہ ہم نے اپنی فرصت ہستی یعنی عمر کو ضایع کر دیا۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ اگر ہم چاہتے تو اس کو اس سے بھی بہتر کاموں یعنی عاشقی یا خدمت خلق میں صرف کر سکتے تھے۔ بیدل کہتے ہیں افسوس کہ فرصت ہاتھ سے جاتی رہی اور دل نے اپنی ذمہ داری نہیں نبھائی، قافلہ نکل گیا اور میں خواب غفلت میں پڑا سوتا رہا۔ غالب اور بیدل دونوں نے فرصت ہستی کی فوت کا غم منایا ہے۔ غالب کے نزدیک جس نے اپنی عمر عبادت میں گزاری اسے بھی یہ غم لاحق ہوتا ہے۔ جبکہ بیدل کے نزدیک جس نے مقصد حیات کو پورا کرنے کی کوشش نہیں کی اسے یہ غم لاحق ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک شعر میں واضح طور پر کہتا ہے:

حیف اوقاتیکہ صرف کوشش بیجا شود
شیشۂ عمری چہ برجاں کندن فرہاد داشت

افسوس ہے ان اوقات پر جو بیجا کوششوں میں صرف ہو گئے۔ یعنی بے مقصد لغو اور لایعنی مصروفیات میں گذرنے والے اوقات پر اسے افسوس ہے۔ غالب نے عبادت میں گذری ہوئی زندگی پر بھی فرصت ہستی کی فوت کا غم منایا ہے۔ جو شرعی نقطہ نظر سے غلط ہے۔ قرآن کہتا ہے خدا کی عبادت موت تک کرتے رہو (واعبد ربك حتیٰ یاتیك الیقین) جب تک موت نہ آ جائے۔ اس کا مطلب ہے کہ جو زندگی عبادت میں گذری اس نے فرصت ہستی کا پورا فائدہ اٹھایا۔

شہادت تھی مری قسمت میں جو دی تھی یہ خو مجھ کو
جہاں تلوار کو دیکھا جھکا دیتا تھا گردن کو
غالبؔ

منِ بیدل نبودم اینقدر پروانۂ جرأت
دمِ تیغ تو دیدم ذوق کشتن کرد سیمابم
بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ میری قسمت میں چونکہ شہادت لکھی ہوئی تھی اس لئے کارکنان قضا وقدر نے میرے اندر یہ عادت پیدا کر دی تھی کہ جہاں تلوار دیکھتا تھا سرِ تسلیم خم کر دیتا تھا۔ بیدل کہتے ہیں میرے اندر اتنی جرأت تو نہ تھی کہ معشوق سے کہتا مجھے شہید کر دو، مگر اس کی تلوار آبدار کے دم خوشگوار کو دیکھا تو اس کے ہاتھوں شہید ہونے کی خواہش نے سیماب کی طرح مجھے بے قرار کر دیا۔ معشوق کے ہاتھوں شہادت کا شوق غالب اور بیدل دونوں کا موضوع ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کا شعر بیدل کے شعر کا معمولی سی تبدیلی کے ساتھ آزاد منظوم ترجمہ ہے۔ خصوصاً غالب کا دوسرا مصرعہ ''جہاں تلوار کو دیکھا جھکا دیتا تھا گردن کو'' بیدل کے دوسرے مصرعہ ''دمِ تیغ تو دیدم ذوق کشتن کرد سیمابم'' کا ادھورا ترجمہ ہے۔

سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ جویا ہوں جواہر کے
جگر کیا ہم نہیں رکھتے جو کھودیں جا کے معدن کو
غالبؔ

بسخن قانعم از نعمت الوا بیدل
رزق خود چوں صدف از گوش گرفتن دارد
بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کیا ہم شعر نہیں کہہ سکتے جو ہیرے جواہرات کی تلاش میں نکلیں، کیا ہمارے پاس جگر نہیں ہے جو معدن کو کھودیں۔ بیدل کہتے ہیں انواع واقسام کی نعمتوں میں سے

صرف شاعری پر میں نے قناعت کر لی ہے۔ سیپ کی طرح اپنی روزی اپنے کان سے حاصل کرتا ہوں۔ غالب اور بیدل دونوں نے سخن یعنی شاعری سے اپنی والہانہ وابستگی کا اظہار کیا ہے اور دنیا کے تمام ہیرے جواہر کے مقابلے پر شاعری کو اپنی توجہ کا مرکز قرار دیا۔

ہے جوش گل بہار میں یاں تک کہ ہر طرف	امروز نو بہار است ساغر کشاں بیائید
اڑتے ہوئے الجھتے ہیں مرغِ چمن کے پاؤں	گل جوش بادہ دارد تا گلستاں بیائید
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں بہار میں پھولوں کی اس قدر کثرت یا اس کا جوبن ہے کہ جب بلبل چمن میں ایک شاخ سے دوسری شاخ پر اڑ کر جاتی ہے تو اس کے پاؤں پھولوں میں الجھ جاتے ہیں ۔ بیدل کہتے ہیں آج موسم بہار کی تازہ نکھار ہے اور پھولوں میں شراب کا سا ابال یا جوبن ہے اس لئے اے میکشو باغ میں آ کر اس کا لطف لو۔ غالب اور بیدل دونوں نے موسم بہار میں پھولوں کی شگفتگی کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک اس کی وجہ سے بلبل کے پاؤں اڑتے ہوئے الجھتے ہیں۔ جبکہ بیدل کے نزدیک یہ موقع ہوتا ہے مے کشوں کو باغ میں دعوت دینے کا۔ بیدل نے ایک دوسرے شعر میں بلبل کی ایک دوسری کیفیت کا ذکر کیا ہے۔

جلوۂ گل گر چنیں طاقت گدازیہا کند
بعد ازیں خاکستری یابی بجائے عندلیب

پھول کے جلوے نے اگر اسی انداز سے طاقت گدازی کا کام کیا تو اس کے بعد باغ میں بلبل کے وجود کی جگہ راکھ کا ڈھیر نظر آئے گا۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کے شعر میں بیدل کے دونوں اشعار کا عکس نظر آئے گا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ غالب کے نزدیک بلبل کے پاؤں الجھتے ہیں اور بیدل کے نزدیک بلبل کا وجود خاک میں مل جاتا ہے۔

غالب مرے کلام میں کیونکر مزا نہ ہو	بیدل چقدر شور کلامت مزہ دارد
پیتا ہوں دھو کے خسروِ شیریں سخن کے پاؤں	کز یاد تو باید لب اندیشہ مکیدن
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں چونکہ میں خسروِ شیریں سخن یعنی بہادر شاہ ظفر کے پاؤں دھو کر پیتا ہوں یعنی ان سے عقیدت رکھتا ہوں اس لئے میرے کلام میں بھی لطف پیدا ہو گیا ہے۔ غالب کا ایک فارسی شعر اس مضمون کا ملاحظہ ہو:

باز چسپیدہ لب از جوش حلاوت باہم
مرگ مشکل کہ زما لذت گفتار برد

بیدل کہتے ہیں تیرے کلام میں اسی قدر ملاحت اور نمکینی کا لطف اور مزہ ہے کہ لبِ اندیشہ کو تیری یاد میں چوستے رہنا چاہئے۔ غالب کے مربی بہادر شاہ ظفر تھے۔ بیدل کے مربی نواب شکر اللہ خاں تھے۔ جن کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی سے بیدل نے شاعری میں کمال حاصل کیا۔ چنانچہ اس کا ذکر کرتے ہوئے بیدل کہتے ہیں:

عمری بفنون نظم مائل گشتم
چندی با نثر نیز شاغل گشتم
دیدم کرمِ تو سخت بے پایانست
عاری ماندم ز شکر و بیدل گشتم

ایک مدت تک میں نے مختلف اصناف کلام میں طبع آزمائی کی کچھ دنوں نثر نگاری بھی کی جب دیکھا کہ اے نواب تیرے کرم اور عنایت کی کوئی حد نہیں ہے تو شکر گذاری سے عاجز ہو کر بیدل ہو گیا۔

ضعف سے نقشِ پئے مور ہے طوق گردن
تیرے کوچے سے کہاں طاقتِ رم ہے ہم کو
غالب

نازم بدستگاہِ ضعیفی کہ چوں خیال
در عالمی کہ اوست منِ زار می رسم
بیدل

غالب کہتے ہیں چونکہ میں اس قدر ضعیف ہوں کہ چیونٹی کے پاؤں کا نشان بھی میرے حق میں طوق گردن یعنی وزنی شئے کا حکم رکھتا ہے۔ اس لئے تیرے کوچے سے بھاگ کر کہاں جا سکتا ہوں۔ بیدل کہتے ہیں اپنے ضعف و ناتوانی پر مجھے فخر ہے کہ جہاں بھی وہ محبوب ہوتا ہے عالم خیال کی طرح میں زار و نزار وہاں پہنچ جاتا ہوں۔ بیدل و غالب دونوں نے ضعف کے باوجود

محبوب کے کوچے میں اپنی موجودگی کا ذکر کیا ہے۔اس فرق کے ساتھ کہ غالب کے نزدیک ضعف وناتوانی کی وجہ سے محبوب کے کوچے سے بھاگ کر کہیں جانے کی سکت ہی نہیں ہے۔جبکہ بیدل کے نزدیک ضعف ولاغری کے باوجود وہ عالمِ خیال کی طرح محبوب کے کوچے میں پہنچ جاتا ہے۔

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف، سب درست	گویند بہشت است ہمہ راحتِ جاوید
لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو	جائیکہ بداغی نطپد دل چہ مقام است
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں اہل مذہب جنت کی ستائش میں کہتے ہیں کہ وہاں باغ ہوں گے نہریں ہوں گی، انواع واقسام کی ماکولات ومشربات ہوں گی، حوریں ہوں گی وغیرہ شاعر کہتا ہے کہ یہ لوگ جنت کی جتنی تعریف وتوصیف کرتے ہیں میں اس کو صحیح تسلیم کرتا ہوں لیکن خدا کرے کہ وہاں تو بھی ہو، کیونکہ وہاں اگر تیرا جلوہ نظر نہ آیا تو سب ہیچ ہے۔بیدل کہتے ہیں مشہور ہے کہ بہشت میں ہر طرح کا دائمی آرام نصیب ہوگی، مگر جہاں انسان کا دل داغ عشق الٰہی میں نہ تپے، وہ کوئی رہنے کی جگہ ہے۔غالب کے نزدیک بہشت کی ساری تعریف درست ہے شرط یہ ہے کہ وہاں تیرا جلوہ نظر آئے۔دونوں کے بیان میں تھوڑا سا فرق ہے۔عشق میں دل جب ہی تپے گا جب وہاں محبوب کا جلوہ نظر آئے۔چنانچہ بیدل نے دوسری جگہ اس کا تذکرہ اس طرح کیا ہے:

جلوہ مشتاقم ، بہشت و دوزخم منظور نیست
می روم از خویش در ہرجا کہ می خوانی مرا

میں تو تیرے جلوے کا مشتاق ہوں مجھے دوزخ وبہشت سے کیا مطلب جہاں تو بلائے گا مستانہ وار وہاں چلا جاؤں گا۔غالباً ان دونوں حضرات کو یہ معلوم نہیں یا دانستہ جہالت سے کام لے رہے ہیں کہ جنت میں جو سب سے بڑی چیز حاصل ہوگی وہ خدا کی خوشنودی اور اس کا دیدار ہوگا۔(ورضوان من الله اکبر) دونوں شعر کو ملانے سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کے شعر پر بیدل کے ان دونوں اشعار کا اثر ہے۔

تم ہی کہو کہ گذار صنم پرستوں کا	نشانِ مردمی بیدل چہ جوئی از سیہ چشماں
بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خوتو کیوں کر ہو	وفا کن پیشہ و زیں قوم آئینِ جفا بنگر
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ دنیا کے تمام معشوقوں کا طرزِ عمل اگر تمہاری ہی طرح ظالمانہ وجابرانہ ہو جائے تو خود انصاف کرو کہ عاشقوں کی زندگی پھر کیسے بسر ہوگی یعنی عاشقی کا سلسلہ ختم ہو جائے گا۔ بیدل کہتے ہیں سیاہ چشم محبوبوں سے انسانیت اور ہمدردی کی توقع ہی کیوں رکھتے ہو تم کو تو ان سے وفاداری نبھانی ہے اور ان کی طرف مشق ستم ہونے کی توقع رکھنی ہے، تم کو اسی انداز سے گذارا کرنا ہوگا۔ غالب اور بیدل دونوں نے محبوب کی سنگ دلی کا تذکرہ کیا ہے اس فرق کے ساتھ کہ غالب کے نزدیک محبوب کی سنگ دلی اور جفا کاری کی یہی عادت رہی تو عاشقوں کی زندگی گذرنی مشکل ہو جائے گی۔ جبکہ بیدل کے نزدیک اسی انداز سے گذرے گی کہ وہ ظلم کرتے رہیں اور ہم اسے سہتے رہیں۔

الجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ	نیست با حسنت مجالِ گفتگو آئینہ را
جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیوں کر ہو	سرمہ می ریزد نگاہت در گلو آئینہ را
غالبؔ	بیدلؔ

حالی لکھتے ہیں کہ اس کا مطلب ایک تو یہ ہے کہ تم جیسے نازک مزاج شہر میں ایک دو اور ہوں تو شہر کا کیا حال ہوگا۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ جب تم کو اپنے عکس کا بھی اپنی مانند ہونا گوارا نہیں تو شہر میں اگر فی الواقع تم جیسے ایک دو حسین اور موجود ہوں تو کیا قیامت برپا کرو (۱۴۱)۔ بیدل کہتے ہیں آئینہ میں اتنی جرأت نہیں کہ تیرے حسن سے ہم کلام ہو، اور آنکھ سے آنکھ ملائے۔ تیری نگاہ اس کے گلے میں سرمہ انڈیل دیتی ہے۔ جب کسی کے گلے میں سرمہ ڈال دیا جائے تو اس کی گویائی بند ہو جاتی ہے۔ غالب کے نزدیک محبوب آئینہ سے الجھ رہا ہے کہ اپنے عکس کا بھی اپنے مانند ہونا اسے گوارا نہیں ہے۔ بیدل کے نزدیک آئینے میں اتنی صلاحیت ہی نہیں ہے کہ محبوب کے حسن سے الجھے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں غالب نے یہاں بیدل سے اختلاف کیا ہے۔

بیدل از کیفیتِ شوق گرفتاری دل مپرس	دل کو میں اور مجھے دل محو وفا رکھتا ہے
نالہ زنجیر ہرجا گل کند دیوانہ ام	کس قدر ذوق گرفتاریِ ہم ہے ہم کو
بیدلؔ	غالبؔ

غالب کہتے ہیں کہ ہم جانتے ہیں کہ ظالم معشوق سے وفا کا نتیجہ رنج وغم کے سوا کچھ نہیں ہے پھر بھی رنج وغم میں مبتلا رہنے میں اس قدر لذت محسوس ہوتی ہے کہ میں ہمیشہ دل کو ترغیب وفا دیتا رہتا ہوں اور دل مجھے راہِ وفا میں ثابت قدم رہنے کی تلقین کرتا رہتا ہے۔ بیدل کہتے ہیں شوق گرفتاری دل کی کیا کیفیت ہے مجھ سے نہ پوچھو، جہاں کہیں زنجیر کا نالہ بلند ہوتا ہے میں دیوانہ ہو جاتا ہوں۔ غالب اور بیدل دونوں نے شوق وذوق گرفتاری کا تذکرہ کیا ہے اس فرق کے ساتھ کہ غالب یہ جاننے کے باوجود کہ ستم پیشہ معشوق سے وفاداری کا نتیجہ غم کے سوا کچھ نہیں ہے مبتلائے غم رہنے میں لذت محسوس کرتا ہے۔ جبکہ بیدل کے شوق گرفتاری دل کی کیفیت اور لذت کا یہ عالم ہے کہ زنجیر کے بجنے کے آواز کے ساتھ وہ دیوانہ ہو اٹھتا ہے۔ (زنجیر اور دیوانے کا تلازمہ ہے)۔

نہ مرا بضاعت طاقتی نہ ترا دماغ مروتی	وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں
ز نیاز پنبہ در آستیں چہ برم بسنگ شرر بکف	سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو
بیدلؔ	غالبؔ

غالب کہتے ہیں کہ ہمیں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ اپنی بے رخی کی عادت کبھی نہیں چھوڑیں گے تو پھر ہم اپنی خودداری کی روش کیوں چھوڑ دیں۔ اس لئے ان سے بے رخی کی وجہ دریافت کر کے اپنے آپ کو ذلیل نہیں کریں گے۔ بیدل کہتے ہیں نہ تو میرے اندر تیرے ظلم کو سہنے کی سکت ہے اور نہ تیرے اندر انسانی ہمدردی کی صفت ہے۔ آستین میں روئی بھر کر شرر بکف پتھر کے پاس کس نیازمندی کے ساتھ جاؤں، معلوم ہے کہ روئی جب چنگاری کے مقابلے پر آئے گی تو جل کر خاک ہو جائے گی۔ غالب اور بیدل دونوں نے عاشق ومعشوق کی خو اور وضع کا تذکرہ کیا ہے۔ غالب کے نزدیک معشوق اپنی خوئے ستم رانی یا بے رخی ترک نہیں کریں گے تو عاشق بھی اپنی وضع خودداری ترک نہیں کرے گا۔ بیدل کے نزدیک دونوں اپنی اپنی خو اور وضع ستم رانی وستم کشی پر قائم رہیں گے۔

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو
غالبؔ

محبت بسکہ پر کرد از وفا جان و تنِ مارا
کند یوسف صدا گر بو کنی پیراہن مارا
بیدلؔ

غالب کے شعر کا مطلب واضح ہے کہتے ہیں کہ ہم نے وفا کی لیکن تو نے جفا کی، ہم نے تجھ سے محبت کی تو نے ہم سے نفرت کی۔ تیری بے اعتنائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم نے سر پھوڑ کر مر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اچھا تو جب سر پھوڑنا ہی ٹھہرا تو پھر ہم پاس وفا یا پاس عشق کیوں کریں یعنی تیرے ہی سنگ آستاں سے اپنا سر کیوں پھوڑیں۔ دنیا میں پتھروں کی کوئی کمی نہیں جہاں دل چاہے گا سر پھوڑ لیں گے۔ بیدل کا مطلب یہ ہے کہ ایک عاشق صادق کی حیثیت سے عشق نے وفاداری کو میرے جسم و جان میں پوری طرح پیوست کر دیا ہے۔ معشوق چاہے جتنا ستم ڈھائے میں اس کو سہتا ہی رہوں گا اور شکوہ نہیں کروں گا۔ یہاں غالب نے بیدل سے اختلاف کیا کہ ہم نے وفا کی تو تو نے جفا کی ہم نے محبت کی تو تو نے نفرت کی اس لئے میں نے کسی اور آشیانے پر سر پھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے، جبکہ بیدل نے اپنے متعدد اشعار میں عاشق کی وفاداری اور معشوق کی ستم رانی کو کشور حسن کا ایک قانون اور اصول بتایا ہے۔ ع:

وفا کن پیشہ و زیں قوم آئین جفا بنگر

ہجوم جلوہ بیاراست ذرہ تا خورشید
بجیرتم منِ بیدل دل ازکہ برگیرم
بیدلؔ

از مہر تا بہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ
طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ
غالبؔ

غالب کا مطلب یہ ہے کہ آفتاب سے لے کر ذرہ تک ہر شے دل کے درجے میں ہے اور دل آئینے کے درجے میں ہے جس میں ذات حق سبحانہ تعالیٰ جلوہ گر ہے اس لئے طوطی یعنی عارف کو ہر شے میں وہی نظر آتا ہے یعنی ساری کائنات ذات وصفات حق کا پرتو ہے۔ بیدل کہتے ہیں کہ سورج سے لے کر ذرے تک پوری فضا جلوہ محبوب سے آراستہ و پیراستہ ہے ایسے میں کن کن چیزوں سے میں اپنی توجہ ہٹاؤں۔ غالب اور بیدل دونوں نے آفتاب سے لے کر ذرے تک ساری کائنات کو محبوب کی جلوہ گاہ اور اس کا مظہر قرار دیا ہے البتہ غالب نے سب کو دل قرار دے کر

اسے آئینہ بنایا پھر اس آئینہ میں ذات حق جلوہ گر ہے۔ تعبیر کا فرق ہے ورنہ مضمون ایک ہی ہے۔ بیدل نے اس خیال کو دوسری جگہ اس طرح ادا کیا:

ذرات جہاں چشمۂ انوار تجلی است
ہر سنگ کہ آید بنظر طور بہ بینید

دنیا کے سارے ذرات چشمۂ انوار تجلی الٰہی ہیں جو پتھر بھی تمہیں نظر آئے اسے طور ہی تصور کرو۔ صاف ظاہر ہے کہ اس شعر میں بیدل کے خیال کا ارتعاش موجود ہے۔

ہے سبزہ زار ہر در و دیوار غم کدہ	در خزان سیر بہارم زیں گلستاں کم نشد
جس کی بہار یہ ہو پھر اس کی خزاں نہ پوچھ	رنگہا پرواز کرد و حیرتم گلباز ماند
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں میرا گھر عشق کے ہاتھوں برباد ہو گیا۔ دیواریں گر گئیں، چھتیں بیٹھ گئیں، ملبہ پر سبزہ اُگ آیا، گویا گھر میں بہار آئی ہوئی ہے شاعر اس سبزے کو دیکھ کر طنزاً یہ کہتا ہے کہ جس گھر کی بہار میں تباہی و بربادی کا یہ عالم ہے تو جب اس پر خزاں آئے گی تو اس کی بربادی کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔ بیدل کہتے ہیں کہ خزاں کے موسم میں بھی اس باغ کے اندر موسم بہار کی سیر میں کمی نہیں آئی۔ رنگ اگر اڑ گیا تو میری حیرت نے گل بازی شروع کر دی۔ غالب اور بیدل دونوں نے خزاں اور بہار کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک جس کے گھر میں بہار میں تباہی کا یہ عالم ہو خزاں میں اس کا کیا حال ہوگا۔ بیدل کے نزدیک خزاں میں بھی وہ سیر بہار کا لطف اٹھاتا ہے۔ کیونکہ خزاں میں اگر چہ پھولوں کا رنگ اڑ گیا اور اس کی تر و تازگی جاتی رہی پر حیرت نے گل بازی یعنی پھول لگانا یا اس سے کھیلنا شروع کر دیا۔ اس مضمون کو بیدل نے دوسرے انداز سے بھی بیان کیا ہے۔

ہر گہ مژہ برہم زند ایں باغ خزانست
تا فرصتِ نظارہ بہارست بہ بینید

جب پلک درہم برہم ہو جائے تو یہ باغ خزاں میں بدل جاتا ہے اس لئے جب تک نظارہ یعنی دیکھنے کی فرصت حاصل ہے بہار موجود ہے اسے دیکھتے رہو۔

ہے سنگ پر برات معاش جنون عشق	سنگ ہم در کفِ اطفال نگیرد آرام
یعنی ہنوز منتِ طفلاں اٹھایئے	دور مجنوں چہ قدر ست نسق می باشد
غالب	بیدل

غالب کہتے ہیں کہ عاشقوں کی روزی چونکہ پتھروں پر موقوف ہے یعنی بچے اسے پتھر ماریں اور وہ انہیں سہیں اس لئے ہمیں کاروبارِ عاشقی میں لڑکوں کا احسان مند ہونا چاہئے یعنی اگر چہ ہماری آرزو تو یہ تھی کہ احسان نہ اٹھائیں لیکن یہاں احسان اٹھانا ہی بہتر ہے۔ بیدل کہتے ہیں پتھر کا بھی عجیب حال ہے کہ اگر وہ بچوں کے ہاتھ لگ جائے تو جب تک اس کو وہ کہیں مار نہ لیں سکون نہیں ملتا۔ خصوصاً مجنوں پر مگر مجنوں ایسے ست نسق واقع ہوئے ہیں کہ وہ پتھر کا جواب پتھر سے نہیں دے سکتے۔ یہاں غالب اور بیدل دونوں نے بچوں کے ہاتھ سے مجنوں کو پتھر مارنے کا ذکر کیا ہے۔ غالب کے نزدیک بچوں کا احسان مانئے کہ انہوں نے مجنوں پر پتھر پھینکا۔ بیدل نے ایک عام مشاہدے کی بات کہہ کر مجنوں کو ست نسق قرار دیا ہے۔ دونوں کا پہلا مصرع کے موازنہ سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کے ذہن میں بیدل کا یہ شعر تھا۔

دیوار بارِ منتِ مزدور سے ہے خم	منت کشِ تکلف اخلاق کس مباد
اے خانماں خراب نہ احساں اٹھایئے	بیگانہ ام ز خویش و ہم از ناز آشنا
غالب	بیدل

غالب کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے لئے بہتر یہی ہے کہ کسی کا احسان نہ اٹھائے کیونکہ احسان کا بوجھ دیوار بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ حالانکہ وہ احساس سے عاری ہے، لہذا انسان کو دیوار سے عبرت حاصل کرنی چاہئے۔ بیدل کہتے ہیں کہ کسی کے اخلاق کا احسان مند مت ہونا میں خود آپ سے بیگانہ ہوں اور ناز سے آشنا۔ بیدل اور غالب دونوں نے کسی کا احسان لینے سے اجتناب کو موضوع بنایا ہے لیکن دوسرے اشعار میں بیدل نے خصوصیت سے نااہلوں اور عزیزوں کا احسان لینے سے روکا ہے:

قبول انعام بد معاشاں بخود گوارا مگیر بیدل
کہ می شوند گلو خراشاں چو استخواں از نوالہ پیدا

بدمعاشوں کے احسان اور انعام کو قبول کرنا گوارا نہ کرنا کیونکہ یہ ایسے گلوخراش ہوتے ہیں جیسے نوالے میں کوئی ہڈی حلق میں جاکر پھنس جائے۔ (دورِ حاضر نے پاکستان میں امریکہ سے انعام لیا تو اس کا انجام سامنے ہے)۔

بیدل از خویشاں نمی باید اعانت خواستن
مومیائی چارہ فرمائے شکستِ شیشہ نیست

بیدل عزیزوں سے اعانت کی درخواست کبھی نہ کرنا، شکست شیشہ کا علاج مومیائی نہیں ہے۔ یعنی موم سے اس کو جوڑا نہیں جاسکتا۔

ہے رنگ لالہ و گل و نسریں جدا جدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہئے
غالب

صفات ہر چہ بود ذات را تعدد نیست
بفکر لالہ و گل خوں مخور بہار یکیست
بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ اگر چہ ہم مختلف پھولوں میں مختلف رنگ دیکھتے ہیں پر ہمیں لازم ہے کہ ہر رنگ کی علت ایک ہی شئے یعنی بہار کو قرار دیں، سخت غلطی ہوگی اگر مختلف رنگوں کو دیکھ کر ان کے لئے مختلف اسباب کی جستجو کی جائے۔ بیدل کہتے ہیں صفات چاہے جتنے ہوں ذات میں کوئی تعدد نہیں ہوتا ہے۔ لالہ وگل کے تصور سے خون کے آنسومت رو۔ بہار ایک ہی ہے۔ بیدل کا مطلب یہ ہے کہ اگر چہ خدا کی صفات ننانوے ہیں مگر ذات الٰہی یکہ وتنہا ہے۔ اس میں تعدد نہیں ہے۔ جس طرح لالہ وگل دو مختلف رنگ و بو کے پھول ہیں مگر بہار دونوں میں یکساں ہے۔ غالب اور بیدل دونوں نے ذات خداوندی کی یکتائی یا وحدۃ الوجود کو موضوع بنایا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کا پورا شعر بیدل کے مصرع ''بفکر لالہ وگل خوں مخور بہار یکیست'' کا منظوم ترجمہ نظر آئے گا۔ چنانچہ بعد کے اشعار بھی اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ غالب کے تحت الشعور میں بیدل کے یہ اشعار موجود تھے۔

سر پائے خم یہ چاہئے ہنگامِ بیخودی
رہ سوئے قبلہ وقت مناجات چاہئے

یعنی بحسبِ گردشِ پیمانۂ صفات
عارف ہمیشہ مستِ مئے ذات چاہئے

خیالِ مرگ کب تسکین دلِ آزردہ کو بخشے	آرام در طریقت ما نیست غیر مرگ
مرے دامِ تمنا میں ہے اک صیدِ زبوں وہ بھی	ہنگامہ گرم ساز نفسہا طپیدن است
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ میرا دل اس قدر آزردہ ہو چکا ہے کہ اب اسے خیالِ مرگ سے بھی کوئی تسکین نہیں ہوتی ۔ میرے دامِ تمنا میں یہ خیال ایک صیدِ زبوں سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ یعنی دل کے بہلانے میں ایسی ایسی سیکڑوں صورتیں میرے تصور میں موجود ہیں مگر سب غیر موثر اور بیکار ہیں ۔ بیدل کہتے ہیں ہماری طریقت یعنی اصول زندگی میں آرام وسکون تو موت کے سوا کسی اور شکل میں ممکن ہی نہیں ہے۔ طپش یعنی بے قراری اور بے کلی سانس کے ہنگامہ کو گرم کئے رہتی ہے۔ غالب اور بیدل دونوں نے مرگ کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک اس کا دل اس قدر آزردہ اور مایوس ہو چکا ہے کہ مرگ کے تصور سے بھی اسے سکون نہیں ملتا۔ جبکہ بیدل کے نزدیک موت سے ہی آرام وسکون نصیب ہوگا۔ یہ اس کے اصول سے زندگی میں داخل ہے۔ یہاں غالب نے بیدل سے اختلاف کیا ہے۔

نہ کرتا کاش نالہ ، مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم	ہجوم درد پیچیدہ است ہستی تا عدم بیدل
کہ ہوگا باعث افزائش دردِ دروں وہ بھی	تو ہم گر گوش داری نالہ خواہی شنید اینجا
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ میں نے آہ و نالہ اس لئے کیا تھا کہ بچپن سے سنتا چلا آیا ہوں کہ رونے سے دل کی بھڑاس نکل جاتی ہے اور اس کی وجہ سے قدرے سکون خاطر نصیب ہوتا ہے۔ مگر افسوس کہ تجربے کے بعد یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ نالہ کرنے سے دل کے درد میں کمی کے بجائے زیادتی ہوگئی۔ بیدل کہتے ہیں ہستی سے لے کر عدم تک درد و تکلیف کا ہجوم پیچیدہ ہے تمہارے پاس اگر کان ہے تو تم بھی اس سے نکلنے والے نالے کو سنو گے۔ مطلب یہ ہے کہ جب سے وجود میں آیا

ہوں تب سے لے کر راہی عدم ہونے تک درد کا سلسلہ جاری ہے۔ جس کی وجہ سے آہ و نالے کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ اگر تمہارے پاس کان ہو تو تم بھی اسے سن سکتے ہو۔ غالب اور بیدل دونوں نے درد و نالے کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک آہ و نالہ کرنے سے درد کم ہونے کے بجائے بڑھتا گیا۔ جبکہ بیدل کے نزدیک پوری زندگی میں چونکہ درد کا ہجوم ہے اس لئے فطری طور پر آہ و نالے کا سلسلہ بھی غیر منتہی ہے۔

مئے عشرت کی خواہش ساقی گردوں سے کیا کیجئے	نباید راستی از چرخ کجرو آرزو کردن
لئے بیٹھا ہے اک دو چار جام واژگوں وہ بھی	مبادا با خدنگیہا بدل سازد کمانی را
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں ساقی گردوں سے شراب عشرت کی آرزو ہم کیا کریں اس کے پاس ہے کیا جو وہ ہمیں دے گا۔ اس کی کل کائنات بس یہی دو چار اوندھے پیالے ہی تو ہیں جو شراب عیش سے خالی ہیں۔ بیدل کہتے ہیں چرخ کجرو سے راستی اور درستی کی آرزو نہیں کرنی چاہئے۔ خدا نخواستہ کمان کو کہیں تیر سے نہ بدل دے۔ بیدل اور غالب دونوں نے چرخ سے مئے عشرت یا درستی کی آرزو کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک ساقی گردوں سے شراب عیش کی آرزو نہیں کرنی چاہئے کیونکہ اس کی کل کائنات دو چار اوندھے پیالے ہیں۔ بیدل کے نزدیک چرخ کجرو سے درستی کی آرزو نہیں کرنی چاہئے۔ غالب کے کلام میں بیدل کے اس شعر کی جھلک پوری طرح موجود ہے۔ البتہ بیدل نے چرخ کو کجرو کہہ کر اس کی مناسبت سے راستی کا لفظ استعمال کیا۔ اور غالب نے اسے اوندھے جام قرار دے کر مئے عشرت کا لفظ استعمال کیا۔ جبکہ مفہوم دونوں کا ایک ہے۔

لپٹنا پرنیاں میں شعلہ آتش کا آسان ہے	ہجومِ داغ عشقت کرد ایجاد سرشک من
ولے مشکل ہے حکمت دل میں سوزِ غم چھپانے کی	عرق ریزیست ہرجا جمع می گردد حرارتہا
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کا مطلب یہ ہے کہ یہ تو ممکن ہے کہ شعلہ آتش سے پرنیاں یعنی ریشمی کپڑا نہ جلے مگر یہ ممکن نہیں کہ دل سوزِ غم سے نہ جل اٹھے۔ بالفاظ دیگر ریشمی کپڑا آگ کو اپنے اندر پوشیدہ کر سکتا ہے مگر سوزِ غم دل میں پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔ وہ یقیناً دل کو جلا کر خاک کر دے گا۔ بیدل کا مطلب یہ ہے کہ اے محبوب تیرے عشق کے داغ (سوزش) کی فراوانی نے مجھے آنسو بہانے پر مجبو کر دیا۔ گرمی جب بڑھتی ہے تو انسان کے پسینے چھوٹنے ہی لگتے ہیں۔ غالب اور بیدل دونوں نے سوزِ غم عشق یا داغ عشق کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک سوزِ غم عشق کو پوشیدہ رکھنا بہت دشوار ہے۔ جبکہ بیدل کے نزدیک داغ عشق کے ہجوم کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ آنکھوں کے راستے آنسوؤں کی شکل میں نکلے ہے اور پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کے شعر میں بیدل کے شعر کا ارتعاش موجود ہے۔

کہوں کیا خوبیِ اوضاع ابنائے زماں غالب
بدی کی اس نے جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی
غالب

تا توانی قطع کن بیدل ز ابنائے زماں
آشنائے کس نہ گردند ایں حیا بیگانہا
بیدل

دنیا والوں کے طرزِ عمل پر طنز کرتے ہوئے غالب کہتے ہیں کہ ان کی خوبی کیا بیان کروں۔ بس یہ سمجھو کہ جس شخص کے ساتھ ہم نے بارہا نیکی کی تھی اس نے بھی ہمارے ساتھ بدی کی۔ یعنی اس دنیا میں نیکی کا بدلا بدی ہے۔ بیدل کہتے ہیں جہاں تک ممکن ہو ابنائے زمانہ سے قطع تعلق کر لو، یہ حیا بیگانہ کسی کے دوست آشنا نہیں ہوتے۔ غالب اور بیدل دونوں نے ابنائے زمانہ سے شکوہ کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک ابنائے زمانہ کا حال یہ ہے کہ جس کے ساتھ نیکی کی اسی نے بدی کی۔ بیدل کے نزدیک ابنائے زمانہ چونکہ شرم و حیا سے بیگانہ ہے وہ کسی کے دوست نہیں ہو سکتے اس لئے ان سے قطع تعلق کر لینا چاہئے۔ گویا ابنائے زمانہ سے دونوں کو شکوہ ہے۔ بیدل نے اس موضوع پر چند اشعار اور کہے ہیں:

بیدل از اہلِ زماں چشم ترحم بردار
گریہ خوں ریختن است از مژہ بے نمِ تیغ

در حق انصاف ابنائے زماں
داد تحسیں می دہد دشنام ما

بساط عجز میں تھا ایک دل یک قطرۂ خوں وہ بھی	آب گہریم و خون یاقوت
سو رہتا ہے بانداز چکیدن سرنگوں وہ بھی	داریم بروئے خود چکیدن
غالب	بیدل

ان اشعار کی تشریح میں نیاز فتح پوری لکھتے ہیں:

غالب کے شعر کا مفہوم یہ ہے کہ میری بساط عجز میں سوائے ایک دل کے کیا تھا، سو اس کی بھی کیفیت یہ ہے کہ محض ایک قطرۂ خوں ہے جو ہر وقت ٹپک پڑنے کے لئے آمادہ رہتا ہے۔ اس شعر میں قلب صنوبری ساخت اور اس کی تعلیق واژگونی سے اس کا بصورت قطرہ آمادہ چکیدن رہنا ظاہر کیا ہے۔ یہ خیال غالب نے بیدل کے درج بالا شعر سے لیا ہے۔ لیکن فرق قابل غور ہے۔ بیدل کہتا ہے کہ عالم خلق میں بہتر سے بہتر چیز کو لے لو۔ مثلاً گوہر و یاقوت لیکن اس کا بھی یہ حال ہے کہ اس کا عجز اس کی حالت سے ظاہر ہے۔ ''داریم بروئے خود چکیدن'' یہ پورا مصرعہ کیفیاتی تشبیہ سے متعلق ہے۔ غالب کے یہاں تشبیہ نظری و مادی ہے۔ اور دل کی تخصیص کر کے بساط عجز کے صرف ایک محدود و مخصوص منظر کو سامنے لاتا ہے۔ بیدل کوئی تعیین نہیں کرتا بلکہ وہ تمام عالم وجود سے بحث کرتا ہے۔ غالب کو دل کی تخصیص کے ساتھ سرنگوں اور یک قطرہ خوں بڑھانا پڑا۔ بیدل کو اپنے مقصود کی وسعت کے لحاظ سے مطلق اس کی ضرورت نہیں ہوئی۔ غالب کو اپنا مفہوم ذہن نشیں کرانے کے لئے غیر معمولی تکلف کرنا پڑا، لیکن بیدل نے اسے زیادہ سادہ و مختصر الفاظ میں اور زیادہ قوت کے ساتھ ظاہر کر دیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ فرق کیوں پیدا ہوا۔ صرف اس لئے کہ بیدل کا نظریہ شاعری غالب سے زیادہ بلند ہے اور اس لئے جس مضمون کو

بیدل نے اس قدر بلند ہوکر بیان کیا غالب کو اس کے اظہار کے لئے نیچے آنا پڑا۔ (۱۴۲)

حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ اے آرزو خرامی	پرواز آرزوہا مارا بخواری افگند
دل جوش گریہ میں ہے ڈوبی ہوئی اسامی	دودیکہ در سرِ ماست گر بشکند کلاہ است
غالب	بیدل

غالب کہتے ہیں کہ آرزو خرامی یعنی وہ تحریک جو کسی آرزو سے پیدا ہوتی ہے حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ یعنی جدوجہد سے کچھ حاصل نہیں ہو سکے گا۔ ڈوبی ہوئی اسامی سے وہ کاشتکار مراد ہے جس سے لگان وصول ہونے کی مطلق امید نہ ہو۔ دل کو ڈوبی ہوئی اسامی قرار دینے سے مقصد یہ ہے کہ دل جوش گریہ وزاری سے اس قدر بیکار ہو چکا ہے کہ وہ حصول مقصد میں کوئی مدد نہیں کر سکتا ۔مقصد یہ ہے کہ دل زار روتے روتے اس حد تک مایوس ہو چکا ہے کہ اب اس سے کسی تمنا کے پوری ہونے کی امید رکھنی فضول ہے۔ بیدل کہتے ہیں آرزوؤں کی پرواز نے ہم کو ذلت وخواری سے ہم کنار کردیا۔ ہمارے سر سے دھواں اٹھ رہا ہے اگر وہ ٹوٹے تو ٹوپی کی شکل اختیار کرلے یعنی میرے وجود کو ڈھنک لے۔ غالب اور بیدل دونوں نے آرزو خرامی یا پرواز آرزو کے حاصل اور نتیجے کو موضوع بنایا ہے، جو نتیجے کے لحاظ سے ایک ہی ہے کیونکہ آرزو خرامی کا مطلب ہے آرزوؤں کا دل میں پیدا ہوتے رہنا، اور پرواز آرزو کا مطلب ہے آرزوؤں کا دل میں اڑان بھرتے رہنا۔ غالب کے نزدیک چونکہ جدوجہد کا ثمرہ ملنا مشکل ہے اس لئے عالم مایوسی میں آرزو خرامی کو خطاب کرکے کہتا ہے کہ اس سے ہاتھ دھو لے۔ بیدل کے نزدیک پرواز آرزو کو جدوجہد میں ناکامی کی وجہ سے ذلیل وخوار ہونا پڑا۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کے مصرعہ ''حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ اے آرزو خرامی'' میں بیدل کے مصرعہ ''پرواز آرزوہا مارا بخواری افگند'' کی ہلکی جھلک پائی جاتی ہے۔

اس شمع کی طرح جس کو کوئی بجھا دے	عمر چوں شمع بواماندگیم طے گردید
میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغِ ناتمامی	نام جادہ برسرِ منزل بستند
غالب	بیدل

غالب کہتے ہیں کہ میری حالت اس شمع کی سی ہے جو پوری جل نہ سکی اس لئے مجھے افسوس ہے کہ میں ان عاشقوں کے زمرے میں شامل نہیں ہوسکتا جنہوں نے اپنے آپ کو آتش عشق میں پوری طرح فنا کر کے مرتبۂ کمال حاصل کرلیا ہے۔ اس مضمون کو انہوں نے یوں بھی ادا کیا ہے:

جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے
اے ناتمامیِ نفس شعلہ بار حیف

بیدل کہتے ہیں میری زندگی شمع کی طرح عاجزی ووا ماندگی میں گذر گئی۔ میری منزل کو جادہ کا نام دے دیا گیا۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح شمع جلتے پگھلتے ہوئے اپنی واماندگی اور عاجزی میں وقت گذارتی ہے میری زندگی بھی اسی طرح عشق کی آگ میں جلتے اور پگھلتے گزر گئی پر منزل نہ مل سکی ۔گویا سفر عشق ادھورا رہا۔ غالب نے بھی عشق میں مرتبۂ کمال تک نہ پہنچنے کا تذکرہ کیا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کے اس شعر میں بیدل کے شعر کا عکس پوری طرح موجود ہے۔

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے	کیست از فیض جنوں مایہ ندارد اینجا
پرتو سے آفتاب کے ذرّے میں جان ہے	خرد آں بہ کہ بتکلف نگذارد اینجا
غالب	بیدل

غالب کہتے ہیں تمام دنیا کو تیری ہی لو لگی ہوئی ہے اور اسی لگن کی وجہ سے اس میں حرکت وزندگی پائی جاتی ہے۔ جس طرح آفتاب باعث تابش ذرات ہے اسی طرح آفتاب حقیقی یعنی حق تعالیٰ باعث رونق کائنات بلکہ حرکت وحیات ہے۔ بالفاظ دیگر کائنات کی ہر شے کے دل میں تیرا عشق کارفرما ہے اور یہی جذبہ عشق ان کی زندگی کا سبب ہے۔ عشق نہ ہوتا تو یہ کائنات کب کی فنا ہو چکی ہوتی۔ بیدل کہتے ہیں آفتاب سے لے کر ذرہ تک اور قطرے سے لے کر دریا تک کون سی چیز ایسی دنیا میں ہے جو جنون اور عشق کے فیض سے مایہ ور نہ ہو۔ عقل کے لئے بہتر یہی ہے کہ وہ یہاں بہ تکلف قدم نہ رکھے۔ غالب اور بیدل دونوں نے کائنات کے ہر چیز میں عشق الٰہی کے جذبے کو موضوع بنایا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کے اس پورے شعر میں بیدل کے پورے شعر کی جھلک پوری طرح موجود ہے۔

خاک میں ناموس پیمانِ محبت مل گئی
اٹھ گئی دنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے ہائے
غالبؔ

از ترحم تا مروت ، از مدارا تا وفا
ہر چہ را کردم طلب دیدم ز عالم رفتہ است
بیدلؔ

غالب کہتے ہیں تیری موت سے پیمانِ محبت کی عزت خاک میں مل گئی اور دنیا سے محبت کی راہ ورسم کا خاتمہ ہوگیا۔یعنی وفا شعار عاشق اب پیدا نہ ہوگا۔ بیدل کہتے ہیں رحم دلی سے انسانی ہمدردی تک اور خاطر مدارات سے لے کر وفاداری تک جس اخلاقی قدر کو بھی میں نے تلاش کیا پتہ چلا کہ دنیا سے وہ رخصت ہوچکی ہے۔ غالب اور بیدل دونوں نے راہ ورسم محبت اور انسانیت کے دنیا سے ناپید ہو جانے کو موضوع بنایا ہے۔ غالب نے خاص طور سے عشق ومحبت کی راہ ورسم کے اٹھنے کا ذکر کیا ہے جبکہ بیدل کے یہاں محبت سمیت تمام اخلاقی قدروں کے اٹھ جانے کا ذکر ہے۔غور سے دیکھا جائے تو غالب کے شعر میں بیدل کے اس شعر کی جھلک پوری طرح موجود ہے۔

گوش مہجور پیام و چشم محرومِ جمال
ایک دل تس پر یہ ناامیدواری ہائے ہائے
غالبؔ

یاسِ جدائیم چہ کمی داشت ای فلک
کامروز نا امید ز پیغام ہم شدیم
بیدلؔ

غالب کہتے ہیں میرے کان تیرے پیام سے اور میری آنکھیں تیرے جمال سے ہمیشہ کے لئے محروم ہوچکی ہیں۔ ہائے افسوس ایک میرا دل اور اس پر مایوسی اور نامرادی کا یہ بار گراں۔ بیدل کہتے ہیں اے فلک جدائی کی مایوسی ہی کیا کم تھی کہ آج اس کے پیغام سے بھی ہم ناامید ہوگئے۔ غالب اور بیدل دونوں نے پیغام محبوب سے مہجوری یا مایوسی کو موضوع بنایا ہے۔البتہ غالب نے اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کان کو پیام محبوب سے مہجور اور آنکھ کو جمال محبوب سے محروم قرار دے کر مایوسی کی کیفیت میں مزید کشش پیدا کردی ہے۔

سرگشتگی میں عالم ہستی سے یاس ہے
تسکیں کو دے نوید کہ مرنے کی آس ہے
غالبؔ

دریں محفل بہ امید تسلی خوں مخور بیدل
بیا تا عالم دیگر رویم اینجا نشد پیدا
بیدلؔ

غالب کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا مضطرب قلب تسکین کا خواہاں تھا لیکن سر گشتگی یعنی جنون کی وجہ سے اس نعمت سے محروم تھا۔ اب چونکہ اس سر گشتگی کی بدولت ہمیں زندگی سے مایوسی ہو گئی ہے اس لئے ہمیں یقین ہے کہ مرنے کے بعد ہمارے دل کو تسکین نصیب ہوگی۔ اس بات کو شاعر نے یوں بیان کیا کہ ہماری طرف سے تسکین کو ہماری موت کی خبر سنادو۔ بیدل کہتے ہیں اس محفل یعنی دنیا میں تسکین و تسلی کی امید میں خون کے آنسو مت روؤ۔ یہ چیز یہاں ناپید ہے آؤ کسی اور دنیا کا سفر کریں۔ غالب اور بیدل دونوں نے تسکین و تسلی کو موضوع بنایا ہے۔ غالب نے طنزیہ انداز میں کہا کہ ہمارا دل تسکین کا طالب تھا مگر جنوں کی وجہ سے وہ اس سے محروم رہا اس لئے ہماری طرف سے تسکین کو موت کی خوش خبری سنادو یعنی موت کے بعد شاید تسکین حاصل ہو۔ بیدل کے مطابق اس دنیا میں تسکین اور تسلی ناپید چیز ہے۔ اس لئے اس کی خاطر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ غور سے دیکھا جائے تو بیدل کے اس خیال کی جھلک غالب کے کلام میں موجود ہے۔

کیجئے بیاں سرور تپ غم کہاں تلک	سیاہ بخت محبت بہار ہا دارد
ہر مو مرے بدن پہ زبانِ سپاس ہے	بہند ناز فروشِ سواد کشمیرم
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں غم الفت میں جو لذت محسوس ہو رہی ہے اس کا بیان الفاظ کے ذریعے کہاں تک کروں۔ بس یہ سمجھ لو کہ اس تپِ غم کا شکر ادا کرنے کیلئے میرا بال بال زبان بن گیا ہے۔ بیدل کہتے ہیں درد محبت میں گرفتار بدقسمت آدمی بھی بہاروں کا حامل ہوتا ہے۔ اگرچہ میں ہندوستان میں ہوں پر سواد کشمیر کا ناز فروش ہوں۔ غالب اور بیدل دونوں نے غم الفت کی وجہ سے سیاہ بختی یعنی بدنصیبی میں لذت کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک غم الفت کی لذت کو جامۂ الفاظ میں پیش نہیں کیا جاسکتا۔ جبکہ بیدل کے نزدیک درد محبت میں گرفتار بدنصیب آدمی میں ایسی بہاریں پوشیدہ ہوتی ہیں جو کشمیر جنت نظیر کی بہاروں پر بھی بالاتری رکھتی ہے۔ سرور اور بہار میں تلازمہ ہے جہاں سرور ہوگا وہاں بہار ہوگی جہاں بہار ہوگی وہاں سرور ہوگا۔

وحشت پہ مری عرصۂ آفاق تنگ تھا　　عالمی را وحشتِ ماچوں سحر آوارہ کرد
دریا زمیں کو عرقِ انفعال ہے　　چیں فروش دامن صحرائے امکانیم ما

غالبؔ　　بیدلؔ

غالب کہتے ہیں میری وحشت ودیوانگی اس درجہ بڑھی ہوئی ہے کہ اس کے لئے یہ دنیا بھی تنگ ہے۔ اس لئے زمین کو اپنی کم مائیگی پر شرم کے مارے پسینہ آگیا اور یہ سمندر وہ پسینہ ہی تو ہے۔ بیدل کہتے ہیں میری وحشت نے ایک عالم کو سحر کی طرح آوارہ کر دیا۔ ہم تو دامنِ صحرائے امکاں کے چیں فروش ہیں۔ وحشت ودیوانگی کو غالب اور بیدل دونوں نے موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک اس کی وحشت کی وسعت کے سامنے عرصہ آفاق تنگ ہے۔ جبکہ بیدل کے نزدیک اس کی وحشت نے دنیا کو سحر کی طرح آوارہ کر دیا اور دامن صحرا کو سمیٹنے والا بنا دیا۔ وحشت تو اصل میں جنون ودیوانگی دربدری یا رمندگی کا نام ہے اور دیوانہ خود آوارہ ہوتا ہے اور دوسروں کو آوارہ کرتا ہے اس لئے غالب اور بیدل کے یہاں وحشت کی یہ دونوں خصوصیت نتیجے کے اعتبار سے زیادہ فرق نہیں رکھتی۔

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد　　فریب فرصت ہستی مخور کہ ہمچو شرار
عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے　　نہفتنی است اگر ہست وا نمودن ہا

غالبؔ　　بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ حقیقی ہستی صرف خدا کی ہے جو واجب الوجود یعنی از خود موجود ہے عالم کی ہستی خدا کی ہستی کا پرتو ہے۔ اس لئے عالم کی ہستی حقیقی نہیں، بلکہ اعتباری یا وہمی یا خیالی ہے۔ غالب کا ایک اور شعر اسی مفہوم کا ہے:

ہاں کھائیو مت فریب ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

بیدل کہتے ہیں ہستی کے فریب اور دھوکے میں نہ آنا کیونکہ چنگاری کی طرح اگر اس کی کچھ دیر کے لئے نمود ہے بھی تو آخرکار اسے فنا ہونا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کا مصرعہ ''ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد'' بیدل کے مصرعہ ''فریب فرصت ہستی مخور کہ ہمچو شرار'' کا بالکل منظوم ترجمہ

ہے۔البتہ دوسرے مصرعہ میں غالب نے ہستی کے خیال اور وہمی ہونے کو واضح کیا ہے جبکہ بیدل نے شرار سے تشبیہ دے کر اس کی کم فرصتی کو واضح کیا ہے۔

مری ہستی فضائے حیرت آبادِ تمنا ہے	ز درسِ دیدہ و دل از من بیدل چہ می پرسی
جسے کہتے ہیں نالہ وہ اسی عالم کا عنقا ہے	سراپا حیرتم حیرت نمی دانم چہ فہمیدم
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ میری ہستی سراپا عالم حیرت ہے۔عالم حیرت میں انسان مبہوت ہو جاتا ہے نہ حرکت کر سکتا ہے نہ آواز نکل سکتی ہے۔ایسی حالت میں نالہ وفریاد خارج از بحث ہے۔اس بات کو انہوں نے اس انداز میں بیان کیا کہ نالہ اس عالم کا عنقا معدوم ہے۔مقصود صرف اتنا ہے کہ میرا وجود کمال شوق کی وجہ سے حیرت کدہ بن گیا ہے یعنی وہاں حیرت کے سوا کچھ نہیں ہے۔بیدل کہتے ہیں میرے دیدہ و دل نے مکتب کائنات میں کیا سبق پڑھا اس کی بابت مجھ سے کیا دریافت کرتے ہو، میں تو سراپا حیرت ہوں، مجھے کچھ پتہ نہیں میں نے کیا سمجھا۔حیرت بیدل کا بہت ہی محبوب موضوع ہے جس پر اس نے اپنی منثور و منظوم تصانیف میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔یہاں اس کا موقع نہیں ہے لیکن موضوع کی مناسبت سے مختصر تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔بیدل نے چہار عنصر میں لکھا ہے:

''ہر فردی از افراد دیوان نمود آئینہ دار تحیر است (۱۴۳)

دیوان نمود یعنی کائنات کا ہر فرد تحیر کا آئینہ دار ہے۔دوسری جگہ لکھتا ہے:

''اینجا امداد حیرت حوصلہ بخش عروج نظری باشد'' (۱۴۴)

حیرت کی امداد بلند نظری کو حوصلہ اور ہمت عطا کرتی ہے۔ڈاکٹر اقبال لکھتے ہیں:

> ''افلاطون کے نزدیک حیرت کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ وہ دنیا کے حالات کے سلسلے میں ہمارے اندر ایک ذوق تجسس پیدا کرتی ہے جبکہ بیدل کے نزدیک اس کے فطری نتائج سے قطع نظر حیرت بجائے خود بڑی اہمیت کی حامل ہے اور اس مضمون کو بیدل کے سوا کوئی شاعر اتنی خوبصورتی سے ادا نہیں کر سکا:

نزاکتہاست در آغوش مینا خانۂ حیرت

مژہ برہم مزن تا نشکنی رنگ تماشارا (۱۴۵)

حیرت اصل میں کائنات کے آفاقی اور انفسی آیات پر غور فکر سے حاصل ہوتی ہے۔ بیدل نے دوسرے اشعار میں اس خصوصیت کو واضح کیا ہے۔

در چار سوئے دہر گذر کرد خیالم

لبریز شد از حیرت آئینہ دکانہا

بسکہ چوں جوہر آئینہ تماشا نظریم

می چکد خون تحیر ز رگ و ریشہ ما

غالب اور بیدل دونوں نے اپنی ہستی کو سراپا حیرت کہا ہے دونوں کے کلام کے موازنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس موضوع پر بیدل کے کلام سے بہت متاثر ہے۔

دل لگی کی آرزو بیچین رکھتی ہے ہمیں	تب شوقت چہ آتش ریخت در بنیاد شمع من
ورنہ یاں بے رونقی سود چراغ کشتہ ہے	کہ شد سرمایہ ہستی سراپا حرف تبخالم
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ اگر چراغ روشن نہ ہو یعنی بے رونق رہے تو اس میں اس کا فائدہ ہے کیونکہ اس کا تیل ختم نہیں ہوگا۔ اسی طرح اگر ہم اپنے دل میں عشق کی شمع روشن نہ کریں یعنی آرزو نہ کریں تو ہمارا فائدہ ہے کہ بیچین نہ ہوں گے۔ مگر کیا کریں دل کے ہاتھوں مجبور ہیں دل لگی کی آرزو ہمیں بے چین رکھتی ہے۔ بیدل کہتے ہیں تیرے عشق کی حرارت نے میری شمع زندگی کی اساس میں جانے کیسی آگ لگادی کہ میرا کل سرمایۂ ہستی آبلہ بن کر رہ گیا مطلب یہ ہے کہ عشق کی حرارت سے اس کے سرمایۂ ہستی میں چھالے پڑ گئے ہیں جن کی وجہ سے بے چینی رہتی ہے۔ غالب اور بیدل دونوں نے عشق میں بے کلی اور بے چینی کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر عشق نے اسے بے چین کر رکھا ہے جبکہ بیدل کو حرارت عشق نے بیکل کر رکھا ہے ۔غور سے دیکھا جائے تو غالب کے مصرع ''دل لگی کی آرزو بیچین رکھتی ہے ہمیں'' میں بیدل کے مصرع ''تب شوقت چہ آتش ریخت در بنیاد شمع من'' کا عکس موجود ہے۔

چشم خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے
سرمہ تو کھوے کہ دودِ شعلۂ آواز ہے
غالبؔ

از تغافل تا نگاہِ چشم خوباں فرق نیست
نشہ یکرنگست اینجا درد و صاف جام را
بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ حسینوں کی آنکھیں اگر چہ بے زبان ہیں اس کے باوجود اشاروں ہی اشاروں میں عاشقوں سے گفتگو کرتی ہیں۔ ان کی آنکھوں میں جو سرمہ کی تحریر نظر آتی ہے یہ سرمہ نہیں ہے بلکہ آواز کے شعلے کا دھواں ہے۔ یہ شعر غالب کی قوت تخیل کی بہت عمدہ مثال ہے ۔ بیدل کہتے ہیں تغافل یعنی دانستہ غفلت شعاری اور نگاہ چشم خوباں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہاں پیالے کے دُرد و صاف دونوں میں ایک ہی قسم کا نشہ ہے۔ غالب اور بیدل دونوں نے چشم خوباں کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک چشم خوباں خاموشی میں بھی نوا پرداز ہے۔ جبکہ بیدل کے نزدیک چشم خوباں کا نشہ قابل توجہ ہے۔

ڈالا نہ بیکسی نے کسی سے معاملہ
اپنے سے کھینچتا ہوں خجالت ہی کیوں نہ ہو
غالبؔ

بر ہیچ کس افسانہ امید نہ خواندیم
عمریست ہماں بیکسی ماست کسِ ما
بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ بیکسی کا میں ممنون ہوں کہ اس نے مجھے دوسروں کا احسان لینے سے بچالیا چنانچہ اب یہ صورت ہے کہ اگر مجھے شرمندگی بھی ہے تو خود آپ ہی سے ہے کسی غیر سے نہیں ہے۔ بیدل کہتے ہیں میں ایک عرصہ سے بیکسی کی زندگی گذار رہا ہوں۔ یہی میری شخصیت کی پہچان ہے۔ اس لئے میں نے اپنی امید کی کہانی کسی کو نہیں سنائی۔ غالب اور بیدل دونوں نے بیکسی کو موضوع بنایا ہے اس فرق کے ساتھ کہ غالب بیکسی کا ممنون ہے کہ اس نے اسے دوسروں کا احسان لینے سے بچالیا۔ بیدل کے نزدیک بیکسی چونکہ اس کی شخصیت کی پہچان ہے اس لئے اپنی امید کے برآنے کی کہانی اس نے کسی کو نہیں سنائی۔ غالب کے شعر میں اس شعر کا اثر واضح ہے البتہ انداز بیان بدلا ہوا ہے۔

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی
غالبؔ

نگردد جمع نورِ آگہی با ظلمتِ غفلت
صفائے دل نمک در دیدۂ خوابست شبنم را
بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ اگر کسی کو اپنی ہستی سے آگاہی حاصل نہ ہو سکے تو اپنی ہستی سے غفلت ہی اختیار کر لے۔ یعنی اپنے آپ کو اس کی محبت میں فنا کر دے یا بھلا دے اس غفلت کا نتیجہ بھی معرفت الٰہی ہوگا۔ غرض کہ اپنی ہستی سے آگاہی بھی معرفت کا ذریعہ ہے اور غفلت بھی۔ بیدل کہتے ہیں کہ نور آگہی اور تاریکیِ غفلت ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتی۔ دل کی صفائی شبنم کے دیدۂ خواب میں نمک کی حیثیت رکھتی ہے۔ غالب اور بیدل دونوں نے ہستی سے آگہی اور غفلت کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کہتے ہیں کہ ہستی سے آگہی اگر نصیب نہیں ہے تو غفلت ہی سہی کہ اس صورت میں انسان اپنے کو محبوب کے عشق میں فنا کر کے بھلا دیتا ہے۔ جس کا نتیجہ معرفت ہے۔ یہاں غالب نے بیدل سے اختلاف کیا ہے۔ بیدل آگہی کو نور اور غفلت کو تاریکی سے تعبیر کرتا ہے جو قرآن کے مطابق بھی ہے۔ ھل تستوی الظلمات والنور نیز ایک جگہ فرمایا گیا ہے کہ کافر قیامت کے دن کہیں گے ہم تو غفلت ہی میں پڑے رہے۔ قد کنا فی غفلة من ھذا غفلت کا مفہوم تصوف میں بھی یہی ہے کہ انسان خدا فراموشانہ زندگی گذارے۔ چنانچہ بیدل نے ایک اور شعر میں اس مفہوم کی طرف اشارہ کیا ہے:

غبارِ غفلت و روشن دلی نگردد جمع
کجاست دیدۂ آئینہ را غنودنہا

نشاطِ جاوداں خواہی دلی را صید الفت کن	عمر ہر چند کہ ہے برق خرام
کہ مستیہاست موقوف بدست آوردنِ مینا	دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی
بیدلؔ	غالبؔ

غالب کہتے ہیں کہ یہ مانا کہ عمر برق خرام ہے یعنی بڑی تیزی کے ساتھ گذرتی چلی جاتی ہے مگر اتنی مہلت ضرور مل سکتی ہے کہ دل کو خون کر کے یعنی کسی کی محبت میں خود کو فنا کر کے مقصد حیات حاصل کیا جائے۔ بیدل کہتے ہیں اگر ابدی نشاط مطلوب ہو تو دل کو دام عشق میں گرفتار کرو۔ کیونکہ مستی مینا کے ہاتھ میں آنے پر ہی موقوف ہے۔ غالب اور بیدل دونوں نے عشق کو اپنانے پر زور دیا ہے۔ غالب کے نزدیک کسی کی محبت میں دل کو خون کرنے یا فنافی المعشوق ہونے

سے زندگی کو دوام حاصل ہوتا ہے۔ بیدل کے نزدیک بھی اسی سے دائمی نشاط و سرور حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ دوسرے اشعار میں بھی اسی نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے:

مقیم دشت الفت باش و خواب ناز ساماں کن
بہم می آورد چشمِ تو مژگاں گیاہ آنجا

ع

حیات جاوداں خواہی مقیم دشت الفت باش

یار سے چھیڑ چلی جائے اسد
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی
غالبؔ

اے زندگی بحسرت وصل اضطراب چیست
بنشیں دمیکہ قاصد ما از عدم رسد
بیدلؔ

یہاں حسرت سے اظہار حسرت وصل مراد ہے تاکہ چھیڑ کا پہلو پیدا ہو سکے۔ غالب کہتے ہیں کہ کہ اگر وہ وصل پر راضی نہیں ہے تو اظہار حسرت وصل کرتے رہو تا کہ چھیڑ کا سلسلہ قائم رہے۔ پہلے مصرعہ کی بندش یعنی لطف زبان اور انداز بیان دونوں باتیں قابل داد ہیں۔ بیدل کہتے ہیں اے زندگی وصل کی حسرت میں تیرا یہ اضطراب کیسا ہے؟ تھوڑی دیر انتظار کرتا آنکہ ہمارا قاصد عدم سے آجائے۔ غالب اور بیدل دونوں نے حسرت وصل محبوب کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک محبوب سے چھیڑ کو جاری رکھنے کے لئے حسرت وصل کا اظہار ضروری ہے۔ بیدل کے نزدیک حسرت وصل کے لئے بیقراری اور بے کلی کے اظہار کی ضرورت نہیں، مقصد یہ ہے کہ حسرت وصل اپنی جگہ بجا سہی پر اس کے اظہار کی چنداں ضرورت نہیں۔

مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیِ خیال
تا باز گشت سے نہ رہے مدعا مجھے
غالبؔ

خراب میکدۂ عالمِ خیال تو ایم
چہ مشربی کہ قدح نوش کردہ ای مارا
بیدلؔ

غالب کہتے ہیں میں اپنے محبوب کا تصور عالم مستی میں اس لئے کر رہا ہوں کہ اس کے تصور میں اس طرح غرق ہو جاؤں کہ پھر کبھی ہوش میں نہ آؤں۔ بیدل کہتے ہیں تیرے عالم خیال کے میکدے میں ہم سب مست و مدہوش پڑے ہوئے ہیں۔ تو کیسا مشرب و میخانہ ہے کہ ہم سب

کو قدح نوش کر کے تو نے مدہوش کر دیا ہے۔ غالب اور بیدل دونوں نے عالم خیال میں میکدۂ محبوب سے مست ہونے کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک عالم خیال میں عاشق محبوب کے تصور کرنے کی آرزو اس لئے کرتا ہے تا کہ پھر ہوش میں نہ ائے جبکہ بیدل کے نزدیک عالم تصور میں وہ پہلے سے ہی مست و مدہوش پڑا ہوا ہے۔

زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالب	چہ بار کلفتی اے زندگی کہ ہچو حباب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے	تمام آبلہ بردوش کردہ ای مارا
غالب	بیدل

غالب کہتے ہیں کہ جب ہماری زندگی اس قدر غموں اور مصیبتوں میں کٹی کہ ساری عمر کوئی تمنا پوری نہ ہوئی۔ تو پھر ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے جو ان کو دور کرتا۔ دوسرے مصرعہ کی بندش انتہائی دلکش اور قابل تحسین ہے۔ اس کی نثر نہیں ہو سکتی۔ بیدل کہتے ہیں اے زندگی! تو کلفتوں اور دکھوں کا کیسا بار گراں بن کر رہ گئی ہے کہ بلبلے کی طرح تو نے ہمارے وجود کو آبلہ بردوش کر دیا ہے۔ یعنی مصیبتوں اور پریشانیوں کی وجہ سے مضطرب اور بے قرار کر دیا ہے۔ غالب اور بیدل دونوں نے زندگی کے آلام و مصائب کو موضوع بنایا ہے۔ غالب اس کی وجہ سے یہ شکایت کر بیٹھے کہ ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے جو ان کو دور کرتا۔ بیدل نے خدا سے شکایت نہیں کی بلکہ خود زندگی سے شکایت کی ہے۔ دوسرے اشعار میں بھی اس مضمون کو دوسرے انداز سے بیان کیا ہے:

چو سایہ عمر بافتادگی گذشت اما
ہیچ جائے نکردیم گرم پہلو را

میری ساری زندگی سائے کی طرح افتادگی میں گذر گئی کہیں بھی اپنے پہلو کو گرم کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ ع

گراں شد زندگی امانمی افتد ز دوش من

بے صرفہ ہی گذرتی ہے ہو گرچہ عمر خضر | حیف اوقاتیکہ صرف کوشش بیجا شود
حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کئے | شیشہ عمری چہ برجاں کندن فرہاد داشت

غالبؔ | بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ انسان کو کتنی ہی طویل عمر کیوں نہ ملے وہ دنیوی امور میں ایسا منہمک ہو جاتا ہے کہ اپنی عمر کو بے صرفہ یعنی بے کار ضایع کر دیتا ہے۔ چنانچہ خضر بھی قیامت کے دن یہی کہیں گے کہ افسوس ہم نے اپنی عاقبت کے لئے کچھ کمائی نہیں کی۔ بیدل کہتے ہیں ان اوقات پر مجھے افسوس ہے جو بیجا کوششوں میں صرف ہوئے۔ فرہاد کی جانکنی پر شیشہ عمر نے کیا غضب ڈھایا۔ مطلب یہ ہے کہ فرہاد نے شیریں کے عشق میں پہاڑ کھودنا شروع کیا مگر اس کی موت کی خبر سن کر تیشے سے اپنا سر پھوڑ لیا۔ گویا اس کا سارا وقت کوشش بے جا میں صرف ہوا۔ اسی طرح بہت سے لوگ دنیا میں بیجا کوششوں میں اپنا وقت ضایع کرتے ہیں۔ بیدل اس پر افسوس کا اظہار کرتا ہے۔ غالب نے ہر کوشش کو خواہ وہ کیسا ہی ہو اضاعت عمر عزیز سے تعبیر کیا ہے جبکہ بیدل کو کوشش بیجا پر صرف ہونے والے اوقات پر افسوس ہے اور یہ بات زیادہ معقول نظر آتی ہے۔ رہا خضرؑ کا اپنی کوششوں پر افسوس کرنا یہ غالب کے ذہن کی اختراع ہے۔ حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ نیز قرآن کی رو سے غلط ہے۔

رفتارِ عمر قطع رہِ اضطراب ہے | عمرِ شرار و برق بفرصت نمی کشد
اس سال کے حساب کو برق آفتاب ہے | بیدل گذشتہ گیرد رنگ از شتاب ما

غالبؔ | بیدلؔ

غالب کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی ساری زندگی ایک اضطرابی کیفیت میں بسر ہو جاتی ہے۔ اس کی سرعتِ رفتار کا اندازہ مقصود ہو تو یوں سمجھو کہ عمر کا ایک سال ایک چشمک برق کے برابر ہے، یعنی انسان کی عمر اگر سو سال کی ہو جائے تو بھی مرتے وقت اس کو یہی محسوس ہوگا کہ میں سو لمحات یا چند ساعتوں سے زیادہ اس دنیا میں نہیں رہا۔ بیدل کہتے ہیں ہماری زندگی جو چنگاری اور برق کی سی مہلت رکھتی ہے اسے کہیں ٹھہرنے کی فرصت نہیں۔ ہماری زود گذری کا عالم یہ ہے کہ میرا ہر لمحہ ماضی کی شکل اختیار کرتا جاتا ہے۔ غالب اور بیدل دونوں نے عمر کی زود گذری کو

موضوع بنایا ہے۔البتہ غالب نے ایک نکتے کا اضافہ کیا کہ ساری زندگی ایک اضطرابی کیفیت میں بسر ہوتی ہے۔ بیدل نے اس مفہوم کوایک دوسرے شعر میں اس طرح ادا کیا ہے:

آمد و رفتِ نفس سامان شوقِ جانکنی است
زندگی تا تیشہ بردوش است فرہادیم ما

سانس کی آمدورفت درحقیقت شوق جانکنی کا سامان ہے۔ زندگی جب تک تیشہ بردوش ہے ہم فرہاد کی طرح اضطراب اور بے چینی میں زندگی گزارتے ہیں۔اس طرح غالب کے شعر میں بیدل کے ان دونوں اشعار کے مضامین کی جھلک پائی جاتی ہے۔

نظارہ کیا حریف ہو اس برق حسن کا	بہر نظارہ حسنش شوخیِ رنگِ دگر دارد
جوش بہار جلوے کو جس کے نقاب ہے	تصور چوں تواں کردن جمال بے مثالش را
غالب	بیدل

غالب کہتے ہیں کہ انسان کی آنکھ برق حسن خدا کا دیدار نہیں کرسکتی کیونکہ یہ عالم ذات باری کے جلوؤں کے لئے بمنزل نقاب ہے۔جس طرح نقاب چہرے کو چھپا لیتی ہے اسی طرح مظاہر کائنات نے ذات کو نگاہوں سے پوشیدہ کردیا ہے۔ بیدل کہتے ہیں ہر نظارے میں اس کے حسن کی شوخی کا رنگ نرالا ہوتا ہے۔اس کے حسن بے مثال کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔غالب اور بیدل دونوں نے حسنِ ذات باری کو موضوع بنایا ہے۔غالب کہتے ہیں کہ بینائی اس کے برق حسن کا حریف نہیں ہوسکتی ہے۔کیونکہ یہ ساری دنیا اس کے جلوؤں کے لئے نقاب کے درجے میں ہے۔جبکہ بیدل کہتے ہیں اس کے جمال بے مثال کے ہر دفعہ دیکھنے میں جداگانہ شوخی ہے۔اس لئے اس کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ایک دوسرے شعر میں اس مفہوم کو بیدل نے اور زیادہ واضح الفاظ میں کہا ہے:

ہر جلوہ باز شیفتہ رنگِ دیگر است
آں حسن برق نیست کہ سوزد نقاب را

یعنی ذات باری کا ہر جلوہ جدا جدا رنگ وروپ کا حامل ہے۔وہ حسن برق نہیں ہے جو نقاب کو جلا کر رکھ دے اس شعر میں غالب سے ہم آہنگ خیال کو ادا کیا گیا ہے۔

شوق کو یہ لت کہ ہر دم نالہ کھینچے جایئے
دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہے
غالبؔ

شوق می بالد گناہِ شوخیِ اظہار نیست
مطلب از دل تا بلب آید فغانی می شود
بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ عشق کا تقاضا تو یہ ہے کہ میں ہر لحہ آہ و نالہ کروں لیکن دل کی حالت یہ ہے کہ نقاہت کی وجہ سے اسے سانس لینی بھی دشوار ہو رہی ہے۔ بیدل کہتے ہیں شوق میں بالیدگی (یعنی اظہار نالہ کی خصوصیت) ہے شوخی اظہار کا گناہ نہیں ہے۔ بات جب دل سے نکل کر ہونٹوں تک آتی ہے تو وہ آہ و فغاں کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ غالب اور بیدل دونوں نے شوق کی کیفیت اور دل کی حالت کو بیان کیا ہے۔ غالب نے شوق کے تقاضے اور دل کی کیفیت کے درمیان ہونے والی کشمکش کو واضح الفاظ میں بیان کیا ہے۔ جبکہ بیدل نے شوق کے تقاضے اور دل کی کیفیت میں ایک طرح کی ہم آہنگی پیدا کی ہے۔

نسیہ و نقد دو عالم کی حقیقت معلوم
لے لیا مجھ سے مری ہمت عالی نے مجھے
غالبؔ

دین و دنیا چیست تا از الفتش نتواں گذشت
پیش ہمت ایں دو منزل یک رہِ خوابیدہ است
بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ چونکہ نسیہ و نقد یعنی دنیا اور عقبیٰ میں کوئی بھی مجد و شرف ذاتی کا خریدار نہیں ہے۔ اس لئے میری ہمت عالی نے میری شخصیت کی توہین گوارا نہ کی کہ دنیا یا عقبیٰ مجھ جیسے گوہر بے بہا کو سستے داموں خرید لیتی۔ یہی وجہ ہے کہ میری ہمت عالی نے مجھ سے مجھے خود خرید لیا۔ مقصد یہ ہے کہ میری ذات دنیا اور عقبیٰ دونوں سے بلند تر اور بالاتر واقع ہوئی ہے۔ ویسے بھی انسان کا رتبہ دونوں عالم سے اونچا ہے۔ بیدل کہتے ہیں دین و دنیا آخر ہے کیا چیز جس کی محبت سے انسان آگے نہیں نکل سکتا؟ ہمت کے سامنے یہ دونوں منزلیں ایک سوئے ہوئے راستے کی طرح ہیں۔ غالب اور بیدل دونوں نے ہمت عالی کے سامنے دین و دنیا کو بے حقیقت سمجھا ہے، اور موازنے سے پتہ چلتا ہے غالب کے اس شعر میں بیدل کے شعر کی پوری جھلک موجود ہے۔

کثرت آرائیِ وحدت ہے پرستاریِ وہم	بایں کثرت نمائی غافل از وحدت مشو بیدل
کر دیا کافر ان اصنام خیالی نے مجھے	خیال آئینہ ہا در پیش دارد شخص تنہا را
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ کثرت آرائی وحدت یعنی اہل وحدت کا کثرت موہوم کے طلسم میں گرفتار ہو جانا دراصل خیالی باتوں کی پرستش ہے۔ دوسرے الفاظ میں کثرت کو موجود سمجھنا گویا وہم کی پرستش کرنا ہے۔ ہر وہ شے جسے ہم موجود سمجھتے ہیں ایک صنم ہے جو تراشیدۂ خیال ہے۔ اس لئے اشیائے کائنات دراصل اصنام خیالی ہیں۔ چونکہ شرک فی الوجود وحدت الوجودی صوفیوں کی تعلیم کے مطابق کفر ہے اس لئے جو شخص اشیائے کائنات کو موجود سمجھتا ہے وہ کافر ہے۔ بیدل کہتے ہیں اس قدر کثرت نمائی کے باوجود تم وحدت سے غافل مت رہو۔ قوت خیالیہ ایک آدمی کے سیکڑوں آئینے سامنے رکھتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا اگر چہ دنیائے کثرت ہے مگر تم اسے وحدت تصور کرو، جیسے کوئی اکیلا آدمی ہے مگر اس کے افکار و خیالات بے انتہا ہیں خیالات کی تعدد سے اس کی وحدت میں فرق نہیں آتا۔ چنانچہ ایک اور شعر میں بیدل کہتا ہے:

کثرت نہ شد محو از ساز وحدت
ہمچوں خیالات از شخص تنہا

وحدت کے ساز کی وجہ سے کثرت محو نہیں ہوتی۔ جیسے آدمی اکیلا ہے پر اس کے خیالات وسیع ہیں۔ لیکن ایک اور شعر میں بیدل نے خالق اور مخلوق کے درمیان اتحاد پر زور دیتے ہوئے کہا ہے:

حق جدا از خلق و خلق از حق بروں اوہام کیست
تا ابد گرداب در آبست و در گرداب آب

حق کو مخلوق سے اور مخلوق کو حق سے جدا سمجھنا وہم پرستی ہے بھنور سدا پانی میں رہتا ہے اور بھنور میں سدا پانی رہتا ہے۔ غالب اور بیدل دونوں نے کثرت و وحدت کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک وحدت کی کثرت آرائی وہم پرستی ہے۔ بیدل کے نزدیک کثرت نمائی کے باوجود وحدت برقرار ہے۔

غنچہ تا شگفتن ہا برگ عافیت معلوم	تا غنچہ دم زند ز شگفتن بہار رفت
باوجود دل جمعی خوابِ گل پریشاں ہے	تا نالہ گل کند ز جرس کارواں گذشت
غالبؔ	بیدلؔ

غالب نے اس کی وضاحت خود کی ہے کہ ''کلی جب نئی نکلے تو بصورت قلب صنوبری نظر آئے اور جب تک پھول بنے برگ عافیت معلوم یہاں معلوم بہ معنی معدوم ہے۔اور برگ عافیت بہ معنی آرام۔ برگ اور سرو برگ بمعنیٰ ساز و سامان ہے۔خواب گل بہ اعتبار خموشی و باوجود دل جمعی پریشانی ظاہر ہے۔یعنی شگفتگی وہی پھول کی پنکھڑیوں کا بکھرا ہونا،غنچہ بصورت دل جمع ہے، باوصف جمعیت دل گل کو خواب پریشاں نصیب ہے (۱۴۶)''۔یعنی جس طرح غنچے کا انجام پریشانی ہے اسی طرح ہر شخص مبتلائے رنج والم ہے۔ بیدل کہتے ہیں کلی جب تک کھلے بہار رخصت ہو چکی ہوتی ہے۔نالہ جب تک جرس سے ظاہر ہو کارواں گذر چکا ہوتا ہے۔غور سے دیکھا جائے تو غالب کا مصرعہ ''غنچہ تا شگفتن ہا برگ عافیت معلوم'' بیدل کے مصرعہ ''تا غنچہ دم زند ز شگفتن بہار رفت'' کا بالکل ترجمہ ہے ۔غالب اور بیدل دونوں نے غم کی ہمہ گیری کو موضوع بنایا ہے۔غالب کے شعر پر بیدل کے شعر کا اثر پوری طرح نمایاں ہے۔

بس ہجومِ ناامیدی خاک میں مل جائے گی	آنقدر یاسم شکست آخر کہ چوں بنیاد رنگ
یہ جو اک لذت ہماری سعی بے حاصل میں ہے	قطع کرد آب و گلِ من الفتِ تعمیر را
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ ناامیدی کا لازمی نتیجہ ترک سعی ہوتا ہے۔اور عاشق کو سعی وصال میں اگر چہ وہ بے حاصل ہی کیوں نہ ہو یقیناً ایک لذت محسوس ہوتی ہے، اس لئے وہ کہتا ہے کہ اے جذبہ یاس مجھ سے دور ہو جا، کیونکہ اگر تو میرے دل پر غالب آ گیا تو میں وصال کی کوشش سے باز آ جاؤں گا۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاؤں گا اور لذت سعی سے محروم ہو جاؤں گا۔ بیدل کہتے ہیں یاس و نومیدی نے مجھے اس قدر شکستہ خاطر کر دیا کہ رنگ کی طرح میرے آب و گل نے تعمیر کی الفت کو ختم کر دیا۔غالب اور بیدل دونوں نے مایوسی کو موضوع بنایا ہے۔لیکن غالب مایوسی کے

باوجود اپنی سعی بے حاصل کو جاری رکھنا چاہتے ہیں کیونکہ اس میں لذت ہے۔ جبکہ بیدل نے اپنی سعی کا سلسلہ ختم کر دیا۔

دیکھو تو دل فریبیِ انداز نقش پا　　ز نقش پائے تو بوئے بہار می آید
موجِ خرام یار بھی کیا گل کتر گئی　　بیا کہ جبہہ نہم بر زمیں و گل چینم

غالبؔ　　بیدلؔ

غالب کہتے ہیں معشوق کے خرام ناز نے گل کترا یعنی شگوفہ چھوڑا کہ نقوش میں اس درجہ دل فریبی کی شان پیدا کر دی (یہی گل کا کترنا ہے) کہ جب اس عاشق نے وہ نقوش قدم دیکھے تو آپس میں سر پھٹول ہوگئی۔ اس طرح کہ ہر عاشق دوسروں سے یہ کہتا کہ میرے سوا اور کوئی اس نقش پا کو آنکھوں سے نہیں لگا سکتا۔ بیدل کہتے ہیں تیرے نقوش پا سے موسم بہار کی خوشبو آ رہی ہے اے محبوب اب آ بھی جا کہ تیرے سامنے زمین پر پیشانی ٹیکوں اور گل چینی کروں یعنی تیرے نقوش پا جو پھول کی حیثیت رکھتے ہیں اسے اکٹھا کروں۔ غالب اور بیدل دونوں نے نقش پائے محبوب کی دلفریبی اور دلکشی کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک محبوب کے خرام ناز نے اس کے پاؤں کے نقوش میں اس درجہ دلکشی پیدا کر دی کہ نقوش قدم دیکھنے والوں کے بیچ سر پھٹول کی نوبت آ گئی ۔ بیدل کے نزدیک محبوب کے نقوش پا سے چونکہ موسم بہار کی خوشبو آتی ہے اس لئے اس پر سر ٹیک کر گل چینی کرنے کا تذکرہ کرتا ہے۔ موازنہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب کے اس شعر میں بیدل کے شعر کا عکس موجود ہے۔

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی　　از راہِ ہوس چند دہی عرض محبت
اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی　　مکتوب نہ بندند ببال ہوس ایجا

غالبؔ　　بیدلؔ

غالب کا یہ شعر اپنی دلکشی کی وجہ سے ضرب المثل ہوگیا ہے۔ مطلب واضح ہے کہ چونکہ آج کل ہر شخص حسن پرست بن گیا ہے اس لئے سچے عاشقوں کی جو اہل نظر ہیں قدر و منزلت باقی نہیں رہی۔ بیدل کہتے ہیں ہوس کی راہ سے کب تک تو محبت کا اظہار کرتا رہے گا۔ یہاں مکتوب

عشق کو بال ہوس سے نہیں باندھتے۔ مطلب یہ ہے کہ ہوس اور عشق میں فرق ہے۔ ہوس نفسانی خواہشات کی تسکین کو کہتے ہیں جس کے پورے ہونے پر آدمی معشوق سے کنارہ کشی کر لیتا ہے۔ جبکہ عشق و محبت میں ایسا نہیں ہوتا۔ بلکہ ہر دکھ سکھ میں معشوق کا ساتھ نبھاتا ہے۔ غالب اور بیدل دونوں نے ارباب ہوس کی مذمت کی ہے۔ غالب کے نزدیک ہر ہوس پرست نے حسن پرستی یا عشق بازی شروع کر دی اس لئے اب اہل نظر یعنی سچے عاشق کی قدر و منزلت جاتی رہی۔ بیدل کے نزدیک چونکہ عشق نامہ ہوس کے بازو سے نہیں باندھتے اس لئے نصیحت کرتا ہے کہ ہوس بازی کے ذریعہ عشق کا دعویٰ مت کرو۔

فردا و دی کا تفرقہ یکبار مٹ گیا
تم کیا گئے کہ ہم پہ قیامت گذر گئی
غالبؔ

گزشت یار و من از ہر چہ بود وا ماندم
پئش نہ رفتم و از خویش ہم جدا ماندم
بیدلؔ

حالی لکھتے ہیں تمہارے جاتے ہی بہ سبب خود رفتگی اور خود فراموشی کے یہ حالت ہوگئی کہ آج اور کل کی مطلق تمیز نہیں رہی اور ایسا ہی قیامت کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہاں ماضی اور مستقبل دونوں مبدل بہ زمانہ حال ہو جائیں گے۔ پس تم کیا گئے گویا ہم پر قیامت گذر گئی۔ دونوں معنی ہیں نہایت سختی کا زمانہ گذرنا اور خود قیامت کا آجانا۔ (۱۴۷) بیدل کہتے ہیں کہ میرا محبوب سامنے سے گذر گیا اور توانائی وغیرہ کا جو سرمایہ میرے پاس تھا سب سے میں عاجز و درماندہ ہو گیا۔ میں نے اس کا پیچھا بھی نہیں کیا لیکن خود آپ سے بھی جدا ہو گیا۔ محبوب کی جدائی پر عاشق کی بیخودی کو غالب اور بیدل دونوں نے موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک محبوب کی جدائی کی وجہ سے حاصل ہونے والی خود رفتگی کی بنا پر اس پر قیامت گذر گئی جبکہ بیدل کے نزدیک محبوب کی جدائی پر عاشق نے نہ تو پیچھا کیا اور نہ خود ہوش و حواس پر قائم رہا۔ غالب کے شعر میں بیدل کے اس خیال کا عکس بالکل واضح ہے۔

مارا زمانے نے اسد اللہ خاں تمہیں
وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی
غالبؔ

طفلی گذشت و رفت جوانی ہم از نظر
پیرم کنوں و جاں بدم سرد می کنم
بیدلؔ

اگر چہ اس شعر میں غالب نے اپنی آپ بیتی نظم کی ہے مگر یہ مضمون کم وبیش ہر شخص کی زندگی پر صادق آسکتا ہے۔ کہتے ہیں زمانے کا وار ہر شخص پر چل جاتا ہے یعنی عام پیری میں نہ جوانی باقی رہتی ہے نہ جوانی کے ولولے۔ بیدل کہتے ہیں بچپن اور جوانی دیکھتے دیکھتے گزر گئی اور اب میں بوڑھا ہوا ہوں اور جان دم سرد کے ساتھ نکال رہا ہوں۔ بیدل اور غالب دونوں نے عہد جوانی اور اس کے ولولے اور حوصلے کو یاد کر کے افسوس کا اظہار کیا ہے۔ غالب کے نزدیک زمانے کا وار ہر شخص پر پڑتا ہے یعنی نہ تو عالم پیری میں جوانی رہتی ہے اور نہ جوانی کے ولولے رہتے ہیں۔ بیدل نے بچپن اور جوانی کے گذرنے کے ساتھ بڑھاپے میں سرد آہیں بھر کر جانکنی کا ذکر کیا ہے۔ بیدل نے کچھ اور اشعار بھی اسی ضمن میں کہے ہیں۔

آں رنگہا کہ داشت خیال ایں زماں کجاست
افگندہ بود آئینہ در آب روغنم

خیال جو اس رنگ وروغن کا حامل تھا اب کہاں رہا۔ آئینہ نے میری جوانی کے رنگ وروغن کو پانی میں ڈال دیا ہے۔

یارب چہ بودم و کجا رفتہ ام کہ من
ہر گہ بیاد خویش رسم گریہ می کنم

خدایا میں کیا تھا اور اب کہاں پہنچ چکا ہوں جب کبھی جوانی یاد آتی ہے تو آہ وزاری کرتا ہوں۔

مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہئے
بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہئے
غالب

در سایۂ ابرو نگہت مست و خرابست
چوں تیغ ز سر در گذرد عالمِ آبست
بیدل

آنکھ کو خرابات سے اور بھوں کو محراب مسجد سے تشبیہ دی ہے اور یہ تشبیہ بہت مشہور ہے۔ قبلہ حاجات سے واعظ وناصح مراد ہے قبلہ چونکہ مسجد کے ضلع کا لفظ ہے اس لئے یہاں بہت برمحل معلوم ہوتا ہے۔ غالب کا مطلب یہ ہے کہ اے واعظ اگر ہم نے مسجد کے زیر سایہ خرابات یعنی شراب خانہ بنا دیا ہے تو اس پر تجھے معترض ہونے کا کوئی موقع نہیں ہے کیونکہ خود خدا نے محراب ابرو کے زیر سایہ آنکھ بنائی ہے۔ شعر مضمون آفرینی کی بہت عمدہ مثال ہے۔ بیدل کہتے ہیں

بھوں کے سایہ تلے تیری نگاہ مست وخراب واقع ہوئی ہے تلوار جب سر سے گذر جاتی ہے تو وہ عالم آب ہو جاتا ہے یعنی ہر طرف خون کی ندیاں بہہ جاتی ہیں۔ غالب اور بیدل دونوں نے ابرو کے سایہ اور نگاہ کو موضوع بنایا ہے۔ البتہ غالب نے آنکھ کو خرابات اور بھوں کو محراب مسجد سے تشبیہ دے کر نکتہ آفرینی سے کام لیا کہ مسجد کے زیر سایہ شراب خانہ ہونا ایسا ہی ہے جیسے محراب ابرو کے سایہ تلے آنکھ بنی ہے۔ موازنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے شعر میں اس تشبیہ کا استعمال کرتے وقت غالب کے تحت الشعور میں بیدل کا مصرعہ ''در سایۂ ابرو نگہت مست وخرابست'' موجود تھا۔

لازم نہیں کہ خضرؑ کی ہم پیروی کریں	دریں صحرا بوضع خضر باید زندگی کردن
مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے	نگردد گم کسی کز مردماں پنہاں شود پیدا
غالب	بیدل

غالب کہتے ہیں ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ خضر ایک بزرگ آدمی ہیں جو حسن اتفاق سے ہمارے ہم سفر ہیں لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہم ان کو اپنا رہنما یا پیشوا بھی مان لیں۔ ہمارا رتبہ ان سے کم تو نہیں ہے۔ بیدل کہتے ہیں اس صحرائے امکاں میں انسان کو حضرت خضر کی وضع یعنی ان کی روش کے مطابق زندگی گزارنی چاہئے۔ جو شخص لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو کر زندگی گذارتا ہے وہ گمنام نہیں ہوتا ہے۔ غالب اور بیدل دونوں نے خضر کے اصول زندگی کی پیروی کو موضوع بنایا ہے۔ غالب نے یہاں بیدل سے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ اگر چہ وہ ہمارے ہمسفر ہیں مگر ضروری نہیں کہ ان کی روش زندگی کی ہم پیروی کریں۔ جبکہ بیدل ان کی پیروی کی تاکید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ لوگوں کی نظر سے اوجھل رہ کر گمنامی میں زندگی بسر کرنا گمنامی نہیں ہے۔

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام	تنگی بجگر بستہ ام از سختی ایام
ایک مرگ ناگہانی اور ہے	آئینہ ام و جوہر فولاد من این است
غالب	بیدل

غالب کہتے ہیں ہماری تقدیر میں جس قدر بلائیں لکھی ہوئی تھیں وہ سب ہم پر وارد ہو چکی ہیں یعنی ساری عمر مصیبتوں میں گزری ہے بس ایک مرگ ناگہانی اور رہ گئی ہے۔ واضح رہے کہ مرگ ناگہانی موت کی سب سے زیادہ تکلیف دہ صورت ہے۔ کیونکہ اس میں انسان نہ

اپنی کہہ سکتا ہے نہ دوسروں کی سن سکتا ہے۔ بیدل کہتے ہیں زمانے کی سختیوں کا ایک پتھر میں نے اپنے جگر سے باندھ رکھا ہے۔ میں تو ایک آئینہ ہوں اور یہ میرا جوہر فولاد ہے۔ غالب اور بیدل دونوں نے زمانے کی سختیوں کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک بلاؤں کی جس قدر تعداد ممکن تھی وہ سب پوری ہو چکیں لے دے کے اب صرف مرگ ناگہانی رہ گئی ہے۔ بیدل نے اگر چہ ساری زندگی سختیاں جھیلی ہیں لیکن ہمت نہیں ہاری، کیونکہ اس کی شخصیت اگر آئینہ کے درجے میں ہے تو سختیوں کا پتھر جو جگر سے بندھا ہے جوہر فولاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ بیدل نے ہمت سے کام لے کر بلاؤں کو انگیز کیا ہے۔ ع

شکستِ کار دنیا نیست تشویش دماغ من

دنیاوی امور میں ناکامی میرے دل و دماغ کے لئے موجب پریشانی نہیں رہی۔

کوئی امید بر نہیں آتی	آنقدر بر یاس پیچیدم کہ امیدی نماند
کوئی صورت نظر نہیں آتی	پای تا سر یک گرہ شد رشتہ ام از تابہا
غالبؔ	بیدلؔ

عاشقانہ زندگی کا نقشہ کھینچتے ہوئے غالب کہتے ہیں کہ نہ تو عاشقوں کی کوئی آرزو پوری ہوتی ہے اور نہ آرزو پوری ہونے کی کوئی صورت نظر آتی ہے۔ یعنی عشق میں ناکامی ہی ناکامی ہے۔ بیدل کہتے ہیں مایوسی پر میں نے اس قدر پیچ و تاب کھایا کہ کوئی امید باقی نہیں رہ گئی اس پیچ و تاب کی وجہ سے میرا سراپا ایک گرہ دار دھاگا ہو گیا۔ غالب اور بیدل دونوں نے عشق یا اپنے مقصد میں مایوسی کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کہتے ہیں عشق میں سدا مایوسی سے سابقہ ہے۔ کامیابی کی کوئی شکل دکھائی نہیں دیتی۔ بیدل کہتے ہیں کہ میں اس میں اتنا مایوس ہوا کہ میرا سراپا ایک ایسا دھاگا بن گیا جس میں گرہ پڑ گئی ہو۔ دونوں کے شعر کے موازنہ سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کے اس شعر میں بیدل کے خیال کا عکس موجود ہے۔

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب	چیست در دشت طلب با کعبہ ما را احتیاج
شرم تم کو مگر نہیں آتی	سجدہ گاہِ ماست ہر جا نقشِ پا افتادہ است
غالبؔ	بیدل

غالب خود کو مخاطب کر کے کہتے ہیں ساری عمر تو شراب نوشی اور شاہد پرستی میں گزر گئی اب کیا منہ لے کر کعبہ جاؤ گے۔ شاید تم شرم و حیا سے عاری ہو چکے ہو۔ بیدل کہتے ہیں طلب حق کے صحرا میں ہمیں کعبہ کی کیا حاجت ہے ہر وہ جگہ سجدہ گاہ ہے جہاں ہمارے قدموں کی چھاپ پڑتی ہے۔ بیدل کا خیال یہ ہے کہ خدا کی وحدانیت اگر تمہارے دل میں اس قدر پیوست ہو جائے کہ غیر کا تصور بھی نہیں آئے تو بظاہر کفر کے راستے پر رہتے ہوئے بھی تم حق پر ہو گے۔ اور اگر غیر کا تصور بھی شامل ہے تو کعبہ میں رہتے ہوئے بھی تم ننگ دیر ہو۔ غالب اور بیدل دونوں نے دخول کعبہ کو موضوع بنایا ہے۔ غالب نے چونکہ ساری زندگی شراب نوشی اور معشوق تراشی میں گزاری اس لئے کعبہ میں جاتے ہوئے شرما رہے ہیں۔ بیدل کے نزدیک اصل چیز وحدت الوجود کا تصور ہے اگر یہ چیز تمہیں حاصل ہے تو کعبہ جانے کی حاجت نہیں بلکہ اس کی آرزو فضول ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں:

یار در آغوش و سیر کعبہ و دیر آرزوست
تا کجا رفتہ است از خود شوق بے پروائے ما

محبوب آغوش میں ہے اور کعبہ اور دیر کی سیاحت کی آرزو ہے ہمارا شوق بے پروا کہاں تک خود آپ سے بیگانہ کر گیا ہے۔

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے	محبت پیشہ ای بگداز و خوں شو
آخر اس درد کی دوا کیا ہے	کہ درد عشق درمانی ندارد
غالب	بیدل

عاشق اپنے دل کو ملامت کرتا ہے کہ تو کس خبط میں مبتلا ہے تیری آرزو کبھی پوری نہیں ہو گی، یاد رکھ جس درد میں تو گرفتار ہے اس کی دوا کہیں نہیں ہے اگر اپنی زندگی چاہتا ہے تو اس خیال سے باز آ۔ بیدل کہتے ہیں تم نے عشق و محبت کو اپنا پیشہ بنایا ہے تو اس کی آگ میں جلو، پگھلو اور خون ہو جاؤ۔ کیونکہ درد عشق کا کوئی علاج نہیں۔ غالب اور بیدل دونوں نے درد عشق کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک جس درد عشق میں عاشق گرفتار ہے اس کی دوا کہیں نہیں ہے۔ بیدل کے نزدیک درد عشق میں مبتلا ہو کر عاشق کو اسے بخوشی جھیلنا چاہئے۔ کیونکہ اس کی دوا تلاش کرنی فضول

ہے۔غالب کے مصرع ''آخر اس درد کی دوا کیا ہے'' میں بیدل کے مصرع ''کہ درد عشق درمانی ندارد'' کی چھاپ پوری طرح موجود ہے بلکہ ایک طرح سے ترجمہ ہے۔درد پر بیدل کے کچھ اور اچھے اشعار ملاحظہ ہوں۔

سراپا دردم ، از مطلب مپرسید
بمکتوب آہ آہی می نویسم

با نشہ حلاوتِ درد آشنا نہ ای
چوں نے بہ نالہ پیچ وسراپا شکر برآ

بنازم بہ اقبال درد محبت
کہ تا چرخ یک نالہ بالندہ بودم

تا توانی مشق دردی کن کہ در دیوانِ عشق
نیست خطی جز دریدن نامہ ہائے سادہ را

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار	شوق می بالد بقدر رم نگاہہائے حسن
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے	ورنہ دام دلبری کو آہوان رام را
غالبؔ	بیدلؔ

حالی مرحوم نے اس کا مطلب یہ لکھا ہے کہ گویا ابھی عشق کے کوچے میں قدم رکھا ہے اور معشوق و عاشق میں جو ناز و نیاز کی باتیں ہوتی ہیں ان سے ناواقف ہے اس لئے باوجود اپنے مشتاق ہونے کے معشوق کے بیزار ہونے پر تعجب کرتا ہے (۱۴۸)۔بیدل کہتے ہیں کہ معشوق کی رم نگاہی یا گریز کے مطابق عاشق کا اشتیاق بڑھتا ہے ورنہ ہلی ہوئی ہرنیوں میں دلبری کا جال کہاں ہوتا ہے۔گویا بیدل کے نزدیک عاشق کا اشتیاق اور معشوق کی بیزاری یا گریز دونوں کے درمیان چولی دامن کا ساتھ ہے۔اس لئے یہ ایسا کوئی ماجرا نہیں ہے جس پر حیرت کا اظہار کیا جائے۔غور

سے دیکھا جائے تو غالب کے مصرع ''ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار'' میں بیدل کے مصرع ''شوق می بالد بقدر رم نگاہیہائے حسن'' کا عکس پایا جاتا ہے۔

دلدار رفت و من بہ وداعی بسوختم	ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم
یارب چہ برق بر من آتش بجاں گذشت	آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں گو آئے
بیدلؔ	غالبؔ

غالب کہتے ہیں اگر چہ وہ میرے پاس آئے لیکن ان کا آنا میری سمجھ میں بالکل نہیں آیا ،یعنی میری نگاہ میں ان کا آنا نہ آنا دونوں برابر ہے کیونکہ سیماب کی طرح انہیں بھی قرار نہ تھا اور بجلی یا شعلے کی طرح بس ایک جھلک دکھا کر چلے گئے۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انسان دنیا میں آتا ہے تو سیماب کی طرح بیقرار رہتا ہے۔ ایک گھڑی کو بھی قرار یا سکون نصیب نہیں ہوتا اور بہت جلد واپس چلا جاتا ہے۔ بیدل محبوب کی رخصتی یا زود روی پر اپنے دل پر ہونے والے اثر کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں ویسے ہی آتش بجان اور بیقرار تھا محبوب کی رخصتی اور زود روی کی وجہ سے ایک اور بجلی مجھ پر گر گئی۔ غالب اور بیدل دونوں نے محبوب کی زود روی پر اپنے ردعمل کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک اس کا آنا نہ آنا برابر ہے جبکہ بیدل کے نزدیک اس کی وجہ سے عاشق کی بے قراری میں مزید اضافہ ہوگیا۔ اور اگر غالب کے شعر کا دوسرا مطلب لیا جائے تو بیدل کے درج ذیل اشعار سے اس کا موازنہ کیا جاسکتا ہے۔

زبس عام است در وحشت سرائے دہر بیتابی
دلِ ہر ذرہ دارد در قفس چندیں طپیدنہا

اس وحشت سرائے عالم میں بیقراری اور بے کلی ایک عام بات ہوگئی ہے۔ چنانچہ ہر ذرے کا دل کھول کر دیکھو گے تو ہزاروں طپش اس کے اندر موجود ہوگی۔ اس خیال کو ایک اور شعر میں یوں ادا کرتا ہے:

ہم چو عکس آب تشویش از بنائے ما نرفت
مرتعش بودہ است گوئی پنجۂ معمارہا

پانی کے عکس کی طرح تشویش اور بے قراری ہماری بنیاد جسم سے نہیں گئی۔ گویا معمار کا پنجہ رعشہ

دار رہا ہے۔

ہاں اہل طلب کون سنے ''طعنہ نایافت''
دیکھا تو وہ ملتا نہیں ، اپنے ہی کو کھو آئے
غالبؔ

مقامِ وصل نایاب است و راہِ سعی ناپیدا
چہ می کردیم یارب گر نبودی نارسیدنہا
بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ جب انسان اپنی خودی ذات کو مٹا دیتا ہے تو خدا ملتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر جب اپنے کو کھوتا ہے تو اسے پاتا ہے۔ یہ وہ نکتہ ہے جو تمام ارباب تصوف کے نزدیک مسلم ہے لیکن غالب نے اس نکتہ کو بیان اس انداز سے کیا ہے کہ اس میں شوخی کا رنگ پایا جاتا ہے یعنی ہم اسے تلاش کرنے چلے لیکن وہ ہمیں نہ ملا۔ چونکہ ہمیں اہل طلب کا یہ طعنہ گوارا نہ تھا کہ غالب خدا کو نہ پا سکا اس لئے ہم نے اپنے آپ کو کھو دیا۔ نہ ہم ہوں گے نہ کسی کو طعنہ دینے کا موقع ملے گا۔ بیدل کہتے ہیں وصل کا مقام نایاب ہے اور کوشش کی راہ نگاہوں سے اوجھل ہے خدایا اگر نارسائی کا مسئلہ درپیش نہ ہوتا تو ہم کیا کرتے۔ اس نارسائی کی وضاحت مجنوں گورکھپوری نے اس طرح کی ہے۔

> ''جو چیز ہماری ہستی کا اصلی اور مرکزی ترکیبی عنصر ہے وہ اس امر کی دلیل ہے کہ ہماری زندگی ایک مسلسل ''نایافت'' ہے۔ ہم کو کبھی کبھی دھوکا ہو جاتا ہے کہ ہم منزل پر پہنچ گئے ہیں اور گوہر مقصود کو پالیا ہے۔ یہ دھوکا انسان کے حق میں بہت مبارک ہے اس سے اس کے اندر نئی تاب اور راہ طلب میں آگے بڑھنے کی تازہ سکت پیدا ہوتی رہتی ہے۔
>
> مقیم انجمن نارسائیم بیدل
> بہر کجا نرسد سعی کس مراد ریاب'' (۱۴۹)

غالب اور بیدل دونوں نے نایافت کو موضوع بنایا ہے۔ غالب نے اہل طلب کی نایافت کے طعن سے بچنے کے لئے اپنے کو کھو دیا ہے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خدا اسے مل گیا۔ جبکہ بیدل کے نزدیک نایافت یا نارسائی کا جذبہ انسان کے اندر آگے بڑھنے کی تازہ توانائی عطا کرتا ہے۔

کعبہ و دیر تسلی کدہ نیست
درد نایابی مطلب ہمہ جا است

کعبہ و دیر سے میری تسلی نہیں ہوتی، نایابی مطلب کی تکمیل ہر جگہ برقرار رہتی ہے۔ غالب کا ایک اور شعر بالکل اسی کا ترجمہ ہے:

دیر و حرم آئینۂ تکرار تمنا
واماندگیِ شوق تراشے ہے پناہیں

اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں
اس در پہ نہیں بار تو کعبہ ہی کو ہو آئے
غالب

یار در آغوش و سیر کعبہ و دیر آرزوست
تا کجا رفتہ است از خود شوق بے پروای ما
بیدل

غالب کہتے ہیں کہ کعبہ کا رتبہ در یار سے فروتر ہے مگر اس بات کو کہتے اس طرح ہیں کہ چونکہ ہمیں نچلے بیٹھنے کی عادت نہیں ہے ہرزہ گردی طبیعت ثانیہ بن گئی ہے۔ اس لئے جب ہم نے دیکھا کہ درِ جاناں تک ہماری رسائی نہیں ہو سکتی تو کعبہ ہی کو ہو آئے۔ بیدل کہتے ہیں محبوب آغوش میں ہے اور کعبہ و دیر کی سیاحت کی آرزو دل میں ہے۔ ہمارا شوق بے پروا کس حد تک آپ سے بیگانہ ہو گیا ہے۔ غالب کے نزدیک درِ جاناں تک اگر رسائی نہیں ہوئی تو کعبہ ہو آئے۔ بیدل کے نزدیک محبوب تو خود آغوش میں ہے:

نیست از قعر تو بیروں گوہر مقصود تو
بیخبر سر می زنی چوں موج بر ساحل چرا

تیرا گوہر مقصود تیرے دل سے باہر نہیں ہے پھر اے بےخبر آدمی موج کی طرح تو اپنا سر ساحل سے کیوں ٹکراتا رہتا ہے۔ یار جب آغوش میں ہے پھر کعبہ جانے کی کیا ضرورت رہ گئی۔ غالب نے یہاں بیدل سے اختلاف کیا ہے۔

دل ہوائے خرام ناز سے پھر
محشرستان بیقراری ہے
غالب

بیدل اثری بردہ ای از یاد خرامش
طاؤس بروں آ کہ خیال تو چمن شد
بیدل

غالب کہتے ہیں میرا دل محبوب کے خرام ناز کی آرزو میں پھر محشرستان بے قراری بنا ہوا ہے یعنی میں پھر اس کی حشر برپا کرنے والی چال سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہوں۔ بیدل کہتے ہیں اس کے خرام ناز کی یاد کا اثر تجھ پر چونکہ ہے لہٰذا تو طاؤس کی طرح منقش ہو کر نکل آ کہ تیرا خیال چمن ہو گیا۔ محبوب کے خرام ناز کو غالب اور بیدل دونوں نے موضوع بنایا ہے اس فرق کے ساتھ کہ غالب اس کی آرزو میں بے چین ہیں تا کہ اس کا لطف لے سکے۔ جبکہ بیدل پر محض اس کی یاد سے اتنا اثر ہے کہ اس کا خیال مور کی طرح سراپا چمن یعنی انواع واقسام کے رنگین معانی کی جلوہ گاہ بن گیا۔ دونوں کی اثر پذیری ان کے طرز فکر کے مطابق ہے۔

کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعی آزادی
ہوئی زنجیر موجِ آب کو فرصت روانی کی
غالبؔ

بہ فنا بود مگر ایمنی زکشاکشِ غم زندگی
کہ فتادہ برسر عافیت زنفس غبار تسلسلم
بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ ہستی کی کشاکش یا کشمکش سے آزادی کی کوشش بالکل بے سود ہے یعنی جیتے جی کسی کو آزادی نصیب نہیں ہو سکتی۔ مثال کے طور پر موج کو دیکھو وہ روانی میں آزاد ہے (فرصت بمعنی آزادی) لیکن یہی روانی اس کے حق میں زنجیر بن جاتی ہے۔ کیونکہ روانی موج سے زنجیر کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ بیدل کہتے ہیں غم زندگی کی کشاکش سے امن وامان اور آزادی شاید فنا ہو کر ہی حاصل ہو۔ کیونکہ میری سانس کی لگاتار گرد و غبار عافیت کے سر پر جمی ہوئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سانس کی مسلسل آمد و رفت کی وجہ سے آرام و عافیت کے سر پر اس کی گرد اٹی ہے اس لئے غم زندگی کی کشاکش سے رہائی کی شکل اب صرف نابود ہو جانے ہی میں نظر آتی ہے۔ بیدل اور غالب دونوں نے کشاکش ہستی یا غم زندگی سے آزادی کو موضوع بنایا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ غالب کے نزدیک اس سے آزادی کی کوشش بے سود ہے جبکہ بیدل کے نزدیک اس سے آزادی کی شکل نابود ہونے میں ہے۔ غالب کے پہلے مصرعہ ''کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعی آزادی'' میں بیدل کے پہلے مصرعہ ''بہ فنا بود مگر ایمنی زکشاکشِ غم زندگی'' کا عکس ہی نہیں موجود ہے بلکہ ایک طرح سے وہ آزاد ترجمہ ہے۔ دوسرے مصرعہ میں مثالیں دونوں نے الگ الگ دی ہیں۔

بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے | بنیاد جسد کہ کارگاہِ اسماست
جتنے زیادہ ہم ہوئے اتنے ہی کم ہوئے | روزی دو ز حکمت طبیعی برماست

غالبؔ | بیدلؔ

بر صوم و صلوٰۃ میفزا کانجا
تعدیل بہر امر کمالِ عرفاست

غالب کہتے ہیں حد اعتدال سے تجاوز کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم سب لوگوں کی نگاہ میں ذلیل ہوگئے۔ اس بات کو دوسرے مصرعہ میں شاعرانہ انداز سے بیان کیا ہے کہ جس قدر ہم اپنی حد سے بڑھے اسی قدر لوگوں کی نظروں میں گھٹ گئے۔ بیدل کہتے ہیں جسم کی اساس جو اسمائے الٰہی کی کارگاہ اور مظہر ہے دو دنوں کے لئے خدا کی حکمت طبیعی سے ہم کو ملی ہے۔ پس نماز روزے میں مبالغہ سے مت کام لے کیونکہ ہر معاملے میں اعتدال اور میانہ روی کی روش ہی عارفوں کا کمال ہے۔ ہر امر میں اعتدال اور میانہ روی غالب اور بیدل دونوں کا موضوع ہے۔ البتہ بیدل نے اعتدال کو عارفوں کا کمال بتایا ہے جبکہ غالب نے بے اعتدالی کو رسوائی کا سبب قرار دیا ہے۔ ایک اور شعر میں بیدل اس نکتہ کو دوسرے انداز سے بیان کرتا ہے:

وضع ہمواری ابنائے زماں مطلوب ماست
آدمیت گر نباشد ہر کہ خواہد خر شود

ابنائے زماں کی طبیعت میں ہمواری اور اعتدال پیدا کران ہمارا مقصد ہے انسان میں اگر انسانیت اور آدمیت نہیں ہے تو وہ گدھا ہے۔

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خونچکاں | قصہ دیوانگاں دارد سراسر نامہ ام
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے | می تراود شور زنجیر از صریرِ خامہ ام

غالبؔ | بیدلؔ

غالب کہتے ہیں اگر چہ داستان عشق لکھنے کے جرم میں محبوب نے ہمارے ہاتھ قلم کروادئے مگر ہم پھر بھی اپنے عشق کی حکایت خوں چکاں لکھنے سے باز نہیں آئے۔ بیدل کہتے ہیں میرے نامہ یعنی دیوان میں یکسر دیوانوں اور عاشقوں کی حکایات اور قصہ کہانیاں ہی ہیں۔ میرے

قلم کی آواز سے شورزنجیر بلند ہے مطلب یہ ہے کہ میں نے اپنے دیوان میں سراسر عاشقانہ مضامین ہیں یا عاشقوں کے جذبات وخیالات ہی بیان کئے ہیں۔ جن کی وجہ سے صریر قلم سے دیوانے کی زنجیر کا شور بلند ہورہا ہے۔ غالب اور بیدل دونوں نے عاشقانہ حکایات کو موضوع بنایا ہے۔ غالب نے بھی اپنے دیوان میں اسی قسم کے مضامین بیان کئے ہیں۔ چنانچہ غالب کے پہلے مصرعہ ''لکھتے رہے جنوں کی حکایات خونچکاں'' میں بیدل کے پہلے مصرعہ ''قصہ دیوانگاں دارد سراسر نامہ ام'' کی جھلک موجود ہے۔

ساقی بجلوہ دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین ہوش ہے
غالب

ہوس تسخیر معشوقان بازاری مشو بیدل
کسی تا کی پی ایں وحشیان رام بردارد
بیدل

غالب کہتے ہیں ساقی اپنا جلوہ دکھا کر تمہیں ایمان اور عقل دونوں سے محروم کرنا چاہتا ہے اور مطرب اپنا گانا سنا کر تمہیں خود داری اور عاقبت بینی سے بیگانہ بنا دینا چاہتا ہے۔ یعنی شاہدان بازاری سے دل لگانا گویا اپنی زندگی تباہ کرنا ہے۔ بیدل کہتے ہیں بازاری معشوقوں کو اپنے دام محبت میں گرفتار کرنے کی ہوس مت کرو۔ ان مانوس اور ہلی ہوئی ہرنیوں کا پیچھا کہاں تک کوئی کرے۔ غالب اور بیدل دونوں نے بازاری معشوقوں سے دل نہ لگانے کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک چونکہ وہ دشمن ایمان ویقین اور رہزن ہوش وتمکین ہیں اس لئے ان سے اجتناب چاہئے۔ بیدل کے نزدیک چونکہ وہ ہلی ہوئی مانوس ہرنیوں کی طرح کشش سے خالی اور بے وفا ہیں اس لئے ان سے اجتناب کرنا چاہئے۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے
غالب

زاں نشہ کہ قلقل بلب شیشہ دواند
صد رنگ صریر قلمم ریشہ دواند
بیدل

غالب کہتے ہیں کہ یہ دلکش مضامین عالم غیب سے میرے خیال میں آتے ہیں اس لئے میں کہہ سکتا ہوں کہ لکھتے وقت جو آواز میرے قلم سے پیدا ہوتی ہے وہ دراصل اس فرشتے کی آواز ہے جو یہ مضامین عالیہ میرے دل پر القا کرتا رہتا ہے۔ بیدل کہتے ہیں اس نشہ کی وجہ سے جولب

شیشہ پر قلقل کی بدولت پیدا ہوتا ہے۔ میرے قلم کی آواز سیکڑوں انداز سے ریشہ دوانی کرتی ہے ۔غالب اور بیدل دونوں نے صریرِ قلم سے مضامین بیان کرنے کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک وہ مضامین چونکہ عالم غیب سے اتر رہے ہیں اس لئے اس کو نوائے سروش سے اس نے تعبیر کیا ہے۔ بیدل نے قلقل کی وجہ سے شیشے پر پیدا ہونے والے نشے کو اس کا سبب قرار دیا ہے۔

در وصل ہم ز حسرتِ دیدار چارہ نیست	خار خار الم حسرت دیدار تو ہے
با عشق طالعیست کہ ما آزمودہ ایم	شوق گلچیں گلستانِ تسلی نہ سہی
بیدلؔ	غالبؔ

غالب کا مطلب یہ ہے کہ میرا شوق اگر اس کے دیدار کی لذت سے لطف اندوز نہیں ہے تو نہ سہی وہ مبتلائے رنج حسرت دیدار تو ہے اور اس کی تسلی کے لئے یہ الم حسرت ہی بہت کافی ہے۔ بیدل کہتے ہیں وصل حاصل ہونے پر بھی حسرت دیدار سے چارہ نہیں ہے۔ عشق کا ایک ایسی قسمت سے سابقہ ہے جسے ہم نے بارہا آزمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عاشق کی قسمت ہی کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ معشوق کا وصال حاصل ہونے پر بھی اس کے دیدار کی حسرت باقی رہ جاتی ہے۔ غالب اور بیدل دونوں نے حسرت دیدار کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک اگر شوق، لذت دیدار محبوب سے لطف اندوز نہیں ہے تو کم از کم الم حسرت دیدار تو حاصل ہے۔ بیدل کے نزدیک وصل معشوق حاصل ہونے پر بھی حسرت دیدار باقی رہتی ہے۔ حسرت دیدار اور شوق دیدار پر بیدل کے کئی اور اچھے اشعار ہیں۔

باز از جہاں بحسرت دیدار می رسم
آئینہ در بغل بہ در یار می رسم

بچشم بستہ غافل نیستم از شوق دیدارت
ز صد روزن ز حیرت می طپد در پردہ بادامم

حسرت چہ فسوں خواند کہ از روز وداعت
بر ہرچہ نظر افگنم رو بقفایم

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق	عشرتی گر نیست می باید بکلفت ساختن
نوحہ غم سہی نغمہ، شادی نہ سہی	دُرد ہم صافست بہر سرخوشی مخمور را
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ ہمیں تو ہنگامہ مطلوب ہے کیونکہ دنیا کی رونق ہنگامہ پر موقوف ہے ۔سکون و جمود خلاف فطرت ہے ۔اس لئے اگر نغمہ شادی نہیں ہے تو نوحہ غم ہی سہی ۔ بیدل کہتے ہیں اگر عشرت میسر نہیں ہے تو کلفت سے ہی سمجھوتہ کر لینا چاہئے ۔درد (تلچھٹ) بھی شرابی کی سرخوشی اور مستی کیلئے خالص شراب کے درجے میں ہے ۔ غالب اور بیدل دونوں نے نوحۂ غم اور نغمۂ شادی یا عشرت وکلفت کو موضوع بنایا ہے ۔غور سے دیکھا جائے تو غالب کے مصرعہ ''نوحہ غم سہی نغمہ شادی نہ سہی'' میں بیدل کے مصرعہ ''عشرتی گر نیست می باید بکلفت ساختن'' کی جھلک پوری طرح موجود ہے ۔ غالب کے نزدیک دنیا کی رونق ایک ہنگامہ پر موقوف ہے ۔وہ ہنگامہ چاہے نغمہ خوشی ہو یا نوحہ غم ہو بیدل کے نزدیک سکھ اگر حاصل نہیں ہے تو دکھ سے سمجھوتہ کر لینا چاہئے ۔جس طرح تلچھٹ بھی خالش شراب کی طرح نشہ آور ہے ایک شعر میں اس مضمون کو دوسرے انداز سے ادا کرتا ہے ۔

رنجِ غم و شادی مبر ، کو مطرب و کو نوحہ گر
مشتی سپند بیخبر دارد دریں مجمر صدا

دکھ سکھ کا رنج مت اٹھا یعنی اس سے متاثر نہ ہو ۔غور سے دیکھو کہ مطرب کہاں گئے اور نوحہ گر کہاں گئے ۔مٹھی بھر کالے دانے اس آتش دان میں اپنی آواز بلند کر کے خاموش ہو جاتے ہیں ۔

دل سے اٹھا لطف جلوہ ہائے معانی	محرم حیرت آئینہ ایں آئینہ باید بود
غیرِ گل آئینۂ بہار نہیں ہے	کہ بطوفش چہ معانی چہ صور می آید
غالبؔ	بیدلؔ

غالب نے دل کوگل سے اور جلوہ ہائے معانی کو بہار سے تشبیہ دی ہے۔ جس طرح گل وہ آئینہ ہے جس میں بہار کا جلوہ نظر آتا ہے اسی طرح دل وہ آئینہ ہے جس میں معانی کا جلوہ نظر آتا ہے۔ لہٰذا اے مخاطب تو جلوہ ہائے معانی کی بہار اپنے دل کے آئینے میں دیکھ۔ اور لطف اندوز ہو یعنی اگر تجھے عالم معانی کی سیر مطلوب ہے تو اپنے آئینہ دل کو صیقل کر۔ کیونکہ ادراک معانی کی صلاحیت صرف دل میں ہے۔ بیدل کہتے ہیں اس آئینہ دل کی حیرت کا محرم اور راز داں ہونا چاہئے ۔جس کا طواف کیسے کیسے معانی اور صورتیں کرتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ دل کی اہمیت اور قدر ومنزلت کو سمجھو جس پر دھیان مرکوز کرنے سے طرح طرح کے مضامین اور معانی صفحۂ ذہن پر ابھرتے ہیں۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کے مصرعہ ''دل سے اٹھا لطف جلوہ ہائے معانی'' میں بیدل کے پورے شعر کا عکس موجود ہے۔ بیدل نے نثر نظم دونوں میں دل کی اہمیت پر بڑی روشنی ڈالی ہے۔ چہار عنصر میں لکھتا ہے ''دل اجتماع کیفیتِ علوم است وعلوم ادراکاتِ معانی نا مفہوم'' (۱۵۰)

چہ شد آستانِ حضور دل کہ تو رنج دیر و حرم کشی
بجریدہ سبق وفا نہ زدی رقم کہ قلم کشی

پا بدامن ہو رہا ہوں بسکہ میں صحرا نورد	پا بدامن می خرامد وحشی صحرای دل
خار پا ہیں جوہرِ آئینہ زانو مجھے	آنچہ ما پیمودہ ایم از ملک طول وعرض نیست
غالب	بیدل

غالب کہتے ہیں صحرا نوردی سے ہٹ کر پابدامن ہو رہا ہوں یعنی پاؤں دامن میں سمیٹ کر بیٹھ گیا ہوں تو میرے کانٹوں بھرے پاؤں زانو کے ساتھ مل کر آئینہ میں جوہر کی سی کیفیت پیدا کر رہے ہیں۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آئینہ زانو کے جوہر پاؤں کے کانٹے معلوم ہوتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں بقول نظم طباطبائی تشبیہ کے سوا معنی میں کچھ لطف نہیں ہے۔ بیدل کہتے ہیں صحرائے دل کا وحشی پابدامن ہو کر محوِ خرام ہے جو راستہ ہم نے طے کیا ہے وہ اس ملکِ طول وعرض کا نہیں ہے۔ بیدل خود اپنی شخصیت کو صحرائے دل کا وحشی قرار دے کر کہتے ہیں کہ ہم دامن سمیٹ کر یعنی دنیا سے بے تعلق ہو کر جس جگہ پر چلے ہیں وہ اس دنیائے طول وعرض

سے تعلق نہیں رکھتا۔یعنی ماورائے دنیائے چون وچرایا عشق الٰہی سے تعلق رکھتا ہے۔غور سے دیکھئے تو غالب کے مصرعہ ''پابدامن ہورہا ہوں بسکہ میں صحرانورد'' کو بیدل کے مصرعہ ''پابدامن می خرامد وحشی صحرای دل'' سے موازنہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ غالب نے اس ترکیب کو استعمال کر کے بیدل سے مختلف مضمون بیان کیا ہے۔

دیکھنا حالت مرے دل کی ہم آغوشی کے وقت	ز نیرنگِ فسوں پردازیِ الفت چہ می پرسی
ہے نگاہِ آشنا تیرا سرِ ہر مو مجھے	تو در آغوشی و من کشتہ از دور دیدنہا
غالب	بیدل

غالب نے اس شعر میں بوقت ہم آغوشی عاشق کی نفسیاتی کیفیت بیان کی ہے۔کہتے ہیں کہ اس حالت خاص میں مجھے تیرے جسم کا ایک ایک بال نگاہِ آشنا معلوم ہوتا ہے۔یعنی مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ مجھ میں اور تجھ میں کسی قسم کی بے گانگی باقی نہیں رہی۔بیدل کہتے ہیں محبت کی فسوں پردازی کے نیرنگ کا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔تم میری آغوش میں ہوتے ہو پھر بھی تم کو اپنے سے دور سمجھ کر مرا جارہا ہوں۔یعنی ہم آغوشی کے باوجود تم سے دوری کا احساس مجھے ستارہا ہے۔غالب اور بیدل دونوں نے ہم آغوشی کے وقت عاشق کی کیفیت کو بیان کیا ہے۔یہاں غالب نے بیدل سے اختلاف کرتے ہوئے کہا ہے کہ مجھ میں اور تجھ میں کسی قسم کا فرق نہیں رہا ہے جبکہ بیدل دونوں کے بیچ دوری کے قائل ہیں۔لیکن ایک اور شعر میں بیدل نے بالکل غالب کے انداز میں عاشق ومعشوق کی یگانگت کا ذکر کیا ہے۔

نمی دانم چہ نیرنگست افسون محبت را
کہ خودرا ہم تو می پندارم و باخود سخن گویم

افسون محبت کے اندر جانے کیا خصوصیت ہے کہ خود اپنی ذات کو تمہاری ذات تصور کرتا ہوں اور خود آپ سے محوِ گفتگو ہوں۔

سائے کی طرح ساتھ پھریں سرو وصنوبر	با این قد و عارض بچمن گر بخرامی
تو اس قدِ دلکش سے جو گلزار میں آوے	گل تاج بخاک افگند و سرو علم را
غالب	بیدل

غالب کہتے ہیں اے محبوب اگر تو باغ میں چلا جائے تو سرو و صنوبر تیرے دلکش قد پر عاشق ہو جائیں اور ہر وقت تیرے ساتھ رہیں تا کہ تیرے قد کی دلکشی سے لطف اندوز ہوتے رہیں۔ بیدل کہتے ہیں اے محبوب اس قد و قامت اور عارض و رخسار کے ساتھ اگر تو چمن میں محو خرام ہو تو گل اپنا تاج اور سرو اپنا علم زمین پر رکھ دیں۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کا پورا شعر بیدل کے پورے شعر کا ترجمہ نظر آئے گا۔ اور اگر پورا شعر نہیں تو غالب کا مصرعہ ''تو اس قدِ دلکش سے جو گلزار میں آوے'' بیدل کے مصرعہ ''بااین قد و عارض بچمن گر بخرامی'' کا بالکل ہو بہو ترجمہ ہے۔ غالب اور بیدل دونوں نے محبوب کی قد و قامت کی دلکشی کو موضوع بنایا ہے اس فرق کے ساتھ کہ غالب نے سرو کے ساتھ صنوبر کو ملا کر محبوب کی ہمراہی کا تذکرہ کیا ہے، جبکہ بیدل نے اس کے سامنے گل کی تاج افگنی اور سرو کی علم افگنی کا ذکر کیا ہے۔

اس چشم فسوں گر کا اگر پائے اشارہ	بچشمِ آئینہ تا جلوہ گر شد چشم مخمورت
طوطی کی طرح آئینہ گفتار میں آوے	زمستی چوں مژہ بر یکدگر افتاد جوہر ہا
غالب	بیدل

غالب کہتے ہیں کہ محبوب کی آنکھ میں وہ جادو ہے کہ اگر وہ آئینہ کو اشارہ کر دے تو آئینہ بھی طوطی کی طرح باتیں کرنے لگے۔ طوطی اور آئینہ کی مناسبت باہمی مشہور ہے۔ بیدل کہتے ہیں تیری مخمور نگاہ جب سے چشم آئینہ میں جلوہ گر ہوئی ہے، عالم مستی میں جوہر آئینہ پلکوں کی طرح ایک دوسرے پر گرے پڑ رہے ہیں۔ غالب اور بیدل دونوں نے محبوب کی نشیلی آنکھ کا آئینہ پر ہونے والے اثر کا ذکر کیا ہے۔ غالب نے اس کو اس انداز سے بیان کیا کہ اگر وہ آئینہ کو اشارہ کرے تو آئینہ طوطی کی طرح بولنے لگے۔ جبکہ بیدل کے نزدیک جوہر آئینہ یعنی اس کی صیقل عالم مستی میں ایک دوسرے پر گرنے لگیں۔

دیتے ہیں جنت حیات دہر کے بدلے	جنت نبود چارۂ افسردگیِ دل
نشہ بہ اندازِ خمار نہیں ہے	تعمیر بہ اندازۂ ویرانۂ ما نیست
غالب	بیدل

غالب کا مطلب یہ ہے کہ اگر چہ کارکنان قضا وقدر نے مجھے مصائب دنیوی کے بدلے میں جنت دینے کا وعدہ کیا ہے مگر یہ معاوضہ ان مصائب کے مقابلے میں بہت کم ہے اس لئے قابل قبول نہیں ہے۔ بیدل کہتے ہیں جنت ہماری افسردگی دل کا علاج نہیں ہوسکتی کیونکہ تعمیر ویرانہ کے بقدر نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ناسازگار حالات یا گردش روزگار کی وجہ سے میرا دل اس قدر افسردہ ہے کہ اس کا علاج یا بدلہ جنت سے ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ یہاں مکان کی آبادی اس کی ویرانی کے مطابق نہیں ہے۔ غالب اور بیدل دونوں نے گردش روزگار کے بدلے میں جنت کے وعدے کو نا قابل قبول معاوضہ قرار دیا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کے پورے شعر میں بیدل کے خیال کا عکس نظر آئے گا۔ البتہ بیدل کے مصرعہ ''تعمیر بہ اندازۂ ویرانۂ مانیست'' کو غالب نے ''نشہ بہ انداز خمار نہیں ہے'' بلکہ غالب نے ایک فارسی شعر میں بیدل کی پوری نقل کی ہے:

جنت نہ کند چارۂ افسردگیِ دل
تعمیر بہ اندازۂ ویرانیِ مانیست

تا فضل و ہنر آئینہ پرداز نشد	ہم سخن تیشہ نے فرہاد کو شیریں سے کیا
اقبال درش بر روئے کس باز نشد	جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہے
بیدؔل	غالبؔ

غالب کہتے ہیں کہ اگر چہ فرہاد ادنیٰ طبقہ سے تعلق رکھتا تھا اور شیریں بادشاہ کی بیوی تھی مگر چونکہ وہ اپنے فن میں کامل تھا اس لئے اسے شیریں سے ہمکلامی کا موقع حاصل ہوگیا اس سے ثابت ہوا کہ ایک معمولی درجے کا انسان بھی کمال فن کی بدولت دنیا میں عزت حاصل کرسکتا ہے۔ بیدل کہتے ہیں فضل و ہنر جب تک کسی کی شخصیت کا آئینہ پرداز نہ ہو، عروج واقبال کا دروازہ اس کے سامنے نہیں کھلا۔ بیدل اور غالب دونوں نے کسب کمال کو موضوع بنایا ہے اس فرق کے ساتھ کہ غالب نے ہر میدان میں کمال کو ایک قابل قدر چیز قرار دیا ہے جبکہ بیدل نے انسان کے عروج واقبال کو فضل وکمال پر منحصر سمجھا ہے۔ ع

از ہنر آئینۂ مقدار ہر کس روشن است

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے	دریاست قطرۂ کہ بدریا رسیدہ است
کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے	جز ما کسی دگر نتواند بما رسید
غالب	بیدلؔ

غالب کا مطلب یہ ہے کہ قطرہ بذات خود بہت حقیر شئے ہے لیکن جب وہ دریا میں مل جاتا ہے تو دریا ہو جاتا ہے اس سے ثابت ہوا کہ ہر وہ فعل قابل تحسین ہے جس کا انجام اچھا ہے پس انسان کو لازم ہے کہ خدا سے ملنے کی کوشش کرے۔ بیدل کہتے ہیں جو قطرہ دریا تک رسائی حاصل کر لیتا ہے وہ دریا ہو جاتا ہے۔ غالب کے مصرعہ ''قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے'' کو بیدل کے مصرعہ ''دریاست قطرۂ کہ بدریا رسیدہ است'' سے موازنہ کر کے پڑھئے تو غالب کا مصرعہ بیدل کے مصرعہ کا بالکل لفظی ترجمہ معلوم ہوگا۔ دوسرے مصرعہ کے لئے بیدل کا درج ذیل شعر ملاحظہ ہو:

کفِ دست توانائی بسودنہا نمی ارزد
مکن کاریکہ انجامش ندامت آفریں باشد

دست توانائی کی ہتھیلی گھسے جانے کی اہل نہیں ہے، جس کام کا انجام ندامت آفریں ہو اس کو مت انجام دو۔ یہاں غالب کے مصرعہ ''کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے'' کو بیدل کے مصرعہ ''مکن کاریکہ انجامش ندامت آفریں باشد'' کے ساتھ ملا کر پڑھئے تو صاف ظاہر ہوگا کہ غالب نے مفہوم مخالف کے طور پر اس کا ترجمہ کر دیا، اس طرح غالب نے بیدل کے دو شعروں کو ایک شعر میں جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا	بیدل من و آں دولت بیدار سرِ فقر
ساغر جم سے مرا جام سفال اچھا ہے	کز نسبت او چینیِ خاموش سفال است
غالب	بیدلؔ

حالی لکھتے ہیں جام جم پر جام سفال کو کس خوبی سے ترجیح دی ہے کہ اس کی تعریف نہیں ہو سکتی اور بالکل نیا خیال ہے جو کہیں نظر سے نہیں گذرا (۱۵۱)۔ بیدل کہتے ہیں فقر کے اس دولت بیدار سے مجھ کو واسطہ ہے جس کی نسبت سے سفال یعنی مٹی کا پیالہ چینی کا پیالہ ہو گیا۔ غالب

اور بیدل دونوں نے مٹی کے پیالے کو ترجیح دی ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ غالب کے نزدیک ساغر جم سے جام سفال اس معنی میں اچھا ہے کہ اگر وہ ٹوٹ گیا تو بازار سے اور لے آئیں گے۔ جبکہ بیدل کے نزدیک مٹی کا پیالہ چینی کے پیالے سے اچھا ہے۔ بیدل نے ایک اور شعر میں مٹی کے پیالے کو غنیمت کہا ہے:

سفال خویش غنیمت شمر کہ مدتہاست
شکستِ چینی می ریخت از سر فغفور

مٹی کے پیالے کو غنیمت سمجھ کہ ایک مدت ہوئی جب فغفور (چین کے بادشاہ کا ٹائیٹل) کے سر سے ٹکرا کر چینی کا پیالہ ٹوٹ کر گر چکا ہے۔ غالب کے شعر میں بیدل کے ان دونوں شعروں کی جھلک ہے۔

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن	وصف جنت شنیدہ عبرت گیر
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے	ہر جا زر و گوہریست جز دنیا نیست
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں ہم جانتے ہیں کہ جنت کا کوئی وجود نہیں ہے۔ لیکن دل کے خوش رکھنے کو یہ خیال بہت اچھا ہے کہ دنیا میں جس قدر تکلیفیں اٹھائی ہیں ان کا نعم البدل جنت میں مل جائے گا۔ بیدل کہتے ہیں جنت کی تعریف جو تم نے سنی ہے کہ وہاں ہر طرح کا آرام نصیب ہوگا: ع

گویند بہشت است ہمہ راحت جاوید

اس سے عبرت حاصل کرو کیونکہ جہاں سونا چاندی اور روپے پیسے کی بات ہو وہ دنیا کے سوا کون سی جگہ ہوگی۔ غالب اور بیدل دونوں نے جنت کو موضوع بنایا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ غالب کے نزدیک جنت صرف دل کو خوش رکھنے کے لئے ایک خیال ہے۔ حقیقت سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ غالب کا اگر واقعی یہی نظریہ تھا تو اس کا قرآن پر ایمان متزلزل ہے اور یہ اگر تفنن طبع کے طور پر ہے تو بھی شریعت میں اس کی گنجائش نہیں ہے۔ علم کلام وعقاید کی رو سے اسلامی شعائر کا مذاق اڑانے والا اسلام کے دائرے سے خارج ہو جاتا ہے۔ بیدل جنت کی حقیقت کا انکار تو نہیں کرتے مگر یہ ضرور کہتے ہیں کہ جہاں روپے پیسے، سونا چاندی اور آرام وراحت کی سہولت ہو اسے دنیا ہی کہہ سکتے ہیں۔ دراصل اس کا نظریہ یہ ہے کہ جہاں خدا کے عشق میں انسان کا دل نہیں تڑپے

گا وہ رہنے کی جگہ نہیں اور جنت ایسی ہی جگہ ہے۔ ع

جائے کہ بداغی نطپد دل چہ مقام است

یہ نظریہ بھی قرآنی نقطہ نظر سے غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جنت کا وجود حق ہے اور اس میں آرام وراحت کے وہ سامان بھی حق ہیں جو انسان کے تصور سے ماوراہیں۔ مگر جنتیوں کو جو سب سے بڑی نعمت حاصل ہوگی وہ قرآن کے مطابق خدا کی رضا اور خوشنودی ہوگی، (ورضوان من اللہ اکبر) اور ظاہر ہے یہ رضائے الٰہی اسی کو حاصل ہوگی جس کا دل اس کے آتش عشق میں تپ رہا ہوگا اس بنا پر دونوں شاعر صراط مستقیم سے بھٹک گئے۔

خدا کے واسطے داد اس جنون شوق کی دینا	ہیچ کس از معنیِ مکتوب شوق آگاہ نیست
کہ اس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے ہم آگے	ورنہ جائے نامہ پیش یار مارا خواندنست
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں اے ہمدم خدا کے واسطے ہمارے جذبۂ عشق کی داد دینا کہ ہم اپنے خط کا جواب لینے کے لئے نامہ بر سے بھی پہلے درِ جاناں پر پہنچ گئے۔ اگر ہمیں جنون نہ ہوتا تو ایسی حماقت کاہے کو کرتے۔ بیدل کہتے ہیں میرے مکتوب شوق کے مفہوم سے کوئی شخص واقف نہیں ہے نہیں تو خط کی جگہ مجھے محبوب کے روبرو بلانا تھا۔ غالب اور بیدل دونوں نے جنون شوق کی انتہا کا ذکر کیا ہے۔ انداز بیان البتہ الگ ہے۔ غالب کے نزدیک جنون شوق کی انتہا یہ ہے کہ خط کا جواب لینے کے واسطے عاشق نامہ بر سے پہلے ہی آستانہ یار پر پہنچ گیا۔ بیدل کے نزدیک شوق نامہ کے مضامین میں جنون عشق کی جس انتہا کا ذکر ہے اس سے محبوب واقف نہیں ہے نہیں تو خط کے بجائے وہ عاشق کو اپنے پاس بلالیتا۔ یہاں بیدل نے جس بات کی تمنا کی ہے غالب کو وہ حاصل ہے۔

نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا اور اب	اے فغاں بگذر ز چرخ ولامکاں تسخیر باش
لب تک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے	چند در زیر سپر کردن نہاں شمشیر را
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں ابتدائے عشق میں میرے اندر اس قدر طاقت تھی کہ میرا نالہ عرش سے

بھی پرے چلا جاتا تھا مگر اب ضعف کا یہ عالم ہے کہ اگر بہت رسا ہوا تو لب تک آ جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب میں نالہ بھی نہیں کر سکتا۔ بیدل کہتے ہیں اے آہ و فغاں آسمان پار کر کے لامکاں کو اپنے بس میں کر لے۔ اپنی تلوار کو کب تک ڈھال میں چھپا تا رہے گا۔ غالب اور بیدل دونوں نے نالہ کے عرش کے پار پہنچنے کو موضوع بنایا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ غالب میں اتنی توانائی تھی کہ اس کا نالہ عرش کے پار تک رسائی حاصل کر لیتا تھا لیکن ناتوانی کی وجہ سے اب صرف لب تک پہنچ کر رہ جاتا ہے۔ جبکہ بیدل نالہ کو عرش کے پار لامکاں تک پہنچانے کی ہدایت کرتے ہیں، گویا بیدل جو چاہتے ہیں غالب کو وہ چیز پہلے سے حاصل تھی۔ مگر ایک اور شعر میں بیدل اپنی ناتوانی کی وجہ سے دست نالہ کی کوتاہی کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں:

چساں بدوش اجابت رسائمش بیدل
کہ از ضعیفی من دست نالہ کوتاہ است

نالہ کو دوش اجابت تک کیسے پہنچاؤں کیونکہ میری ناتوانی کی وجہ سے اس کا ہاتھ کوتاہ واقع ہوا ہے۔ بیدل کے اس شعر کا عکس غالب کے شعر میں موجود ہے۔

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ "تو کیا ہے"
تم ہی کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے
غالبؔ

گفتی چہ کسی در چہ خیالی بکجائی
بیتاب تو ام، محو تو ام، خانہ خرابم
بیدلؔ

غالب کہتے ہیں تم میری ہر بات پر یہ کہتے ہو کہ میرے سامنے تیری حقیقت کیا ہے یعنی تو بہت ذلیل ہے تم خود ہی انصاف کرو یہ انداز گفتگو تہذیب سے کس قدر گرا ہوا ہے۔ بیدل محبوب سے کہتے ہیں تم نے کہا تم کون ہو، کس خیال میں ہو، کہاں ہو؟ جواب اس کا یہ ہے کہ میں تمہارا بیقرار عاشق ہوں، تمہارے اندر کھویا ہوا ہوں اور خانہ خراب ہوں۔ غالب اور بیدل دونوں نے محبوب کے اس سوال کو کہ تم کیا ہو کون ہو؟ کا ذکر کیا ہے۔ عاشق نے جو جواب محبوب کے سوال کا دیا اسے غالب نے اس طرح ادا کیا ہے۔ "یعنی تم ہی کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے" جب کہ بیدل نے نہایت وضاحت سے جواب دیا ہے۔ محبوب کے سوال اور عاشق کے جواب کا انداز بیدل کے یہاں غالب سے بہتر معلوم ہوتا ہے۔ یعنی تم کون ہو؟ کس خیال میں ہو؟ کہاں کھوئے ہوئے

و؟اس کے لحاظ سے جواب بھی اسی انداز سے طویل ہے۔

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا	عمری بفنون نظم مائل گشتم
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے	چندی با نثر نیز شاغل گشتم
غالب	بیدلؔ

دیدم کرم تو سخت بے پایانست
عاری ماندم ز شکر و بیدل گشتم

غالب یہ کہتے ہیں کہ شہر دہلی ان کی کوئی عزت نہیں تھی ۔مگر جب سے وہ بادشاہ کا مصاحب بنا ہے اس وقت سے اتراتا پھرتا ہے۔یعنی اس کو جو کچھ عزت حاصل ہے وہ مصاحبت بادشاہ کی بنا پر ہے۔ بیدل نے ان اشعار میں اپنے محسن اور سرپرست نواب شکر اللہ خاں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ زندگی کا ایک حصہ مختلف اصناف کلام میں طبع آزمائی میں گذارا، کچھ دنوں نثر نگاری بھی کی جب دیکھا کہ تیرے کرم اور عنایت کی کوئی حد نہیں ہے تو شکر سے عاجز ہو کر بیدل ہوگیا۔غالب اور بیدل دونوں نے اپنے محسن کا ذکر کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ بیدل کو نواب شکر اللہ خاں جیسا محسن اور سرپرست نصیب ہوا غالب کو بہادر شاہ ظفر بادشاہ ہونے کے باوجود ویسے محسن اور سرپرست ثابت نہ ہوئے۔ کیونکہ نواب موصوف نے بیدل کو رہنے کے لئے ایک مکان خرید کر دیا اور خرچ کے لئے ساٹھ روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا تھا (جو آج کے لحاظ سے ساٹھ ہزار سے بھی زیادہ ہوگا) جس کی وجہ سے وہ پوری یکسوئی کے ساتھ اپنی شاعرانہ تخلیقات میں مصروف رہے۔

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو	شاید بنگاہی کنندم شاد و بخواند
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے	مکتوب امیدم برسانید بیارم
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں خط لکھنے سے کوئی نتیجہ برآمد وہ یا نہ ہو مگر ہم تمہیں مسلسل خط لکھتے رہیں گے۔ کیونکہ ہم تو تمہارے نام کے عاشق ہیں یعنی اس بہانے تمہارا نام لکھنے کا موقع ملتا رہے گا۔ بیدل کہتے ہیں میرا مکتوب امید میرے محبوب تک پہنچا دو۔شاید اپنی ایک نظر کرم سے مجھے

خوش کر کے اپنے پاس بلا لے۔ غالب اور بیدل دونوں نے عشق نامہ لکھنے کا تذکرہ کیا ہے اس فرق کے ساتھ کہ غالب چونکہ اس کے نام کے عاشق ہیں اس لئے خط لکھنے کا کوئی نتیجہ چاہے برآمد نہ ہو خط لکھتے رہیں گے۔ جبکہ بیدل اس امید پر خط بھیج رہے ہیں کہ شاید محبوب ایک نظر دیکھ کر خوش کر دے اور پھر بلا لے۔

عشق نے غالب نکما کر دیا ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے
غالبؔ

صرف نقصانیم دیگر از کمال ما مپرس
عشق پر کردہ است آغوش ہلال از ماہ ما
بیدلؔ

غالب کہتے ہیں ہمیں عشق نے نکما و بیکار کر دیا، یعنی ہماری زندگی تباہ کر دی، ورنہ اس سے پہلے ہمارے اندر بہت سی خوبیاں تھیں یا کام کرنے کی سکت تھی۔ یہاں لطف زبان قابل داد ہے۔ بیدل کہتے ہیں ہمارے کمال کا حال کچھ نہ پوچھو، ہم تو ہمیشہ زوال پذیر رہے ہیں۔ عشق نے آغوش ہلال کو میرے چاند سے بھر دیا ہے۔ غالب اور بیدل دونوں نے عشق کی کارفرمائی کا ذکر کیا ہے اس فرق کے ساتھ کہ غالب کے نزدیک عشق نے نکما کر دیا جبکہ بیدل کے نزدیک اسے زوال پذیر کر دیا۔

خلش غمزۂ خونریز نہ پوچھ دیکھ خوں نابہ فشانی میری
غالبؔ

نشہ صد خم شراب از چشم مستت غمزہ ای
خونبہائے صد چمن از جلوہایت یک ادا
بیدلؔ

غالب کہتے ہیں تو مجھ سے اپنے غمزہ خونریز کی خلش کا حال کیا پوچھتا ہے میری خوں نابہ فشانی کو ایک نظر دیکھ لے تو تجھے خود ہی اندازہ ہو جائے گا۔ بیدل کہتے ہیں اے محبوب! تیری مست آنکھ کا ایک غمزہ سیکڑوں خمہائے شراب کے نشے کا حامل ہے۔ تیرے جلوؤں کی ایک ادا سیکڑوں چمن کی خونبہا ہے۔ غالب اور بیدل دونوں نے محبوب کے غمزے کا ذکر کیا ہے اس فرق کے ساتھ کہ غالب اس کے غمزہ کو خوں ریز قرار دے کر اس کی خلش کی وجہ سے خوں نابہ فشانی کر رہے ہیں۔ جبکہ بیدل اس کے غمزہ سے حاصل ہونے والے نشہ کا تذکرہ کرتے ہیں جو شراب کے

سیکڑوں مٹکے خالی کردینے سے حاصل ہوتا ہے۔غمزہ کے سلسلے میں دونوں کی اپروچ الگ الگ ہے۔

یہ عمر بھر جو پریشانیاں اٹھائی ہیں ہم نے | ما جنوں شیفتگاں امت آشفتگیم
تمہارے آئیو، اے طرہ ہائے خم بہ خم آگے | وضع مارا بسرِ زلف پریشاں قسم است

غالب | بیدلؔ

غالب کہتے ہیں معشوق کی زلفو! خدا کرے وہ سب پریشانیاں جو ہم نے تمھاری جدائی میں اٹھائی ہیں تمہارے آگے آئیں یعنی تم بھی میری طرح ساری عمر پریشان رہو۔اس شعر میں خوبی یہ ہے کہ شعرا ہمیشہ زلف محبوب کو پریشان باندھا کرتے ہیں۔کیونکہ عاشق کو اپنے معشوق کی زلف پریشاں بہت دلکش معلوم ہوتی ہے۔بیدل کہتے ہیں ہم جنوں شیفتہ لوگ آشفتگی کی امت ہیں، ہماری حالت کو زلف پریشانِ محبوب کے ساتھ قسم ہے۔مطلب یہ ہے کہ ہم جنوں زدہ یا جنوں شیفتہ لوگ سدا حیران و پریشان رہتے ہیں اس حد تک کہ ہم کو اگر ایک آشفتہ قوم کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ہماری حالت کو محبوب کی زلف پریشاں سے ہم آہنگی کی قسم ہے، غالب اور بیدل دونوں نے عاشق کی عمر بھر کی پریشانیوں کا ذکر کیا ہے۔غور سے دیکھا جائے تو غالب کے مصرعہ ''یہ عمر بھر جو پریشانیاں اٹھائی ہیں ہم نے'' میں بیدل کے مصرعہ ''ما جنوں شیفتگاں امت آشفتگیم'' کا عکس پوری طرح موجود ہے۔دوسرے مصرعہ میں البتہ الگ ہو گئے۔غالب نے بددعا کے رنگ میں دعا دی کہ تم بھی میری طرح ساری عمر پریشان رہو۔جبکہ بیدل نے اپنی آشفتگی کو محبوب کی زلف پریشاں سے ہم آہنگی کی قسم کا ذکر کیا ہے۔

دہن اس کا جو نہ معلوم ہوا | اسرار دہانت بتامل نتواں یافت
کھل گئی ہیچ مدانی میری | از فکر کسی رہ نہ برد راہِ عدم را

غالب | بیدلؔ

غالب کہتے ہیں چونکہ میں اس کے دہن کی کیفیت معلوم نہ کرسکا (معشوق کے دہن کو عموماً معدوم وغیر معلوم باندھا کرتے ہیں) اس لئے میری نادانی، جہالت یا لاعلمی ثابت ہوگئی۔بیدل کہتے ہیں اس کے دہن کے اسرار کو غور خوض کر کے بھی نہیں پایا جاسکتا۔غور خوض سے کوئی آدمی عدم کی راہ طے

نہیں کرسکا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ محبوب کا دہن اپنی نزاکت کی وجہ سے معدوم ہے۔ اس لئے غور فکر کر کے بھی اس کا پتہ لگانا مشکل ہے، بھلا عدم کی راہ کو کوئی غور فکر کر کے طے کرسکا ہے جو وہ طے کریں گے۔ غالب اور بیدل دونوں نے محبوب کے دہن کی معدومی کا ذکر کیا ہے۔ بیدل کے نزدیک تامل اور تدبر سے بھی اس کا سراغ نہیں لگایا جاسکتا۔ غالب نے اس سے ایک نکتہ یہ پیدا کیا کہ اس کی وجہ سے ہم کو اپنی جہالت اور لاعلمی کا اندازہ ہوا۔

اس لب سے مل ہی جائے گا بوسہ کبھی تو ہاں ۔۔۔ شوق فضول و جرأت رندانہ چاہئے
غالبؔ

بخاموشی طلب از لعل یار کام امید ۔۔۔ کہ بوسہ رو ندہد تا بہم نیاری لب
بیدلؔ

غالب کہتے ہیں بوسہ لب جاناں کے لئے شوق بے پایاں اور جرات رندانہ درکار ہے۔ بیدل کہتے ہیں لب یار سے اگر کامرانی مقصود ہے یعنی اس کا بوسہ لینا چاہتے ہو تو خاموشی سے اس مقصد کو پورا کرو، کیونکہ بوسہ تب تک رونما نہیں ہوسکتا جب تک ہونٹ باہم نہ ملائیں۔ مطلب یہ ہے کہ محبوب کے ہونٹوں کا بوسہ تو خاموشی سے ہی لیا جاسکتا ہے۔ غالب اور بیدل دونوں نے محبوب کے لب کے بوسے کو موضوع بنایا ہے اس فرق کے ساتھ کہ غالب کے نزدیک اس کے لئے شوق بے پایاں اور جرأت رندانہ چاہئے جب کہ بیدل کے نزدیک خاموشی درکار ہے۔

صحبتِ رنداں سے واجب ہے حذر ۔۔۔ جائے مے اپنے کو کھینچا چاہئے
غالبؔ

از مئے حذر کنید کہ ایں دشمن حیا ۔۔۔ کاری کہ از ادب نتواں کردمی کند
بیدلؔ

غالب نے یہ شعر ایہام گوئی کی خاطر موزوں کیا ہے۔ کھینچنے کے دو معنی ہیں دور رہنا، یا باز رہنا، اور شراب کھینچنا یعنی شراب پینا، مطلب یہ ہے کہ مئے نوشوں کی صحبت سے دور رہنا چاہئے۔ بالفاظ دیگر مئے کشی کے بجائے مئے سے کنارہ کشی کرنا چاہئے۔ بیدل کہتے ہیں شراب سے حذر یعنی اجتناب کرو کیونکہ یہ دشمن حیا ہے جو کام ادب کے تقاضے کی وجہ سے نہیں کیا جاسکتا اسے انجام دیتی ہے۔ بیدل و غالب دونوں نے مئے کشی سے اجتناب کو موضوع بنایا ہے۔ غور سے

دیکھا جائے تو غالب کے پورے شعر میں بیدل کے مصرعہ ''از مئے حذر کنید کہ ایں دشمن حیا'' کا عکس موجود ہے۔

اپنی رسوائی میں کیا چلتی ہے سعی	رسوائی و عشق ، مستوری و حسن
یار ہی ہنگامہ آرا چاہیئے	مجنوں و صحرا ، لیلیٰ و محمل
غالب	بیدل

غالب کہتے ہیں ہم لاکھ رسوائی کی کوشش کریں کچھ نہیں ہوسکتا۔ ہاں محبوب ہی اگر اپنا جلوہ دکھاتا رہے تو ہم مست و بیخود ہو جائیں گے اور یہ حالت یقیناً رسوائی کا موجب ہو جائے گی۔ بیدل کہتے ہیں عاشق ورسوائی، معشوق و مستوری لازم ملزوم ہیں جس طرح مجنوں وصحرا اور لیلیٰ و محمل میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ غالب اور بیدل دونوں نے رسوائی عاشق کو موضوع بنایا ہے۔ بیدل کے نزدیک عاشق کی رسوائی فطری امر ہے اس میں اس کی سعی کا کوئی دخل نہیں ہے۔ جبکہ غالب کے نزدیک محبوب اپنا جلوہ دکھا کر عاشق کی رسوائی کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ گویا غالب نے بیدل سے اس امر میں اختلاف کیا۔

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید	با کہ باید گفت بیدل ماجرائے آرزو
نا امیدی اس کی دیکھا چاہیئے	آنچہ دل خواہ منست از عالمِ ادراک نیست
غالب	بیدل

غالب کہتے ہیں وہ شخص کتنا نا امید ہوگا جس کی سب سے بڑی امید یا آرزو یہ ہو کہ اسے موت آجائے تو تمام غموں سے رہائی حاصل ہو جائے۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ شخص کتنا بدنصیب ہے جس کی آرزو کا حصول موت پر منحصر ہے۔ ظاہر ہے جب انسان مر گیا پھر آرزو برآئی تو کیا حاصل۔ بیدل کہتے ہیں آرزو کا ماجرا بھی کس سے بیان کیا جائے۔ جو چیز میری من پسند ہے وہ عالم ادراک سے باہر ہے۔ غالب و بیدل دونوں نے آرزو کو موضوع بنایا ہے ۔غالب کے نزدیک وہ شخص کتنا بدنصیب ہے جس کی آرزو کا حصول موت پر موقوف ہو۔ موت کے بعد اگر آرزو پوری ہی ہوئی تو اس کا کیا حاصل۔ بیدل کے نزدیک ایسے آدمی کی آرزو کا حال

کس قدر نا گفتہ بہ ہے کہ جو چیز اس کی من پسند ہے وہ ماورائے ادراک ہے۔ نہ وہ چیز ملے گی نہ آرزو شرمندۂ تکمیل ہوگی۔

ہر قدم دوری منزل ہے نمایاں مجھ سے	بر امید وصل مشکل نیست قطع زندگی
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے	شوق منزل می کند نزدیک راہ دور را
غالبؔ	بیدلؔ

غالبؔ کہتے ہیں کہ قاعدہ یہ ہے کہ مسافر کا ہر قدم اس کی منزل کو نزدیک کر دیتا ہے۔ مگر میری بدقسمتی دیکھو کہ جس قدر آگے بڑھتا ہوں منزل اسی قدر دور ہوتی جاتی ہے۔ بیدل کہتے ہیں وصل کی امید میں زندگی کی راہ طے کرنا مشکل نہیں ہے۔ منزل کا شوق دور دراز راستے کو بھی نزدیک بنا دیتا ہے۔ بیدل اور غالب دونوں نے منزل پر رسائی کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک بدقسمتی کا عالم یہ ہے کہ جس قدر آگے بڑھتے ہیں منزل اسی قدر دور ہوتی جاتی ہے۔ جبکہ بیدل کے نزدیک اگر منزل پر پہنچنے کا واقعی شوق ہو اور اس کا دھن ہو تو دور دراز مسافت کو بھی وہ قریب کر دیتا ہے۔ ایسا آدمی دوری منزل کا شکوہ نہیں کرتا۔ بات شوق منزل پر آ کر ٹھہرتی ہے۔ بیدل نے اس موضوع پر بہت سے اچھے اشعار کہے ہیں:

شوق می گویدم پر افشاں باش
طالب آنچہ یافت نتواں باش

شوق مجھ سے کہتا ہے اپنی کوششوں کا سلسلہ جاری رکھو، جو چیز حاصل نہیں ہو سکتی اس کو حاصل کرو۔

شوق در بیدست پائی نیست مایوسِ طلب
چوں قلم سعی قدم می بالد از مژگان ما

شوق بے دست و پائی میں بھی مایوس طلب نہیں ہوتا۔ قلم کی طرح پلکوں کے بل ہمارا قدم چلنے لگتا ہے۔

بیخودی بسترِ تمہید فراغت ہو جو	ہزار جلوہ در آغوش بیخودی محو است
پُر ہے سایہ کی طرح میرا شبستاں مجھ سے	جہاں شعور طلب می کند تو خواب طلب
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں خدا کرے میری بیخودی میری فراغت یعنی راحت کا سبب بنی رہے چونکہ اس کی وجہ سے میرا گھر مجھ سے اسی طرح معمور ہے جس طرح سایہ کا گھر سایہ سے معمور ہوتا ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں خدا میری بے خودی کا بھلا کرے جس کی بدولت میں اپنے گھر میں آرام سے لیٹا ہوا ہوں۔ بیدل کہتے ہیں بیخودی کی آغوش میں ہزاروں جلوے محو ہیں دنیا شعور طلب کرتی ہے تو خواب طلب کر۔ بیخودی یعنی لاشعوری یا مست مولیٰ رہنا غالب اور بیدل کا موضوع ہے۔ غالب دعا کے طور پر کہتے ہیں کہ خدا کرے میری بیخودی میری راحت کا سبب بنے۔ بیدل کے نزدیک بیخودی میں آرام وراحت اور سکون ودلجمعی کے ہزاروں جلوے نہاں ہیں اس لئے کہتے ہیں کہ دنیا اگر شعور کے چکر میں ہو تم پیر پھیلا کر آرام سے سو رہو۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کے مصرعہ ''بیخودی بسترِ تمہید فراغت ہو جو'' میں بیدل کے پورے شعر کا عکس موجود ہے۔

حسن ہرجا دست بیداد تجلی واکند	گردشِ ساغر صد جلوہ رنگیں تجھ سے
نیست جز حیرت کسی فریاد رس آئینہ را	آئینہ داریِ یک دیدۂ حیراں مجھ سے
بیدلؔ	غالبؔ

غالب کہتے ہیں اگر جلوہ حسن کا تعلق تجھ سے ہے تو حیرانیِ عشق کا تعلق مجھ سے ہے۔ یعنی اگر تیرا کام جلوہ دکھا کر مست وبیخود بنانا ہے تو میرا کام آئینہ کی طرح محو حیرت ہو جانا ہے۔ دوسرے الفاظ میں تیرے حسن کا تقاضا ہے کہ تو جلوہ دکھائے اور میرے عشق کا تقاضا ہے کہ مجھے حیران کرے۔ بیدل کہتے ہیں حسن (معشوق) جہاں بھی بیداد تجلی کا ہاتھ دراز کرتا ہے آئینہ دل کا فریاد رس حیرت کے سوا کوئی چیز نہیں ہوتی۔ مطلب یہ ہے کہ محبوب جب تجلی دکھاتا ہے تو عاشق پر حیرت واستعجاب کا عالم طاری ہوتا ہے۔ غالب اور بیدل دونوں نے حسن وعشق یا معشوق وعاشق کے کرشموں کا ذکر کیا۔ غالب کے نزدیک حسن کا کرشمہ یہ ہے کہ وہ جلوہ دکھائے اور عشق کا کرشمہ یہ ہے کہ وہ حیران کرے۔ بیدل بھی حسن وعشق کی اسی کیفیت کا ذکر کرتے ہیں انداز بیان البتہ الگ ہے۔ غالب کے اس شعر پر بیدل کے شعر کا اثر پوری طرح نمایاں ہے۔

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے	نتواں یافت از آں جلوۂ نیرنگ سراغ
پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے	مگر آئینہ کنی دیدۂ قربانی را
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ اس میں کچھ شک نہیں یہ کائنات بذات خود کچھ نہیں ہے۔ محض اس کی جلوہ گری ہے مگر چونکہ وہ خود اس پردے میں پوشیدہ ہوگیا ہے اور عوام الناس اس پردے کو اٹھا نہیں سکتے اس لئے وہ عرفان حقیقت سے محروم ہیں۔ یعنی بالیقین نہیں کہہ سکتے کہ اسی کی جلوہ گری ہے۔ ہاں جو لوگ اہل معرفت ہیں وہ جانتے ہیں کہ بلاشبہ کائنات اسی کی جلوہ گری ہے۔ یعنی ان مظاہر سے وہی ظاہر ہو رہا ہے۔ بیدل کہتے ہیں اس جلوۂ نیرنگ کا سراغ نہیں لگایا جاسکتا جب تک تو دیدۂ قربانی کو آئینہ نہیں بناتا۔ مطلب یہ ہے کہ اس معشوق ازلی کے جلوے تک اسی وقت رسائی حاصل کرسکتے ہیں جب اپنی آنکھ کو اس پر قربان کردیں۔ یعنی فنافی المعشوق ہوجائیں۔ اس وقت یہ دیدہ قربانی آئینہ بن کر اس جلوہ کو دیکھ سکے گی۔ غالب اور بیدل دونوں نے خدا کے جلوے یا مظاہر کو موضوع بنایا ہے اس فرق کے ساتھ کہ غالب کے نزدیک مظاہر قدرت اس کی جلوہ گری تو ہے پر وہ خود اس پردے کے پیچھے چھپا ہے۔ اور عام لوگوں میں اس پردے کو اٹھانے کی صلاحیت نہیں۔ ہاں اہل اللہ اس پردے کو اٹھانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ بیدل کے نزدیک فنا فی المعشوق ہی اس کے جلوے کا سراغ لگا سکتا ہے۔ اس طرح دونوں ایک ہی نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کے شعر میں بیدل کے شعر کا ارتعاش موجود ہے۔

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب	بہ طبع کارگہِ عشق آتش افتادہ است
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے	کسی چہ آب دہد آشیانِ فاختہ را
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں عشق پر کسی کا زور نہیں چل سکتا کیونکہ یہ وہ آگ ہے کہ ہم اگر کسی کے دل میں لگانا چاہیں تو لگا نہیں سکتے اور کسی کی آگ بجھانا چاہیں تو بجھا نہیں سکتے۔ یعنی کوئی شخص نہ کسی کو اختیار عشق پر راغب کرسکتا ہے نہ ترک پر۔ بیدل کہتے ہیں فاختہ کے آشیانے میں جو عشق کی کارگاہ ہے (فاختہ اور عشق میں باہمی مناسبت ہے اور فاختہ کو عاشقی معشوقی کا سمبل قرار دیا گیا

ہے) آگ لگی ہوئی ہے۔کون آ کر اس پر پانی چھڑکے۔ غالب اور بیدل دونوں نے عشق کو ایک آگ قرار دیا۔غالب کے نزدیک یہ آگ ایسی ہے جس پر کسی کا بس نہیں۔ نہ تو وہ کسی کے لگانے سے لگتی ہے اور نہ بجھانے سے بجھتی ہے۔ بیدل کے نزدیک آشیانہ فاختہ میں جو علامت ہے خانہ عاشق سے عشق کی ایسی آگ لگی ہے جس پر پانی چھڑک کر بجھانے کی کسی میں جرأت نہیں ہے۔اس طرح دونوں عشق کی آگ پر اپنی بے بسی کا اظہار کرتے ہیں۔اس طرح غالب کے کلام پر بیدل کے خیال کا اثر نمایاں ہے۔

جلوے کا تیرے وہ عالم ہے کہ گر کیجئے خیال	بیدل غیر از خیال جلوہ ات نقشی نمی یابم
دیدۂ دل کو زیارت گاہِ حیرانی کرے	بجز حیرت کسی در خانۂ آئینہ کی باشد
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں تیرا جلوہ اس قدر دلکش ہے کہ دیکھنا درکنار محض اس کے تصور سے عاشق کا دل یعنی عاشق سراپا حیرت بن جاتا ہے۔بیدل کہتے ہیں تیرے جلوے کے خیال کے سوا کوئی اور نقش نہیں ہے۔خانہ آئینہ میں حیرت کے سوا کون سی چیز رہتی ہے۔غالب اور بیدل دونوں نے جلوۂ محبوب کے تصور کو موضوع بنایا ہے۔غالب کے نزدیک اس کے تصور سے عاشق کا دل سراپا حیرت بن جاتا ہے جبکہ بیدل کے نزدیک عاشق کے آئینہ دل میں حیرت جاگزیں ہوجاتی ہے۔صاف ظاہر ہے کہ غالب کا یہ خیال بیدل کے اس شعر سے ماخوذ ہے۔

میکدہ گر چشم مستِ ناز سے پائے شکست	نشہ صد خم شراب از چشم مستت غمزہ ای
موئے شیشہ دیدۂ ساغر کی مژگاں کرے	خونبہائے صد چمن از جلوہ ہایت یک ادا
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں اگر محبوب کی ناز آفریں مست نگاہوں کے مقابلے میں میکدہ شکست پا جائے یعنی ٹوٹ جائے تو چونکہ یہ فعل اس کی آنکھوں نے کیا ہے اس لئے ساغر کے ٹوٹنے سے جو بال اس میں پڑے گا وہ بھی چشم ساغر کی پلک بن جائے گا یعنی بہت دلکش معلوم ہوگا۔محبوب کی چشم مست حسین ہی نہیں ہے بلکہ حسن آفریں بھی ہے جس شئے پر پڑ جاتی ہے اسے بھی حسین بنادیتی

ہے۔ نیاز فتح پوری اس کا مطلب یہ لکھتے ہیں کہ "چشم یار سے جو مستی اور بے خودی پیدا ہوتی ہے وہ خم کا خم پی جانے کے بعد بھی حاصل نہیں ہوتی، اور یہ بات میکدے کے لئے اتنی باعث شرم ہے کہ ساغر بھی اس کو دیکھ کر آنکھیں نیچی کر لیتے ہیں" (۱۵۲) بیدل کہتے ہیں تیری چشم مست کا ایک اشارہ شراب کے سیکڑوں مٹکے کے نشے کا حامل ہے اور تیرے جلوے کی ایک ادا سیکڑوں چمن کا خوں بہا ہے۔ بیدل اور غالب دونوں نے چشم مست محبوب کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک محبوب کی ناز آفریں مست نگاہوں کے مقابلے میں میکدے میں شکست و ریخت کا عمل جاری ہے۔ بیدل کے نزدیک محبوب کی چشم مست کے ایک اشارے میں نشے کی جو کیفیت ہے وہ شراب کے سیکڑوں مٹکے سے حاصل ہونے والے نشہ کے برابر ہے۔ بیدل نے محبوب کی چشم مست پر کئی اچھے اشعار کہے ہیں۔

بچشم آئینہ تا جلوہ گر شد چشم مخمورت
زمستی چو مژہ بر یک دگر افتاد جوہر ہا

اے ز چشم مئے پرستت مست حیرت جامہا
حلقہ زلفِ گرہ گیرت بگوشِ دامہا

شادی سے گزر کہ غم نہ ہووے　　اے دل ز غم و نشاط دوراں بگذر
ارد جو نہ ہو تو دی نہیں ہے　　وز بیش و کم و مشکل و آساں بگذر
غالب　　　　　　　　　　　　بیدل

در گلشن دہر ہمچو نسیم دمِ صبح
آزادہ در آ و دامن افشاں بگذر

غالب کہتے ہیں اگر تو غم سے محفوظ رہنا چاہتا ہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ خوشی کا احساس دل سے نکال دے۔ غم دراصل خوشی کے زوال کا دوسرا نام ہے۔ اگر تو خوشی سے قطع تعلق کر لے گا تو تجھے کبھی غم نہیں ہوگا۔ مثلاً اگر اردی بہشت یعنی موسم بہار نہ آئے تو دی یعنی خزان بھی نہیں آسکتی۔ بیدل کہتے ہیں غم وخوشی، کمی بیشی اور سہل ودشوار کے حدود کو پار کر جاؤ، نسیم صبح کی طرح آزادی سے چمن میں آؤ اور دامن جھاڑتے ہوئے نکل جاؤ۔ یعنی مست مولا ہو کر زندگی

گزارو، تب تم کسی چیز سے متاثر نہیں ہو گے۔ نہ خوشی پہ اتراؤ گے نہ غم پہ گھبراؤ گے۔ غالب اور بیدل دونوں نے غم وخوشی کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک خوشی کا احساس اگر دل سے نکال دیں تو غم خود ہی دور ہو جائے گا۔ بیدل نے اس کا دائرہ وسیع کرتے ہوئے کہا کہ ایک غم وخوشی ہی کیا، کمی وبیشی اور آسانی ودشواری کا ایک لامتناہی سلسلہ انسان کو درپیش رہتا ہے اور ان سب سے رہائی کی ایک ہی صورت ہے اور وہ ہے آزادمنشی۔ جس طرح بادنسیم صبح کو چمن میں آزادی سے داخل ہوتی ہے اور دامن جھاڑتی ہوئی نکل جاتی ہے۔ یہاں بیدل کا فلسفہ غالب سے بہتر نظر آتا ہے۔

ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب
آخر تو کیا ہے؟ اے ''نہیں ہے''
غالبؔ

زہستی گر بروں تازی عدم در پیش می آید
دریں وادی مقامی نیست غیر از نارسید نہا
بیدلؔ

اس غزل کی ردیف میں ''نہیں ہے'' بار بار آیا ہے اس لئے غالب نے اپنا نام ہی ''نہیں ہے'' رکھ لیا ہے۔ اب اپنے آپ سے پوچھتے ہیں کہ جب تو ہستی وعدم دونوں کا منکر ہے تو مجھے بتا کہ آخر تو ہے کیا؟ بیدل کہتے ہیں ہستی کے دائرے سے اگر باہر آؤ تو عدم سامنے آتا ہے۔ اس وادی میں نارسائی کے سوا کوئی مقام ہی نہیں ہے۔ غالب اور بیدل دونوں نے ہستی اور عدم کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک اس کی نہ تو ہستی ہے نہ عدم ہے جب کہ بیدل کے نزدیک ہستی سے نکلو تو عدم سامنے ہے۔ اس طرح نارسائی کا سلسلہ دراز ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں بیدل کی بات غالب سے معقول تر نظر آتی ہے۔ قرآن میں سورۂ دھر میں ہے کہ کیا انسان پر ایک وقت ایسا نہیں گذرا جب اس کا کوئی ذکر نہ تھا یعنی عدم میں تھا اسے وجود سے نوازا، پھر عدم ہوگا پھر وجود ہوگا۔ قرآنی نقطۂ نظر سے دونوں کا نظریہ غلط معلوم ہوتا ہے۔

بجا ہے گر نہ سنے نالہ ہائے بلبل زار
کہ گوش گل نمی شبنم سے پنبہ آگیں ہے
غالبؔ

بپیش خویش بنالید و لاف عشق زنید
گل از ترانۂ بلبل کجا خبر دارد
بیدلؔ

غالب کہتے ہیں چونکہ پھول کے کانوں میں شبنم کی روئی پڑی ہوئی ہے اس لئے اگر وہ

بلبل کے نالہ وفریاد کی طرف متوجہ نہیں ہوتا ہے تو بالکل بجا ہے۔ بیدل کہتے ہیں گل کے سامنے بلبل چاہے جس قدر آہ و نالہ کرے اور چاہے جس قدر عشق کا دم بھرے گل کو قطعاً اس کی خبر نہیں ہوتی ہے۔ غالب اور بیدل دونوں نے نالہ بلبل سے گل کی بیخبری کو موضوع بنایا ہے اس فرق کے ساتھ کہ غالب کے نزدیک بلبل کے نالے کو اگر گل نہ سنے تو بجا ہے کیونکہ گل کے کانوں میں شبنم کی روئی پڑی ہوئی ہے۔ بیدل کے نزدیک گل کے سامنے بلبل کی آہ وزاری اور عشق کا دعویٰ لا حاصل ہے۔ کیونکہ اسے اس کی کوئی خبر ہی نہیں ہوتی ہے۔ یہاں غالب نے ایک نکتہ پیدا کیا ہے جبکہ بیدل نے اسے سادگی سے ادا کر دیا ہے۔

کیوں نہ ہو چشم بتاں محو تغافل کیوں نہ ہو
یعنی اس بیمار کو نظارے سے پرہیز ہے
غالبؔ

تا چشم تو شد ساغر دوران تغافل
خون دو جہاں ریخت بداماں تغافل
بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ اگر معشوق کسی کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھتے یعنی اپنے عاشقوں کے طرف سے غفلت برتتے ہیں تو بالکل بجا ہے وہ الزام کے لائق نہیں ہیں کیونکہ ان کی آنکھیں بیمار ہیں۔ (شعراء عموماً چشم محبوب کو بیمار باندھا کرتے ہیں) اور جب آنکھ علیل ہو تو اطباء نظارے سے پرہیز کی تلقین کیا کرتے ہیں۔ بیدل کہتے ہیں جب سے تیری آنکھ دوران تغافل کا ساغر بنی ہے اس نے دامن تغافل میں دونوں جہاں کا خون بہایا ہے۔ غالب اور بیدل دونوں نے محبوب کی چشم کے محو تغافل ہونے کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک چشم بتاں محو تغافل اس لئے ہے کہ وہ بیمار ہے اور بیمار آنکھ کو دیکھنے سے پرہیز کی ہدایت کی جاتی ہے۔ بیدل کے نزدیک چشم بتاں جب سے ساغر دوران تغافل ہو گئیں یعنی دانستہ غفلت برتنے لگیں (یہاں تغافل کو دور بادہ سے اور آنکھ کو ساغر سے تشبیہ دی ہے۔ گویا محبوب کی آنکھ شراب تغافل کا دور چلانے کے لئے ساغر کا رول ادا کرتی ہے) تغافل کے دامن پر دونوں جہاں کا خون بہہ گیا۔ یعنی بے شمار لوگ اس تغافل کی وجہ سے شہید ہو گئے۔ یہاں غالب نے چشم بتاں کے تغافل کی توجیہ کرتے ہوئے اسے بجا قرار دیا۔ جبکہ بیدل نے اس کا نتیجہ بیان کر دیا ہے کہ بے شمار لوگ جام شہادت نوش کر گئے۔ تغافل پر بیدل کے بہت اچھے اشعار ہیں۔ ایک جگہ کہتا ہے:

شیوہ تغافل خوش است ورنہ بر ایں برق حسن
تا تو نظر کردہ ای آئینہ خاکستر است

حسد سزائے کمال سخن ہے کیا کیجئے
ستم بہاءِ متاع ہنر ہے کیا کیجئے
غالب

عرض جوہر ندہی بے حسدی نیست فلک
ورنہ چوں آئینہ دستت بہ ہنر می بندد
بیدل

غالب کہتے ہیں کہ دنیا میں جو شخص سخن وری اور شاعری میں کمال حاصل کرتا ہے دنیا والے اس کی تحسین کے بجائے اس سے حسد کرنے لگتے ہیں۔ اور جو شخص صاحب ہنر ہو جاتا ہے یعنی کسی فن میں کمال حاصل کر لیتا ہے دنیا والے اس کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ بیدل کہتے ہیں اپنے جوہر کمال کی نمائش مت کرنا کیونکہ آسمان حسد سے عاری نہیں ہے ورنہ آئینے کی طرح وہ تیرے ہاتھ ہنر سے باندھ دے گا۔ یہ تو حسد کے بابت ہے ستم یاراں کے بابت بیدل کہتا ہے:

دیگر از یاران ایں محفل چہ باید داشت چشم
صد جفا بردیم وزیںہا مرحبائے برنخاست

اس محفل کے احباب سے اب اور کا ہے کی امید رکھی جا سکتی ہے میں نے سیکڑوں جفائیں ان کی سہیں مگر ان کے منھ سے ایک مرتبہ بھی مرحبا نہیں نکلا۔ غالب اور بیدل دونوں کو متاع ہنر کی نمائش سے حسد اور ظلم و جفا کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا۔ یہ صورت حال عموماً بڑے شاعروں کو پیش آتی ہے ۔حافظ کہتے ہیں:

حسد چہ می بری اے سست نظم بر حافظ
قبول خاطر و لطف سخن خدا داد است

کہا ہے کس نے کہ غالب برا نہیں لیکن
سوائے اس کے کہ آشفتہ سر ہے کیا کہیے
غالب

چو اشک ز سر گشتگیم نیست رہائی
بیدل چہ کنم نشہ ایجاد من این است
بیدل

غالب کہتے ہیں کہ بیشک وہ بہت برا ہے مگر اس کے سوا اس میں اور کوئی برائی نہیں ہے

کہ وہ آشفتہ سر یعنی دیوانہ ہے اور دیوانے کو ہر شخص معذور سمجھتا ہے اس شعر میں خوبی یہ ہے کہ در پردہ اپنی تحسین کا پہلو نمایاں کر دیا۔ کیونکہ دیوانگی عاشق کے حق میں قابل فخر ہے نہ کہ موجب تحقیر۔ بیدل کہتے ہیں آنسو کی طرح مجھے سرگشتگی سے رہائی نصیب نہیں ہے۔ میں کیا کروں میری ایجاد کا نشہ یہی ہے۔ غالب اور بیدل دونوں نے اپنی آشفتگی کو موضوع بنایا ہے۔ غالب نے اسے نرالے انداز سے بیان کیا۔ کہ غالب برا تو ہے پر اس کی برائی آشفتگی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ بیدل کے نزدیک آشفتگی اور سرگشتگی اس کا فطری نشہ ہے یعنی وہ فطری طور پر ایسی ہی طبیعت لے کر پیدا ہوا ہے۔ ایک اور شعر میں بیدل اپنے عیب و ہنر کا تذکرہ اس طرح کرتا ہے:

کسی بہ فہم کمالم دگر چہ پردازد
ز فرق تا بہ قدم عیبم ، ایں ہنر دارم

میرے کمال کو سمجھنے کی کوئی کیا کوشش کرے گا۔ سر سے لے کر پیر تک میں سراپا عیب ہوں یہی میرا ہنر ہے۔

وائے واں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا	مردہ ہم فکر قیامت دارد
لے گیا تھا گور میں ذوقِ تن آسانی مجھے	آرمیدن چہ قدر دشوار است
غالب	بیدل

غالب کا مطلب یہ ہے کہ میں نے قبر میں قیام کرنا اس لئے پسند کیا تھا کہ وہاں مجھے ہر طرح کا اطمینان اور سکون حاصل ہوگا مگر افسوس کہ وہاں شور محشر نے مجھے آرام سے نہ رہنے دیا۔ بیدل کہتے ہیں مردہ قبر میں دفن ہونے کے بعد بظاہر آرام سے ہے مگر اسے بھی قیامت کی فکر ستا رہی ہے۔ لہٰذا آرام کرنا کس قدر مشکل کام ہو گیا ہے۔ بیدل اور غالب دونوں نے مردے کی عافیت و آرام اور فکر قیامت کو موضوع بنایا ہے۔ بات دونوں نے ایک ہی کہی ہے انداز بیان البتہ جداگانہ ہے۔ غالب کا بیان یہاں زیادہ خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ غالب نے یہ خیال بیدل کے شعر سے ہی لیا ہے۔ چنانچہ غالب کے مصرعہ "وائے واں بھی شور محشر نے نہ دم لینے دیا" کا بیدل کے مصرعہ "مردہ ہم فکر قیامت دارد" سے موازنہ کر کے پڑھئے تو بیدل کے شعر کا آزاد ترجمہ معلوم ہوگا۔

ہاں نشاط آمد فصل بہاری واہ واہ	بسکہ چیدم از بہار جلوہ ات گلہائے زرد
پھر ہوا ہے تازہ سودائے غزل خوانی مجھے	جیب دامان خیال ما چمن می پرورد
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ فصل بہار کی آمد کی ایسی خوشی ہے کہ ذوق غزل سرائی از سرنو زندہ ہو گیا۔ بیدل کہتے ہیں میں نے تیری بہار جلوہ سے اس قدر زرد پھول توڑے ہیں کہ میرا جیب دامان خیال چمن پرور ہو گیا۔ غالب موسم بہار کی آمد سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کے اندر سودائے غزل خوانی تازہ ہو گیا۔ بیدل بہار جلوہ محبوب سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کا دامان خیال چمن پرور ہو گیا۔ یعنی وہ عمدہ اور نفیس غزلیں کہنے لگے۔ یہاں بھی غالب کے شعر پر بیدل کے شعر کا اثر واضح ہے۔

طبع ہے مشتاق لذت ہائے حسرت کیا کروں	در شکستِ آرزو تعمیر چندیں آبروست
آرزو سے ہے شکستِ آرزو مطلب مجھے	شبنم ایجادست اگر موج ہوا خواہد شکست
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ چونکہ میں دلدادۂ یاس وحرمان ہوں لہذا آرزو اس لئے کرتا ہوں کہ جب وہ پوری نہ ہوگی تو مجھے یاس وحرمان یعنی شکست آرزو سے لذت اندوز ہونے کا موقع مل سکے گا۔ بیدل کہتے ہیں شکست آرزو میں کئی عزت آبرو کی تعمیر پوشیدہ ہے۔ موج ہوا اگر شکست کھائے تو وہ شبنم کو ایجاد کرتی ہے۔ شکست آرزو کو غالب اور بیدل دونوں نے موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک آرزو سے شکست آرزو یعنی یاس وحرمان مطلوب ہے جس سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملے گا۔ جبکہ بیدل کے نزدیک شکست آرزو سے انسان کی آبرو اور عزت میں اضافہ ہوتا ہے۔ جیسے ہوا کی لہر جب ٹوٹ جاتی ہے تو وہ شبنم کے گرنے کا باعث بنتی ہے۔

کریں گے کوہکن کے حوصلے کا امتحاں آخر	در ساز وفا ناخن تدبیر دگر نیست
ہنوز اس خستہ کے نیروئے تن کی آزمائش ہے	فرہاد ہماں برسر خود تیشہ دواند
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں ابھی تو فرہاد کی جسمانی توانائی کا امتحان ہو رہا ہے کہ پہاڑ کھود کر نہر نکال سکتا ہے یا نہیں۔ جب وہ اس مہم میں کامیاب ہو جائے گا تو اس کے حوصلے کا امتحان ہوگا کہ شیریں کی موت کا صدمہ بھی برداشت کر سکتا ہے یا نہیں۔ بیدل کہتے ہیں وفاداری کے ساز میں اس کے سوا کوئی ناخن تدبیر نہیں ہے کہ فرہاد اسی تیشے سے اپنا سر پھوڑ لے جس سے وہ پہاڑ کھود رہا ہے۔ غالب اور بیدل دونوں نے کوہکن کے حوصلے کا ذکر کیا ہے۔ غالب کے نزدیک اگر مرگ شیریں کو بھی وہ برداشت کر لے گیا تو اس کے حوصلے کی آزمائش ہوگی۔ بیدل کے نزدیک اس نے اس حوصلے کا فوراً اظہار کر دیا کہ مرگ شیریں اسی تیشے سے اپنا سر پھوڑ لیا جس سے وہ پہاڑ کھود رہا تھا۔ ایک اور شعر میں بیدل فرہاد کا ذکر اس طرح کرتا ہے

چگونہ تلخ نہ گردد بکوہکن مے عیش

کہ شربتِ لب شیریں بکام پرویز است

شراب عیش کوہکن کے حلق میں تلخ کیوں نہ ہو جبکہ لب شیریں کا شربت پرویز کے حلق میں ہے۔ یہاں تلخ شیریں کا مقابلہ بھی بہت خوب ہے۔

نہیں کچھ سبحہ و زنار کے پھندے میں گیرائی	کو طاعتی کہ مارا تا کوئے او رساند
وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے	تسبیح تا زبان است زنار تا بگردن
غالب	بیدل

غالب کہتے ہیں تسبیح و زنار میں بذات خود کوئی دل کشی نہیں ہے۔ بلکہ ان سے صرف یہ دیکھنا مطلوب ہے کہ شیخ و برہمن اپنی اپنی وضع وفاداری پر قائم رہتے ہیں یا نہیں۔ بیدل کہتے ہیں وہ طاعت کہاں ہے جو ہمیں محبوب کے کوچے تک پہنچا دے۔ شیخ کی تسبیح صرف زبان تک ہے اور برہمن کا زنار صرف گردن تک۔ غالب اور بیدل دونوں نے تسبیح و زنار کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک اس کے ذریعہ شیخ و برہمن کی وفاداری کی آزمائش ہے جبکہ بیدل کے نزدیک عبادت میں خلوص اور خدا رسیدگی کی آزمائش مطلوب ہے۔ جو شیخ و برہمن دونوں کے یہاں مفقود ہے۔ کیونکہ شیخ کی تسبیح صرف زبان تک ہے اور برہمن کا جنیو صرف گردن تک۔ خلوص اور وفاداری نتیجہ کے لحاظ سے ایک ہی چیز ہے۔

پڑا رہ اے دل وابستہ بیتابی سے کیا حاصل
مگر پھر تابِ زلفِ پرشکن کی آزمائش ہے
غالبؔ

دل ز دامِ حلقہ زلفت چساں آید بروں
مہرہ را نتواں گرفتن از دہان مارہا
بیدلؔ

غالب کہتے ہیں اے دل تو اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ اس کی زلف پرشکن کے پھندے سے نکلنے کی کوشش کر چکا ہے، مگر ہر مرتبہ ناکام رہا۔ اس لئے اب بیتابی فضول ہے۔ کیا تو پھر سعی ناکام کرنا چاہتا ہے۔ بیدل کہتے ہیں دل تیری زلف کے حلقے کے پھندے سے کیوں کر نکل سکتا ہے، سانپ کے مہرے کو اس کے منھ سے نہیں نکال سکتے۔ بیدل اور غالب دونوں نے دل کے دام زلف محبوب میں گرفتار ہونے کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک دل کو اظہار بیتابی سے باز آجانا چاہئے کیونکہ وہ اس سے نکل نہیں سکتا۔ بیدل کے نزدیک اظہار بیتابی کرے یا نہ کرے اس کی قید سے وہ اسی طرح نہیں نکل سکتا جس طرح سانپ کے منھ سے مہرہ نہیں نکل سکتا۔ یہاں بھی غالب کے شعر پر بیدل کے شعر کا اثر نمایاں ہے۔

رہے دل ہی میں تیر اچھا، جگر کے پار ہو بہتر
غرض شستِ بتِ ناوک فگن کی آزمائش ہے
غالبؔ

چشمت بغلط سوئے دل انداخت نگاہی
تیریکہ از آں شست خطا شد چہ بجا شد
بیدلؔ

غالب کہتے ہیں مجھے اس بت ناوک فگن کے کمال فن کی آزمائش مطلوب ہے اگر اس کا تیر میرے دل میں پیوست ہو جائے تو اچھا ہے لیکن اگر جگر کے پار ہو جائے تو بہتر ہے۔ بیدل کہتے ہیں تیری آنکھ نے غلطی سے میرے دل پر ایک نگاہ ڈالی جو تیر اس کمان سے نکل کر غلطی سے میرے دل پر پڑا وہ کس قدر بجا اور برمحل تھا یعنی نشانے پر لگا۔ بیدل اور غالب دونوں نے محبوب کی تیر افگنی کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک اس کے اس ہنر کی آزمائش مطلوب ہے کہ اس کا تیر دل میں اتر جائے تو اچھا ہے۔ جگر کے پار ہو جائے تو اور اچھا ہے بیدل کے نزدیک معشوق اپنی بے نیازی سے عاشق کو نہیں دیکھتا ہے لیکن اتفاق سے غلطی سے اس پر نگاہ پڑ گئی تو اس کو وہ ایسا تیر قرار دیتا ہے جو نشانے پر برمحل پڑا ہے۔ بیدل نے اس خیال کو جس خوبصورتی سے ادا کیا غالب اس

طرح ادا نہ کر سکے۔

سراغ جیب سلامت نمی تواں دریافت	بہ پیچ و تاب ہوس سلک عافیت مت توڑ
مگر ز کسوتِ بیرنگ ہیچ بودنہا	نگاہ عجز سر رشتۂ سلامت ہے
بیدؔل	غالبؔ

غالب کہتے ہیں کہ اگر تو ہوس کرے گا تو عافیت یعنی سکون قلب سے محروم ہو جائے گا۔ سلامتی کا رشتہ تو نگاہ عجز یعنی ترک ہوس کے ہاتھ میں ہے بیدل کہتے ہیں جیب سلامت کا سراغ نہیں لگایا جا سکتا مگر ہیچ بودن یعنی خاکساری و عاجزی کے بے رنگ لباس کو زیب تن کر کے ہی مطلب یہ ہے کہ ہوس رانی کے ذریعہ سکون نہیں مل سکتا۔ بلکہ ہیچ شماری و عاجزی یعنی ترک ہوس سے ہی عافیت مل سکتی ہے۔ بیدل اور غالب دونوں نے ترک ہوس کے ذریعہ عافیت کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک نگاہ عجز سر رشتۂ سلامت ہے جبکہ بیدل کے نزدیک ہیچ بودن سراغ جیب سلامت ہے۔ یہاں غالب کے شعر پر بیدل کے خیال کا اثر بالکل نمایاں ہے۔

شاید بنگاہی کندم شاد و بخواند	کیا تعجب ہے کہ اس کو دیکھ کر آجائے رحم
مکتوب امیدم برسانید بیارم	واں تلک کوئی کسی حیلے سے پہنچا دے مجھے
بیدؔل	غالبؔ

غالب کہتے ہیں مجھے یقین ہے کہ اگر کوئی شخص مجھے اس تک پہنچا دے تو میری حالت دیکھ کر اسے ضرور مجھ پر رحم آجائے گا۔ بیدل کہتے ہیں میرا مکتوب امید میرے محبوب تک پہنچا دو ہو سکتا ہے وہ اپنے پاس بلا کر اپنی نگاہ کرم سے مجھے شاد کرے۔ بیدل اور غالب دونوں نے محبوب کی نگاہ کرم اور رحم کو موضوع بنایا ہے اس فرق کے ساتھ کہ غالب کو ایسے آدمی کی تلاش ہے جو اسے دریار تک پہنچا دے۔ کیا تعجب ہے کہ عاشق کو دیکھ کر اسے رحم آجائے۔ بیدل کو ایسے قاصد کی تلاش ہے جو مکتوب شوق محبوب تک پہنچا دے تو شاید اپنے پاس بلا کر وہ اپنی نگاہ کرم سے اسے شاد کردے۔ موازنہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب کے شعر پر بیدل کے اس شعر کا اثر ہے۔

جز نام نہیں صورت عالم مجھے منظور	صورتِ وہمی بہستی متہم داریم ما
جز وہم نہیں ہستی اشیا مرے آگے	چوں حباب آئینہ بر طاقِ عدم داریم ما
غالبؔ	بیدلؔ

غالب نے اس شعر میں وحدت الوجود کی تعلیم دی ہے۔ وہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہستی حق کے سوا کسی شئے کی ہستی حقیقی نہیں ہے۔ کائنات کی ہستی وہمی ہے یعنی اگر چہ موجود ہے مگر اس کا وجود مرتبہ وہم سے آگے نہیں ہے۔ بیدل کہتے ہیں ہم ایک موہوم صورت ہیں جس پر ہستی یعنی وجود کی تہمت لگی ہوئی ہے۔ ہمارا آئینہ حباب کی طرح طاق عدم پر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وجود تو اصل میں خدا کا ہے ہمارا وجود وہمی فرضی، خیالی اور ظلی ہے۔ غالب اور بیدل دونوں نے انسانی ہستی یا ہستیِ اشیا کو وہمی ہونے کو موضوع بنایا ہے بلکہ غور سے دیکھا جائے تو وحدت الوجود کو موضوع بنایا ہے۔ یہاں غالب کے مصرعہ ''جز وہم نہیں ہستی اشیا مرے آگے'' میں بیدل کے مصرعہ ''صورتِ وہمی بہستی متہم داریم ما'' کا عکس پوری طرح موجود ہے۔ بلکہ ایک طرح سے اس کا ترجمہ ہے۔

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر	اگر از دیر وارستیم شوق کعبہ پیش آمد
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے	تگ و پوئے نفس یا رب کجاہا می برد ما را
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں ایمان کعبہ مجھے اپنی طرف کھینچتا ہے اور کفر کلیسا اپنی طرف بلا رہا ہے گویا ایمان وکفر کی باطنی کشمکش میں وہ مبتلا ہیں۔ غالب نے اس شعر میں انسان کی نفسیاتی کیفیات کی تصویر دلکش شاعرانہ انداز میں کھینچی ہے کہ انسان زندگی بھر کفر وایمان، حق وناحق اور حلال وحرام کے بیچ کشمکش میں گرفتار رہتا ہے۔ بیدل کہتے ہیں اگر بت خانہ سے آزاد ہوئے تو شوق کعبہ پیش آیا۔ سانس کا تگ پو خدایا کہاں کہاں تک مجھے لے جائے گا۔ گویا وہ بھی باطنی کشمکش میں گرفتار ہیں۔ موازنہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب کے اس شعر پر بیدل کے اس شعر کا اثر ہے۔ بلکہ خصوصیت سے غالب کا مصرع ''کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے'' کا بیدل کے مصرع ''اگر از دیر وارستیم شوق کعبہ پیش آمد'' کا غور سے موازنہ کیا جائے تو اس کا عکس اس میں نظر آئے

گا۔ بیدل نے کفر و ایمان کے درمیان اتحاد و ہم آہنگی کا تذکرہ کرتے ہوئے دوسری جگہ یوں کہا ہے:

قضا ربطی دگر دادا است باہم کفر و ایماں را
ز خود ہم می رمد گر سبحہ بے زنار می افتد

قضا و قدر نے کفر و ایمان کے بیچ ایک قسم کا ربط پیدا کیا ہے۔ تسبیح کے دانوں میں اگر زنار یعنی دھاگہ نہ ہو تو دانے بکھر جائیں گے۔

نہیں بہار کو فرصت، نہ ہو، بہار تو ہے
طراوتِ چمن و خوبیِ ہوا کہیے
غالبؔ

قدم بوادیِ فرصت زن و مژہ بردار
بہار می رود اے بیخبر شتاب طلب
بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ اگر بہار کو ٹھہراؤ نہیں ہے تو نہ سہی، بہر حال بہار قابل تحسین ہے اس لئے تم چمن کی شادابی اور آب و ہوا کی خوبی کو بیان کرو۔ بیدل کہتے ہیں اے بیخبر انسان پلکیں اٹھا کر دیکھو اور وادیِ فرصت میں قدم رکھو۔ بہار رخصت ہو رہی ہے جلد اس سے لطف لے لو۔ غالب اور بیدل دونوں نے موسم بہار کی خوبی یا اس سے لطف اندوزی کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک موسم بہار کو اگر ٹھہراؤ نہیں ہے تو بھی وہ قابل تعریف ہے اس لئے اس کی آب و ہوا کی خوبی کو بیان کرو۔ بیدل کے نزدیک موسم بہار چونکہ تیزی سے نکلا جا رہا ہے اس لئے جو موقع اور فرصت اس کا تمھیں حاصل ہے اس سے جلد لطف لے لو۔ یہاں بیدل کا بیان غالب کے بیان سے بہتر معلوم ہوتا ہے۔

رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے
دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے
غالبؔ

نگردد محرم راز محبت بے شکستِ دل
کہ چوں گل خواندن ایں نامہ می باید دریدنہا
بیدلؔ

حالی لکھتے ہیں کہ جب تک آنکھ سے آنسو نہیں نکلے تھے تو اس بات کا پاس و لحاظ تھا کہ عشق کا راز کسی پر ظاہر نہ ہونے پائے، مگر جب رونا ضبط نہ ہو سکا اور ہر وقت آنسو جاری رہنے لگے

تو اخفائے رازِ عشق کا خیال دل سے جاتا رہا، اور ایسے بے شرم و بے حجاب ہو گئے کہ آزادوں اور شہدوں کی طرح کھل کھیلے۔ اس مطلب کو ان لفظوں میں ادا کرنا کہ رونے سے ایسے دھوئے گئے کہ بالکل پاک ہو گئے۔ بلاغت اور حسن بیان کی انتہا ہے۔ (۱۵۳) بیدل کہتے ہیں شکست دل کے بغیر رازِ محبت سے کوئی شخص واقف نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ پھول کی طرح اس خط کو پڑھنے کا مطلب ہے چاک کرنا۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح پھول کھل کر چاک گریباں ہوتا ہے اسی طرح دل کو بھی عشق میں چاک بلکہ پاش پاش ہو جانا چاہئے۔ تب عشق کے راز اس پر منکشف ہوں گے۔ بیدل اور غالب دونوں نے عشق کے راز کو موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک رونے کی وجہ سے اخفائے رازِ عشق کا خیال دل سے نکل گیا۔ اور عشق میں بے باک ہو گئے۔ بیدل کے نزدیک راہ عشق میں دل کی شکست ریخت کے بغیر کوئی اس کے راز سے واقف نہیں ہوسکتا۔ دل کی شکست یہ ہے کہ اس کے راستے میں بیحد تکلیف اٹھائے جس کا نتیجہ کثرت گریہ وزاری کی شکل میں ظاہر ہوگا۔ اس لحاظ سے دونوں ایک ہی نتیجہ پر پہنچے۔

کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر	بہ پیش خویش بنالید و لاف عشق زنید
پردے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے	گل از ترانۂ بلبل کجا خبر دارد
غالبؔ	بیدلؔ

شعرا پھول کو جگر چاک باندھا کرتے ہیں۔ یہیں سے غالب نے یہ مضمون پیدا کیا کہ بلبل کے نالہ میں ضرور اثر ہوتا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جتنے پھول باغ میں ہیں سب جگر چاک نظر آتے ہیں۔ بیدل کہتے ہیں کہ پھول کو بلبل کے نالے کی کوئی خبر نہیں ہوتی ہے اس لئے وہ خود اپنے آگے آہ و نالے کرے اور عشق کی لاف زنی کرے۔ غالب اور بیدل دونوں نے نالہ بلبل کی تاثیر کو موضوع بنایا ہے۔ غالب نے نکتہ آفرینی سے کام لیتے ہوئے کہا کہ بلبل کا نالہ اگر بے اثر ہوتا تو پھول کے دامن کیوں چاک ہوتے۔ گویا غالب نے بیدل کو چیلنج کیا ہے۔ جس نے کہا کہ بلبل کو نالے کی خبر نہیں ہوتی، غالب کہتے ہیں کہ کون کہتا ہے کہ گل کو نالہ بلبل کی خبر نہیں ہوتی، اور اس کا نالہ بے اثر رہتا ہے۔ چاک دامانی گل نالہ بلبل کے موثر ہونے کی علامت ہے۔

پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہل شوق کا
آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے
غالبؔ

بر اہل فنا خوردہ مگیرید کہ منصور
با گردن دیگر سر اقبال بر آورد
بیدلؔ

غالب کہتے ہیں جس طرح خس وخاشاک آگ میں پڑ کر فنافی النار ہو جاتے ہیں اس لئے نہ اسے معدوم کہہ سکتے ہیں نہ موجود، اسی طرح جو لوگ فنافی اللہ ہو جاتے ہیں ان کا بھی یہی حال ہو جاتا ہے۔ انھیں موجود اس لئے نہیں کہہ سکتے ہیں کہ ان کی ہستی مٹ جاتی ہے۔ اور معدوم اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ وہ باقی باللہ ہو جاتے ہیں۔ بیدل کہتے ہیں اہل فنا یعنی فنافی اللہ لوگوں پر اعتراض مت کرو، کیونکہ منصور حلاج نے دوسری گردن کے ساتھ سرِ اقبال اٹھایا۔ مطلب یہ ہے کہ منصور اناالحق کہنے کے جرم میں سولی پر چڑھائے گئے تب بھی، جب ان کی بوٹی بوٹی کردی گئی تب بھی اور جب ان کو جلا کر راکھ کرکے دریا میں پھینک دیا گیا تب بھی اناالحق کی آواز اس سے آتی رہی۔ کیونکہ وہ فنافی اللہ ہو کر باقی باللہ ہو چکے تھے۔ اہل فنا یا اہل شوق کے وجود و عدم کو غالب اور بیدل دونوں نے موضوع بنایا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کے اس شعر پر بیدل کے شعر کا اثر ہے۔ البتہ بیدل نے ایک مثال کے ذریعہ اس کی وضاحت کی ہے۔ جبکہ غالب نے اسے عام رکھا ہے۔

کرنے گئے تھے اس سے تغافل کا ہم گلہ
کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے
غالبؔ

شیوہ تغافل خوش است ورنہ بایں برق حسن
تا تو نظر کردہ ای آئینہ خاکستر است
بیدلؔ

اس شعر کا مطلب خود غالب نے بیان کیا ہے۔ ''معشوق حقیقی کا جو معاملہ غیر عشاق کے ساتھ ہے اس کو تغافل کے ساتھ اور عشاق کے معاملے کو نگاہ کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کے تغافل سے تنگ آکر ہم نے شکایت کی تھی اور اس کی توجہ کے خواستگار ہوئے تھے۔ مگر جب اس نے توجہ کی تو ایک ہی نگاہ نے ہم کو فنا کر دیا'' (۱۵۴)۔ بیدل کہتے ہیں محبوب کے تغافل کا انداز بہتر ہے۔ اس لئے کہ اس برق حسن پر اگر تم نے ایک نظر ڈالی تو تمھارا آئینہ دل راکھ کا ڈھیر ہو جائے گا۔ محبوب کے تغافل کو غالب اور بیدل دونوں نے موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک

عاشق محبوب سے اس کے تغافل کا شکوہ کرنے گئے تھے کہ اس کی ایک ہی نظر میں وہ خاک ہو گئے۔ بیدل کے نزدیک چونکہ اس برق حسن پر عاشق کی ایک نگاہ اس کے دل کو جلا کر خاک کر دیتی، اس لئے اس کا شیوۂ تغافل ہی بہتر ہے۔ایک نظر میں خاک ہونے کو دونوں نے ذکر کیا ہے۔مگر بیدل کے نزدیک عاشق کی ایک نگاہ مراد ہے۔جبکہ غالب کے نزدیک معشوق کی ایک نگاہ مراد ہے،اور دونوں ہی ممکن ہیں۔

ہے عدم میں غنچہ محوِ عبرتِ انجام گل	غنچہ و گل ہمہ با چاک جگر ساختہ اند
یک جہاں زانو تامل در قفائے خندہ ہے	خوں شواے دل کہ جہاں جائے دلِ خرم نیست
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں غنچہ ابھی شگفتہ نہیں ہوا ہے لیکن وہ اس سوچ میں ہے کہ پھولوں کی طرح میرا انجام بھی یہی ہونا ہے کہ میں پھول بنوں گا اس کے بعد مرجھا جاؤں گا۔ بیدل کہتے ہیں، غنچہ وگل نے چاک جگری سے سمجھوتا کر رکھا ہے اس لئے اے دل خون کے آنسو رو، کہ دنیا کوئی خوشی کی جگہ نہیں ہے۔غالب اور بیدل دونوں نے غنچہ وگل کو موضوع بنایا ہے۔غالب کے نزدیک غنچہ گل سے عبرت حاصل کر رہا ہے کہ اس کا انجام بھی پھول کی طرح مرجھا جانا ہے۔مطلب یہ ہے کہ دنیا میں خندہ کے پیچھے گریہ اور خوشی کے پیچھے غم کا سلسلہ جاری ہے۔بیدلؔ کے نزدیک دونوں کا چاک جگر ہونا اس بات کی علامت ہے کہ دنیا کوئی خوش دلی کی جگہ نہیں ہے۔نتیجہ کے لحاظ سے دونوں ایک ہی جگہ پہنچے ہیں، صرف انداز کا فرق ہے۔

سوزش باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں	مدعا از دل بلب نگذشتہ می سوزد نفس
دل محیط گریہ و لب آشنائے خندہ ہے	ایں قدر دارد خموشی آتش پنہان ما
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں احباب میرے ضبط وتحمل کو دیکھ کر اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ سوزش باطن سے محروم ہوں۔حالانکہ ایسا نہیں ہے میں بظاہر ہنس رہا ہوں لیکن میرا دل آنسوؤں کا دریا بہا رہا ہے۔بیدل کہتے ہیں میری آتش پنہاں یا سوزش باطن کس قدر خاموش ہے کہ مدعا دل سے نکل

کر ابھی ہونٹ تک نہیں پہنچا ہے کہ اس نے سانس کو جلا کر رکھ دیا۔ بیدل اور غالب دونوں نے آتش پنہاں یا سوزش باطن کو موضوع بنایا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ غالب کے نزدیک اس کی شکیبائی کی وجہ سے لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہ سوز نہاں سے محروم ہے۔ بیدل کے نزدیک اس کی آتش پنہاں اتنی ہی خاموش ہے کہ مدعا دل سے نکل کر ہونٹوں تک پہنچا نہیں کہ وہ سانس کو جلا کر رکھ دیتی ہے۔

حسن بے پروا خریدار متاع جلوہ ہے
آئینہ زانوئے فکرِ اختراع جلوہ ہے
غالبؔ

حسن بے پرواست اینجا قاصدی درکار نیست
نامۂ احوال مجنوں طرہ لیلیٰ بس است
بیدلؔ

غالب کہتے ہیں معشوق بظاہر بے پروا نظر آتا ہے مگر بباطن ہر وقت نئے جلوے دکھانے کا آرزومند رہتا ہے، اس لئے ہر وقت آئینہ دیکھا کرتا ہے کہ کس قسم کی آرائش کرے کہ نئے نئے جلوے دکھا سکے بیدل کہتے ہیں حسن یعنی معشوق بے پرواہ واقع ہوا ہے۔ یہاں قاصد کی ضرورت نہیں۔ مجنوں کے احوال نامہ کے لئے لیلیٰ کی زلف کافی ہے۔ حسن بے پروا کو غالب اور بیدل دونوں نے موضوع بنایا ہے۔ بیدل کے نزدیک محبوب تو بے پروا اور بے نیاز ہے۔ یہاں قاصد کی ضرورت نہیں ہے، جو جا کر مجنوں کے حالات اسے بتائے مجنوں کے حالات معلوم کرنا ہو تو لیلیٰ کی زلف دیکھ کر سمجھ لو جس طرح وہ پریشان ہے اسی طرح مجنوں بھی پریشان ہے۔ غالب کے نزدیک محبوب بظاہر بے پروا ہے مگر تازہ بہ تازہ جلوہ دکھانے کی آرزو رکھتا ہے۔ یہاں غالب نے بیدل سے اختلاف کیا ہے، اور میرے خیال میں بیدل کا خیال غالب سے بہتر ہے۔ کیونکہ محبوب اگر بے پروا ہے یعنی اس کو عاشق کے عاشقانہ جذبات کا پاس ولحاظ نہیں ہے تو پھر اسے تازہ بہ تازہ جلوہ دکھا کر اسے لبھانے کی کیا ضرورت ہے۔

حسنِ فروغ شمع سخن دور ہے اسد
پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی
غالبؔ

بے جگر خوردن بہار طرز نتواں تازہ کرد
غوطہ تا در خوں نزد فطرت سخن رنگیں نشد
بیدلؔ

غالب کا مطلب یہ ہے کہ جب تک شاعر کے دل میں سوز و گداز کی کیفیت پیدا نہ ہو اس کے کلام میں تاثیر پیدا نہیں ہو سکتی۔ بیدل کہتے ہیں جگر خوری کے بغیر بہار طرز میں کوئی شخص تازگی نہیں پیدا کر سکتا۔ شاعر کی فطرت جب تک خون میں غوطہ نہیں لگاتی یعنی سخت ریاضت نہیں کرتی اس کا کلام رنگین نہیں ہو سکتا۔ غالب اور بیدل دونوں نے کلام میں تاثیر اور رنگینی کے لئے ایک شرط لگائی ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ سخت ریاضت کے بغیر اسلوب میں تازگی اور کلام میں رنگینی نہیں پیدا ہو سکتی۔ اس فرق کے ساتھ کہ غالب کے نزدیک وہ شرط دل گداختہ ہے اور بیدل کے نزدیک جگر خوری ہے۔ دونوں کا نتیجہ ایک ہی ہے۔ اقبال نے یہیں سے یہ مضمون لے کر کہا ہے:

نقش ہیں سب ناتمام خون جگر کے بغیر

مدعا محوِ تماشائے شکستِ دل ہے	بتدبیر دگر نتواں نشانِ مدعا جستن
آئینہ خانے میں کوئی لئے جاتا ہے مجھے	شکستِ دل مگر چوں موج زہ بندد کمانم را
غالب	بیدل

غالب کہتے ہیں کہ میرا مدعا یہ تھا کہ میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے اور میں اپنے دل کی شکستگی کا تماشا دیکھتا رہوں۔ الحمد للہ یہ مدعا حاصل ہو گیا یعنی آئینہ دل کے سو ٹکڑے ہو گئے۔ چونکہ آئینہ کے ہر ٹکڑے میں صورت نظر آتی ہے اس لئے مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ میں کسی آئینہ خانے میں بیٹھا ہوا ہوں۔ بیدل کہتے ہیں کسی اور تدبیر سے مدعا کا نشان پتہ لگانا ممکن نہیں ہے۔ شاید شکستِ دل موج کی طرح میرے کمان کی زہ بندی کرے (چلا چڑھایا)۔ مطلب یہ ہے کہ شکست دل کے بغیر مقصد کا سراغ لگانا مشکل ہے۔ بیدل اور غالب دونوں نے شکست دل کو موضوع بنایا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ غالب کے نزدیک اس کا مقصد دل کی شکستگی کا تماشا دیکھنا ہے۔ جبکہ بیدل کے نزدیک مدعا عشق میں سرخروئی و کامرانی ہے جو دل کی شکستگی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ یعنی راہ عشق میں ایسے حالات پیش آتے ہیں جو دل کے پاش پاش ہونے کا باعث ہوتے ہیں اگر ان کو انگیز کر لیا تو مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔ چنانچہ بیدل دوسری جگہ کہتے ہیں

دل عشاق ز آفت نتواں باز خرید

پر فشانست شکست از بر و دوش مینا

عاشقوں کے دل کو آفات سے محفوظ رکھنا ممکن نہیں ہے۔ مینا کے بر و دوش سے شکست و ریخت کا عمل ظاہر ہے۔ یہاں بیدل کا خیال غالب کے خیال سے واضح تر نظر آتا ہے مجموعی طور پر غالب کے شعر میں بیدل کے اس شعر کا عکس موجود ہے۔

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن	ہیچ دانا نزند تیشہ بپائے آرام
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے	از بہشت آنکہ بروں آمدہ است آدم نیست
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کا مطلب یہ ہے کہ آدم کا جنت سے نکلنا مشہور ہے لیکن ہم حضرت آدم سے کہیں زیادہ بے آبرو ہو کر کوچہ محبوب سے نکالے گئے۔ بیدل کہتے ہیں کوئی عقل مند اپنے پای عافیت پر کلہاڑی نہیں مار سکتا۔ بہشت سے جو شخص باہر آیا وہ آدم نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آدم تو دانا اور عقلمند تھے، جنت میں آرام سے رہ رہے تھے، وہاں سے نکل کر اپنے پائے عافیت پر کلہاڑی ماری تو اگر چہ وہ آدم دانا تھے پر شیطان کے اغواسے ان کی دانائی کچھ دیر کیلئے موقوف ہوگئی۔ قرآن بھی اس امر کی تائید کرتا ہے چنانچہ ایک جگہ اللہ نے فرمایا کہ آدم سے بھول ہوگئی اور وہ نافرمانی کر بیٹھے (۱۵۵)۔ ہم نے ان کے اندر نافرمانی کا ارادہ نہیں پایا۔ اس لئے بیدل کا خیال ہے کہ آدم کی اس میں کوئی بے آبروئی نہیں تھی جبکہ غالب نے اس کو ان کی بے آبروئی سے تعبیر کیا ہے۔

محبت میں نہیں ہے فرق مرنے اور جینے کا	محبت از من و تو رنگ امتیاز گداخت
اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے	تری و آب سزاوار نیست فاصلہ را
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کا مطلب یہ ہے کہ جس کافر پر ہمارا دم نکلتا ہے یعنی جس پر ہم مرتے ہیں اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں تو پھر اس میں کیا شک ہے کہ محبت میں مرنا اور جینا ایک ہی بات ہے۔ دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ بیدل کہتے ہیں محبت نے میرے اور تیرے بیچ امتیاز کے رنگ کو پگھلا کر رکھ دیا۔ تری اور آب میں فاصلہ نہیں ہوتا ہے۔ یعنی جس طرح تری آب اور آب میں تری ہونا ضروری ہے ان کے بیچ کسی قسم کا فاصلہ اور دوری نہیں ہوتی ہے۔ اسی طرح محبت نے

عاشق ومعشوق کے بیچ سارے امتیاز کو ختم کر دیا۔ غالب کے نزدیک محبت میں حالات کے بدلنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بیدل کے نزدیک محبت میں عاشق ومعشوق کے درمیان یگانگت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

بیضہ آسا ننگ بال و پر ہے یہ کنج قفس	تنکنائے بیضہ ، بیدل گوشۂ آرام بود
از سر نو زندگی ہو ، گر رہا ہو جائیے	شد پریشاں مرغ تا بال و پر آوردہ است
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ چوزہ جب تک انڈے میں رہتا ہے وہ پرواز نہیں کرسکتا۔ لیکن جب انڈے کے قفس سے باہر نکل آتا ہے تو پرواز کرسکتا ہے۔ اگر وہ اسی میں رہے تو کبھی پرواز نہ کر سکے۔ اسی طرح دنیا انسان کے لئے بمنزلہ بیضہ ہے۔ جب تک انسان اس دنیا کی قید میں گرفتار ہے وہ روحانی اعتبار سے پرواز نہیں کرسکتا۔ اور جس طرح چوزے کو انڈے سے باہر نکلنے کے بعد نئی زندگی ملتی ہے اسی طرح جب انسان جسم کی قید سے آزاد ہو جاتا ہے تو اسے نئی زندگی نصیب ہوتی ہے۔ بیدل کہتے ہیں بیضے کی تنگ کوٹھری پرندہ کے لئے گوشہ عافیت تھی جب اس کے بال و پر نکل آئے تو وہ پریشان ہوا۔ بیدل کا مطلب یہ ہے کہ انسان جب اپنے گھر میں ہوتا ہے تو گوشہ عافیت میں ہوتا ہے، اور جب باہر نکلتا ہے تو اسے پریشانیاں لاحق ہوتی ہیں۔ اس طرح بیدل بظاہر جمود ورکود کی تعلیم دیتے نظر آتے ہیں۔ مگر اس کا دوسرا شعر اسی استعارہ کے ساتھ فلسفہ حرکت کی تعلیم دیتا ہے۔

درون بیضہ جز افسردگی دیگر چہ می باشد
چمنہا وقف پرواز است سعی پرفشانی کن

انڈے کے اندر افسردگی اور پژمردگی کے سوا کیا رکھا ہے سارا چمن وقف پرواز ہے تو بھی اپنی کوششوں کا سلسلہ جاری رکھ۔ اس بنا پر بیدل کا مقصد پہلے شعر میں یہی ہے کہ گھر کی چہار دیواری سے نکل کر اپنے تگ ودو کا سلسلہ جاری رکھو۔ بقول سعدی:

تا بدکان خانہ در گروی
ہرگز اے خام آدمی نہ شوی

غالب اور بیدل دونوں نے فلسفہ حرکت کی تعلیم دی ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کے شعر میں بیدل کے دونوں اشعار کا مجموعی مفہوم ہے۔ خصوصیت سے غالب کے مصرع ''بیضہ آسا ننگ بال و پر ہے یہ کنج قفس'' میں بیدل کے مصرعہ ''تنگنائے بیضہ بیدل گوشۂ آرام بود'' کا عکس نظر آئے گا۔

ہوں میں بھی تماشائی نیرنگ تمنا	نفس وقفِ تمنا ہا ، نگہ صرف تماشا ہا
مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آئے	دماغی دارم و در گیر و دار خویش می سوزم
غالب	بیدل

غالب کہتے ہیں تمنا کرنے سے میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ میری وہ تمنا پوری بھی ہو جائے۔ بلکہ میں تو تمناؤں کی نیرنگیوں کا تماشا دیکھنا چاہتا ہوں۔ یعنی یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ تمنائیں متمنی کو کس قدر پریشان کرتی ہیں۔ اور جب وہ پوری نہیں ہوتی ہیں تو انسان مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے۔ بیدل کہتے ہیں سانس وقف تمنا ہے اور نگاہ محو تماشا، میرا دماغ اپنے اسی دار و گیر میں جل رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسان کی سانس تمنا پر تمنا اور آرزو پر آرزو کئے جاتی ہے اور نگاہ ان آرزوؤں کا تماشا دیکھنے میں محو ہے۔ ایسی صورت میں کہہ سکتا ہوں کہ میرا دماغ اپنے ہی دار و گیر میں گرفتار ہو کر جل رہا ہے۔ گویا تمنائے نفس اور تماشائے نگاہ وہ دار و گیر ہے جس میں انسان ہر وقت الجھا ہوا رہتا ہے۔ غالب اور بیدل دونوں نے تمناؤں کے تماشا کو موضوع بنایا ہے۔ غالب تماشائی نیرنگ تمنا ہیں یعنی جانتے ہیں تمنا پوری نہیں ہوگی پھر بھی اس کے طلسم میں گرفتار ہیں۔ جبکہ بیدل تمنائے نفس اور تماشائے نگہ کی کشمکش میں الجھے ہوئے ہیں۔ مضمون قریب قریب ایک ہے انداز بیان الگ ہے۔ غور سے دیکھئے تو غالب کے اس شعر پر بیدل کے شعر کا اثر نمایاں ہے۔ خصوصیت سے غالب کا مصرع: ''ہوں میں بھی تماشائی نیرنگ تمنا'' بیدل کے مصرع ''نفس وقفِ تمنا ہا، نگہ صرف تماشا ہا'' کا ایک طرح سے آزاد ترجمہ ہے۔

ہوئی یہ کثرتِ غم سے تلف کیفیتِ شادی	خندہ ما چوں گل از چاک گریبانست و بس
کہ صبح عید مجھ کو بدتر از چاک گریباں ہے	نسخہ ای از دفتر وضع سحر داریم ما
غالب	بیدل

غالب کہتے ہیں غم کی کثرت سے میرے دل میں خوشی کا احساس بھی باقی نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ عید کی صبح جو عموماً لوگوں کی نظر میں بہت خوش آیند معلوم ہوتی ہے میری نگاہ میں چاک گریباں سے بھی بدتر ہے۔ یعنی یوم عید بھی میرے لئے باعث رنج والم ہے۔ بیدل کہتے ہیں ہماری ہنسی پھول کی طرح چاک گریباں سے واضح ہے۔ وضع سحر کے دفتر کا ایک نسخہ ہمارے پاس بھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پھول کا کھلنا اس کی ہنسی یا قہقہ ہے جو خوشی کی علامت ہے۔ مگر یہی کھلنا چاک گریبانی بھی ہے جو شدت غم کی علامت ہے۔ پس جس طرح پھول کھل کر بظاہر خوش نظر آتا ہے پر چاک گریبانی سے وہ اپنی دائمی پژمردگی اور غم کا اظہار بھی کرتا ہے۔ اور جس طرح سحر کی وضع چاک دامانی کی ہوتی ہے بالکل اسی طرح ہمارا بھی حال ہے۔ بیدل اور غالب دونوں نے چاک گریباں سے مضمون پیدا کیا ہے۔ غالب کے نزدیک کثرت غم کی وجہ سے خوشی کا احساس جاتا رہا۔ بیدل کے نزدیک ہماری حالت خندۂ گل کی طرح ہے جس کی چاک دامانی خوشی سے زیادہ غم کی نمائندہ ہے۔ نیز سحر کی طرح ہے جو چاک دامانی کی وضع کا حامل ہے۔ یہاں غالب کے شعر پر بیدل کے اس شعر کا اثر نمایاں ہے۔

دل و دیں نقد لا، ساقی سے گر سودا کیا چاہے کہ اس بازار میں ساغر متاعِ دست گرداں ہے غالبؔ	دل و دانش ہمہ در عشق بتاں باید باخت خویش را بیدل دیوانہ لقب باید کرد بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ اگر تو یہ چاہتا ہے کہ ساقی تجھے شراب عنایت کرے یعنی تو اس سے عشق کرنا چاہتا ہے تو تجھے اس کی قیمت فوراً ادا کرنی ہوگی۔ پہلے اپنا دل اور اپنا دین اس کے حوالے کرنا پڑے گا پھر وہ تجھے اپنی محبت کا جام عطا کرے گا۔ وجہ اس کہ یہ ہے کہ بازار عشق میں قرض کا رواج نہیں ہے۔ ساغر عشق کو متاع دست گرداں قرار دینا بلاشبہ لائق ہزار تحسین ہے۔ بیدل کہتے ہیں حسینوں کے عشق میں دل و دانش کا سارا سرمایہ ہاتھ سے دے بیٹھنا چاہئے اور اپنا لقب بیدل دیوانہ رکھنا چاہئے۔ بیدل اور غالب دونوں نے عشق میں دل و دین یا دل و دانش محبوب کے حوالے کرنے کو موضوع بنایا ہے اس فرق کے ساتھ کہ غالب نے شرطیہ انداز میں کہا کہ اگر عشق چاہتے ہو تو دل و دین نقد معشوق کے حوالے کرنے پڑیں گے۔ جبکہ بیدل ناصحانہ انداز میں کہتے ہیں کہ

عشق میں دین ودانش سب معشوق کے حوالے کردینا چاہئے۔غور سے دیکھا جائے تو غالب کے اس شعر پر بیدل کے شعر کا اثر نہایت واضح ہے۔

پچ آپڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے	قاصد نوید وعدہ دلدار می دہد
وہ آئے یا نہ آئے پہ یاں انتظار ہے	اے آرزو بہار شو ، اے انتظار وصل
غالب	بیدل

غالب کہتے ہیں چونکہ اس نے آنے کا وعدہ کیا ہے اور میں نے یہ کہہ دیا کہ اچھا میں تمھارا انتظار کروں گا اس لئے میں بہرحال اپنی بات پر قائم رہوں گا۔مانا کہ اس کے وعدے کا اعتبار نہیں مگر مجھے اپنی بات کی پچ ہے کیوں کہ اگر میں ایسا نہ کروں تو ممکن ہے وہ مجھ پر اعتراض کرے کہ مجھے جھوٹا سمجھا میرا انتظار نہیں کیا۔بیدل کہتے ہیں قاصد وعدہ دلدار کی خوش خبری سنا رہا ہے۔اے آرزو تو بہار ہوجا اور اے انتظار تو وصل میں بدل جا۔غالب اور بیدل دونوں نے وعدہ دلدار کو موضوع بنایا ہے اس فرق کے ساتھ کہ غالب کے نزدیک وعدہ دلدار کی پاسداری کا تقاضا ہے کہ وہ معشوق کی آمد کا انتظار کرے، خواہ وہ آئے یا نہ آئے۔جبکہ بیدل کے نزدیک وعدہ دلدار کی نوید قاصد نے آکر دی ہے۔اس لئے وہ آرزو واشتیاق کو بہار کی طرح خوش وخرم ہونے اور انتظار کو وصل میں بدل جانے کی ہدایت کرتا ہے۔

تمثال میں تیری ہے وہ شوخی کہ بصد ذوق	عمریست تماشہ کدۂ شوخی نازیم
آئینہ بہ انداز گل آغوش کشا ہے	آئینہ ما با کہ دچار است بہ بینید
غالب	بیدل

غالب کہتے ہیں تیرے تمثال یعنی عکس میں اس قدر شوخی ودلکشی ہے کہ آئینہ اسے پھول کی طرح آغوش میں لینے کیلئے بیتاب ہے۔بیدل کہتے ہیں ایک مدت سے ہم محبوب کی شوخی ناز کی تماشا گاہ بنے ہوئے ہیں۔بھلا دیکھو تو ہمارا دل کس سے دوچار ہے۔مطلب یہ ہے کہ ایک عرصہ سے محبوب اپنی شوخی ناز کا اظہار کررہا ہے۔اور ہم اسے سہتے چلے آرہے ہیں اس طرح ہم اس کی شوخی ناز کی تماشا گاہ بنے ہوئے ہیں۔ذارد یکھو تو ہمارا آئینہ دل کس تمثال سے دوچار ہے

۔ بیدل اور غالب دونوں نے محبوب کے تمثال کی شوخی کو موضوع بنایا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ بیدل کے نزدیک ایک مدت سے آئینہ دل میں محبوب کا تمثال شوخی ناز دکھا رہا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ اس کی تماشا گاہ بن گیا ہے۔ جبکہ غالب کے نزدیک اس کے تمثال میں اس قدر شوخی اور دلکشی ہے کہ آئینہ دل عاشق اس کے لئے آغوش کھولے ہوئے ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کے اس شعر پر بیدل کے خیال کا عکس پوری طرح پایا جاتا ہے۔

اے پرتوِ خورشید جہاں تاب ادھر بھی
سائے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے
غالب

سایہ را وہمِ بقا در عجز خوابا نیدہ است
ورنہ یک گام از خودت آنسو جہان کبریاست
بیدلؔ

حالی لکھتے ہیں کہ ''یہ خطاب ہے آفتاب حقیقت کی طرف کہ جیسا سایہ دراصل موجود نہیں ہے مگر متہم بہ وجود ہے اور فی الواقع اس کی کچھ ہستی نہیں ہے۔ اسی طرح ہم بھی اس دھوکے میں پڑے ہیں کہ ہم موجود ہیں اگر آفتاب حقیقت کی کوئی تجلی ہم پر لمعہ فگن ہو جائے تو یہ دھوکا جاتا رہے، اور فنافی الشمس ہو جائیں کیونکہ جہاں آفتاب چمکا سایہ کافور ہوا'' (۱۵۶)

بیدل کہتے ہیں سایہ کو وہم بقا نے عجز و درماندگی میں محوخواب کر دیا ہے ورنہ ایک قدم اگر اپنے سے آگے بڑھ کر دیکھے تو جہان کبریا ہے۔ غالب اور بیدل دونوں نے آفتاب حقیقت یا عالم کبریا کے مقابلے پر انسانی ہستی کو جو سائے کی طرح وہم وجود و بقا میں مبتلا ہے موضوع بنایا ہے۔ غالب کے نزدیک سائے کی طرح ہمارا بھی کوئی وجود نہیں اس لئے اگر آفتاب حقیقت کا ایک پرتو ہم پر پڑ جائے تو فنافی اللہ ہو کر ہم باقی باللہ ہو جائیں جبکہ بیدل کے نزدیک بھی سائے کو اپنی ہستی کے وہم بقا نے محوخواب کر دیا ہے اگر وہ اس دارئے سے نکل کر ایک قدم آگے بڑھے تو اسے جہان کبریا نظر آئے۔ اس موضوع کو بیدل نے دوسرے انداز سے بھی بیان کیا ہے۔

ظلمت مارا فروغ نور وحدت جاذب است
سایہ آخر می رود از خود بطرف آفتاب

فروغ نور وحدت نے ہماری تاریکی کو جذب کر لیا ہے۔ سایہ آخر کار خود بخود آفتاب کی طرف چلا جاتا ہے۔

سراغ سایہ از خورشید نتواں یافتن بیدل
من و آئینہ نازی کی می سوزد مقابل را

سورج سے سائے کا سراغ نہیں لگایا جا سکتا۔ میں ہوں اور آئینہ ناز جو مقابل کو جلا کر رکھ دیتا ہے۔

حق است آئینہ اینجا خیال ما و تو چیست
کہ دید سایہ در آفتاب تافتہ را

حق آئینہ ہے یہاں ہمارے تمھارے خیال کی کیا گنجائش ہے بھلا روشن آفتاب کے اندر کسی نے سائے کو بھی دیکھا ہے۔

آمد بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج
اڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی
غالب

بلبل بہ نالہ حرف چمن را مفسر است
یا رب زبان نکہت گل ترجمانِ کیست
بیدل

غالب کہتے ہیں کہ بلبلوں کی نغمہ سنجی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بہار آ گئی ہے۔ یہاں آمد بہار کو طیور کی زبانی اڑتی سی خبر سے تعبیر کرنا حسن ادا کا کمال ہے۔ بیدل کہتے ہیں بلبل اپنے نالہ کے ذریعہ حرف چمن کی تشریح کر رہی ہے۔ خدایا نکہت گل کی زبان کس بات کی ترجمان ہے۔ غالب اور بیدل دونوں نے بلبل کی نوا سنجی کو موضوع بنایا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو غالب کا مصرعہ ''آمد بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج'' بیدل کے مصرعہ ''بلبل بہ نالہ حرف چمن را مفسر است'' کا آزاد ترجمہ معلوم ہوگا۔ کیونکہ بلبل اگر چمن میں نالہ کرتی یا نغمہ سنجی کرتی ہے تو وہ چمن کے حرف یعنی موسم بہار کی آمد کو بیان کرتی ہے۔ بیدل کا مزید خیال ہے کہ بلبل کی نوا سنجی کے مقابلے پر نکہت گل کی زبان کس بات کی ترجمانی کرتی ہے۔ یہاں سوالیہ انداز میں اس نے قاری کے ذہن کو سوچنے پر مجبور کیا ہے لیکن دوسری جگہ اس کی وضاحت کر دی ہے:

خلق معشوقاں کمندِ صید مشتاقاں بس است
نیست غیراز بوئے گل زنجیر پائے عندلیب

عاشقوں کو شکار کرنے کے لئے معشوق کی ادا کافی ہے۔ بوئے گل کے سوا کوئی چیز بلبل کے پاؤں

کی زنجیر نہیں ہے۔ گویا نکہت گل کی زبان یہ بتاتی ہے کہ بلبل کے پاؤں اس کی زنجیر میں پھنسے ہوئے ہیں۔

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں	عافیت خواہی وداعِ آرزوئے جاہ کن
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے	شمع ایں بزم از کلاہِ خود بکامِ اژدہاست
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ قفس میں بڑے آرام سے گذر رہی ہے نہ صیاد کا کھٹکا ہے نہ تیر کا اندیشہ۔ مگر بقول حالی نکتہ یہ پیدا کیا ہے کہ جو شخص گمنامی اور کسمپرسی کی حالت میں ہوتا ہے اس کا کوئی دشمن یا بدخواہ نہیں ہوتا۔ ساری خرابیاں شہرت، اقتدار اور نام ونمود کے ساتھ وابستہ ہیں۔ (۱۵۷) بیدل کہتے ہیں اگر عافیت چاہتے ہو تو جاہ وحشم کی آرزو دل سے نکال دو۔ اس بزم کی شمع اپنی کلاہ کی وجہ سے اژدہا کے منہ میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دنیاداروں میں جاہ وجلال اور دولت واقتدار کی کشمکش کی وجہ سے ان کا سکون چین غارت رہتا ہے اس لئے عافیت مطلوب ہو تو اس کی خواہش ترک کرو۔ دیکھو شمع اپنی لو کی وجہ سے ہر وقت اژدہے کے منہ میں رہتی ہے۔ غالب اور بیدل دونوں نے کنج قفس میں عافیت کو موضوع بنایا ہے۔ انداز بیان دونوں کا الگ ہے۔ یہاں غالب کا انداز بیدل کے انداز سے بہتر معلوم ہوتا ہے لیکن خیال کا سرچشمہ بیدل کا شعر ہے۔

کیا زہد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ ریائی	حرص ہر سو می برد بر سیم و زر دارد نظر
پاداش عمل کی طمع خام بہت ہے	زاہد از فردوس ہم مطلوب جز دنیا نداشت
غالبؔ	بیدلؔ

جناب اثر لکھنوی لکھتے ہیں ”غالب نے پاداش عمل کو وہ خواہ بہ امید جزا ہو یا بخوف سزا طمع خام کہا ہے۔ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ زہد ریائی کی زبونی تو ظاہر ہے لیکن وہ زہد بھی کسی کام کا نہیں جس میں جزا یا سزا کا خیال شامل ہو۔ کیونکہ جہاں یہ خیال گذرا اخلوص رخصت ہوا۔ اس لئے انسان کو چاہئے کہ پاداش سے یکسر بے تعلق ہو کر اپنے نفس کی پاکی اور خدمت خلق میں مشغول رہے۔ (۱۵۶) بیدل کہتے ہیں حرص وہوس انسان کو ایسے رخ پر لے جاتی ہے جہاں اس کے پیش

نظر صرف مال ودولت ہوتی ہے۔ چنانچہ زاہد بھی جو اپنی عبادت حصول فردوس کے لالچ میں کررہا ہے۔ مقصود اس کا دنیا کے سوا کچھ نہیں ہے۔ بیدل کا مقصد شاید یہ ہے کہ عبادت میں خلوص اور بے لوثی مطلوب ہے۔ اگر جنت کے لالچ میں عبادت کی تو یہ دینداری نہیں بلکہ دنیاداری ہے۔ غالب نے بھی اسی خیال کا اظہار کیا ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ دین کے ہر امر میں خلوص اور للٰہیت شرط ہے اس کی مقبولیت کے لئے۔ قرآن وحدیث میں اس قسم کے مضامین بھرے پڑے ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ جنت کی طلب اور جہنم سے پناہ مانگنے کی ہدایت تو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کی ہے اور یوں دعا کرنے کو کہا ہے کہ اے اللہ میں تجھ سے جنت اور جنت سے قریب کرنے والے اعمال چاہتا ہوں، اور جہنم اور جہنم سے قریب کرنے والے اعمال سے پناہ مانگتا ہوں۔ اس کے علاوہ قرآن کہتا ہے یدعو ننا رغبا و رھبا کہ وہ ہماری عبادت کرتے ہیں ہماری رحمت کی امید اور عذاب کے خوف سے۔ اگر غالب اور بیدل کے یہاں بھی یہ فرق ملحوظ ہے جو میں نے بیان کیا تو اس میں کوئی تضاد نہیں لیکن اگر اس کے خلاف ہے تو یہ دونوں زبردست غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔

ہیں اہل خرد کس روش خاص پہ نازاں	زندگی در قید و بند رسم و عادت مردن است
پابستگی رسم و رہِ عام بہت ہے	دست دستِ تست بشکن ایں کلاہ را
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ جاہل تو رسم ورہِ عام کے غلام ہیں لیکن جو لوگ اہل خرد ہیں ان کا دامن بھی اس عیب سے پاک نہیں ہے۔ اس لئے وہ روش خاص پر چلنے کا دعویٰ نہیں کرسکتے۔ بیدل کہتے ہیں رسم ورواج کی قید میں رہ کر زندگی گزارنا ایک طرح سے موت ہے۔ ہاتھ تو تیرا ہاتھ ہے اس ٹوپی کو توڑ دے۔ غالب اور بیدل دونوں نے رسم پرستی کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ غالب کے مصرعہ ''پابستگی رسم ورہِ عام بہت ہے'' میں بیدل کے مصرعہ ''زندگی در قید و بند رسم و عادت مردن است'' کا عکس موجود ہے۔ البتہ غالب نے رسم ورواج کی پابندی کی عمومیت کا تذکرہ کیا ہے جب کہ بیدل رسم ورواج کی پابندی کو موت قرار دیتا ہے۔

ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالب کو نہ جانے	بیدل ہر چند شور نظم بیش است
شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے	گر وارسم اندیشہ خجالت کیش است
غالبؔ	بیدلؔ

در سلک سخن وراں گہر ہائے مرا
چوں ژالہ ہماں آب شدن در پیش است

مطلب یہ ہے چونکہ غالب بہت اچھا شاعر ہے اس لئے ہر شخص اسے جانتا ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ وہ بدنام بہت ہے۔ شعر کی خوبی اس بات میں مضمر ہے کہ تحسین کے پردے میں اپنی بھی مذمت کر دی۔ بیدل کہتے ہیں اگر چہ ہماری شاعری کا بڑا چرچا ہے اور ہر طرف اس کی شہرت ہے پر جب اپنے کلام پر غور کرتا ہوں تو میری قوت فکریہ کو پشیمانی لاحق ہوتی ہے۔ شاعروں کی صف میں میرے موتی جیسے کلام کو مارے شرم کے اولے کی طرح پانی پانی ہو جانے سے سابقہ ہے۔ غالب اور بیدل دونوں کو زندگی ہی میں اپنے کلام کی شہرت اور مقبولیت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اس لئے انھوں نے اس کا اظہار کیا۔ البتہ غالب نے دوسرے مصرعہ میں اپنی شہرت کے ساتھ بدنامی کا اور بیدل نے اپنی شہرت کے ساتھ پشیمانی کا ذکر کیا ہے۔

باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب	دل صید شوق و دیدہ اسیر خیال تست
نظارہ و خیال کا ساماں کئے ہوئے	ویرانہ کشوریکہ بہ ایں بندوست نیست
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں دل نے محبوب کے تصور کا اور آنکھوں نے اس کے دیدار کا پھر سامان کیا ہوا ہے، اس لئے دونوں میں رقابت کا بازار گرم ہو گیا ہے۔ بیدل کہتے ہیں دل عشق محبوب میں گرفتار ہے تو دیدہ تصور محبوب میں اسیر ہے۔ جس ملک میں اس قسم کا بندوبست اور نظم ونسق نہ ہو وہ ملک ویران ہے۔ غالب اور بیدل دونوں نے دیدہ و دل کی اسیری کو موضوع بنایا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ غالب نے دل کو محبوب کے تصور اور دیدہ کو اس کے دیدار کا سامان قرار دے کر دونوں میں رقابت پیدا کر دی۔ جبکہ بیدل نے دل کو عشق محبوب میں اور دیدہ کو خیال محبوب میں گرفتار کر کے کشور دل عاشق کی آبادی کا ذکر کیا ہے۔ اور کہا کہ جس دل کے اندر یہ بندوبست نہیں ہے وہ گویا کہ ایک ویران ملک ہے۔ یہاں بیدل کا

خیال غالب کے خیال سے بہتر معلوم ہوتا ہے۔

دل پھر طواف کوئے ملامت کو جائے ہے	درشتیہا گوارا می شود در عالم الفت
پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے	رگِ سنگ ملامت رشتہ جاں بود مجنوں را
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں چونکہ محبوب کے کوچے میں جاکر بہت ذلیل ہوا اس لئے وہاں نہ جانے کا عہد کرلیا تھا مگر میں نے اپنی خود داری کو ملیامیٹ کردیا۔ اس لئے پھر وہاں جانا چاہتا ہوں۔ بیدل کہتے ہیں عالم الفت میں سختیاں گوارا ہوتی ہیں چنانچہ مجنوں کے لئے رگ سنگِ ملامت رشتہ جاں ثابت ہوئی۔ مطلب یہ ہے کہ مجنوں کو لوگ لیلیٰ کی محبت میں جس قدر ملامت کرتے تھے اسی قدر اس کی محبت میں اضافہ ہوتا تھا۔ گویا رگ سنگ ملامت اس کے لئے رشتہ جاں ثابت ہوئی۔ غالب اور بیدل دونوں نے عاشق کی ملامت کو موضوع بنایا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ غالب نے عہد کرلیا تھا کہ اب جاکر مزید ذلت نہیں اٹھاؤں گا۔ مگر وہ اپنے عہد پر قائم نہ رہ سکے اور خودداری کو بالائے طاق رکھ کر دوبارہ کوئے ملامت کا طواف کرنا چاہتے ہیں جبکہ بیدل کے خیال میں لعنت ملامت کی سختی عشق کی راہ میں گوارا اور پسندیدہ ہے۔

مانگے ہے پھر کسی کو لب جام پر ہوس	برخط وزلف بتاں غرہ عشقی بیدل
زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کئے ہوئے	حسن فہمیدہ ای اجزائے پریشانی را
غالبؔ	بیدلؔ

غالب کہتے ہیں کہ میں پھر کسی ایسے معشوق کو دیکھنا چاہتا ہوں جو کوٹھے پر اپنی زلفیں کھولے ہوئے بیٹھا ہو۔ بیدل کہتے ہیں اے بیدل معشوق کے خط وزلف کے عشق میں گرفتار ہو کر تم پھولے نہیں سماتے ہم نے اجزائے پریشاں کو حسن سمجھ رکھا ہے۔ غالب اور بیدل دونوں نے معشوق کی سیاہ زلف کو موضوع بنایا ہے اس فرق کے ساتھ کہ غالب کی خواہش ہے کوٹھے پر کسی معشوق کو ایسی حالت میں دیکھے کہ وہ اپنی زلفیں بکھرتے ہوئے ہو۔ جبکہ بیدل اس کو اجزائے پریشاں قرار دے کر موجب پریشانِ خاطر قرار دیتا ہے اس لئے اس سے کنارہ کشی کی دعوت دیتا ہے۔

غالب کی فارسی شاعری اور بیدل کی پیروی

یہ تو غالب کی اردو شاعری میں بیدل کی پیروی سے متعلق بحث تھی۔ ضمنی طور پر غالب کے بعض فارسی اشعار بھی جابجا اس میں شامل کئے گئے ہیں جن میں بیدل کی پیروی کا احساس ہوتا ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، غالب نے صرف اپنی ابتدائی اردو شاعری میں بیدل کی پیروی کا اعتراف کیا ہے۔ مگر اس بحث کے خاتمے پر جو تاثر پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ پیروی کا سلسلہ آخر تک جاری رہا اسی طرح دونوں کی فارسی غزلوں کا تقابلی مطالعہ واضح کرتا ہے کہ پیروی کا سلسلہ یہاں بھی جاری رہا ہے۔ چنانچہ حالی لکھتے ہیں:

''معلوم ہوتا ہے کہ مرزا نے فارسی غزل بھی اول مرزا بیدل وغیرہ کی طرز میں کہنی شروع کی تھی۔ چنانچہ اس قسم کی بہت سی غزلیں ان کے دیوان میں اب تک موجود ہیں۔ مگر رفتہ رفتہ یہ طرز بدلتی گئی اور آخر کار عرفی، ظہوری، نظیری اور طالب آملی وغیرہ کی غزل کا رنگ مرزا کی غزل میں پیدا ہو گیا''۔ (۱۵۸)

راقم السطور کے خیال میں اگر چہ اس نے صرف عرفی، نظیری، حزین اور ظہوری وغیرہ کا تذکرہ اپنی غزلیات اور خطوط میں کیا ہے اور ان میں بھی صرف عرفی کے بارے میں کہتا ہے کہ وہ مطاع ہے اور میں اس کا مطیع ہوں مگر ان اساتذہ کی پیروی کی نوعیت کیا رہی ہے؟ خود غالب کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

''صرف بحر، ردیف اور قافیہ دیکھ لیا اور اس زمین میں غزل قصیدہ لکھنے لگا''۔ (۱۵۹)

پیروی کی اگر یہی نوعیت رہی ہے تو غالب نے یقیناً بیدل کی بھی پیروی کی ہے۔ ذیل میں ان دونوں کی چند غزلیں ایک دوسرے کے مقابلے پر پیش کی جاتی ہیں۔ دونوں کی غزلوں کے مطالعہ سے یہ اندازہ بھی آسانی سے لگایا جا سکتا ہے کہ کیا صرف بحر، ردیف اور قافیہ تک پیروی محدود رہی ہے یا خیالات اور اسلوب میں بھی اس نے بیدل کی تقلید کی ہے۔

غالب

ما لاغریم گر کمرِ یار نازکست
فرقیست درمیانه که بسیار نازکست

دارم دلی ز آبله نازک نهاد تر
آهسته پانهم که سرِ خار نازکست

از جنبش نسیم فروریزدی زهم
مارا چو برگ گل در و دیوار نازکست

بانالہ ام ز سنگدلیہاے خود مناز
غافل قماش طاقت کہسار نازکست

زحمت کشید و آن مژه برگشت ہمچنان
ما سخت جان و لذت آزار نازکست

رسوائیِ مباد خود آرائے ترا
گل پر مزن که گوشۂ دستار نازکست

ترسم تپش ز بند برون افگند مرا
تابِ کمند کاکل خمدار نازکست

از جلوه ناگداختن و رونساختن
آئینه را به بین که چه مقدار نازکست

می رنجد از تحمل ما بر جفاے خویش
ہاں شکوۂ که خاطر دلدار نازکست

از ناتوانے جگر و معده باک نیست
غالب دل و دماغ تو بسیار نازکست

بیدل

از بس قماش دامن دلدار نازکست
دستم اگر به کار رود کار نازکست

از طوف گلشنت ادبم منع میکند
کیفیت درشتیِ این خار نازکست

تا دم زنی چو آئینه گردانده است رنگ
این کارگاه جلوه چه مقدار نازکست

عرض وفا مباد وبال دگر شود
ای نالہ عبرتی که دل یار نازکست

تاگشت جنبش مژه سیل بنائے اشک
بے پرده شد که طینت ہموار نازکست

اے نازنیں طبیب ز دردت گداختم
پیش آ که نالۂ من بیمار نازکست

فرصت کفیل ایں ہمه غفلت نمی شود
خوابت گراں و سایۂ دیوار نازکست

مشکل بنفیِ خود کنم اثبات مدعا
آئینه وہم و خاطر زنگار نازکست

وحدت بہیچ جلوه مقابل نمیشود
بیرنگ شو که آئینه بسیار نازکست

اظہار ما ز حوصله آخر بعجز ساخت
چندانکه نالہ خوں شده منقار نازکست

اندیشه در معاملۂ عشق داغ شد
آئینه اوست یا منم اسرار نازکست

بیدل نمیتواں ز سر دل گذشتنم
ایں مشت خوں ز آبلہ صد بار ناز کست (۱۶۰)

☆☆☆

غالب

خیز و بیراہہ روی را سراہی دریاب
شورش افزا نگہ حوصلہ گاہی دریاب
عالم آئینہ راز است چہ پیدا چہ نہان
تاب اندیشہ نداری بنگاہی دریاب
گر بہ معنی نرسی جلوۂ صورت چہ کمست
خم زلف و شکن طرف کلاہِ دریاب
غم افسردگیم سوخت کجائی اے شوق
نفسم را بہ پرافشانی آہی دریاب
بر توانائی ناز تو گواہیم ز عجز
تاب بیجادہ بجذب پر کاہی دریاب
تاچہا آئینہ حسرتِ دیدار تو ایم
جلوہ برخود کن و مارا بنگاہی دریاب
تو در آغوش و دست و دلم از کار شدہ
تشنہ بے دلو و رسن بر سر چاہی دریاب
داغ ناکامی حسرت بود آئینہ وصل
شب روشن طلبی روز سیاہی دریاب
فرصت از کف مدہ و وقت غنیمت پندار
نیست گر صبح بہاری شب ماہی دریاب
غالب و کشمکش بیم و امیدش ہیہات

بیدل

فال تسلیم زن و شوکت شاہی دریاب
گردنی خم کن و معراج کلاہی دریاب
دام تسخیر دو عالم نفس نومیدیست
اے ندامت زدہ سررشتہ آہی دریاب
فرصت صحبت گل پا برکابِ رنگ است
آرزو چند اگر ہست نگاہی دریاب
از شبیخوں خط یار نگردی غافل
ہر کجا شوخیِ گردیست سپاہی دریاب
دود پیچیدۂ دل گرد سراغی دارد
از سویدا اثرِ چشم سیاہی دریاب
تا کی اے پائے طلب زحمت جولاں دادن
طوف آسودگی آبلہ گاہی دریاب
یوسفی کن گرت اسباب مسیحائی نیست
بہ فلک گر نہ رسیدی بن چاہی دریاب
نامرادی صدفِ گوہرِ اقبال رساست
غوطہ در جیب گدائی زن و شاہی دریاب
سیل بنیاد دو عالم شدی اے آتش عشق
ما گیاہیم زما ہم پرکاہی دریاب
چہ وجود و چہ عدم بست و کشاد مژہ است

یا تیغی بکش ویا بہ نگاہی دریاب
چوں شرر ہر دو جہاں را بنگاہی دریاب
خلوتِ عافیت شمع گداز است اینجا
پی خاکستر خود گیر و پناہی دریاب
دامن دیدہ بہر سرمہ میالا بیدل
انتظاری شو و گرد سرِ راہی دریاب (۱۶۱)

غالب کی اس فارسی غزل کے سلسلے میں، جس میں بیدل کی غزل کا پورا عکس اور اسلوب وخیال میں بیدل کی پیروی کا پورا ثبوت ملتا ہے، ڈاکٹر تنویر احمد علوی لکھتے ہیں:

"غالب کی یہ فارسی غزل ان کی بہت دلکش غزلوں میں سے ایک ہے۔ اس میں زبان کی پیچیدگی اور خیالات کی گرہ بندیاں نہیں ملتیں۔ بلکہ زندگی اور اس کے معاملات پر ایک دانشمندانہ تبصرہ ملتا ہے۔ ہم ان اشعار کو غالب کے حکیمانہ انداز نظر کا ترجمان کہہ سکتے ہیں۔ پہلے ہی شعر میں جو خیز سے شروع ہوتا ہے یعنی "اٹھ جا" یہ کہا گیا ہے کہ خواہ مخواہ بیٹھے بیٹھے اور غیر معمولی خیالات میں گھرے ہوئے زندگی کیوں گذارتے ہو۔ بے راہ روی اختیار کرلو اسی میں صحیح راہ بھی مل جائے گی۔ سوتے رہنے کے مقابلے میں تو بیہودہ کوشش کرنا زیادہ بہتر ہے۔ اردو میں ایک عمدہ مثل ہے حرکت میں برکت ہے۔ کچھ کروگے تو نتیجہ ملے گا۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھے رہنے سے کیا فائدہ۔ اور کچھ نہیں تو ایسی نگاہ کا راز پا جاؤ جو شورشوں کو بڑھاتی ہو اور حوصلوں کو گھٹاتی ہو۔

یہ ایک نفسیاتی مسئلہ ہے اور انداز نظر سے تعلق رکھتا ہے۔ دوسروں کی اور ہماری نگاہ، کشمکش کو بھی بڑھا سکتی ہے۔ شورشوں میں بھی اضافہ کرسکتی ہے اور حوصلوں کو کم بھی کر سکتی ہے۔ اس کو سمجھ کر قدم اٹھاؤ اور فیصلہ کرو۔ یہ تمام دنیا ایک آئینہ راز ہے۔ کوئی اس راز کو آشکار دیکھتا ہے اور کوئی پنہاں۔ تم اس نکتہ کو سمجھو، سوچ لو اور اشارہ فہم ہو جاؤ، اگر سوچ نہیں سکتے تو دوسروں کے اشارے سے تو سمجھا جا سکتا ہے۔ پہلا مصرع غالب کی خوبصورت زبان میں ہے اور ایک جانے پہچانے مفہوم سے متعلق ہے۔ مگر دوسرے مصرع میں اس میں ایک ندرت پیدا کردی۔" (۱۶۲)

☆☆☆

غالب

تعالی اللہ برحمت شاد کردن بے گناہاں را
خجل نپسند د آزرم کرم بیدستگاہاں را
خوے شرم گنہ در پیشگاہِ رحمتِ عامت
سہیل و زہرہ افشاند ز سیما روسیاہاں را
زہے دردت کہ با یک عالم آشوبِ جگر خائی
دود در دل گدایاں را و در سر پادشاہاں را
بحرفی حلقہ در گوش افگنی آزاد مرداں را
بخوابی مغز در شور آوری بالیں پناہاں را
ز شوقت بیقراری آرزو خارا نہاداں را
بیزمت لائے خواری آبرو پرویز جاہاں را
بداغت شادم امازیں خجالت چوں بروں آیم
کہ رشکم در جحیم افگند خلد آرام گاہاں را
بدلہا ریختی یکسر شکستن ہم ز یزداں داں
کہ لختی برخم زلف و کلہ زد کجکلاہاں را
بنازم خوبیِ خونگرم محبوبِ کہ در مستی
کند ریش از مکیدنہا زباں عذر خواہاں را
ہمئے آسائشِ جانہا بداں ماند کہ ناگاہاں
گذر بر چشمہ افتد تشنہ لب گم کردہ راہاں را
ز جورش داوری بردم بدیواں لیک زیں غافل
کہ سعی رشکم از خاطر برد نامش گواہاں را
گسست تار و پود، پردۂ ناموس را نازم
کہ دامِ رغبتِ نظارہ شد رسوا نگاہاں را

بیدل

الٰہی پارۂ تمکیں رم وحشی نگاہاں را
بقدرِ آرزوئے ما شکستی کجکلاہاں را
بحشر گرچنیں باشد ہجوم حیرتِ قاتل
چو مژگاں برقفا یابند دستِ دادخواہاں را
چہ امکانست خاکِ ما نظر گاہِ بتاں گردد
فریب سرمہ نتواں داد ایں مژگاں سیاہاں را
رعونت مشکل است از مزرعۂ ما سر بروں آرد
کہ پامالی بود بالیدنِ ایں عاجز گیاہاں را
گواہی چوں خموشی نیست بر معمورۂ دلہا
سواد دلکشائے سرمہ بس باشد صفاہاں را
ز شوخیہائے جرمِ خویش می ترسم کہ در محشر
شکستِ دل بحرف آرد زبان بے گناہاں را
تواں زد بے تامل صد زمین و آسماں برہم
کفِ افسوس اگر باشد ندامت دستگاہاں را
نشانہا نقش بر آبست در معمورۂ امکاں
نگیں بیہودہ در زنجیر دارد نام شاہاں را
دریں گلشن کہ یکسر رنگ تکلیفِ ہوس دارد
مژہ برداشتن کوہیست استغناء نگاہاں را
صدائے از درائے کاروان عجز می آید
کہ حیرت ہم براہی می وردگم کردہ راہاں را
مزاج فقر ما با گرم و سرد الفت نمی گیرد
ہوائے نیست بیدل سرزمینِ بیکلاہاں را (۱۶۳)

نشاطِ ہستیِ حق دارد از مرگ ایمنم غالب
چراغم چوں گل آشامد نسیم صبح گاہاں را

☆☆☆
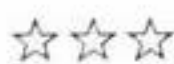
غالب

نوید التفاتِ شوق دادم از بلا جاں را
کمند جذبۂ طوفاں شمرد موج طوفاں را

پرستارم جگر درباخت یارب در دل اندازش
ز بیتابی بزخم سرنگوں کردن نمکداں را

چناں گرمست بزم از جلوۂ ساقی کہ پنداری
گداز جوہرِ نظارہ در جامست مستاں را

ندارم شکوہ از غم باہجوم شوق خرسندم
زجا برداشت جوش دل ہمانا داغ ہجراں را

قضا از نامہ آہنگ دریدن ریخت در گوشم
ز پشتِ ناخنم نسترده نقشِ روئے عنواں را

بتن چسپید بازم از نمِ خونابہ پیراہن
خراشِ سینہ سطر بخیہ شد چاک گریباں را

بجرم تاب ضبط نالہ بامن داوری دارد
زشوخی می شمارد زیرلب دزدیدن افغاں را

ہنوز آئینہ ما می پذیرد عکس صورتہا
چہ ناصح خندہ زد اندر دل افشردیم دنداں را

تکلف برطرف لب تشنۂ بوس و کنارستم
زراہم باز چیں دامِ نوازشہائے پنہاں را

بہ مستی گر بہ جنت بگذری زنہار نگزینی
سرابی در رہستی تشنہ دیدار جاناں را

بیدل

عبث تعلیم آگاہی مکن افسردہ طبعاں را
کہ بینائی چو چشم از سرمہ ممکن نیست مژگاں را

بغیر از باد پیمائی چہ دارد پنجۂ منعم
زوصلِ زر ہماں یک حسرت آغوش است میزاں را

بہر جا عافیت روداد ناداں در تلاش افتد
دویدن ریشۂ گلہائے آزادیست طفلاں را

حسد را ریشہ نتواں یافت جز در طینتِ ظالم
سر دنبالہ دایم در دل تیر است پیکاں را

درشتاں را ملایم طینتیہایم خجل دارد
زباں از نرم گوئی سرنگوں افگند دنداں را

اگر سوز نفس از شور محشر باج می گیرد
خموشیہائے ایں نے در گرہ دارد نیستاں را

کتاب پیکرم یکموج مے شیرازہ میخواہد
نم آبی فراہم می کند خاک پریشاں را

فغاں کیں نوخطاں سادہ لوح از مشق بیباکی
بآبِ تیغ میشویند خط عنبر افشاں را

دگر کو تحفۂ تا گلرخاں فہمند مقدارش
چو نقشِ پا بخاک افگندہ اند آئینہ جاں را

چو بوئے گل لباسِ راحتِ ما نیست عریانی
مگر در خواب بیند پائے مجنوں وصل داماں را

چمن ساماں بتی دارم کہ دارد وقت گل چیدن
خرامی کز ادائے خویش برگل کردہ داماں را
چہ دود دِل چہ موج رنگ در ہر پردہ از ہستی
خیالم شانہ باشد طرۂ خوابِ پریشاں را
رسید نہائے منقارِ ہما بر استخواں غالب
پس از عمری بیادم داد رسم و راہِ پیکاں را

بہ بیساما نیم وقست اگر شورِ جنوں گرید
کہ دستی گر کنم پیدا نمی یابم گریباں را
بچشمِ خوں فشاں بیدل تو آں بحر گہر خیزی
کہ لاف آبرو پیشت گداز دابر نیساں را (۱۶۴)

☆☆☆

غالب

ظہور بخشش حق را ذریعہ بے سببیست
وگرنہ شرم گنہ در شمار بے ادبیست
زگیر و دار چہ غم چوں بعالمیکہ منم
ہنوز قصہ حلاج حرف زیر لبیست
رموز دین نشناسم درست و معذورم
نہاد من عجمی و طریق من عربیست
نشاط جم طلب از آسماں نہ شوکت جم
قدح مباش زیا قوت بادہ گر عنبیست
بالتفات نیرزم در آرزو چہ نزاع
نشاط خاطر مفلس ز کیمیا طلبیست
بود بہ طالع ما آفتاب تحت الارض
فروغ صبح ازل در شراب نیمشبیست
نہ ہم پیالگی زاہداں بلائے بود
خوشست گرمی بیغش خلاف شرع نیست
ہر آنچہ در نگری جز بہ جنس مائل نیست

بیدل

ادب نہ کسب عبادت نہ سعی حق طلبیست
بغیر خاک شدن ہر چہ ہست بے ادبیست
ز بیقراریِ نبض نفس تواں دانست
کہ ہمراہی وحشت کمند بے سببیست
خمار جام تسلی شکستن آساں نیست
ز نالہ تا بخموشی ہزار تشنہ لبیست
تغافل آئینہ دار تبسم است اینجا
بعرض چیں نتواں گفت ابروش غضبیست
بفہم مطلب موہوم ما کہ پردازد
زبان عجز فروشاں مدعا عربیست
دلی گداختہ برگ نشاط امکانست
کبابہا جگری کن شراب ما عنبیست
اسیر شانہ و حیران سرمۂ زاہد
کجاست عصمت و کو عفت این ہمہ جلبیست
ہنوز موئے سفیدش بشیر می شویند

عیار بیکسی ما شرافت نسبیست
کسیکه از تو فریب وفا خورد داند
که بیوفائی گل در شمار بوالعجبیست
میان غالب و واعظ نزاع شد ساقی
بیا به لابه که ہیجان قوتِ غضبیست

فریب جبه و دستار شیخ چند صبیست
ز پشت و روئے ورق ہر چه ہست باید خواند
کدام عیش و چه کلفت زمانه روز و شبیست
چو صبح به که بصد رنگ شبنم آب شویم
کف غبار و غرور نفس حیا طلبیست
چو موج اگر ہمه تسلیم گل کنی بیدل
ہنوز گردن تمہید دعویت عصبیست (۱۶۵)

☆☆☆
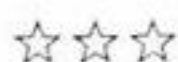
غالب

امشب آتشیں روئے گرم ژند خوانیہاست
کز لبش نوا ہردم در شرر فشانیہاست
تا در آب افتاده عکس قد دلجویش
چشمه ہمچو آئینه فارغ از روانیہاست
در کشاکش ضعفم نگسلد رواں از تن
اینکه من نمی میرم ہم ز ناتوانیہاست
از خمیدن پشتم روئے بر قفا باشد
تا چہا دریں پیری حسرتِ جوانیہاست
کشته دل خویشم کز ستمگراں یکسر
دید دلفریبیہا گفت مہربانیہاست
سوئے من نگہدارد چیں فگنده در ابرو
باگراں رکابیہا خوش سبک عنانیہاست
دایم از سرِ خاکم رخ نہفته بگذشتن
ہاں و ہاں خدا دشمن اینچه بدگمانیہاست

بیدل

قید الفتِ ہستی وحشت آشیانیہاست
شمع تا نفس دارد شیوه پرفشانیہاست
شانه را بگیسویش طرفه ہمزبانیہاست
سرمه را بچشم او الفت آشیانیہاست
ما ز سیر ایں گلشن عشوه طرب خوردیم
ورنه چشم وا کردن عبرت امتحانیہاست
اے سحر تامل کن یکنفس تحمل کن
وحشت و دم پیری شوخی و جوانیہاست
زلف تابدارش را شانه میدمد افسوں
دیده وقف حیرت کن موج جانفشانیہاست
پیش چشم بیمارش گرد و تا شود نرگس
عیب سرنگونی نیست جائے ناتوانیہاست
بیخودان الفت را نیست کلفتِ مردن
مردنی اگر باشد ہیتو زندگانیہاست

شوخیش در آئینہ محو آں دہن دارد چشم سحر پردازش باب نکتہ دانیہاست	در وفا چہ امکانست جاں کنم دریغ از تو برجبیں گرہ مپسند ایں چہ بدگمانیہاست
با عدو عتابستی وز منش حجابستی وہ چہ دلربائیہا ہی چہ جانستانیہاست	چارسوئے امکاں را جز غبار جنسی نیست بستن در مژگاں عافیت دکانیہاست
با چنیں تہی دستی بہرہ چہ بود از ہستی کار ما ز سرمستی آستیں فشانیہاست	محو یاس کن حاجت ورنہ نزد عبرتہا در طلب عرق کردن نیز ترزبانیہاست
ایکہ اندریں وادی مژدہ از ہما دادی برسرم ز آزادی سایہ را گرانیہاست	از غرور وہم ایجاد ہرزہ رفتہ ای برباد اے غبار بے بنیاد اینچہ آسمانیہاست
ذوق فکر غالب را بردہ ز انجمن بیروں با ظہوری و صایب محو ہمزبانیہاست	عمرہاست بے حاصل می زنی پر بسمل بہر نیم جاں بیدل اینچہ سخت جانیہاست (۱۲۶)

غالب کی یہ غزل اگر چہ ظہوری اور صایب کی غزل کی زمین میں ہے اور اس نے اسے ہمزبانی سے تعبیر کیا ہے لیکن بیدل کی غزل سے موازنہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کے خیالات اور اسلوب میں کتنی یکسانیت ہے۔

☆☆☆

غالبؔ	بیدلؔ
جنت نہ کند چارہ افسردگیِ دل تعمیر باندازۂ ویرانی ما نیست	جنت نبود چارۂ افسردگیِ دل تعمیر باندازۂ ویرانۂ ما نیست
در وہم قطرگیست کہ در خود گمیم ما اما چو وارسیم ہماں قلزمیم ما	کدام قطرہ کہ صد بحر در رکاب ندارد کدام ذرہ کہ طوفان آفتاب ندارد
زحمتِ احباب نتواں داد غالب بیش ازیں ہر چہ میگوییم بہر خویش میگوئیم ما	نالۂ داریم و محو پردۂ گوشِ خودیم شوق ما را برکسِ دیگر دماغ عرض نیست

راحت دائی ذوق طلب را نازم
گرد نمناک بود سایہ بنا ہائے مرا

بہ بے آرامیت آسائشِ ذوق طلب بیدل
خوش آں رہرو کہ خارِ پائے خود فہمید منزل را

جز دفع غم ز بادہ نبودہ ست کام ما
گوئی چراغ روز سیاہست جام ما

مطلب از مئے پرستی تردماغیہا نبود
یک دو ساغر آب دادم گریہ مستانہ را

با ہمہ نزدیکی از وے کام دل نتواں گرفت
تشنہ اما در کنارِ آب جو پا در گلست

ہمہ عمر با تو قدح زدیم و نرفت رنجِ خمار ما
چہ قیامتی کہ نمی رسی ز کنارِ ما بکنارِ ما

بہوس چوں پرِ طاؤس چمنہا دارم
داغ صد رنگ خیالم چہ قدر بیکارم

بیدل چمن آرائے گریبان خیالیست
یا رب نشود آنکہ سر از خویش بر آرد

دولت بہ غلط نبود از سعی پشیماں شو
کافر نتواں شد ناچار مسلماں شو

طریقِ عشق دشوارست ز آئینِ خرد بگذر
حریف کفر نتواں شدن باری مسلماں شو

ما ہماں عین خودیم اما خود از وہم دوئی
درمیان ما و غالب ما و غالب حائل است

لب فرد ماندیم اما خود از وہم دوئی
درمیان ما و تو ما و تو حائل شود

از چشم ما خیال تو بیروں نمی رود
گوئی بدام تارِ نگاہش گرفتہ ایم

دل صید شوق و دیدہ اسیر خیال تست
ویرانہ کشوریکہ بایں بندوبست نیست

ہاں اے شیخ پریخواں مئے گلگوں بقدح ریز
تا در نظرت بال پریزاد بجنبد

بہار می گذرد مفت فرصت است اے شیخ
قدح بخون ورع زن شراب را دریاب

دبیرم، شاعرم، رندم، ندیمم، شیوہ ہا دارم
گرفتم رحم بر فریاد و افغانم نمی آید

تحیرم، طپشم، برق نالہ ام، داغم
چو درد عشق بچندیں لباس عریانم

نمی رنجد کہ در دامِ تغافل می طپد صیدش
نمی دانم چہ پیش آمد نگاہِ بی محابا را

بہر سو چشم وا کردم نگہ وقفِ خطا کردم
نمی دانم چہ پیش آمد من غفلت تقاضا را

رموز دیں نشناسم درست و معذورم
نہاد من عجمی و طریق من عربیست

بفہم مطلبِ موہوم ما کہ پردازد
زبانِ عجز فروشاں مدعا عربیست

نشاط جم طلب از آسماں نہ شوکت جم — دل گداخته برگ نشاط امکانست
قدح مباش ز یاقوت بادہ گر غنیست — کبابہا جگری کن شراب ما غنیست

بیکسیہائے من از صورت حالم دریاب — صورت احوالم از طرز تخلص روشن است
مردہ ام بر سر راہ و کف خاکم کفن است — بیکسیہا چیدہ ام بر خود ز وضع روزگار

سینہ بکشودیم خلقی دید کاینجا آتش است — عشق می آید بروں گر واشگافی سینہ ام
بعد ازیں گویند آتش را کہ گویا آتش است — چوں طلسم سنگ نام ایں معمہ آتش است

گر بود مشکل مرنج اے دل کہ کار — رنج جہاں ہمت مردانہ راحت است
چوں رود از دست آساں می شود — گر بار می کشی کمرت استوار پیچ

در سلوک از ہر چہ پیش آمد گذشتن داشتم — بیطاقت شوقیم و جبیں داغ سجود است
کعبہ دیدم نقش پائے رہرواں نامیدمش — بت خانہ دریں راہ چہ و کعبہ کدام است

ہر رشحہ باندازۂ ہر حوصلہ ریزند — دل وفا، بلبل نوا، واعظ فسوں، عاشق جنوں
میخانہ توفیق خم و جام نریزند — ہر کسی در خورد ہمت پیشہ پیدا می کند

کو فنا تا ہمہ آلایش پندار برد — کو بقا گر نفست گشت مکرر پیدا
از صور جلوہ وز آئینہ زنگار برد — پا ندارد چو سحر چند کنی سر پیدا

بلبل بہ چمن نگرد و پروانہ بہ محفل — در وصل ہم ز حسرت دیدار چارہ نیست
شوق است کہ در وصل ہم آرام ندارد — با عشق طالعیست کہ ما آزمودہ ایم

در عشق انبساط بپایاں نمی رسد — نشاط جاوداں خواہی دلی را صید الفت کن
چوں گرد باد خاک شو و در ہوا برقص — کہ مستیہاست موقوف بدست آوردن مینا

در ہر مژہ برہم زدن ایں خلق جدید است — بسامانست بے ساز تردد
نظارہ سگالد کہ ہماں است و ہماں نیست — بہر مژگاں زدن چندیں تجدد

حواشی

۱ چہار عنصر مطبوعہ نولکشور ص ۴۱۹

۲ مآثر عالمگیری ص ۱ تا ۲۹، مفتاح التواریخ ص ۲۶۹، ۲۹۷، اویماق مغل ص ۵۵۰

۳ دیوان بیدل مطبوعہ تہران ص ۵۵۱

۴ ایضاً ص ۳۱

۵ مآثر عالمگیری ص ۵۲۷، ۵۳۰، فارسی ادب بعہد اورنگ زیب ص ۱۱، اویماق مغل ص ۵۵۰

۶ غالب اور آہنگ غالب ص ۱۳ تا ۱۶ غالب اکیڈمی نئی دہلی ۱۹۶۸ء

۷ تحقیقات مرتبہ پروفیسر نذیر احمد انتخاب مقالات غالب نامہ ۱۹۹۷ء ص ۴۷۶

۸ مجلہ سویرا ۱۹۵۷ء ص ۹ (پردیسی کے خطوط بیدل کے سلسلے میں۔ از مجنوں گورکھپوری)

۹ ایضاً ص ۹

۱۰ کلیات غالب مطبوعہ نولکشور ص ۴۷۷

۱۱ قلمرو سعدی از علی دشتی ص ۹۸

۱۲ دیوان بیدل مطبوعہ تہران ص ۹، ۱۲۱

۱۳ چہار عنصر مطبوعہ نولکشور ص ۴۴۴

۱۴ ایضاً ص ۴۴۴

۱۵ غالب کے خطوط جلد ۴ ص ۱۴۵۱

۱۶ ایضاً جلد ۲ ص ۷۲۳، ۷۴۷

۱۷ ایضاً ص ۵۹۱، ۶۵۲

۱۸ ایضاً ص ۳۵۷، ۶۵۲

۱۹ ایضاً ص ۵۹۴

۲۰ ایضاً ص ۳۹۵

۲۱ ایضاً ص ۸۰۲، ۶۵۲

۲۲ ایضاً جلد ۴ ص ۱۵۴۲، ۱۵۴۳

۲۳ ایضاً ص ۱۴۲۹، ۵۹۱

۲۴ ایضاً ص ۴۴۴، ۶۵۲

۲۵ ایضاً ص ۳۳۵، ۵۹۴

۲۶ ایضاً ص ۴۳۴

۲۷ ایضاً ص ۴۳۴، ۴۴۱

۲۸ ایضاً ص ۳۹۵، ۹۶۷

۲۹ ایضاً ص ۶۵۲، ۴۵۰

۳۰ ایضاً جلد ۱ ص ۵۹۴

۳۱ کلیات غالب مطبوعہ نولکشور ص ۲۰۱

۳۲ مقدمہ مثنوی ابر گہربار مطبوعہ احمدی پریس ص ۱

۳۳ ریاض الوداد قلمی ص ۴۵

۳۴ غالب نامہ جنوری ۱۹۹۸ء

۳۵ غالب کے خطوط جلد ۴ ص ۱۴۵۱

۳۶ دیباچہ کلیات غالب ص ۱
۳۷ نقد غالب (غالب کا تفکر
از پروفیسر احتشام حسین) ص ۱
۳۸ غالب کے خطوط جلد ۲ ص ۸۴۶
۳۹ ایضاً ۶۱۰
۴۰ یادگار غالب مطبوعہ الہ آباد ص ۱۹۶
۴۱ روح بیدل مطبوعہ لاہور ص ۱۳۷
۴۲ کلیات غالب مطبوعہ نولکشور ص ۹۸، ۹۹
۴۳ غالب کے خطوط جلد ۳ ص ۱۱۵۲
۴۴ ایضاً ص ۹۸۳
۴۵ ایضاً جلد ۳ ص ۱۰۰۲
۴۶ ایضاً جلد ۲ ص ۶۲۷
۴۷ ایضاً جلد ۲ ص ۸۰۷
۴۸ ایضاً جلد ۱ ص ۳۰۶
۴۹ ایضاً جلد ۲ ص ۵۹۴
۵۰ ایضاً جلد ۲ ص ۶۱۰
۵۱ ایضاً جلد ۱ ص ۳۷۱
۵۲ ایضاً جلد ۲ ص ۷۴۷
۵۳ ایضاً جلد ۱ ص ۳۳۷
۵۴ ایضاً جلد ۱ ص ۲۱۴
۵۵ ایضاً جلد ۲ ص ۶۵۸
۵۶ ایضاً جلد ۲ ص ۶۸۴
۵۷ ایضاً جلد ۲ ص ۵۶۴
۵۸ ایضاً جلد ۲ ص ۸۴۶
۵۹ ایضاً جلد ۴ ص ۱۴۱۵
۶۰ ایضاً جلد ۲ ص ۸۴۶
۶۱ پنج آہنگ مطبوعہ نولکشور ص ۱۹۳
۶۲ غالب کے خطوط جلد ۴ ص ۱۴۶۳
۶۳ یادگار غالب ص ۱۹۶
۶۴ شعرالعجم بحوالہ ''بیدل'' از عباداللہ اختر ص ۱۲۱
۶۵ اقبال لاہوری و دیگر شعرائے فارسی گواز
ڈاکٹر ریاض ص ۱۲۴
۶۶ نقوش، غالب نمبر لاہور فروری ۱۹۶۹ء
۶۷ افکار غالب ص ۶، ۸
۶۸ غالب از غلام رسول مہر ص ۵۷۵، ۵۷۷
۶۹ نقد غالب ص ۷۰ تا ۷۲
۷۰ ایضاً ص ۲۹۱
۷۱ غالب اور آہنگ غالب ص ۱۴۵
۷۲ نئی تحریریں شمارہ ۱، لاہور (غالب اور
بیدل از عابد علی عابد) ص ۶۷، ۶۸
۷۳ مجلّہ سویرا سالنامہ ۱۹۵۷ء ص ۱۱-۱۰
۷۴ مجلّہ ہمایوں جنوری ۱۹۳۸ء (غالب اور
بیدل از پروفیسر حمید احمد خاں) ص ۹۲ تا ۹۷
۷۵ مجلّہ نگار معلومات نمبر جنوری فروری (غالب
اور بیدل از نیاز فتحپوری) ص ۱۰۲ تا ۱۰۳

۷۶ غالب کی شخصیت اور شاعری مطبوعہ مکتبہ جامعہ ص ۵۱ تا ۵۳

۷۷ نقد غالب ص ۱۲۷، مطالعا تغالب ص ۱۸۶، ۱۸۸، ۱۰۴

۷۸ نقد غالب ص ۲۶۵

۷۹ ایضاً ص ۳۸۹

۸۰ غالب نامہ جنوری ۱۹۹۸ء ص ۱۷۰۔۱۷۱

۸۱ چہار عنصر ص ۱۲۹

۸۲ دیوان بیدل مطبوعہ تہران ص ۳۷۵

۸۳ کلیات غالب مطبوعہ نولکشور ص ۱۳

۸۴ یادگار غالب ص ۱۲۳، ۱۲۴

۸۵ روح بیدل از ڈاکٹر عبدالغنی ص ۱۰

۸۶ غالب اور آہنگ غالب ص ۱۰۱

۸۷ کلیات غالب ص ۳۸۸

۸۸ یادگار غالب ص ۱۱۸۔۱۱۹

۸۹ مثنوی محیط اعظم مطبوعہ تہران ص ۶۳، ۶۴

۹۰ غالب کے خطوط جلد ۲ ص ۸۴۵

۹۱ یادگار غالب ص ۱۱۷

۹۲ ایضاً ص ۱۲۰

۹۳ ایضاً ص ۱۱۷

۹۴ غالب کے خطوط ص

۹۵ رقعات بیدل مطبوعہ نولکشور ص ۱۳۷

۹۶ مجلّہ نگار جنوری ۱۹۶۰ء

۹۷ یادگار غالب ص ۱۳۵

۹۸ بحوالہ شرح غالب از یوسف سلیم ص ۳۲۸

۹۹ چہار عنصر ص ۲۹۹

۱۰۰ یادگار غالب ص ۱۲۵

۱۰۱ ایضاً ص ۱۲۶

۱۰۲ مطالعہ غالب ص ۵۷

۱۰۲ شاعر آئینہ ہا ص ۸۰

۱۰۴ یادگار غالب ص ۱۲۳

۱۰۵ ایضاً ص ۱۱۷۔۱۱۸

۱۰۶ ایضاً ص ۱۳۶

۱۰۷ ایضاً ص ۱۳۷

۱۰۸ ایضاً ص ۱۳۷

۱۰۹ ایضاً ص ۱۳۸

۱۱۰ ایضاً ص ۱۳۸

۱۱۱ غالب کے خطوط ص ۵۱۶

۱۱۲ یادگار غالب ص ۱۲۶

۱۱۳ غالب کے خطوط جلد ۴ ص ۱۵۶۷

۱۱۴ یادگار غالب ص ۱۳۸

۱۱۵ ایضاً ص ۱۳۸

۱۱۶ ایضاً ص ۱۳۸

۱۱۷ چہار عنصر ص

۱۱۸ رقعات بیدل ص ۱۳۵

۱۱۹ یادگار غالب ص ۱۳۹

۱۲۰ ایضاً ص ۱۱۹

۱۲۱ ایضاً ص ۱۲۷

۱۲۲ چہار عنصر ص ۵۷۱
۱۲۳ یادگار غالب ص ۱۲۵
۱۲۴ ایضاً ص ۱۱۹
۱۲۵ مجلہ نگار جنوری ۱۹۶۰ء
۱۲۶ یادگار غالب ص ۱۱۹
۱۲۷ غالب کے خطوط ص ۵۱۶
۱۲۸ یادگار غالب ص ۱۴۰
۱۲۹ غالب کے خطوط ص ۱۴۳۶
۱۳۰ ایضاً ص ۱۵۳۷
۱۳۱ ایضاً ص ۸۴۰
۱۳۲ یادگار غالب ص ۱۴۰
۱۳۳ ایضاً ص ۱۴۱
۱۳۴ ایضاً ص ۱۲۸
۱۳۵ بحوالہ شرح غالب از یوسف سلیم ص ۵۰۸
۱۳۶ یادگار غالب ص ۱۴۳۔۱۴۴
۱۳۷ ایضاً ص ۱۳۵
۱۳۸ ایضاً ص ۱۴۶
۱۳۹ غالب کے خطوط ص ۱۱۱۳
۱۴۰ یادگار غالب ص ۱۲۱
۱۴۱ ایضاً ص ۱۲۸
۱۴۲ مجلہ نگار جنوری فروری ۱۹۵۷ء ص ۱۰۳
۱۴۳ چہار عنصر ص ۴۴۸
۱۴۴ رقعات بیدل ص ۱۳۵
۱۴۵ بکھرے خیالات ص ۸۵
۱۴۶ غالب کے خطوط بحوالہ شرح غالب ص ۵۷۳
۱۴۷ یادگار غالب ص ۱۵۰
۱۴۸ ایضاً ص ۱۵۰
۱۴۹ مجلہ سویرا ۱۹۵۷ء ص ۱۱
۱۵۰ چہار عنصر ص ۴۳۴
۱۵۱ یادگار غالب ص ۱۴۲
۱۵۲ مجلہ نگار
۱۵۳ یادگار غالب ص ۱۵۵
۱۵۴ غالب کے خطوط جلد ۲ ص ۳۶۹
۱۵۵ قرآن مجید سورہ طٰہٰ
۱۵۶ یادگار غالب ص ۱۵۷
۱۵۷ ایضاً ص ۱۵۸
۱۵۸ ایضاً ص ۱۹۴
۱۵۹ غالب کے خطوط ص
۱۶۰ کلیات غالب ص ۳۸۸، دیوان بیدل ص ۱۷۰
۱۶۱ کلیات غالب ص ۳۷۷ دیوان بیدل ص ۱۵۴
۱۶۲ غالب کی فارسی شاعری ص ۲۷۰
۱۶۳ کلیات غالب ص ۳۵۴، دیوان بیدل ص ۱۲
۱۶۴ کلیات غالب ص ۳۷۱، دیوان بیدل ۱۹۴
۱۶۵ کلیات غالب ص ۴۰۹ دیوان بیدل ص ۱۶۳
۱۶۶ کلیات غالب ص ۳۰۹ دیوان بیدل ص ۳۲۶

☆ ☆ ☆

کتابیات

۱ دیوان غالب مطبوعہ غالب اکیڈمی دہلی

۲ کلیات غالب فارسی مطبوعہ نولکشور

۳ غالب کے خطوط (چار جلدیں) مرتبہ خلیق انجم مطبوعہ غالب انسٹی ٹیوٹ

۴ غالب اور آہنگ غالب تالیف ڈاکٹر یوسف حسین خاں مطبوعہ غالب اکیڈمی دہلی ۱۹۶۸ء

۵ غالب نامہ جنوری ۱۹۹۸ء

۶ تحقیقات مرتبہ پروفیسر نذیر احمد انتخاب مقالات غالب نامہ مطبوعہ غالب انسٹی ٹیوٹ ۱۹۹۷ء

۷ مثنوی ابر گہر بار مطبوعہ احمدی پریس

۸ غالب کی فارسی شاعری تالیف ڈاکٹر تنویر احمد علوی مطبوعہ غالب اکیڈمی دہلی

۹ مطالعات کلام غالب انتخاب حکیم عبدالحمید مطبوعہ غالب اکیڈمی دہلی

۱۰ نقد غالب مطبوعہ علی گڑھ

۱۱ یادگار غالب تالیف الطاف حسین حالی مطبوعہ شاہی پریس الہ آباد ۱۹۷۰ء

۱۲ شرح دیوان غالب تالیف پروفیسر یوسف سلیم چشتی، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی

۱۳ افکار غالب تالیف خلیفہ عبدالحکیم مطبوعہ غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی ۱۹۹۹ء

۱۴ غالب تالیف غلام رسول مہر مطبوعہ غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی ۲۰۰۵ء

۱۵ پنج آہنگ مطبوعہ نولکشور

۱۶ غالب کی شخصیت اور شاعری پروفیسر رشید احمد صدیقی

۱۷ مآثر عالمگیری تالیف مستعد خاں ساقی، ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ

۱۸ اویماق مغل تالیف عبدالقادر خاں قراچار مطبوعہ امرتسر ۱۹۱۹ء

۱۹ مفتاح التواریخ تالیف طامس ولیم بیل مطبوعہ ۱۲۶۴ء

۲۰ دیوان بیدل مطبوعہ تہران مرتبہ حسین آہی

۲۱ چہار عنصر مطبوعہ نولکشور

۲۲ روح بیدل تالیف ڈاکٹر عبدالغنی مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۸ء

۲۳ شعر العجم تالیف مولانا شبلی مطبوعہ اعظم گڑھ

۲۴ بیدل تالیف عباداللہ اختر ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور ۱۹۵۲ء

۲۵ اقبال لاہوری و دیگر شعرائے فارسی گو تالیف ڈاکٹر ریاض

۲۶ مثنوی محیط اعظم تالیف عبدالقادر بیدل مطبوعہ تہران

۲۷ قلمرو سعدی تالیف علی دشتی مطبوعہ تہران

۲۸ رقعات بیدل مطبوعہ نولکشور

۲۹ شاعر آئینہ ہا تالیف شفیعی کدکنی مطبوعہ تہران

۳۰ فارسی ادب بعہد اورنگ زیب تالیف پروفیسر نورالحسن انصاری مطبوعہ پرشین سوسائٹی دہلی

۳۱ ریاض الوداد تالیف ایزدبخش رسا قلمی محفوظہ خدابخش لائبریری پٹنہ

۳۲ بکھرے خیالات تالیف علامہ اقبال ترجمہ عبدالحق

۳۳ مجلّہ سویرا سالنامہ ۱۹۵۷ء پاکستان

۳۴ مجلّہ ہمایوں جنوری ۱۹۳۸ء

۳۵ مجلّہ نگار معلومات نمبر جنوری فروری ۱۹۵۸ء

۳۶ مجلّہ نئی تحریریں شمارہ ۱، لاہور

۳۷ مجلّہ نقوش غالب نمبر لاہور فروری ۱۹۶۹ء

مَیں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں